معارف القرآن

4

تصنیف

حضرت مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

سورۃ آل عمران مکمل

جلد 4

تصنیف

اُستاذُ العُلماء شیخ الحدیث والتفسیر

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ

سابق اُستاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

اِدارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ

رابطہ نمبرز 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہ نامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہ نامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ④

اپنی بات	۷	زوجہ عمران کی بیٹے کے لیے دعا	۱۱۱
سورۃ آل عمران کا تعارف	۱۲	بیٹے کے لیے دعائے زکریا علیہ السلام	۱۱۸
اللہ تعالیٰ حیّ اور قیّوم	۱۷	حضرت زکریا علیہ السلام	۱۲۴
اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت کاملہ	۲۴	حضرت یحییٰ علیہ السلام	۱۲۵
آیات محکمات اور آیات متشابہات	۲۸	حضرت مریمؑ کی شان امتیازی	۱۳۱
راسخین فی العلم کی دو دعائیں	۳۸	عیسیٰؑ، کتاب، حکمت، تورات، انجیل	۱۴۰
کافروں کی شر انگیزیاں، معرکہ بدر	۴۱	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکیمانہ باتیں	۱۴۲
آزمائش میں ڈالنے والی چیزیں	۴۶	حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات	۱۶۱
متقی لوگوں کا آخرت میں صلہ	۵۲	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری	۱۷۴
دین اسلام کی سچائی	۶۰	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا	۱۷۸
مخالفین اسلام پر اتمام حجت	۶۴	حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے	۱۸۴
انبیاء کرام علیہم السلام وعلماء کرام کے قاتل	۷۰	مسئلہ حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام	۱۸۵
یہودیوں کی تورات سے روگردانی	۷۴	عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چار گروہ	۱۸۸
اللہ جسے چاہے بادشاہی دے	۷۸	اسلامی عقیدہ دربارہ مسیح علیہ السلام	۱۸۸
کافروں کو دوست نہ بنائیں	۸۵	قادیانی عقیدہ دربارہ حیات مسیح علیہ السلام	۱۸۹
روز قیامت اور عمر بھر کا اعمالنامہ	۹۴	حیات مسیح، مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ	۱۹۳
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے فوائد	۹۶	نزول عیسیٰ علیہ السلام	۱۹۵
عالمین کے لیے منتخب کیے گئے لوگ	۱۰۴	نزول مسیحؑ اور فرامین نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۹۶
انبیاءؑ کی جسمانی وروحانی خصوصیات	۱۰۷	تذکرہ مسیحؑ بزبان مصطفےٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم	۱۹۸

صریح احادیث میں تاویل کا نتیجہ	۲۰۱	حباہلوں کا مال کھانے کا گناہ	۲۵۷
اہل علم و عرفان و نزول مسیح علیہ السلام	۲۰۴	نذرانے و رشوتیں ختم ہونے کا خوف	۲۵۸
انجام کفار، صلہ اہل ایمان	۲۰۵	اہل کتاب کی کتاب میں تحریف	۲۶۳
تخلیق آدم و عیسیٰ علیہ السلام میں مماثلت	۲۰۹	کتاب، حکمت، نبوت اور ربانی	۲۷۱
عیسیٰؑ و آدمؑ کے درمیان وجوہ مماثلت	۲۱۱	انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا گیا عہد و پیمان	۲۷۷
کن فیکون کی وضاحت	۲۱۲	اسلام کل کائنات کا دین ہے	۲۸۱
آدم علیہ السلام کو کس چیز سے پیدا کیا گیا؟	۲۱۳	اسلام ہی اسلام کوئی اور نہیں	۲۹۲
مٹی کے مختلف نام	۲۱۴	مرتدین کے لیے احکامات	۲۹۶
غبار کے مختلف نام۔ مٹی کے اوصاف	۲۱۵	مرتدین کی توبہ	۳۰۱
آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنانے میں حکمت	۲۱۶	حالت کفر پر مرنے والوں کی سزا	۳۰۳
آیت مباھلہ	۲۱۸	محبوب مال راہ خدا میں خرچ کرنا	۳۰۶
روافض کے استدلال کا جواب	۲۲۳	یہودی کس قدر جھوٹ بولتے تھے؟	۳۱۰
مباہلہ نہیں صلح	۲۲۶	عبادت کے لیے زمین پر پہلا گھر	۳۱۶
اہل کتاب کی دعوت توحید	۲۲۹	تاریخ کعبہ ایک نظر میں	۳۲۴
ابراہیمؑ کے بارے یہود و نصاریٰ نزاع	۲۳۲	اہل کتاب کی اسلام دشمنی	۳۴۰
حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیفی مسلمان تھے	۲۳۵	یہودیوں کی پیروی کا نقصان	۳۴۲
ابراہیمؑ سے قریبی تعلق والے لوگ	۲۴۰	تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ	۳۵۰
گمراہ کن اہل کتاب کا کارنامہ	۲۴۵	دعوت الی الخیر، امر بالمعروف۔۔۔	۳۶۰
اہل کتاب کی اسلام دشمنی	۲۴۷	امت محمدیہ کے تہتر فرقے	۳۶۸
اہل کتاب، امانت دار و خائن لوگ	۲۵۲	سیاہ و سفید چہرے والے	۳۷۱

امت محمدیہ بہترین امت ہے	۳۷۴	فشل، نزاع، عصیان، طالبان دنیا	۴۶۹
یہود کی ذلت ومسکنت کی وجہ	۳۷۸	مسلمانوں کے لیے پریشان کن	۴۷۴
اہل کتاب کے صالحین	۳۸۵	غزوہ احد میں پہنچنے والے غم	۴۷۶
کافر کو مال واولاد کام نہیں آئے گی	۳۹۰	تلواروں کے سائے میں نیند	۴۷۶
کافروں کو اپنا بھیدی نہ بنانے کا حکم	۳۹۲	اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو معاف کر دیا	۴۸۰
جنگ احد	۴۰۱	دفاع عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	۴۸۳
جنگ احد پر ایک سرسری نگاہ	۴۰۳	کافروں سے مشابہت کی ممانعت	۴۸۴
کیا احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی؟	۴۱۶	مصطفے کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ	۴۸۸
معرکہ بدر میں نصرت خداوندی	۴۱۷	خیانت کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟	۴۹۱
مختار کل اللہ ہے	۴۲۴	اللہ کے طلبگار وغضب کے مستحق	۴۹۵
مالک کل جہاں اللہ	۴۲۶	بعثت مصطفے اہل ایمان پر احسان خدا	۵۰۰
سود خوری، نیک وبرے اعمال کا انجام	۴۲۷	زخم خوردہ مسلمانوں کی پریشانی	۵۰۳
امم سابقہ سے عبرت	۴۴۱	حیات شہدا اور مقام شہدا	۵۶۱
غزوہ احد اور غزوہ بدر	۴۴۸	منافقین کی منافقت۔۔	۵۱۷
جنت سستی نہیں ملے گی	۴۵۴	اللہ تعالیٰ غنی الاغنیاء ہے	۵۲۵
وفات مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر پریشانی	۴۵۷	یہود کا خود ساختہ بہانہ	۵۲۷
موت کا وقت مقرر ہے	۴۵۹	موت اٹل حقیقت، کامیابی، ناکامی	۵۳۰
انبیاء علیہم السلام اور اللہ والوں کے مجاہدات	۴۶۰	مصائب وآلام کے کالے پہاڑ	۵۳۳
اطاعت کفار کی ممانعت	۴۶۴	علم چھپانے کا وبال	۵۳۶
کفار کے دلوں پر رعب ڈال دیا گیا	۴۶۶	خودستائی وخودنمائی کی مذمت	۵۳۷

اپنی بات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِی امتَنَّ عَلَی عِبَادِہٖ بِنَبِیِّہِ المُرسَل صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ وَ کِتَابِہِ الۡمُنَزَّلِ الَّذِی لَا یَأۡتِیہِ الۡبَاطِلُ مِنۡ بَینِ یَدَیہِ وَلَا مِن خَلفِہٖ تَنزِیلٌ مِّن حَکِیمٍ حَمِیدٍ حَتَّی اتَّسَعَ عَلَی أَھلِ الأَفکَارِ طَرِیقُ الِاعۡتِبَارِ بِمَا فِیہِ مِنَ الۡقَصَصِ وَالۡأَخۡبَارِ وَاتَّضَحَ بِہٖ سُلُوکُ الۡمَنۡھَجِ الۡقَوِیمِ وَالصِّرَاطِ الۡمُستَقِیمِ بِمَا فَصَّلَ فِیہِ مِنَ الۡأَحۡکَامِ وَفَرَّقَ بَینَ الۡحَلَالِ وَالۡحَرَامِ فَھُوَ الضِّیَاءُ وَالنُّورُ وَبِہِ النَّجَاۃُ مِنَ الۡغُرُورِ وَفِیہِ شِفَاءٌ لِمَا فِی الصُّدُورِ وَمَن خَالَفَہٗ مِنَ الجَبَابرَۃِ قَصَمَہُ اللّٰہُ وَمَنِ ابتَغَی العِلمَ فِی غَیرِہٖ أَضَلَّہُ اللّٰہُ ھُوَ حَبلُ اللّٰہِ المَتِینِ وَنُورُہُ المُبِین وَالعُرۡوَۃُ الوُثقَی وَالمُعتَصَمُ الأَوفَی وَھُوَ المُحِیطُ بِالقَلِیلِ وَالکَثِیرِ وَالصَّغِیرِ وَالکَبِیرِ لَا تَنقَضِی عَجَائِبُہٗ وَلَا تَتَنَاھَی غَرَائِبُہٗ لَا یَحِیطُ بِفَوَائِدِہٖ عِندَ أَھلِ العِلمِ تَحدِیدٌ وَلَا یَخلقہ عِندَ أَھلِ التِّلَاوَۃِ کَثرَۃُ التَّرۡدِیدِ ھُوَ الَّذِی أَرشَدَ الأَوَّلِینَ وَالآخِرِینَ

الحمدللہ تعالیٰ تفسیر معارف الفرقان کی چوتھی جلد اپنے کرم فرماؤں کی نذر کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں امید کی جاتی ہے کہ وہ پہلی جلدوں کی طرح اس جلد کو بھی قبول فرمائیں گے۔

جیسا کہ ہمارے قارئین کو علم ہے کہ یہ کتاب کوئی عام کتاب نہیں ہے بلکہ سوال وجواب کی شکل میں قرآن کریم کی ایک انوکھی تفسیر ہے، جس سے نہ صرف اہل علم کو بلکہ عامۃ الناس کو بھی فائدہ ہورہاہے۔

بندۂ ناچیز کی زیر ادارت پچھلے ۲۵ سال سے ماہ نامہ "آب حیات" لاہور سے شائع ہورہاہے، اسی رسالہ کی وساطت سے ہم اپنے مافی الضمیر کی آواز کو ملک بھر تک پہنچانے کی سعی کرتے ہیں، الحمدللہ ثم الحمدللہ ساتھی اسے نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ گاہے گاہے اسے خوبصورت بنانے کے لیے مفید مشورے بھی دیتے ہیں، جن کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی اور دوستوں کے ہاتھوں میں پہنچی، انہوں نے اسے دیکھتے ہی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کلمات تشکر ادا کیے کہ الحمدللہ یہ خاصے کی چیز تیار ہو رہی ہے، دوستوں نے اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے مکمل اور مدلل فرمانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانے کی فرمائش کی ہے، مگر میرے خیال کے مطابق یہ کتاب تین جلدوں میں تیار ہونا تھی، مگر جوں جوں اس کے مضامین کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے اس سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ شاید یہ تین جلدوں سے متجاوز ہو جائے۔

پہلی جلد سورۃ الفاتحہ پر مشتمل ہے، جب کہ دوسری جلد پہلے پارے پر مشتمل ہے، تیسری جلد دوسرے پارے پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ سورۃ البقرہ کے اخیر تک کی آیات کی تفسیر پر مشتمل ہے، جب کہ پیش نظر جلد مکمل سورۃ آل عمران پر مشتمل ہے۔

جوں جوں تفسیری سلسلہ آگے کی سمت بڑھ رہا ہے، توں توں میری کوشش یہی ہے کہ تفسیر میں جامعیت ہو، کسی بھی سورت کی تفسیر کا کوئی پہلو اس خوف اور ڈر سے رہ نہ جائے کہ تفسیر کی ضخامت بڑھ جائے گی یا صفحات زیادہ ہو جائیں گی یا پڑھنے والے اکتا جائیں گے، اپنی کوشش یہی ہے کہ ہر پہلو پر بات کی جائے۔

فی زمانہ جب کہ ہر طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوششیں جاری ہیں، قرآن کریم کے ساتھ استہزا کیا جا رہا ہے، قرآن کریم سے مسلمانوں کو دور کرنے کی نت نئی کوششیں ہو رہی ہیں، ایسے میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ہم عرش بریں سے آنے والے اس پیغام سرمدی کو حرز جان بناتے ہوئے اس کی اشاعت و ترویج کے لیے مخلصانہ کاوشیں بروئے کار لائیں، ہم جس قدر اس کتاب ہدیٰ کی اشاعت و تعلیم میں اپنے کو کھپائیں گے اسی قدر اللہ تعالیٰ ہم پر مہربان ہو گا، ہم جتنا اس کتاب کو وقت دیں گے اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں جانے دے گا، وہ ہمارے اوپر اپنے فضل و کرم کا مینہ برسائے گا، ایک حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ جس شخص کو قرآن کریم اس قدر مشغول کر دے کہ اسے دعائیں مانگنے کی فرصت نہ ملے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو دعائیں مانگنے والوں سے، التجائیں کرنے والوں سے، زاریاں کرنے والوں سے زیادہ عطا کرتے ہیں۔

اگرچہ اس مشینی دور میں جب کہ ہر چیز مشین کی طرح چل رہی ہے اور تو اور انسانی زندگی بھی پہلے کی نسبت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہی ہے ایسے حالات میں ہمیں کچھ لمحے اپنے مصروف ترین لمحات میں سے نکال کر اللہ کی کتاب کو دینے چاہییں، اسے سمجھیں، اسے سمجھائیں اور اس پر غور و فکر کریں، تدبر کریں، پھر اس پر عمل کرنے کی سو فیصد کوشش کریں، اس کے مضامین پر دل و جان سے یقین کریں، اس کی تعلیمات کو حرز جان بنائیں، اس کے احکامات پر عمل کریں، اس کے لیے ہر صورت میں وقت نکالیں، اپنے لمحات حیات کو قیمتی بنائیں، دنیا و عقبیٰ سنور جائے گی۔

بندۂ ناچیز نے پہلی جلدوں کی طرح پیش نظر جلد کی تیاری کے لیے بھی عربی تفاسیر کے چیدہ چیدہ مقامات دیکھے ہیں، جہاں سے مجھے کوئی عمدہ اور بہترین چیز ملی اسے میں نے کسی خوبصورت نگینے کی طرح "معارف الفرقان" میں سجادیا ہے، اسی طرح اردو تفاسیر بھی میرے مطالعہ میں رہی ہیں، جن کا ایک معتد بہا حصہ حوالہ جات سمیت اہل نظر کو "معارف الفرقان" میں نظر آئے گا۔

عربی تفاسیر میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر القرآن العظیم، علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ کی مفاتیح الغیب المعروف تفسیر کبیر، ابو الفداء علامہ اسماعیل حقی حنفی رحمہ اللہ کی روح البیان، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ کی روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، علامہ بغوی رحمہ اللہ کی معالم التنزیل فی تفسیر القرآن، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی الجامع لاحکام القرآن، علامہ ناصر الدین بیضاوی رحمہ اللہ کی انوار التنزیل واسرار التاویل، علامہ جلال الدین کی تفسیر جلالین، علامہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ کی بحر العلوم، ابو حفص سراج دمشقی رحمہ اللہ کی اللباب فی علوم الکتاب، علامہ ابن قیم جوزی رحمہ اللہ کی زاد المسیر فی علم التفسیر، ابو حیان اندلسی رحمہ اللہ کی تفسیر البحر المحیط فی التفسیر، علامہ طنطاوی رحمہ اللہ کی الوسیط، میں متعلقہ مقامات پر نظر ڈالی گئی ہے۔

اسی طرح اردو کی مایہ ناز تفاسیر میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی بیان القرآن، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی تفسیر عثمانی، مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی تفسیر معارف القرآن، شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی تفسیر معارف القرآن، مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ کی تفسیر انوار البیان، مولانا محمد آصف ہندی رحمہ اللہ کی تفسیر بصیرت قرآن، مولانا عبد

الحق حقانی رحمہ اللہ کی تفسیر حقانی، مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ کی تفسیر ماجدی، مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کی تفسیر مظہری، مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی ذخیرۃ الجنان، مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ کی معالم العرفان، مولانا عبد الرحمن کیلانی رحمہ اللہ کی تفسیر تیسیر القرآن، سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کی تفسیر تفہیم القرآن، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ کا ترجمہ قرآن اور علامہ نعیم الدین مراد آبادی رحمہ اللہ کی تفسیر کنز الایمان، مولانا غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ کی تبیان القرآن، مولانا پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ کی ضیاء القرآن، میرے پیش نظر رہی ہیں۔

تفاسیر کے علاوہ اردو تراجم میں شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ، حضرت مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ، مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ، مولانا مفتی تقی عثمانی رحمہ اللہ اور مولانا عبد الحئی حسنی ندوی رحمہ اللہ کا ترجمہ پیش نظر رہا ہے۔

اسی طرح کوئی تفسیر احادیث کی کتب دیکھے بغیر کیسے مکمل کہی جاسکتی ہے، چنانچہ اپنی پیش نظر کتاب میں جہاں کہیں احادیث کی ضرورت پیش آئی اس کے لیے متون احادیث کو دیکھا گیا ہے، احادیث کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ کتاب کے صفحات پر سجایا گیا ہے۔

الحمد للہ اپنی علمی کم مائیگی کے اعتراف کے باوجود یہ عرض کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ میں نے دیانت داری کے ساتھ اپنے اکابر اسلاف کی تحریروں کو احسن انداز میں اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، جو مضمون جس کتاب سے لیا گیا ہے پوری دیانت داری کے ساتھ اس کا حوالہ بھی پیش کیا گیا ہے، کہیں بھی کسی عالم دین کی تحریر کو اپنی طرف دانستہ منسوب کرنے کی جسارت نہیں کی گئی، کیونکہ یہ علمی سرقہ ہے اور بندہ مالی سرقہ سے علمی سرقہ کو زیادہ نقصان دہ سمجھتا ہے، اس سے علم و عمل کی برکت ضائع ہو جاتی ہے۔

میں ایک بات کا یہاں کھل کر اظہار کرنا مناسب خیال کرتا ہوں کہ کئی احباب نے مجھے توجہ دلائی ہے کہ جس طرح کتاب کا عنوان لاجواب ہے کم از کم اسی طرح اس کتاب میں استعمال ہونے والا کاغذ بھی لاجواب ہونا چاہیے تھا، لیکن میں حقیقت حال عرض کروں کہ بندہ کے پاس جس قدر مالی گنجائش ہوتی ہے اسی قدر کام کرتا ہے، میں نے اپنی بساط اور ہمت کے مطابق ہی کام کرنا ہوتا ہے، اگر کوئی

صاحب ذوق میری اس کتاب کو اچھے کاغذ اور عمدہ طباعت میں پیش کرنا چاہتا ہے تو میری طرف سے اسے کتاب کی کاپیاں مل جائیں گی وہ خود ہی اپنے حسن ذوق و شوق کو مہمیز دے اور یہ عظیم کام کر ڈالے، مجھے ہزار گنا مسرت اور خوشی ہو گی۔

کتاب کو براہ راست کمپیوٹر پر کمپوز کیا گیا ہے، اس کے لیے کاغذ استعمال نہیں کیا گیا، اس لیے ممکن ہے کہ ہمارے نہ چاہنے کے باوجود اس میں کوئی سقم اور کمزوری رہ گئی ہو، اس لیے دوست احباب سے عرض ہے کہ وہ ہماری کوتاہیوں سے صرف نظر کرنے کی بجائے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہم آئندہ محتاط رہیں اور ازالہ مافات کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول و منظور فرمائے اور دین کے ساتھ تاحیات وابستہ رکھے اور دین پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خادم اسلام

محمود الرشید حدوٹی

جامعہ رشیدیہ، غوث گارڈن، فیز ۲، جی ٹی روڈ، مناواں لاہور کینٹ

۲۷ مارچ ۲۰۱۶، بروز اتوار، بوقت ساڑھے دس بجے رات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ آلِ عمران کا تعارف

سوال سورۃ آل عمران کا تعارف کروایئے، اس کی وجہ تسمیہ بیان کیجیے، نیز اس سورت کے اہم ترین مقاصد بیان کیجیے۔

جواب سورۃ آل عمران مکمل مدنی سورت ہے، اس کی دو سو آیات ہیں، اس کے مضامین میں اہم ترین غزوہ احد کا تذکرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس میں اہل اسلام کے لیے عبرت کا بہت بڑا سامان ہے، اس عجیب واقعہ کا تذکرہ پچاس آیات پر پھیلا ہوا ہے، جو آیت ۱۲۱ سے شروع ہو کر ۱۶۸ تک پہنچتا ہے، ازیں بعد شہادت کی فضیلت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں شہدا کے مرتبے و مقام کا ذکر کیا گیا ہے، غزوہ حمراء الاسد کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، صبر و تحمل کی تلقین بھی کی گئی ہے، سورۃ کے خاتمے پر اہل ایمان کی دعا کا ذکر ہے، پھر رب العالمین کی طرف سے قبولیت کا بیان ہے۔

اس سورت کی آیت ۳۳ میں آل عمران کا ذکر ہے، جب کہ آیت ۳۵ میں عمران کی بیوی کا ذکر ہے، یہ عمران حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں، مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں، عمران حضرت عیسیٰ کے نانا ہیں، آل عمران سے مراد عمران کا خاندان ہے، حضرات مفسرین کرام کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہاں جس عمران کا ذکر ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں، جب کہ راجح یہی ہے کہ یہاں جن عمران کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں، راویوں کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کے والد عمران اور مریم علیہا السلام کے والد عمران کے درمیان کافی طویل مدت کا فاصلہ ہے، س سورت کا نام انہی کے نام پر رکھا گیا ہے، جس میں ان کی بیوی اور بیٹی مریم علیہا السلام کا ذکر ہے، اس سورۃ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

سورۃ آل عمران اگرچہ مدنی سورت ہے لیکن مدینہ منورہ میں پہلے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں سے نہیں ہے، یہ سورت بعض غزوات میں فتح و ہزیمت کے واقعات رونما ہونے کے بعد نازل ہوئی ہے، یہ سورت اس دور میں نازل ہوئی جب مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان واضح طور پر

اختلاط کی فضا موجود تھی، یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے۔

غزوہ بدر ہجرت کے دوسرے سال ہوا، جب کہ غزوہ اُحد ہجرت کے تیسرے سال پیش آیا، جس میں ابتدائی طور پر مسلمانوں پر امتحان آگیا تھا، ان واقعات کا ذکر اس سورت میں موجود ہے، معلوم ہوا کہ یہ سورت ان واقعات کے بعد نازل ہوئی تھی، اس سے پہلے سورۃ الانفال نازل ہو چکی تھی، اس کے بعد سورۃ الاحزاب نازل ہوئی جو کہ ہجرت کے پانچویں سال کے آخر میں نازل ہوئی تھی۔

نبی کریم ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آمد سے پہلے ہی یہاں یہود و نصاریٰ موجود تھے، یہودیوں کے تین بڑے قبائل قینقاع، نضیر اور قریظہ نے یہاں اپنے پنجے گاڑھ رکھے تھے، ان کے عقائد و نظریات و خیالات اور افکار پر سورۃ البقرہ میں بہت عمدگی سے روشنی ڈالی گئی ہے، یہود و نصاریٰ کے ایک دوسرے کے بارے میں خیالات بھی ذکر کیے گئے ہیں، جب کہ اس سورت میں نصاریٰ کی سرگرمیوں اور احوال سے نقاب اٹھایا گیا ہے، سورۃ البقرہ میں روئے سخن یہود کی طرف تھا جب کہ سورۃ آل عمران میں نصاریٰ کی طرف ہے۔

صاحب ''بصیرت قرآن'' نے سورۃ آل عمران کی ابتدا میں نجران کے وفد کا بہت ہی عمدہ پیرائے میں ذکر فرمایا ہے، اسے ملاحظہ فرمایئے ''فتح مکہ کے بعد جب پورے جزیرۃ العرب پر اہل ایمان کی حکومت و سلطنت قائم ہو چکی تھی سنہ ۹ ہجری میں نجران کے بڑے بڑے عیسائی پادریوں نے نبی کریم ﷺ سے ملنے کی درخواست کی تاکہ وہ اپنے عقائد کے مطابق عیسائی مذہب کی تشریح کر سکیں، نبی کریم حضرت محمد ﷺ نے نصاریٰ یعنی عیسائی پادریوں کو آنے کی اجازت مرحمت فرمادی، نجران عرب کے جنوبی علاقے یمن کی ایک بستی کا نام ہے، نجران اسی طرح عیسائیوں کا مرکز تھا، جس طرح موجودہ دور میں ویٹی کن یورپ میں عیسائیت کی تبلیغ کا مرکز ہے، ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے بحث و مباحثہ کے لیے ساٹھ جیّد اور ماہر مبلغین (پادریوں) کا وفد بھیجا جو عیسائی دنیا ہی میں نہیں بلکہ بادشاہوں کے دربار میں بھی بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس وفد میں

بعض ایسے زبردست اور چرب زبان مقرر بھی، جن کی دھاک پوری عیسائی دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی، خاص طور پر عبدالمسیح عاقب بڑا دولت مند اور اپنی قوم کا سردار مانا جاتا تھا، اسی طرح ایہم السید جو رائے، تدبیر جوڑ توڑ اور ذہانت میں ایک خاص مقام اور درجہ رکھتا تھا، ابو حارثہ ابن علقمہ بھی عیسائیوں کا شعلہ بیان مقرر اور مشہور پادری تھا، غرضیکہ ساٹھ آدمیوں کا یہ وفد ایک سے ایک مقرر اور اپنی قوم کے قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا۔

جب یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اسلامی اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ان مہمانوں کے ساتھ اسلامی اخلاق اور اسلامی تعلیمات کے مطابق عزت واحترام کا معاملہ کیا جائے، چنانچہ اس پورے وفد کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پورے آرام سے ایک جگہ ٹھہرایا، یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ جب یہ غیر مسلموں کا وفد آیا تھا اس وقت تک مدینہ منورہ کو حرم کا درجہ نہیں دیا گیا تھا، اس کے بعد مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ منورہ کو بھی حرم کا درجہ دے دیا گیا، تو اب قیامت تک مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور پورے حرم کی حدود میں کسی بھی غیر مسلم کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، جب اس وفد نے رات بھی اچھی طرح آرام کر لیا، تو آپ نے اس وفد کے لوگوں کو اپنے پاس آنے کی اجازت مرحمت فرمادی، اس وفد کے لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور عیسائیت کو سچا بتانے کے لیے مختلف باتیں کیں اور بتایا کہ ہم اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ثابت کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

① حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ ② وہ مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے ③ وہ مٹی سے پرندے بنا کر جب ان کو پھونک مارتے تو وہ زندہ ہو کر اُڑ جاتے تھے ④ جب وہ پیدائشی اندھوں کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تو وہ آنکھوں والے ہو جاتے تھے ⑤ وہ کوڑھیوں کو صحت مند بنا دیتے تھے ⑥ وہ لوگوں کو غیب کی خبریں بتا دیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ ⑦ اس وفد نے قرآن کریم کی چند باتوں کا حوالہ دے کر کہا کہ قرآن نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہا ہے ⑧ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اللہ نے بھی قرآن میں جگہ جگہ یہ کہا ہے کہ ہم نے پیدا کیا، ہم نے یہ کام کیا، ہم نے قرآن کو نازل کیا وغیرہ ان کا کہنا تھا کہ قرآن سے بھی ثابت ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تنہا

نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں، اس وفد کے یہ سوالات تھے جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کو نازل کیا اور عیسائی وفد کی ایک بات کا واضح دلیلوں کے ساتھ جواب دیا، جب اس وفد نے اپنے سوالات کر لیے تو نبی کریم ﷺ نے ان کو جواب دیتے ہوئے پوچھا کہ ① کیا تم نہیں جانتے کہ بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے؟ وفد نے کہا کیوں نہیں۔ ② آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو اللہ وہ ہے جس کو موت نہیں آتی وہ زندہ رہے گا، جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت سے ضرور واسطہ پڑے گا؟ وفد کے لوگوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ ③ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ نے ہر چیز کو وجود دے کر اس کو اپنے دستِ قدرت سے تھام رکھا ہے وہ اس کا محافظ اور نگران اور رزق پہنچانے والا ہے؟ آپ ﷺ نے پوچھا ان میں سے کوئی بات بھی عیسیٰ علیہ السلام میں تھی؟ وفد نے کہا جی نہیں۔ ④ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ وہ ہے جس سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ یا چھپی ہوئی نہیں ہے جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے جتنا علم دیا تھا وہ اس سے زیادہ نہ جانتے تھے؟ وفد نے اس کا بھی اقرار کیا۔ ⑤ آپ ﷺ نے فرمایا پروردگار نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل و صورت اپنی مرضی سے ماں کے پیٹ میں بنائی؟ کہا جی ہاں۔ ⑥ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ کھانے پینے اور دوسری حاجات کا محتاج نہیں ہے؟ وفد کے لوگوں نے کہا جی ہاں اللہ ان میں سے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ ⑦ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اسی طرح نو مہینے تک اپنے شکم میں رکھا جس طرح عام بچے شکم مادر میں رہتے ہیں، پیدا ہونے کے بعد کیا ان کو غذا نہیں دی گئی؟ وفد نے کہا بے شک۔ ⑧ آپ ﷺ نے آخری بات پوچھی کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں یہ باتیں تھیں جن کا تم بھی انکار نہیں کر سکتے تو یہ بتاؤ وہ اللہ تھے یا اللہ کے بندے تھے؟

نبی کریم ﷺ کے سوالات اس قدر بھرپور تھے کہ سب کے سب لاجواب ہو کر شرمندہ سے ہو گئے تھے لیکن سچائی کو جان لینے کے باوجود انہوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنائے رکھا اور کہا کہ ہم ان تمام باتوں پر غور کریں گے۔

سورۃ آل عمران میں ان کے تمام سوالات کے جوابات دیئے ہیں اور بتایا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام بغیر

باپ کے پیدا ہوئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے کیا نعوذ باللہ وہ بھی معبود تھے؟ مردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندے بنا کر پھونک مارنے سے ان کا زندہ ہونا، پیدائشی نابینا کو آنکھوں والا بنانا یہ سب کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کر کے یہ نہیں فرمایا کہ یہ میرا کارنامہ ہے، بلکہ وہ فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوا ہے، اس نے میری زبان میں یہ تاثیر عطا فرمائی ہے کہ جب میں پھونک مارتا ہوں یا نابینا کی آنکھوں پر کوڑھیوں کے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہوں اور مردوں سے کہتا ہوں کہ اللہ کے حکم سے اٹھ جاؤ تو وہ زندہ اور صحت مند ہو جاتے ہیں، سورۃ آل عمران میں اللہ نے اس کا جواب بھی دیا ہے کہ جب اللہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ یا روح کہتے ہیں تو یہ سب "آیات متشابہات" ہیں، قرآن کریم کی ان ہی آیات اور الفاظ کو پکڑ کر بیٹھ جانا غلط ہے کیونکہ قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید بیان فرمائی گئی ہے، خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات بعض آیات کی تشریح ہیں۔

جب عیسائی وفد کے سامنے ساری حقیقت کھول کر بیان کر دی گئی تب اللہ نے فرمایا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ اب بھی دین اسلام کی سچائی کو نہیں مانتے تو ان سے کہیے کہ وہ خود اور اپنے بال بچوں کو لے کر صبح کھلے میدان میں آجائیں، ہم بھی اپنے آپ کو اور گھر والوں کو لے کر آجاتے ہیں پھر اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اے اللہ! ہم میں سے جو بھی جھوٹا ہے اس پر آپ کا غضب نازل ہو جائے۔

جب عیسائی وفد کو اس مباہلہ یعنی قسم کھانے کی دعوت دی گئی تو وہ بوکھلا گئے اور کہنے لگے ہم اس مسئلے پر رات کو غور کر کے جواب دیں گے لیکن وہ اس بات سے اس قدر ڈر گئے کہ بغیر بتائے راتوں رات مدینہ سے نجران کی طرف چپکے سے بھاگ گئے اور انہوں نے "مباہلہ" کے چیلنج کو قبول نہیں کیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس پورے وفد کو ذلت سے دوچار کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سرخ رو فرما دیا۔ (تفسیر بصیرت قرآن)

اللہ تعالیٰ حیّ اور قیّوم

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے

الٓمّٓ {۱} اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ {۲} نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ {۳} مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ {۴} آل عمران

جواب ترجمہ: الٓمّٓ، اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، جو ہمیشہ زندہ ہے، ہر چیز کو تھامے ہوئے ہے۔ اس نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی۔ ایسی کتاب جو ان کتابوں کی تصدیق کرنیوالی ہے جو اس سے پہلے تھیں اور اس سے پہلے نازل فرمایا توراۃ کو اور انجیل کو۔ جو لوگوں کے لیے ہدایت ہیں اور نازل فرمایا فرقان کو، بیشک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غلبہ والا ہے بدلہ لینے والا ہے۔

الٓمّٓ یہ حروف مقطعات میں سے ہے، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لَا یَعرِفُهُ بَعدَ رَسُولِ اللهِ ﷺ اِلَّا الاَوْلِیَاء یعنی ان کا صحیح مفہوم حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد صرف اولیائے امت کو معلوم ہے۔

نجرانی عیسائیوں کا ساٹھ رکنی وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑنے اور مناظرہ کرنے آیا تھا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے آیا تھا، یہاں انہیں واضح اور واشگاف پیغام دیا گیا کہ تم لوگ معبود کی معرفت میں جھگڑا کرتے ہو یا نبوت کے بارے میں، اگر تم معبود کی معرفت میں نزاع کرتے ہو تو اس میں واضح بات یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہو جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو اللہ کا بیٹا نہیں مانتے، تم لوگ اللہ کی اولاد ثابت کرنا چاہتے ہو جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی اولاد کسی کو تسلیم نہیں کرتے، یہی بات حق و صداقت پر مبنی ہے، عقلی اور نقلی دلائل کی تائید اسی مؤقف کے ساتھ ہے۔

اس لیے واضح طور پر فرمادیا کہ اللہ زندہ ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے، عقلی لحاظ سے یہ محال ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، اگر تم نبوت کی بابت جھگڑا کرتے ہو تو تمہارا اس سلسلہ میں جھگڑا کرنا

بھی باطل ہے، کیونکہ جس طرح تم لوگ جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل فرمائی ہے، وہی طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم اُتارنے کا بھی ہے، اگر وہ معجزہ تھا تو یہ بھی معجزہ ہے۔

یہاں واضح فرمادیا گیا کہ اللہ حیّ اور قیّوم ہے، جو حیّ اور قیّوم ہو اس کے لیے اولاد کا ہونا محال ہے، وہ ہستی اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود ہے، اس کے سوا جو بھی ہیں وہ واجب الوجود نہیں ہیں، وہ محدث ہیں، انہیں اللہ کے عطا کرنے سے وجود ملا ہے، انہیں اللہ کی طرف سے پیدا کرنے میں پیدائش ملی ہے، باقی سب مخلوق ہیں وہ خالق ہے، جب باقی سب مخلوق اور حادث ہیں تو ان کے لیے اللہ کا بیٹا ہونا اور معبود ہونا یہ محال ہے، قرآن کریم نے سورۃ مریم آیت ۹۳ میں واضح اعلان کیا ہے کہ ”جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی ذات کا غلام ہے، طوق غلامی سجائے اس کے پاس آئیں گے“۔ (سورۃ مریم آیت ۹۳)

یہاں یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ معبود اور الٰہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیّ اور قیّوم ہو جب کہ یہ صفات عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں پائی جاتیں، کیونکہ وہ ولد (بیٹے) ہیں، وہ کھاتے پیتے ہیں، بائبل کی آیات میں ان کے کھانے پینے کا تذکرہ موجود ہے، بازاروں میں جانے کا ذکر موجود ہے، تو ایسی صفات والا شخص الٰہ اور معبود نہیں ہو سکتا، عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے والے، تثلیث کا عقیدہ رکھنے والے، انہیں خدا کا بیٹا کہنے والے کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا گیا، وہ قاتلوں سے اپنے کو بچا نہیں سکے، تو پتہ چل گیا کہ وہ حیّ اور قیّوم نہیں تھے، اس سے یقینی طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ الٰہ اور معبود نہیں تھے، اس آیت میں رب تعالیٰ کے یہ دو صفاتی نام جامع ہیں، ان سے نصاریٰ کے دعویٰ تثلیث کے سارے تانے بانے ایک ایک کر کے کٹ جاتے ہیں۔

آیت میں نصاریٰ کا رد کیا گیا ہے، کیونکہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بندگی کے قائل ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ اللہ تعالیٰ اکیلا ہی بندگی کے لائق ہے، اس کے سوا کوئی عبادت و بندگی کے لائق نہیں ہے، اس کے بعد حیّ اور قیّوم اللہ تعالیٰ کے فعّال اور درّاک ہونے پر دلالت کرتے ہیں، قیّوم اس ذات کو کہتے ہیں جو قائم بالذات ہو اور مخلوق جن چیزوں کی محتاج ہو ان

کے مصالح و تدبیر کے لیے انتظام وانصرام کرنے والا ہو، دن ہو یا رات، گرمی ہو یا سردی، ہوائیں ہوں یا باران، ایسی ایسی نعمتیں جن پر اس کی ذات کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا، ایسی نعمتوں کی فراوانی کہ اس کے سوا انہیں کوئی شمار بھی نہیں کر سکتا۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الحیّ وہ ہے جو فوت نہیں ہوتا، القیّوم وہ ہے جو مخلوق کے معاملات، ان کی عمروں اور ان کے رزق کو قائم رکھتا ہے، سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ الحیّ اس ہستی کو کہتے ہیں جو سب سے پہلے زندہ ہو، قیّوم اس ہستی کو کہتے ہیں کہ جس کا کوئی شریک نہ ہو، الحیّ اور القیّوم اس ہستی کو کہا جاتا ہے جس میں اُلوہیت کی تمام صفات کماحقّہ پائی جائیں، جب واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی حیّ اور قیّوم ہے تو پھر بدیہی طور پر یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ حیّ ہیں اور نہ قیّوم، نہ معبود ہیں اور نہ ہی معبود برحق اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اس کے باوجود ظالم نصاریٰ انہیں جو کچھ مانتے ہیں وہ بہت ہی ناانصافی اور ظلم کی بات ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ: اللہ تعالیٰ نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے، ابتدائے کلام میں ہی حسن وجودت دکھائی دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہود و نصاریٰ کے سامنے قرآن کریم کی حقانیت و صداقت پر ایک دعویٰ پیش کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کو مخاطب فرما کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اے یہود و نصاریٰ! تم لوگ ہمارے ساتھ اس بات پر متفق ہو کہ قرآن کریم سے پہلے لوگوں کی رشد و ہدایت کے لیے تورات اور انجیل جیسی کتابیں نازل کی گئی تھیں، تم لوگ یہ بات جان چکے ہو کہ تورات اور انجیل اللہ کی طرف سے اُتاری جانے والی دو کتابیں ہیں، کیونکہ ان کے نزول کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے معجزات بھی عطا کیے جو جھٹلانے والوں اور تصدیق کرنے والوں کے درمیان فرق کرتے تھے، جب سچے اور جھوٹے دعوے کے درمیان فرق معلوم ہو گیا تو یہ فرق یقینی ہے، پھر جب حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز تورات اور انجیل کے لیے ثابت ہو گئی کہ وہ اللہ کی طرف سے اتاری گئی دو آسمانی کتابیں ہیں تو یہ بات قرآن کریم کے لیے بھی ثابت ہو گئی کہ وہ اللہ کی طرف سے اُتارا گیا ہے، جب ان کتابوں کا نزول اللہ کی طرف سے ہونا مشترکہ بات ہے تو پھر ضروری ہے کہ ماننا ہے تو سب کو مانو اور اگر انکار کرنا

ہے توسب کا انکار کرو، مسلمان تو پہلی کتابوں کو بھی مانتے ہیں اور آخری کتاب کو بھی مانتے ہیں، بعض کو قبول اور بعض کو رد نہیں کرتے، ایسا کرنا جہالت ہے۔

تورات کا معنیٰ: ① توراۃ کا لفظ توریہ سے ماخوذ ہے، توریہ کنایہ کو کہتے ہیں چونکہ توراۃ میں زیادہ تر مثالیں ہیں اس لیے اس کو توریہ کہا گیا۔ ② یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے اور عبرانی زبان میں توراۃ کا معنی شریعت ہے۔ ③ فرّا کہتے ہیں کہ تورات کا معنیٰ روشنی اور ضیاء ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی تورات کو ضیاء اور روشنی قرار دیا ہے۔ ④ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی ہوئی آسمانی کتاب، اہل کتاب کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پانچ اسفار کا نام ہے، نصاریٰ کے نزدیک عہد قدیم کا نام ہے۔ (القاموس الوحید) یہ دوسری رائے زیادہ صحیح ہے۔ (تبیان القرآن)

تورات موجودہ بائبل (کتاب مقدس) کا ایک حصہ ہے، کتاب مقدس کے دو اہم حصے ہیں۔ ① پرانا عہد نامہ ② نیا عہد نامہ، پرانا عہد نامہ نئے عہد نامے سے نسبتاً زیادہ ضخیم ہے، بائبل تمام عیسائیوں کی مذہبی کتاب ہے لیکن یہودیوں کی مذہبی کتاب صرف پرانا عہد نامہ ہے۔

پرانا عہد نامہ: پرانا عہد نامہ یہودیوں کے مختلف مقدس صحیفوں کا مجموعہ ہے علماء یہود نے عہد نامہ قدیم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، ① تورات ② صحائف انبیاء ③ صحائف مقدسہ۔ تورات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس میں بنی نوع بشر کی پیدائش سے لے کر بنی اسرائیل کی تاریخ تک اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات تک بحث کی گئی ہے، بنی اسرائیل کے لیے جو معاشرتی قوانین اور عبادات کے طریقے وضع کئے گئے تھے وہ سب اس میں مندرج ہیں، اصل تورات حسب ذیل پانچ صحیفوں پر مشتمل ہے۔

اصل تورات: ① تکوین: اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے لوگوں کے احوال بیان کئے گئے ہیں تاکہ آل یعقوب نمایاں ہو اُردو کی کتاب میں اس صحیفہ کا نام پیدائش ہے۔ ② خروج: اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے لے کر ان کے اِعلان نبوت اور کوہ طور پر جانے اور ان کو احکام دیئے جانے تک کے احوال مذکور ہیں۔ ③ لاویین: اس میں خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل کی عبادتوں کے طریقہ کا ذکر ہے اردو کی کتاب میں اس صحیفہ کا نام احبار ہے۔

④ اعداد: اس میں خروج کے بعد کے بنی اسرائیل کے احوال مذکور ہیں کہ کس طرح بنی اسرائیل نے اُردن اور ماوراء اُردن کا علاقہ فتح کیا نیز اس میں تدریجی احکام اور قوانین کا بھی ذکر ہے اُردو کی کتاب میں اس صحیفہ کا نام گنتی ہے۔ ⑤ تثنیہ: اس میں تاریخی پس منظر پر نظر ڈالی گئی ہے اور قوانین کا ایک مجموعہ پیش کیا ہے، یہ صحیفہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ذکر پر ختم ہوتا ہے، یہ پانچ صحائف اصل تورات ہیں، اس کے علاوہ عہد نامہ قدیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد میں آنے والے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والے صحیفوں کو بھی شامل کیا گیا مثلاً یوشع ، قضاۃ صموئیل اور ملوک وغیرہ زبور بھی ان صحائف میں شامل ہے، بعض صحائف کا جزو ہیں یہ کل ۳۴ صحیفے ہیں، عہد نامہ قدیم (اُردو) میں تورات کے پانچ صحائف کے یہ ۳۴ صحائف شامل ہیں، شروع میں ان ۳۹ صحائف کی فہرست ہے، یہ تمام صحائف عبرانی زبان میں تھے، البتہ دانیال اور عزرا آرامی زبان میں تھے۔ (تبیان القرآن)

انجیل کا لفظی معنی: انجیل عبرانی زبان کا لفظ ہے، عربی کے کسی لفظ سے مشتق نہیں ہے اور اس کا کوئی وزن نہیں ہے، بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ لفظ ① نجل سے مشتق ہے، نجل زمین سے پھوٹنے والے پانی کو کہتے ہیں اور چشمہ کے فراخ کرنے کو بھی کہتے ہیں، انجیل بھی احکام الٰہی کا سرچشمہ ہے اور اس میں تورات کے مشکل احکام کو آسان کیا گیا ہے، اس لیے اس میں نجل کی مناسبت پائی جاتی ہے۔ ② ابو عمرو شیبانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انجیل تناجل سے ہے، تناجل نزاع اور جھگڑے کو کہتے ہیں، اس لحاظ سے انجیل کو انجیل اس لیے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اس بارے میں جھگڑا کیا تھا۔

زمخشری نے کہا ہے کہ تورات اور انجیل دونوں عجمی زبان کے لفظ ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواری نسلاً اور مذہباً، عیسائی تھے اور ان کی مذہبی زبان عبرانی تھی یا مغربی آرامی، یونانی زبان میں انجیل کے معنیٰ بشارت ہیں، انجیل کو بشارت اسی لیے کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی، قرآن مجید میں ہے ترجمہ: اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل بیشک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں درآں حالیکہ میں اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور اس عظیم رسول کی بشارت دینے والا ہوں جس کا نام احمد ہے۔ (تبیان القرآن)

قرآن کریم تورات اورانجیل دونوں کے بارے میں ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ یہ دونوں آسمانی کتابیں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا، قرآن کریم جگہ جگہ تورات اورانجیل میں بیان کیے گئے احکامات سے بھی اپنے پڑھنے والوں کو آگاہ کرتا ہے، حاملین تورات وانجیل نے جو خرابیاں ان میں پیدا کیں ان سے بھی پردہ اٹھاتا ہے، قرآن کریم یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کتابوں کے حاملین نے ان میں تحریف کردی ہے، اپنی جگہ سے انہوں نے احکامات ہٹادیے ہیں۔

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ: یہاں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ قرآن کریم سے پہلے تورات اورانجیل اتاری گئی تھیں، جو لوگوں کے لیے پیام ہدایت تھیں۔

علامہ کعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت مبارکہ ان لوگوں کے قول کو باطل قرار دے رہی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ قرآن کریم سے کفار اندھے رہیں گے اور یہ ان کے لیے ہدایت کا سامان نہیں ہے، سورۃ فصلت میں جہاں قرآن کریم کی ہدایت سے استفادہ کرنے سے متعلق کفار کے اندھے پن کا ذکر کیا گیا ہے وہ مجازی معنیٰ میں ہے، جیسے نوح علیہ السلام نے اپنے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ میں نے جب بھی انہیں دعوت دی انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔

تورات اورانجیل انسانی رشد وہدایت کا پیام لے کر آئی تھیں، یہاں الناس فرمایا گیا ہے اس سے کوئی خاص قوم یا جماعت مراد نہیں ہے بلکہ عامۃ الناس مراد ہیں، انہی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات بھی بیان ہوئی تھیں، انہی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھنگریالے بالوں، سرمئی آنکھوں اور میانہ قد کا تذکرہ تھا، انہی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے متعلق بشارت تھی۔

اگرچہ یہاں اسلوب بیان سے اندازہ ہورہا ہے کہ هُدًى لِّلنَّاسِ کی صفت تورات اورانجیل کے لیے بیان کی گئی ہے، لیکن اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ سب آسمانی کتابوں کی صفت ہے، یہاں چونکہ مناظرہ عیسائی لوگوں کے ساتھ ہورہا تھا، اس لیے ان کی کتابوں کے بارے میں هُدًى لِّلنَّاسِ فرمایا گیا اور قرآن کریم کے لیے حق کا لفظ استعمال کیا گیا، کیونکہ انہوں نے قرآن سے ہدایت حاصل کرنا نہیں تھی اس لیے قرآن کریم کو حق قرار دیا گیا چاہے وہ اسے قبول کریں یا نہ

کریں، چونکہ وہ لوگ تورات وانجیل کی صحت پر اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے ان دونوں کے بارے میں یہاں فرمایا گیا کہ وہ لوگوں کے لیے سامان ہدایت ہیں تاکہ ان کے دلوں پر کسی چیز کا کھٹکا نہ ہو۔

وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ: یہاں فرقان سے کون سی کتاب مراد ہے؟ اس بارے میں حضرات مفسرین کرام کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد زبور ہے، جیسا کہ سورۃ النساء میں فرمایا گیا **وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُوراً** (النِّسَاءِ: ۱۶۳) ہم نے داؤد کو زبور عطا کی، دوسرا قول یہ ہے کہ الفرقان سے مراد قرآن کریم ہے، یہاں دوبارہ اس کا ذکر کرنا اس کی عظمت شان اور مدح کے لیے ہے، اس لیے بھی یہاں الفرقان کہا گیا کیونکہ یہ حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والی کتاب ہے، یا اس کا دوبارہ ذکر یہ بتانے کے لیے کیا کہ قرآن کریم کو تورات اور انجیل کے بعد اُتارا گیا ہے، تاکہ یہ یہود ونصاریٰ کے تورات اور انجیل کی بابت پائے جانے والے اختلافات کا فیصلہ کرے، حق وباطل میں تمیز کرے اس طرح تکرار بھی نہیں ہوگا۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے الفرقان کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد ان پر نکیر فرمائی ہے اور فرمایا کہ میرے نزدیک اس کی پسندیدہ تفسیر یہ ہے کہ یہاں الفرقان سے مراد وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں کے نزول کے ساتھ اُتارے ہیں، کیونکہ جب انبیاء کرام علیہم السلام پر یہ کتب نازل کی گئیں اور انہوں نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ ان پر یہ کتابیں اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں، تو ان کے اس دعویٰ پر دلیل کی ضرورت تھی، تاکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے دعوے اور جھوٹے لوگوں کے دعوؤں کے درمیان فرق ہو جاتا، جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دعویٰ کے مطابق معجزات عطا کیے تو دعویٰ صادق اور دعویٰ کاذب کے درمیان فرق واضح ہو گیا، تو یہ معجزہ یہی فرقان ہے، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے یہ سچی کتاب نازل کی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل اس سے پہلے اُتاری تھی تو یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وہ فرقان الحق نازل کیا جو کہ غالب معجزہ تھا جو ان کتابوں کے صحیح اور درست ہونے پر دلالت کرتا تھا۔ (مفاتیح الغیب)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یعنی ہر زمانہ کے مناسب ایسی چیزیں اتاریں جو حق وباطل، حلال وحرام اور جھوٹ سچ کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہوں، اس میں قرآن کریم،

کتب سماویہ، معجزات انبیاء علیہم السلام سب داخل ہو گئے اور ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ جن مسائل میں یہود و نصاریٰ جھگڑتے چلے آرہے ہیں ان اختلافات کا فیصلہ بھی قرآن کے ذریعہ سے کر دیا گیا" (عثمانی)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ تابعی کا ارشاد ہے کہ الفرقان سے قرآن مراد ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے، اس میں حلال و حرام، حدود اور فرائض، طاعت اور معصیت کو خوب اچھی طرح واضح فرما دیا ہے، پہلے اس کی تنزیل کا ذکر فرمایا پھر اس کی صفت بیان فرمائی کہ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ (انوار البیان)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست انتقام لینے والا ہے، اس میں بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ یہ فرماتے ہیں کہ ان سے مراد نصاریٰ ہیں، انہوں نے عموم کو سبب نزول کی وجہ سے مخصوص کر دیا ہے، جب کہ محققین مفسرین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ کوئی خاص سبب نزول عموم کے لیے مانع نہیں ہے، اس لیے یہ تمام ان لوگوں کے لیے عام اور شامل ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دلائل سے اعراض اور روگردانی کی ہے۔

وَاللهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ: اللہ عزیز ہے یعنی ایسا غالب ہے جس پر کوئی غالب نہیں آسکتا، ذوانتقام کا معنیٰ ہے انتقام (بدلہ) لینے والا، انتقام کا معنیٰ سزا ہے، عربی محاورے میں کہا جاتا ہے کہ انْتَقَمَ مِنْهُ انْتِقَامًا اس نے اسے سزا دی، انْتَقَمَ کا معنیٰ ہوتا ہے کیے ہوئے فعل کی سزا دینا، عزیز میں سزا دینے پر پوری قدرت ہونے کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا علم اور قدرت کاملہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ اللهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ {۵} هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ {۶} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک اللہ وہ ہے کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے زمین میں اور نہ ہی آسمان میں۔ اللہ وہ ہے جو تمہاری شکلیں بناتا ہے رحموں میں جیسے چاہے کوئی معبود نہیں اس کے سوا۔ وہ غلبہ

والا ہے، حکمت والا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ: جس پس منظر میں سورۃ آل عمران کی ان آیات کا نزول ہوا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ عقائد و نظریات، افکار و خیالات کی اصلاح کی جائے، تاکہ اللہ کی صفات اللہ کی مخلوق میں تسلیم کرنے کا سلسلہ ختم ہو جائے، غلط عقائد و خیالات کے منہ زور گھوڑے کو لگام ڈالی جائے، وہ جن لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھتے ہوئے انہیں الٰہ مان لیا، انہیں خدائی مسند پر براجمان کرنے کی کوشش کی، انہیں اللہ کا بیٹا قرار دیا، انہیں سمجھ آجائے کہ اللہ کی صفات کیا ہیں، اللہ اپنی ہر صفت کے اعتبار سے کمالات کی انتہاؤں پر ہے۔

جب کہا کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے تو اس میں یہ اشارہ دیا گیا کہ اس کا علم کامل و اکمل ہے، اس کے پاس تمامی معلومات ہیں، جب اسے قیّوم کہا گیا کہ وہ اپنی مخلوقات کے انتظامات و انصرامات کرتا ہے تو یہاں واضح کیا گیا کہ اسے پتہ ہے کہ اپنی مخلوقات کی ضروریات کہاں سے اور کیسے پوری کرنا ہیں، کسی سوالی کا سوال اسے غافل نہیں کر سکتا، اس پر کوئی معاملہ مشتبہ اور مشکوک نہیں ہو سکتا، سوالیوں کی کثرت اور جم غفیر کی وجہ سے اس کے علم میں کوئی خلل نہیں آسکتا۔

نجران کے عیسائیوں کے خیال میں یہ بات تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیب کی خبریں دیا کرتے تھے، کسی شخص کو کہہ دیتے تھے کہ تم نے گھر میں فلاں چیز کھائی ہے، تم نے اپنے گھر میں یہ کام کیا ہے، علم سے متعلق انہیں یہ شبہ تھا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنے، کوڑھی کو تندرست کر دینے، مادرزاد کو بینا کر دینے، مٹی سے پرندے بنا کر ان میں روح پھونکنے کے واقعات سے قدرت پر استدلال کیا، انہی دو شبہات کی بناء پر انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ (معبود) قرار دیا تھا، یہی شبہات ان کے دماغوں میں گردش کر رہے تھے، ان کے ان شبہات کو دور کرنے کے لیے پہلے فرمایا گیا کہ الٰہ (معبود) وہ ہوتا ہے جو حیّ اور قیّوم ہو، یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں ہے، جب ان کی یہ صفت نہیں ہے تو یقینی طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ خدا نہیں ہیں۔

پھر انہیں شبہ لگا کہ عیسیٰ علیہ السلام غیب کی اطلاعات دیتے ہیں تو وہ خدا ہیں، اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ایسا ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے، عیسیٰ علیہ السلام کا بعض غیبی باتوں کی اطلاع دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا ہوں، کیونکہ ان کی طرف سے غیبی اطلاعات میں اس بات کا احتمال پایا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجی جانے والی وحی کے ذریعے غیبی اطلاعات دیتے ہوں، ہو سکتا ہے وہ اللہ کے بتانے سے بتا رہے ہوں، ان کا علم غیب عطائی ہو، جب کہ اللہ کا علم ذاتی ہے عطائی نہیں ہے، الٰہ (معبود) وہ ہوتا ہے جو خالق ہو، خالق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے احوال سے آگاہ ہو، جب کہ عیسیٰ علیہ السلام تمام مخلوقات اور معلومات سے آگاہ نہیں تھے، تمام غیبی چیزوں کو نہیں جانتے تھے، تو جس بات کا دعویٰ نصاریٰ کرتے ہیں وہ کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو جب قتل کرنے کے لیے لایا گیا تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ لوگ انہیں قتل کرنے کے لیے لائے ہیں، اس بناء پر انہیں کس قدر تکلیف و اذیت کا سامنا کرنا پڑا، انہیں ان لوگوں کی رسائی سے پہلے بھاگنا پڑا، جب اس غیب کا انہیں علم نہیں تھا تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ وہ تمام معلومات سے آگاہ نہیں تھے، تمام غیبی باتوں کو نہیں جانتے تھے، جب کہ الٰہ وہ ہوتا ہے جس پر کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہ ہو، یہاں یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو گئی کہ بعض چیزوں کے بارے میں غیب جاننے سے الٰہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، الٰہ ہونے کے لیے سب کچھ جاننا ضروری ہے۔

صاحب تفسیر حقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں" پہلے خدا تعالیٰ نے عقائد باطلہ کے ابطال میں اپنے وصف میں الحی القیوم ذکر فرمایا تھا اور حی قیوم وہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی حاجات پوری کرے اور ان کی ضروریات کا خبر گیراں رہ کر تدبیر و تصرف کرے اور یہ بات دو وصف چاہتی ہے، ایک یہ کہ اس کو ہر ایک بات کا علم بھی ہو، انجام آغاز پر نظر ہو، بے سوال کئے بھی حاجت کو جانتا ہو، دوسری یہ چیز کہ ہر چیز پر قادر بھی ہو، جو چاہتا وہ کر سکتا ہو، اس لیے صفت علم کے اثبات کے لیے إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ فرمایا کہ اس کو ہر چیز معلوم ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں، دوسرے وصف کے ثابت کرنے کو هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ فرمایا کہ اس کا تصرف اشرف المخلوقات انسان پر بھی ماں کے پیٹ اور اندھیری کوٹھڑی میں کس نظم و نسق کے

ساتھ ہے کہ عقل حیران ہے جس کی کسی قدر کیفیت کتب طبیہ سے معلوم ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اول وصف ان اللہ الخ بھی گویا ایک دعویٰ تھا، اس کے ثبوت کے لیے هُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُم دلیل قاطع ہے کیونکہ جو ارحام میں ایسی تصرفات کرتا ہے اس پر کوئی چیز کب مخفی رہ سکتی ہے؟

یا یوں کہو پہلی آیات میں نصاریٰ کے عقائد فاسدہ تثلیث اور اُلوہیت مسیح وغیرہ کا رد تھا اور پیشتر عیسائی ان خیالات باطلہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علم وقدرت سے استدلال کیا کرتے ہیں، علم سے یوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیب کی باتیں بتاتے تھے اور جو کوئی گھر میں کچھ کھا کر آتا اس کو بھی ظاہر کر دیتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ خدا تھے کہ خدا انسان کی صورت میں ظاہر ہوا تھا یا خدا کے بیٹے تھے کہ جو باپ کی طرح علم مغیبات رکھتے تھے، قدرت سے اس طرح پر کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، کوڑھیوں اندھوں کو تندرستی دیتے تھے، ہوا کو ڈانٹتے اور جنوں کو نکالتے تھے، یہ بھاری کام انسان کے نہیں اس سے بھی معلوم ہوا کہ وہ خدا یا اس کے بیٹے تھے، گرچہ پہلی آیتوں میں الحی القیوم فرما کر ان شبہات کو رد کر دیا تھا لیکن یہاں تتمہ کے طور پر اور بھی ان شبہات کا دلائل قطعیہ سے رد کر دیا۔

هُوَ الَّذِی یُصَوِّرُکُمْ فِی الْأَرْحَامِ کَیْفَ یَشَاءُ: اس میں اشارہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمام ممکنات پر قدرت رکھتا ہے، جب یہ بات ہے تو وہ مخلوق کے تمام مصالح اور منافع پر قادر ہو گا، جب مخلوق کے مصالح ومنافع حاصل ہو گئے تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ وہ انصاف قائم کرے گا، وہ تمام ممکنات کا انتظام کرے گا، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید وحمایت میں انہیں کچھ معجزات عطا فرمائے جن میں مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ بھی تھا، مٹی سے بنا کر پرندوں میں روح پھونکنے کا بھی تھا، نصاریٰ ان معجزات کو دیکھ کر یہ سمجھے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں، اللہ تعالیٰ یہاں اس عقیدہ کی تردید کر رہے ہیں کہ کچھ صورتیں اور شکلیں بنا لینے سے کوئی خدا نہیں بن جاتا، یہ قدرت کاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ وہ جیسے چاہے جس طرح چاہے اندھیروں کے اندر شکلیں بنائے، رحموں میں صورتیں بنائے، عیسیٰ علیہ السلام کو تو یہ عزت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی، وہ خود تو ماں کے پیٹ میں بنائے گئے، جب کہ اللہ کو کسی نے نہیں بنایا، الٰہ اور خدا وہ ہوتا ہے جو ایک ناچیز وحقیر چھوٹے سے قطرہ سے رحم کے اندر شکلیں

بنائے، یہ ترکیب عجیب اور تالیف غریب ہے، پتہ چلا کہ یہ قدرت کاملہ صرف اللہ کی ہے، عیسیٰ زندہ کرنے اور مارنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے، نصاریٰ کے عقیدہ میں تو عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے پکڑا اور قتل کر دیا تھا، ان کے خیال باطل کے مطابق تو وہ اپنی جان بھی نہ بچا سکے، تو ایسی ہستی الٰہ اور خدا ہو سکتی ہے؟ اس قرآنی آیت کی روشنی میں ان کے باطل عقیدہ کی جڑ کٹ گئی۔

نصاریٰ کو یہ غلطی لگی کہ عیسیٰ علیہ السلام والد کے بغیر پیدا ہوئے، اس لیے وہ اگر خدا نہیں تو خدا کے بیٹے ضرور ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا کہ میں رحموں میں جس طرح کی شکلیں بناؤں اس پر مجھے قدرت حاصل ہے، چاہے تو یہ صورت نطفہ سے وجود میں لاؤں یا بغیر نطفہ کے وجود میں لاؤں، باپ کے توسط سے پیدا کروں یا بغیر باپ کے پیدا کروں، یہ میرا اختیار اور میری قدرت ہے۔

لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: اللہ تعالیٰ نے علم اور قدرت کے بیان کے بعد فرمایا اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں پہلے دلیل بیان کی پھر دعوی کا ذکر فرمایا پھر فرمایا وہ عزیز اور حکیم ہے حکمت کا معنی ہے ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنا یہ اس کے علم محیط کا تقاضا ہے اور عزیز کا معنی ہے غالب اور یہ اس کی قدرت کا تقاضا ہے۔

آیات محکمات اور آیات متشابہات

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ {۷} آل عمران

جواب ترجمہ: (میرے حبیب!) اللہ وہ ذات ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے۔ اس میں آیات محکمات ہیں جن پر کتاب کی اصل بنیاد ہے اور دوسری آیات متشابہات ہیں۔ سو وہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ ان کے پیچھے پڑتے ہیں جو قرآن میں متشابہات ہیں فتنہ تلاش کرنے کے

لیے اور اس کا غلط مطلب جاننے کے لیے اور نہیں جانتا اس کے مطلب کو مگر اللہ اور جو لوگ علم میں مضبوط ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر عقل والے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ اے میرے حبیب! میں وہ ذات ہوں جس نے آپ پر عظیم الشان کتاب اتاری ہے، جس میں آیات محکمات ہیں، جو اصل بنیاد ہے، چونکہ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قائم کیے گئے غلط عقائد پر قرآنی استدلال پیش کیا تھا کہ قرآن کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہا ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن کریم نے روح اللہ کہا ہے، اللہ نے روح عیسیٰ کی نسبت اپنی طرف کی ہے، معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے فرزند ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل عقیدہ کے رد میں فرمایا کہ قرآن مجید میں آیات محکمات بھی ہیں اور آیات متشابہات بھی ہیں، کلمۃ اللہ، روح اللہ جیسے الفاظ ان آیات میں سے ہیں جنہیں متشابہات کہا گیا ہے، متشابہات کی اصل مراد سے ایک اللہ کی ذات ہی آگاہ ہے۔

محکمات کا معنیٰ اور مفہوم: حکم کا معنیٰ ہوتا ہے روکنا، منع کرنا، حکمت کا لفظ اسی سے ہے، حکمت کو اسی لیے حکمت کہا جاتا ہے کہ وہ عقل کے خلاف کرنے کو روکتی ہے، محکم کا معنیٰ ہوتا ہے جس میں اشتباہ اور خفاء ممنوع ہو، محکمات وہ آیات ہیں جن میں تاویل اور نسخ ممنوع ہو۔ (تاج العروس) محکم وہ آیت ہے جس میں لفظ اور معنیٰ دونوں جہتوں سے کوئی شبہ واشتباہ پیدا نہ ہو۔ (مفردات امام راغب اصفہانی) جس لفظ کا مطلب تبدیلی، تغیر، تخصیص اور تاویل سے محفوظ ہو وہ محکم ہے۔ (کتاب التعریفات)

آیات محکمات کون سی ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ " آیات محکمات وہ ہیں جو ناسخ ہیں، ان میں حلال، حرام، حدود اور فرائض کا بیان ہے، ان میں سے کس پر ایمان لایا جائے اور کس پر عمل کیا جائے یہ وہ آیات ہیں جو منسوخ ہیں اور وہ مؤخر ہیں، ان پر ایمان تو لایا جائے لیکن ان پر عمل نہ کیا جائے۔ (طبری) محمد بن جعفر بن زبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محکم وہ آیات ہیں جن کا صرف ایک معنیٰ اور ایک محمل ہے اور اس میں کسی اور تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا محکم

وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے سابقہ امتوں اور ان کے رسولوں کے واقعات اور قصص بیان فرمائے اور سیدنا محمد ﷺ اور آپ کی امت کے لیے ان کی تفصیل کی۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا محکم وہ آیات ہیں جن کے معنی اور ان کی تاویل اور تفسیر علماء کو معلوم ہے۔

هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ: ان آیات کی حیثیت "ام الکتاب" کی ہے۔ "اُم" کسی چیز کی اصل، جڑ اور بنیاد کو کہتے ہیں، ایسی چیز پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو بہت ساری چیزوں کا مرجع ہو، وہیں سے آغاز ہوتا ہو اور وہیں اختتام ہوتا ہو، دماغ کو اسی لیے اُمُّ الرأس کہتے ہیں کہ یہیں سے پورے جسم کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور یہیں ہر چیز پلٹ کر آتی ہے اور یا "اُم" ایک ایسی اوپر کی چیز کو کہتے ہیں جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں، مکہ معظمہ کو اُمُّ القریٰ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ارد گرد کی تمام بستیوں کا مرکز اعصاب اور قوت کا سرچشمہ ہے، آیات محکمات ام الکتاب ہیں، یعنی ساری کتاب کا مرجع و مرکز یہی آیات ہیں، انہی سے سارے مسائل پھوٹتے ہیں، کسی آیت کے سمجھنے میں اختلاف ہو تو انہی آیات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، پورا دین انہی آیات سے نکلتا ہے اور انہی آیات کی طرف لوٹتا ہے، ہدایت کا سرچشمہ یہی آیات ہیں، متشابہات کو سمجھنے کے لیے انہی کو معیار بنایا جاتا ہے، جو عقیدہ یا جو حقیقت ان آیات سے ثابت ہوتی ہیں متشابہات کی مراد بھی اس کے مطابق متعین کی جاتی ہے۔ (روح القرآن)

وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ: اور دوسری متشابہ آیات ہیں یہ وہ آیات ہیں جن میں کئی تاویلات کی گنجائش ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ متشابہ وہ آیات ہیں جن میں سابقہ امتوں کے حالات اور انبیاء کرام کے واقعات ہیں، ان واقعات کو بار بار ذکر فرمایا ہے اور ان کے الفاظ اور معانی میں اختلاف ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا متشابہ وہ آیات ہیں جن کا معنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور مخلوق میں سے کسی کو بھی ان کا علم نہیں ہے، آیات متشابہات میں حروف مقطعہ ہیں جو اوائل سورۃ میں مذکور ہیں جیسے الٓمٓ، الٓمٓرٰ، المٓصٓ وغیرہ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا وقت، اور سورج کب مغرب سے طلوع ہوگا اور قیامت کب واقع ہوگی۔ (جامع البیان، تبیان القرآن)

متشابہہ کا معنیٰ اور مفہوم: جس لفظ کا معنی اس لفظ سے معلوم نہ ہو سکے وہ متشابہ ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے کہ اس کو محکم کی طرف لوٹانے سے اس کا معنی معلوم ہو جائے دوسری قسم وہ ہے

جس کی حقیقت کی معرفت کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور جو شخص اس کے معنی کے درپے ہو وہ بدعتی اور فتنہ پرور ہے، بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر لفظ سے اس کی مراد ظاہر ہو تو اگر وہ منسوخ ہونے کا احتمال نہ رکھے تو وہ محکم ہے اور اگر وہ منسوخ ہونے کا احتمال رکھتا ہو لیکن اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو مفسر ہے اور اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہو لیکن عبارت اس کی وجہ سے لائی گئی ہو تو نص ہے ورنہ وہ ظاہر ہے اور اگر کسی عارض کی بناء پر لفظ سے اس کی مراد مخفی ہو تو وہ مخفی ہے اور اگر اس لفظ کی وجہ سے اس کی مراد مخفی ہو تو وہ مشکل ہے اور اگر عقل یا نقل سے اس کا ادراک ہو سکے تو وہ مجمل ہے اور اگر کسی وجہ سے اس کا ادراک نہ ہو سکے تو وہ متشابہ ہے۔ (تاج العروس، تبیان القرآن)

امام راغب اصفہانی کے نزدیک متشابہ کی تین قسمیں ہیں: (اول) جس کی معرفت کا کوئی ذریعہ نہ ہو جیسے وقت وقوع قیامت اور دابۃ الارض کے نکلنے کا وقت وغیرہ (ثانی) جس کی معرفت کا انسان کے لیے کوئی ذریعہ ہو جیسے مشکل اور غیر مانوس الفاظ اور مجمل احکام (ثالث) جو ان دونوں کے درمیان ہو علماء راسخین کے لیے اس کی معرفت حاصل کرنا ممکن ہے اور عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق دعا کی تھی: اے اللہ اس کو دین کی فقہ عطا فرما اور اس کو تاویل کا علم عطا فرما، اس دعا سے اسی قسم کی متشابہہ آیات کا علم مراد ہے آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے بھی اسی قسم کی دعا کی ہے۔ (مفردات راغب، تبیان القرآن)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی لکھتے ہیں "جس کا معنی نفس لفظ کی وجہ سے مخفی ہو اور اس کی معرفت کی بالکل امید نہ ہو جیسے اوائل سورۃ میں حروف مقطعات ہیں۔ (کتاب التعریفات)

علامہ ابو بکر عبد القادر رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں محکمات سے ناسخات (منسوخ کرنے والی) آیات مراد ہیں، متشابہات سے مراد آیات منسوخات (منسوخ شدہ) ہیں۔ اسی طرح انہوں نے محکمات سے عقلیات اور متشابہات سے شرعیات مراد لی ہے، اسی طرح انہوں نے محکمات سے وہ آیات مراد لی ہیں جن کا معنیٰ واضح ہو اور متشابہات سے وہ آیات مراد لی ہیں جن کا معنیٰ غیر واضح اور دقیق ہو۔ (انموذج جلیل فی اسئلۃ واجوبۃ من غرائب آی التنزیل)

اصولیین کے نزدیک محکم اور متشابہ: علامہ عبد العزیز بن احمد بخاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں، لفظ سے جس

معنی کا ارادہ کیا گیا ہے اگر اس میں نسخ اور تبدیلی ممتنع ہو تو وہ محکم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ محکم اپنے معنی کا فائدہ پہنچانے میں انتہائی واضح ہوتا ہے اور چونکہ وہ معنی منسوخ نہیں ہو سکتا اس لیے اس کو محکم کہتے ہیں ہمارے عام اصولیین کی یہی رائے ہے، اس کی تفسیر میں اور بھی اقوال ہیں، ① جس میں صرف ایک محمل کی گنجائش ہو۔ ② عقل کے نزدیک وہ واضح ہو۔ ③ وہ ناسخ ہو۔ ④ اس کے معنی کا علم اور اس کی مراد معلوم ہو۔ ⑤ تمام اہل اسلام کے نزدیک اس کا معنی ظاہر ہو اور کسی کا اس معنی میں اختلاف نہ ہو۔ ⑥ جو فرائض اور حدود کے بیان پر مشتمل ہو۔ ⑦ جو حلال اور حرام کے بیان پر مشتمل ہو، محکم کی یہ متعدد تعریفیں ہیں لیکن صحیح تعریف پہلی ہے۔ (کشف الاسرار، تبیان)

علامہ عبد العزیز بن احمد بخاری رحمہ اللہ متشابہ کی تعریف میں لکھتے ہیں، جب کسی لفظ سے اس کی مراد مشتبہ ہو اور اس کی معرفت کا کوئی ذریعہ نہ ہو حتی کہ اس کی مراد کی طلب ساقط ہو جائے اور اس کی مراد کے حق ہونے کا اعتقاد واجب ہو تو اس کو متشابہہ کہتے ہیں۔ (کشف الاسرار، تبیان القرآن)

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ: اللہ تعالیٰ کی بلیغ حکمت آیات محکمات اور آیات متشابہات سے کیا ہے، اس کی بہترین مراد تو وہی علیم بذات الصدور ذات ہی بہتر جانتی ہے، اس عالی ذات نے اپنی عظیم الشان کتاب قرآن کریم میں محکم اور متشابہ آیات کیوں رکھی اور نازل کی ہیں، یہ اسی کو معلوم ہے، اہل علم و عرفان تو شبانہ روز یہی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کا معنیٰ، مفہوم اور تفسیر جانیں، لیکن ایک دوسرا طبقہ ہے جسے کج کلاہ کہہ لیجیے، کج رو کہہ لیجیے، الٹی عقل والے کہہ دیجیے، بے وقوف اور احمق کہہ لیجیے، کچھ بھی کہیے رب تعالیٰ نے انہیں ٹیڑھے دلوں والے قرار دیا ہے، ان کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ اللہ کی رضاجوئی کے لیے آیات پر نظر نہیں رکھتے، وہ فتنہ جوئی کے لیے آیات کے درپے ہوتے ہیں، ان کی صبح و شام کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ کہیں سے کوئی سامان فتنہ گری ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ شر انگیزی کی دیاسلائی جلائیں، عقل و خرد سے عاری لوگ تصوراتی گھوڑے دوڑاتے رہیں ان کے ہاتھ میں کچھ آنے والا نہیں ہے، ان متشابہ آیات کا معنیٰ، مطلب اور مفہوم ایک اللہ ہی کی ذات ہے جو جانتی ہے، اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ: زیغ کا معنیٰ ہے ایک طرف جھکاؤ، ٹیڑھا۔ دلوں کے ٹیڑھ والے کون لوگ ہیں؟ حضرات مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ " اس سے مراد نجران کے عیسائی ہیں کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کی آیات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) ہونے پر استدلال کیا، یہ ربیع کا قول ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد یہود ہیں کیونکہ یہودی عالم حی بن اخطب اور اس کے اصحاب کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف سورتوں کے اوائل سے حروف مقطعات پڑھے تو وہ ابجد کے حساب سے ان کے عدد نکال کر اس دین کی مدت کا حساب کرنے لگے اور جب آپ نے کئی حروف پڑھے تو وہ کہنے لگے ہم پر حساب مشتبہ ہو گیا کہ ہم قلیل عدد کا اعتبار کریں یا کثیر کا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ اس کتاب میں آیات محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں، قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان لوگوں سے مراد منکرین بعثت ہیں اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں، ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام مبتدعین ہیں، قرآن مجید کا ظاہر لفظ عموم کا تقاضا کرتا ہے اور اس کے عموم میں ہر وہ فرقہ داخل ہے جس کے دل میں کجی ہے۔ (تبیان القرآن)

وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ: یہ تاویل کیسے تلاش کرتے ہیں؟ متشابہ آیات کے ظاہر کو لے لیتے ہیں، جس لفظ کے کئی معانی ہونے کا احتمال ہوتا ہے اس میں سے ایسا لفظ لے لیتے ہیں جو ان کی اغراض فاسدہ کے مطابق ہوتا ہے جو بدعت اور باطل کو ثابت کرتا ہے یہ لوگ اپنی خواہش نفسانی کے مطابق اس میں تاویل کرتے ہیں۔ (المقتطف ج ۲ ص ۳۰۵)

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ: ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عائشہ رضی اللہ عنہا اور حسن اور مالک بن انس اور کسائی اور فرّاء اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہم علماء یہ کہتے ہیں کہ الا اللہ پر کلام تمام ہو گیا اور یہاں وقف لازم ہے اور وَالرَّاسِخُونَ جدا کلام ہے "و" عطف کے لیے نہیں بلکہ ابتدائے کلام کے لئے ہے، اس تقدیر پر یہ معنی ہوں گے کہ متشابہات سے جو کچھ مراد ہے اس کو بجز خدا کے اور کوئی نہیں جانتا اور یہی ٹھیک ہے اس لیے کہ اسرار غیب کو عقل جب تک جسم کے ساتھ مقید ہے اس کی تاریکی کی وجہ سے نہیں دریافت کر سکتی اور مجاہد اور ربیع بن انس اور اکثر متکلمین اور جمہور معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ وَالرَّاسِخُونَ

فِي الْعِلْمِ کا اللہ پر عطف ہے یہاں وقف نہیں، اس تقدیر پر یہ معنٰی ہوں گے کہ علمائے ربانی بھی متشابہات کو جانتے ہیں کیونکہ بندوں سے جب کلام کیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کو کوئی بھی نہ سمجھے ورنہ اس کے نازل کرنے سے کیا فائدہ تھا۔ (تفسیر حقانی)

تاویل سے کیا مراد ہے؟ یہ آلَ یَؤُلُ اَولاً مآل سے مشتق ہے، جہاں لفظ کی مراد ظاہر نہ ہو وہاں تاویل کی جاتی ہے، جہاں لفظ کی مراد واضح ہو اسے تفسیر کہا جاتا ہے، شیخ ادریس کاندھلویؒ فرماتے ہیں "لفظ تاویل متقدمین کی اصطلاح میں تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے تفسیر ابن جریر میں جابجا تاویل کا لفظ تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور متاخرین کی اصطلاح میں کسی قرینہ دلیل کی بناء پر ظاہر سے غیر ظاہر کی طرف پھیرنے کا نام تاویل ہے اور قرآن کریم میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے وہاں تاویل سے مخفی حقیقت اور مصداق اور مآل اور انجام اور نتیجہ اور حکمت اور کلام کی غرض اور غایت کے معنی مراد لیے گئے ہیں، لفظ تاویل اصل میں اول سے مشتق ہے جس کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں مثلاً هَل يَنظُرُونَ اِلَّا تَاوِيلَهُ يَومَ يَاتِي تَاوِيله، سے یوم آخرت مراد ہے جس دن وعدہ اور وعید کا مصداق ظاہر ہو گا اور جزاء اور سزا کی حقیقت واضح ہو گی اور بَل كَذَّبُوا بِمَالَم يُحِيطُوا بِعِلمِهِ وَلَمَّا يَاتِهِم تَاوِيلُه، میں تاویل سے خبر خداوندی کے مصداق کا ظہور مراد ہے یا عاقبت اور انجام کے معنی مراد ہیں، ہر خبر کا ایک لفظی مفہوم اور مدلول ہوتا ہے اور ایک اس کا خارجی اور واقعی مصداق ہوتا ہے، جو وقوع کے بعد ظاہر ہوتا ہے كَمَاقَالَ تَعَالىٰ لِكُل نَبَاءٍ مُّستَقَرّ وَسَوفَ تَعلَمُونَ، قرآن کریم نے خبر کے اس خارجی اور وقوعی مصداق کو تاویل سے تعبیر کیا ہے، بسا اوقات خبر کا لفظی مدلول اور مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور اس کے خارجی مصداق کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور هَذَا تَاوِيلُ رُويَايَ میں تاویل سے تعبیر مراد ہے جو خواب کا مآل اور انجام اور خارجی مصداق ہے اور وَزِنُوا بِالقِسطَاسِ المُستَقِيم ذَالِكَ خَيرٌ وَّاَحسَنُ تَاوِيلًا، میں تاویل سے مآل اور انجام کار مراد ہونا بالکل ظاہر ہے اور ذَالِكَ تَاوِيلُ مَالَم تَسطِع عَّلَيهِ صَبراً میں تاویل سے مصداق اور خارجی حقیقت اور حکمت کے معنی مراد ہیں، حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی، اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما، ظاہر

ہے کہ یہاں تاویل سے مخفی حقیقت اور پوشیدہ حکمت کا منکشف کرنا اور مآل اور انجام کا ظاہر کرنا مراد ہے، عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رکوع اور سجود میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے، سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي، گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کے ذریعہ سے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کی تاویل ظاہر فرماتے یعنی اس آیت کا عملی مصداق بیان فرماتے ہیں کہ آیت قرآنی میں تسبیح و تحمید اور استغفار کی تاویل یہ ہے کہ رکوع میں اس طرح تسبیح اور استغفار پڑھی جائے، معلوم ہوا کہ حدیث میں تاویل سے کلام کا ظاہر سے پھیرنا مراد نہیں بلکہ اس کے خارجی مصداق کا تعین مراد ہے۔ (تفسیر معارف القرآن للکاندھلویؒ)

وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا: علماء راسخین سے مراد ایسے علماء ہیں جنہوں نے دین کا پختہ علم حاصل کیا اور قرآن اور حدیث میں مہارت حاصل کی اور تمام اصول اور فروع پر حاوی ہوں، ان سے عقائد اسلام اور احکام شرعیہ کے متعلق جو بھی سوال کیا جائے وہ اس کا جواب دینے پر قادر ہوں۔ (تبیان القرآن)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی رحمہ اللہ راسخین فی العلم (ماہرین علم) کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں "علماء راسخین سے مراد ایسے علماء ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو دلائل یقینیہ قطعیہ سے جانتے ہوں اور ان کو دلائل یقینیہ سے معلوم ہو کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور جب وہ کسی آیت کو دیکھیں کہ اس کا ظاہری معنی قطعی طور پر مراد نہیں ہے تو وہ قطعیت سے جان لیں کہ یہ آیت متشابہہ ہے اور اس کی مراد کا صرف اللہ تعالیٰ کو ہی علم ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل سے قرآن مجید میں غور کرتے ہیں اور جس آیت کا معنی ظاہری دلائل شرعیہ کے مطابق ہوتا ہے اس کو محکم قرار دیتے ہیں اور جس کا ظاہر دلائل شرعیہ کے خلاف ہوتا ہے اس کو متشابہ قرار دیتے ہیں، اس آیت سے متکلمین کی قدر و منزلت کا علم ہوتا ہے جو دلائل عقلیہ سے بحث کرتے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور دلائل عقلیہ، لغت، قواعد عربیہ اور احادیث اور آثار سے قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تفسیر کرنے کے لیے لغت، قواعد عربیہ اور احادیث اور آثار میں تبحر درکار ہے اور جو شخص ان علوم میں تبحر حاصل

کئے بغیر قرآن مجید کی تفسیر کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہو گا اور اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے، جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن مجید کی تفسیر کی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔ (تفسیر کبیر و تبیان القرآن) یہ بہت اہم بات ہے، اپنے اسلاف صالحین کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ علم میں راسخ کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو اپنی قسم پوری کرے اور اس کی زبان سچی ہو اور اس کا دل (حق پر) مستقیم ہو اور اس کا پیٹ اور اس کی شرم گاہ حرام سے محفوظ ہو۔ (جامع البیان)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ طبرانی کی تلخیص کرتے ہوئے لکھتے ہیں " راجح قول یہ ہے کہ ان سے مراد اہل السنۃ والجماعت ہیں جو قرآن و سنت کی اسی تعبیر و تشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جو صحابہ کرام سلف صالحین اور اجماع امت سے منقول ہو، اور قرآنی تعلیمات کا محور اور مرکز محکمات کو مانتے ہیں اور متشابہات کے جو معانی ان کے فہم و ادراک سے باہر ہیں کوتاہ نظری اور قصور علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خدا کے سپرد کرتے ہیں، وہ اپنے کمال علمی اور قوت ایمانی پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل و عنایت کے طلبگار رہتے ہیں ان کی طبیعتیں فتنہ پسند نہیں ہوتیں کہ متشابہات ہی کے پیچھے لگی رہیں، وہ محکمات اور متشابہات سب کو حق سمجھتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہیں، البتہ ایک قسم یعنی محکمات کے معانی ہمارے لیے معلوم کرنے مفید اور ضروری تھے تو اللہ تعالیٰ نے وہ پوشیدہ نہیں رکھے بلکہ کھول کھول کر بیان کر دیئے اور دوسری قسم یعنی متشابہات کے معانی اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے بیان نہیں فرمائے، لہٰذا ان کا معلوم کرنا بھی ہمارے لیے ضروری نہیں، ایسی آیات پر ایمان اجمالاً لے آنا ہی کافی ہے۔ (ملخصا طبرانی بحوالہ معارف القرآن)

راسخین فی العلم کی سات صفات: اللہ تعالیٰ نے (راسخون فی العلم) کی سات صفات بیان کی ہیں، یہ بندے کی خوش بختی کی علامت ہیں۔ ① علم: یہ وہ راستہ ہے جو اللہ تک پہنچاتا ہے، اس کے احکامات اور قوانین کو واضح کرتا ہے۔ ② (رسوخ فی العلم) "علم میں پختہ ہونا" یہ صفت محض علم سے بڑھ کر ہے، اس لیے کہ راسخ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آدمی محقق و مدقق عالم ہو، جس کو اللہ نے ظاہری

علم بھی عطا فرمایا ہو اور باطنی علم بھی، شریعت کے اسرار میں اس کا علم بھی پختہ ہوتا ہے، عمل بھی درست ہوتا ہے اور حال بھی کامل ہوتا ہے۔ ③ وہ پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور متشابہ کو محکم کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا کہتے ہیں ہم تو اس پر ایمان لا چکے۔ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے ④ وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلب گار ہوتے ہیں اور جن غلطیوں میں گمراہ مبتلا ہو چکے ہیں، یہ لوگ ان سے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔

⑤ وہ اللہ کا احسان مانتے ہیں کہ اس نے انہیں ہدایت دی، کیونکہ کہتے ہیں، رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دل ٹیڑھے نہ کرے۔ ⑥ اس کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی رحمت کا سوال کرتے ہیں، جس میں ہر بھلائی کا حصول اور ہر برائی سے بچاؤ شامل ہے، اس مقصد کے لیے اللہ کے اسم مبارک اَلْوَهَّابُ کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں۔ ⑦ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قیامت کے آنے پر ایمان اور پورا یقین رکھتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں، یہی ایمان عمل کرنے پر آمادہ کرتا اور لغزش سے بچا کر رکھتا ہے۔ (تفسیر السعدی)

يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا: یہاں قرآن کریم کی محکم آیات کو چھوڑ کر متشابہ آیات کے پیچھے دوڑنے والے لوگوں کے مقابلے میں علم کے ماہرین، رسوخ فی العلم رکھنے والے لوگوں کی مدح سرائی کی جارہی ہے کہ یہ اللہ کے پسندیدہ لوگ متشابہ آیات قرآنیہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے، سرکشی، تمرد اور تکبر سے کام نہیں لیتے بلکہ عجز وانکساری کا پیکر بن کر کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی محکم آیات پر ایمان لائے، ہم اللہ کی نازل کردہ متشابہ آیات پر بھی ایمان لائے، ہم محکم آیات کو بھی اللہ کی طرف سے اتاری ہوئی مانتے ہیں اور متشابہ کو بھی اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی مانتے ہیں، ہم محکمات اور متشابہات میں کوئی تعارض و ٹکراؤ نہیں جانتے، ہم محکم و متشابہ کے الجھیڑوں میں الجھ کر اپنے اللہ کو ناراض نہیں کرتے۔

یہاں رب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو متشابہات کے نزول کے راز کو ظاہر کرتا ہے، اس میں یہ حکمت پائی جاتی ہے کہ اس میں تربیت کا معنیٰ پایا جاتا ہے، معراج کمال تک پہنچانے کا مفہوم پایا جاتا ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ متشابہ آیات اسی لیے اتاری گئی ہیں، یہاں علماء کرام کی فضیلت ظاہر ہوتی

ہے، ان کا قرآن کریم میں فکر و تدبر ظاہر ہوتا ہے، قرآن کریم سے فقہی احکامات نکالنے کی محنت کا اظہار ہوتا ہے، وہ اس کی بدولت اونچے مراتب تک رسائی کرتے ہیں، اونچے مراتب تک پہنچنا تربیت وراہنمائی کے بغیر ناممکن ہے۔

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ: ان کلمات میں بھی ماہرین علم، راسخین فی العلم کی مدح سرائی کی گئی ہے، ان کے ذہن کی درخشانی کا اظہار کیا گیا ہے، ان کی حسن نظر سے آگاہ کیا گیا ہے، تاویلات میں وہ کس طرح اپنے دامن کو ملوث ہونے سے بچا کر آگے نکلتے ہیں اس کا ذکر کیا گیا ہے، بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ گمراہ کن نفسانی خواہشات اور ٹیڑھے پن سے بہت دور ہیں، اہل عقل وخرد ہیں، ارباب فہم وفراست ہیں، یہ لوگ عقل سلیم کے مالک ہیں۔

راسخین فی العلم کی دو دعائیں

سوال ان آیات میں کیا بیان کیا گیا ہے؟ ان کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ {۸} رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ {۹} آل عمران

جواب ترجمہ (یہ عقل وخرد والے یوں کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کیجیے اس کے بعد کہ آپ نے ہمیں ہدایت دی، اور ہمیں اپنے پاس سے بڑی رحمت عطا کر دیجیے! بیشک آپ بہت دینے والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! بے شک آپ لوگوں کو اس دن جمع کرنے والے ہیں جس دن میں کوئی شک نہیں۔ بے شک اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں راسخین فی العلم، اولو الالباب، ارباب دانش وبینش کا کیا مرتبہ اور مقام ہے، ان کا چناؤ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ ان کے قلب میں علم کے موتی رکھتا ہے، ان کی عجز وانکساری پر قدرت والا ان پر مہربان ہو جاتا ہے، جس قدر علم وعرفان میں رسوخ اور پختگی رکھنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ان میں عجز وانکساری، ادب واحترام بڑھتا جاتا ہے۔

صاحب تدبر قرآن فرماتے ہیں یہ راسخین فی العلم کی دعا ہے جس سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں اتنے بے پروا نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ شبہات اور شکوک کو بلاوے بھیج کر بلائیں اور اپنے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالیں بلکہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے برابر اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ دین میں ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور جب فتنوں کی یورش ہو تو خدائے وہاب اپنے پاس سے ان کے لیے وہ روحانی کمک بھیجے جو ان کے ثبات قدم کا ذریعہ بنے، دوسری آیت میں اس یقین کا اظہار ہے جو ان راسخین کے اندر آخرت کے باب میں ہوتا ہے، موقع کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ درحقیقت یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا اصلی پاسبان ہے، یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی ہرزہ گردی سے نہیں روک سکتی، وہ زندگی کو ایک نہایت سہل بازی سمجھتا ہے اور ہر داؤ پر اس کو لگا دینے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن جن کے اندر آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے وہ ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے اور نہایت پھونک پھونک کر رکھتے ہیں، یہ احتیاط ان کو ہمیشہ جادہ مستقیم پر اُستوار رکھتی ہے۔ (تدبر قرآن)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا: یہ راسخین فی العلم کا مقولہ ہے یعنی وہ متشابہات کو علم الٰہی کے حوالہ کر کے اس پر ایمان لا کر یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ اے رب! تو نے ہمیں ہدایت دی اور فہم سلیم عطا کیا ہے اب ایسا نہ ہو کہ ہمارے دل کجی کی طرف میلان کر جاویں کیونکہ استقامت تیرے ہی ہاتھ میں ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا، قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْنَ أُصْبُعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ بنی آدم کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں میں ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے، داعیہ خیر اور داعیہ شر قلب میں اس کی طرف سے پیدا ہوتا ہے اور دلی استقامت کے بعد ہم کو اپنی رحمت خالصہ بھی عطا کر، نبی کریم ﷺ یہ دعا مانگتے رہتے تھے يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ وَالْأَبْصَارِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ اے دلوں اور آنکھوں کو پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر جما دے۔

انسانی دل ایمان کی جانب مائل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کفر کی جانب مائل ہونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، کسی ایک جانب اس وقت تک مائل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں کوئی داعیہ اور ارادہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے نہ پیدا ہو جائے، اگر اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے اس کے دل

میں داعیہ کفر پیدا ہو جائے تو اسے خذلان، ازاغت، صد، ختم، طبع، رین، قسوۃ، وقر، کنان وغیرہ کے الفاظ سے قرآن کریم نے یاد کیا ہے، اگر انسان کے دل میں داعیہ ایمان پیدا ہو جائے تو اسے توفیق، رشاد، ہدایت، تسدید، تثبیت اور عصمت کے الفاظ سے قرآن کریم نے یاد کیا ہے۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً: رحمت کی چند قسمیں ہیں۔ ① اول یہ کہ دل میں نور ایمان، نور توحید اور معرفت الٰہی کا نور حاصل ہو۔ ② دوم یہ کہ اعضاء وجوارح پر طاعت، عبودیت اور خدمت کے انوار ظاہر ہوں۔ ③ سوم یہ کہ دنیا میں رزق اور اسباب معاش سہل ہو جاویں اور تندرستی اور امن و عافیت حاصل ہو۔ ④ چہارم یہ کہ شدت موت اور اس کے بعد قبر اور حشر میں رستگاری ہو۔ ⑤ پنجم یہ کہ قبر میں سوالات آسان ہوں، قبر کے اندھیروں اور تاریکیوں میں سہولت ہو۔ ⑥ ششم یہ کہ قیامت میں سزا اور خطاب میں سہولت مل جائے، گناہوں کی بخشش ہو جائے، نیکیوں کا پلڑا جھک جائے۔

یہاں جو الفاظ ہیں کہ اپنی طرف سے رحمت عطا فرمایئے، یہ رحمت کی تمام اقسام کو شامل ہے، جب براہین باہرہ اور دلائل قاہرہ سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے، اس کے سوا کوئی کرم کرنے والا نہیں ہے، اس لیے تاکیدی الفاظ مِنْ لَّدُنْكَ استعمال کیے گئے، اس میں عقل، دل اور روح کو خبردار کرنا ہے کہ اس ذات عالی کے سوا کسی سے یہ مقصود حاصل ہونے والا نہیں ہے، یہاں رحمت کو نکرہ ذکر کرنے سے بھی مقصود یہی ہے کہ جس چیز کو طلب کیا جارہا ہے یہ بندے کی بہ نسبت بڑی عظمت والی ہے، اس لیے اسے نکرہ ذکر کیا ہے گویا وہ یوں کہہ رہا ہے میں رحمت کا طلب گار ہوں، کون سی رحمت؟ جو تیری شایان شان ہے، جو تیری ذات کے لائق ہے، جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہے تو انتہائی درجے کی عظمت کی حامل بن گئی۔

إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ: گویا بندہ اللہ سے یوں عرض کر رہا ہے کہ اے میرے پروردگار! یہ جو چیز میں آپ سے مانگ رہا ہوں یہ میری نسبت بہت ہی بڑی چیز ہے، لیکن تیرے کمالات، تیرے کرم، تیری جود وسخا اور رحمت کی طرف نگاہ کرتے ہوئے دیکھوں تو تیرے نزدیک یہ حقیر سی چیز ہے، تو ہی عطا ونوازش کرنے والا ہے، تیرے عطا کرنے سے ہی چیزوں کی حقیقت بنتی ہے، تیرے دینے سے ہی چیزوں کی ذات اور ہئیت وجود میں آتی ہے، تیری ذات کے سوا جو کچھ بھی ہے یہ تیری سخاوت، تیرے

احسان اور تیرے کرم کی وجہ سے ہے، اے ہمیشہ بھلائی کرنے والے، قدیم الاحسان ذات اس مسکین بندے کی آرزوں اور امیدوں کو برباد نہ فرمایئے، اس کی دعا کو مردود نہ فرما، اسے اپنے فضل و کرم سے اپنی رحمت کا حقدار بنادے، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، تو کرم کرنے والوں میں سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے، وھاب ہبہ سے ہے، ہبہ اس عطیہ و نوازش کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی معاوضے کے ہو۔

رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ : راسخین فی العلم کی ایک اور دعا یہاں نقل کر دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جب ٹیڑھا ہونے سے بچانے کی التجا کر رہے ہیں، انہیں ہدایت و رحمت عطا کرنے کا سوال کر رہے ہیں تو گویا وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ ان کی غرض اس سوال سے صرف دنیوی مصالح کی اصلاح و درستگی نہیں ہے، جو کٹ جانے والے اور مٹ جانے والے ہیں، ان کی سب سے بڑی غرض وہ ہے جو آخرت سے تعلق رکھتی ہے، وہ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم جانتے ہیں کہ تو لوگوں کو قیامت کے دن بدلہ دینے کے لیے جمع کرے گا، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تو وعدہ خلافی نہیں کرتا، تیرا کلام جھوٹ اور خلاف واقعہ نہیں ہوتا، جس کا دل ٹیڑھا ہو گیا تو وہ وہاں ہمیشہ کے عذاب بھگتے گا اور جسے تیری طرف سے توفیق، ہدایت اور رحمت مل گئی اور جسے تو نے اہل ایمان میں سے کر دیا تو وہ وہاں سعادت مندی اور بزرگی کی زندگانی ہمیشہ ہمیشہ گزارے گا، اس دعا کی سب سے بڑی غرض آخرت سے متعلق ہے۔

کافروں کی شر انگیزیاں، معرکہ بدر

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ {۱۰} كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ {۱۱} قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ {۱۲} قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ {۱۳} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اموال اور اولاد اللہ کے ہاں کچھ بھی کام نہیں آئیں گے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو دوزخ کا بالن ہیں۔ ان کا طریقہ وہی ہے جو فرعون کی اولاد کا اور ان لوگوں کا تھا جو ان سے پہلے تھے۔ ان لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹی قرار دیا۔ سو اللہ نے انہیں پکڑا ان کے گناہوں کی وجہ سے، اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (میرے حبیب) آپ ان لوگوں سے فرما دیجیے جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے اور تم جمع کیے جاؤ گے دوزخ کی طرف اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ بلاشبہ تمہارے لیے نشانی تھی ان دو جماعتوں میں جو ایک دوسرے کے سامنے ہوئیں، ایک جماعت لڑ رہی تھی اللہ کی راہ میں اور دوسری جماعت کافر تھی وہ دیکھتی آنکھوں مسلمانوں کی جماعت کو دوگنی دیکھ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے ساتھ جس کی چاہے تائید فرماتا ہے۔ بلاشبہ اس میں ضرور بڑی عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو آنکھوں والے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً: یہ قرآن کریم کا بہت ہی خوبصورت اُسلوب بیان ہے کہ جب مسلمانوں پر انعامات واحسانات ربانی کا تذکرہ کرتا ہے تو کفار کی رسوائی، روسیائی اور تباہی کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیتا ہے، تاکہ اہل اسلام کی تسلی کا سامان بنے اور کفر کو سوچنے کا موقع ملے۔

ایک تفسیر کے مطابق یہاں کفار سے مراد یہود ہیں، ایک تفسیر کے مطابق تمام کفار مراد ہیں، کہ ان کے مال و دولت کی کثرت و فراوانی، ان کی آل واولاد اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں کام نہیں دے سکے گی، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہیں دولت کی کثرت بچا سکتی ہے اور نہ اولاد کی قوت وطاقت انہیں سزائے ربانی سے چھٹکارہ دلا سکتی ہے، کفار پر اگر دنیا میں کوئی آزمائش آتی ہے، کوئی خوفناک بیماری لاحق ہوتی ہے یا آخرت میں عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے تو سب کچھ رائیگاں چلا جائے گا، کچھ کام نہیں آئے گا، جو لوگ اپنا مال و دولت اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے کاموں میں نہیں خرچ کرتے انہیں قیامت کے دن اس پر سخت افسوس ہو گا، یہاں مال اور اولاد کا ذکر خصوصیت سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ مال واولاد کی وجہ سے دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ انہیں آخرت میں کچھ بھی کام نہیں آئیں گے، اس لیے آگاہ کر دیا کہ لوگ اپنی

زندگی مال اوراولاد کی خاطر فنا نہ کریں، اللہ نے کافروں کا ذکر اس لیے کیا تاکہ اہل ایمان ان سے عبرت حاصل کریں۔

وَأُولٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ: یہاں وقود واؤ کی زبر کے ساتھ ہے، جب کہ ایک قرأت میں واؤ کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، جس کا مطلب ہے آگ جلانا، قیامت کے دن ان کفار کو دوزخ میں جب سزا دی جائے گی تو اس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، انہیں آگ کا عذاب دیا جائے گا، وقود النار سے مراد دوزخ کا بالن، ایندھن اور لکڑیاں، جن کے جلنے سے آگ میں شدت اور تیزی آئے گی، قیامت کے دن جب ان کافروں کی چمڑیاں آگ میں جل جائیں گی تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کی جگہ دوسری چمڑی چڑھائے گا، وہ جل جائے گی تو دوسری چڑھائے گا، یوں یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیش کفار کے لیے جاری رہے گا، ایک تفسیر یہ کی گئی کہ جب دوزخ کی آگ بجھنے کے قریب ہو گی تو اللہ تعالیٰ ان کافروں کو دوسری چمڑی چڑھادے گا تاکہ آگ مزید تیز ہو جائے، کفار جہنم کی وہ لکڑیاں اور ایندھن ہوں گے جن کی وجہ سے دوزخ بھڑکائی جائے گی۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللّٰهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ: دأب کا معنیٰ طریقہ ہے، یعنی اے میرے حبیب! ان کافروں کا آپ کے ساتھ رویہ اور طریقہ آل فرعون کے طریقے جیسا ہے، جس طرح انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طریقہ روا رکھا ہوا تھا یہ کافر بھی آپ کے ساتھ اسی طرح کر رہے ہیں۔

جن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ستایا، انہیں دنیا میں سزا دی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے والے بھی سزا سے بچ نہیں پائیں گے، پہلے لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو انہیں ان کے گناہوں اور جرائم کے باعث سزا دی گئی، ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں سزا ملی، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

شانِ نزول: حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح آل فرعون نے جھٹلایا تھا یہ بھی اسی طرح جھٹلا رہے ہیں، انہیں دنیا میں عذاب دیا گیا، جس طرح آل فرعون کو پانی میں غرقاب کیا گیا، انہیں بھی دنیا میں قتل کروا کر سزا دی جائے گی، یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کا

ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آل فرعون موسیٰ کے خلاف کرتے تھے اور آل فرعون سے پہلے کے کفار کرتے تھے، جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، ان لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ اے کافرو! عنقریب تم مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف جمع کیا جائے گا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم میدان بدر میں کفار قریش کو سزا دے کر مدینہ پہنچے تو یہود کو بنو قینقاع کے بازار میں جمع کیا، پھر ان سے مخاطب ہوئے اور فرمایا يَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ، أَسْلِمُوا قَبْلَ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللهُ بِمِثْلِ مَا أَصَابَ قُرَيْشاً اے گروہ یہود! اسلام قبول کر لو اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی کفار قریش کی طرح سزا دے، یہودیوں نے کہا، اے محمد! اپنے آپ کو دھوکے میں نہ ڈالو، آپ نے قریش کے چند لوگوں کو قتل کیا ہے، جو لڑائی کے گر نہیں جانتے تھے، اگر آپ نے ہمارے ساتھ لڑائی کی تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ہم وہ لوگ ہیں جن جیسا آپ کو کوئی نہیں ملا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ اے میرے حبیب! کافروں سے فرما دیجیے کہ عنقریب تم مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف جمع کیا جائے گا تمہیں شکست دی جائے گی، قتل کے بعد تمہیں دوزخ کی طرف جمع کیا جائے گا جو برا ٹھکانہ اور بچھونا ہے، جو رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ (بحر العلوم للسمرقندی)

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ: اللہ تعالیٰ نے معرکہ بدر کو نشانی قرار دیا کہ جو میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم مغلوب ہو گے وہ بات سچی ہو گئی ہے، یہاں فِئَتَيْنِ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور کفار مکہ دو گروہ مراد ہیں، اِلْتَقَتَا کا معنیٰ ہے جب یہ دونوں گروہ مدینہ سے دور میدان بدر میں ایک دوسرے کے سامنے آئے، اہل ایمان اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے تھے جب کہ دوسرا گروہ کافروں کا تھا، یہاں اللہ کی حکمت و قدرت ظاہر ہو رہی تھی کہ دوسرا گروہ پہلے گروہ کو اپنے سے دوگنا زیادہ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، جب کہ حقیقت میں کافروں کے گروہ کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی۔

حضرت سعید بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص کو کافروں نے گرفتار کر لیا، پھر اس سے پوچھا کہ تمہاری کتنی تعداد ہے؟ اس نے کہا کہ تین سو دس سے کچھ اوپر ہیں، انہوں نے کہا کہ ہم تو تمہیں اپنی تعداد سے زیادہ دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اِن کی کم تعداد کے باوجود اُنہیں زیادہ دکھایا، تاکہ وہ خوف زدہ ہو جائیں، اور ان سے لڑنے سے باز رہیں، کافروں کا گروہ ساڑھے نو سو جنگجوؤں پر مشتمل تھا، جو سب مسلح تھے، ان میں کفار کے بڑے بڑے سردار بھی تھے، ان کے پاس سات سو اونٹ تھے، ایک سو گھوڑے تھے، ابوجہل ایک سو گھڑ سواروں کی قیادت کر رہا تھا، علاوہ ازیں پیادوں میں بھی زرہ پوش تھے، جب کہ مسلمان تین سو تیرہ تھے، ان کے پاس ستر اونٹ تھے، ہر چار آدمیوں کے پاس ایک اونٹ تھا، کل چھ زرہیں تھیں اور دو گھڑ سوار تھے، مہاجرین کی تعداد ساٹھ سے اوپر تھی، انصار کی تعداد دو سو چالیس سے کچھ اوپر تھی، مسلمانوں کو کبھی معرکہ آرائی کا موقع نہیں ملا تھا، میدان حرب وضرب کے ماہر نہیں تھے، جب کہ کفار مکہ بہت ہی ماہر، مشاق، نشانہ باز اور جنگ آزما لوگ تھے، بس اللہ کی مدد اور نصرت سے ان نہتے لوگوں نے کافروں پر فتح پائی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی اور دعاؤں کا نتیجہ تھا، یہ معرکہ سنہ ۲ ہجری کی ۱۷ رمضان المبارک کو پیش آیا تھا۔

کافروں کے لشکر میں شراب کا نشہ اور شباب کی مستی تھی، مغنیات اور رقّصات نے میدان کارزار گرما رکھا تھا، جب کہ دوسری جانب مسلمان مصلّے بچھائے دعاؤں میں مشغول تھے، خود سپہ سالار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کمال زاری ولجاجت سے دعائیں کیں، اے پروردگار! یہ مٹھی بھر جماعت اگر آج شکست کھا گئی تو روئے زمین پر قیامت تک تیرا نام لیوا کوئی نہیں ہو گا، اللہ نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور مسلمانوں کو نصرت عطا کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے معرکہ بدر میں مسلمانوں کی تسلی کے لیے ایک ہزار فرشتوں کو اُتارا تھا، جو لڑنے کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تسلی کے لیے آئے تھے، کیونکہ کفار سے لڑنے کے لیے فرشتوں کی اتنی بڑی تعداد کی ضرورت نہیں تھی، ایک ہی فرشتہ پورے لشکر کفار کے لیے کافی تھا، اللہ تعالیٰ نے فتح وکامرانی کی اطلاع پہلے بھی دے دی تھی، اسی لیے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے قتل سے پہلے ان

کے ہلاک ہونے کی جگہوں کی طرف اشارہ فرما کر بتا رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی کی بشارت سنائی۔

آزمائش میں ڈالنے والی چیزیں

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ {۱۴} آل عمران

جواب ترجمہ: لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں، اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانہ ہے۔

پس منظر: ابو حارثہ بن علقمہ نصرانی نے اپنے بھائی کے سامنے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا اعتراف کیا تھا کہ میں تو آپ ﷺ کو سچا سمجھتا ہوں لیکن میں اس بات کا اظہار اس لیے نہیں کرتا کہ ملوک روم مجھ سے مال و دولت اور عزت و منصب چھین نہ لیں، اسی طرح نبی کریم ﷺ نے معرکہ بدر کے بعد جب یہودیوں کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے مال و دولت کی فراوانی پر غرور کا اظہار کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ یہاں دنیا کے مال و متاع کے بارے میں واضح کر رہے ہیں کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ فانی اور عارضی چیزیں ہیں، اصل مال و متاع اور زندگانی آخرت کی ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ: یہاں دنیوی لذتوں کی حقارت بیان کی گئی، لوگوں کو ان سے بے رغبتی دلائی گئی ہے، انہیں ان چیزوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو اللہ کے پاس ہیں، جو ان دنیوی لذائذ میں مست و مگن ہیں، ان کے حصول میں اپنا فخر و اعزاز سمجھتے ہیں، انہیں آخرت کی لذتوں سے محرومی ہوگی، یہاں اَلنَّاسُ سے جنس انسانیت مراد ہے، جمہور کے نزدیک ان چیزوں کو مزین (خوبصورت و حسین بنانے والے) کرنے والی ذات اللہ کی ہے، لوگوں کے لیے ان چیزوں کو امتحان و آزمائش کے لیے

خوبصورت بنایا گیا ہے، جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا (الکہف ۷) ہم نے زمین پر موجود چیزیں ان کے لیے مزین کی ہیں تاکہ ہم انہیں آزمائیں، حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان چیزوں کو شیطان نے مزین کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ (النمل ۲۴، العنکبوت ۳۸) اور شیطان نے ان کے لیے ان کے کارنامے مزین کیے ہیں، شہوات وخواہشات کو مزین کرنے، خوبصورت بنانے سے مراد دلوں میں ان کی محبت ڈالنا ہے، اس معنیٰ کے اعتبار سے اس کی اضافت اللہ کی طرف حقیقی معنیٰ میں ہے، اگر اس سے مراد شہوات کی ترغیب دینا لی جائے تو اس وقت اس کی اضافت شیطان کی طرف ہوگی، شیطان شہوات وخواہشات کی تکمیل کی ترغیب دیتا ہے، وسوسے ڈالتا ہے، حضرت حسن رحمہ اللہ کے فرمان کے مطابق یہ دوسرا معنیٰ مراد ہوگا۔

حُبُّ الشَّهَوَاتِ: شہاۃ، شہوۃً کا معنیٰ ہوتا ہے بہت چاہنا، خواہش کرنا، کسی چیز کا جی چاہنا، الشھوۃُ کا معنیٰ ہے زبردست خواہش، نفسانی خواہش، نفسانی قوت جو ہر قابل رغبت چیز کی طرف مائل کرتی ہے، مرغوب اور پسندیدہ چیز، مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں لیکن اس جگہ شہوات سے مراد خواہش اور رغبت کی چیزیں ہیں، محض خواہش اور رغبت مراد نہیں اس لیے کہ محبوب اور مزیَّن حقیقۃً وہ مرغوبات اور مشتہیات ہیں خود شہوت اور رغبت محبوب اور مزین نہیں لیکن اللہ جل شانہ نے توبیخ اور ملامت میں مبالغہ کرنے کے لیے قابل شہوت اور قابل رغبت چیزوں کو شہوات سے تعبیر فرمایا کہ تم ان اشیاء کی محبت میں اس درجہ مستغرق ہوگئے ہو کہ ان شہوات اور خواہشات کی محبت ہی تمہاری نظروں میں محبوب اور مزین بن گئی ہے اور بجائے اشیاء مرغوبہ کے ان کی رغبت ہی تمہاری مرغوب خاطر ہوگئی اور قابل اشتہاء چیزوں کی شہوت کی محبت ہی تمہاری محبوب اور مطلوب بن گئی، یہ عشق کا آخری درجہ ہے کہ محبوب کی محبت خود مستقل محبوب بن جائے، اسی طرح قابل شہوت چیزوں کا شہوت کا محبوب بن جانا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ شخص لذات اور شہوات کے عشق میں آخری درجہ پر پہنچ چکا ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی رحمہ اللہ)

مِنَ النِّسَاءِ: جو سات چیزیں مزین کی گئی ہیں ان میں سب سے پہلے عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ

انہی سے بہت زیادہ لذت حاصل کی جاتی ہے، ان میں ان کی طرف انس و محبت کی پینگیں زیادہ بڑھائی جاتی ہیں، انہیں حدیث شریف میں شیطان کی رسیاں کہاں گیا ہے، یہ فتنہ میں زیادہ مبتلا کرنے والی ہیں، حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے پیچھے جو فتنہ چھوڑ چلا ہوں ان میں سب سے زیادہ مردوں کے لیے نقصان دہ عورتیں ہیں، جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اس دور میں یہ فتنہ سب فتنوں سے زیادہ دکھائی دیتا ہے، آیت مبارکہ کے ان الفاظ کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اور یہ آیت ہمارے ہی اس پر فتن دور کی عورتوں کے بارے میں نازل کی گئی ہے، مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے جنوب تک، تمام ممالک میں عورت بازار کی جنس بنادی گئی ہے، قرآن کریم نے سات مشتہیات میں نمبر اول پہ اسے رکھا ہے۔

وَالْبَنِيْنَ: اولاد میں لڑکا اور لڑکی دونوں آتے ہیں، لیکن لڑکی کی بہ نسبت لڑکے کی محبت زیادہ پائی جاتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر لڑکوں کا ذکر کیا ہے، بچوں کے دنیا میں آنے پر بھی بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، بیٹوں سے فطری اور گہری محبت ہوتی ہے، یہ جگر کے ٹکڑے سمجھے جاتے ہیں، اگرچہ یہاں ذکر لڑکوں کا کیا ہے لیکن ضمناً لڑکیاں بھی سمجھی جائیں، یہاں ایک باریک نکتہ بھی ذہن نشین کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں بیوی اور بچے کی محبت کیوں پیدا کی ہے؟ تاکہ توالد و تناسل کا سلسلہ جاری رہے، اگر بیوی اور بچے کی محبت انسان کے دل میں نہ ہوتی تو توالد و تناسل کا سلسلہ کٹ جاتا، یہ فطری محبت اللہ تعالیٰ نے ہر حیوان میں رکھی ہے۔

وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنطَرَةِ: قناطیر قنطارٌ کی جمع ہے، جس کا معنیٰ بہت زیادہ مال و دولت، علامہ زجاج کہتے ہیں کہ قنطار عقد الشئی واحکامہ سے ماخوذ ہے یعنی کسی چیز کو باندھنا اور اسے مضبوط کرنا، قنطرہ بھی اسی سے ماخوذ ہے کیونکہ اسے بھی طاق کے ساتھ باندھا جاتا ہے، قنطار بہت زیادہ مال کو کہا جاتا ہے، انسان مشکلات و مصائب کو دور کرنے کے لیے اس کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے، ابو عبید عربوں کا مقولہ نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب کہتے ہیں قنطار ایسا وزن ہے جس کی کوئی حد نہیں ہوتی، یہ بات جان لینا چاہیے کہ یہ بات درست ہے، لیکن جو لوگ قنطار کو محدود مانتے ہیں ان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا قنطار بارہ ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ

کی روایت میں قنطار ایک ہزار دینار کو کہتے ہیں، ابی بن کعبؓ کی روایت میں قنطار ایک ہزار دو سو اقیہ کو کہتے ہیں، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قنطار ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم کو کہتے ہیں اور یہ دیت کی مقدار ہے، کلبیؒ فرماتے ہیں کہ قنطار رومی زبان میں جب بیل کی کھال سے بنا مشکیزہ سونے اور چاندی سے بھرا ہوا ہو تو اس وقت قنطار کا لفظ بولا جاتا ہے، قنطار کتنا ہوتا ہے؟ اس کی مقدار کتنی ہوتی ہے، امام رازیؒ نے بہت سے اقوال نقل کیے، بالآخر تنگ ہو کر انہوں نے لکھا کہ بہت سے مزید اقوال بھی ہیں لیکن غیر مقصودی ہونے کی وجہ سے میں انہیں نقل نہیں کر رہا۔ (مفاتیح الغیب للرازی)

الْمُقَنْطَرَةِ: یہ قنطار سے ہی ہے، یہ تاکید کے لیے لایا گیا ہے، جیسے عرب لوگ تاکیدی کلمات استعمال کرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں أَلْفٌ مُؤَلَّفَةٌ، وَبَدْرَةٌ مُبَدَّرَةٌ، وَإِبِلٌ مُؤَبَّلَةٌ، وَدَرَاهِمُ مُدَرْهَمَةٌ۔

الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ: ذہب سونے کو اور فضہ چاندی کو کہتے ہیں، یہ دونوں تو بہت ہی محبوب و مرغوب چیزیں ہیں، اس لیے کہ یہ دونوں تمام چیزوں کے ثمن (قیمت) بنتے ہیں، جس کے پاس سونا چاندی ہے گویا کہ وہ ساری چیزوں کا مالک ہے، مالک ہونے کی صفت پائی گئی تو گویا اس کے پاس قدرت آگئی ہے اور قدرت ہی صفت کمال ہے اور کمال بالذات محبوب چیز ہے، جب سونا اور چاندی اس کمال کو حاصل کرنے کے لیے سب سے زیادہ کامل وسائل میں سے ہے جو بالذات محبوب چیز ہے تو محبوب جس چیز کے بغیر حاصل نہ ہو سکے وہ بھی محبوب ہی ہوا کرتی ہے، تو یقینی بات ہے یہ دونوں چیزیں محبوب ٹھہریں۔ (مفاتیح الغیب) ذہب ذھاب سے مشتق ہے جس کے معنی زوال اور فناء کے ہیں اور فضہ انفاض سے مشتق ہے جس کے معنی تفرق اور جدا ہونے کے ہیں ان دونوں لفظوں کا اشتقاق ہی ان کے فناء اور زوال کی خبر دیتا ہے اس لیے آیت کو ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا پر ختم فرمایا یعنی یہ ساری چیزیں محض چند روزہ نفع کی ہیں۔ (معارف القرآن)

الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ: علامہ واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ خیل ایسی جمع ہے جس کی واحد اس لفظ سے نہیں آئی، جیسے قوم، نساء اور رھط ہے، عربی زبان میں گھوڑوں کو "خیل" ان کی مغرورانہ چال کی وجہ سے کہا جاتا ہے، انسان کی جھوم جھوم کر چلنے والی رفتار کو "اختیال" کہا جاتا ہے، عربی میں کسی استحضاری قوت کے ساتھ ذہن میں آنے والی صورت کو "تخیل" کہا جاتا ہے، عربی میں "اخیل" اس منحوس

پرندے کو کہا جاتا ہے جس سے بری فال لی جاتی ہے، یہ کبھی سبز اور کبھی سرخ روپ دھارتا ہے، عربی میں "خیال" ذہن میں گھومنے اور گردش کرنے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔

الخیل المسومہ کے معنیٰ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ خیل مسومہ سے وہ گھوڑے مراد ہیں جن پر نمبر یا نشان لگا ہوا ہو، مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسوّمہ کے معنی موٹے تازہ خوبصورت گھوڑے کے ہیں، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسوّمہ سے چرنے والے گھوڑے مراد ہیں یعنی جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑ دیے جائیں، ایک قول یہ ہے کہ سدھائے ہوئے گھوڑوں کو الخیل المسومہ کہا جاتا ہے، ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسومہ سیما اور سیماء سے ماخوذ ہے، دونوں کا معنیٰ ایک ہے، یہ بہت خوبصورت ہئیت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان بیان کرتے ہوئے ان کی پیشانیوں پر موجود نشانہائے سجدہ کو سیما فرمایا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ الخیل المسومہ کے بہت سے مطالب بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں " جو کچھ ذکر کیا گیا ہے لفظ ان تمام کا احتمال رکھتا ہے، پس وہ گھوڑا جو چرنے والا ہو، اچھی طرح تیار کیا ہوا ہو اور اسے ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن کے سبب دوسروں سے اس کی پہچان ہو سکے (وہی مراد ہو گا۔

ابو زید رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کی اصل یہ ہے کہ تو اس پر ایسی اون اور علامت بنا دے جو اس کے سارے بدن میں نمایاں ہو تاکہ چراگاہ میں وہ اسے ماسوا سے ممتاز اور الگ کر دے۔ ابن فارس اللغوی رحمہ اللہ نے اپنی مجمل میں بیان کیا ہے: المسومۃ سے مراد وہ گھوڑا ہے جو چھوڑا جائے اور اس پر اس کا سوار بھی ہو، اور مؤرّج رحمہ اللہ نے کہا ہے: المسومہ کا معنی ہے داغ دیا ہوا، مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے: وہ جو شہروں میں معروف ہو، ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے: جس میں سیاہ و سفید داغ ہوں، یہ تمام معانی سیما کے متقارب ہیں۔ (تفسیر القرطبی)

وَالْأَنْعَامِ: ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے جب تو کہے نعم تو اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے اور جب کہے انعام تو اس میں اونٹ اور تمام چرنے والے جانور آجاتے ہیں۔ فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے یہ لفظ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: هَذَا نَعَمٌ وَارِدٌ (یہ اونٹ آرہا ہے) اس کی جمع انعام آتی ہے، ہروی رحمہ اللہ نے کہا ہے: نعم مذکر و مونث دونوں کے لیے آتا ہے اور الانعام سے مراد اونٹ

گائے اور بکری وغیرہ جانور ہیں اور جب کہا جائے: اَلنَّعَم تو پھر صرف اونٹ مراد ہوتا ہے۔

عروہ البارقی رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے انہوں نے بیان کیا اونٹ اپنے مالکوں کے لیے (باعث) عزت ہے اور بکریاں باعث برکت ہیں اور خیر و بھلائی قیامت تک گھوڑے کی پیشانی میں رکھ دی گئی ہے (سنن ابن ماجہ) اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بکری جنت کے جانوروں میں سے ہے (سنن ابن ماجہ)

مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "مطلب یہ ہے کہ اونٹ گائے بکری وغیرہ بھی لوگوں کو مرغوب ہیں جس کے پاس یہ چیزیں زیادہ ہوتی ہیں عام طور سے اسے گاؤں کا بڑا اور چودھری مانا جاتا ہے جب صبح کو مویشی چرنے کے لیے جاتے ہیں اور شام کو آتے ہیں اس وقت چودھری صاحب کے نشہ کا کیا پوچھنا، اپنے جانوروں کو دیکھ دیکھ کر پوری طرح مست ہو جاتا ہے اور اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتا، سورۃ نحل میں فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ آخر میں کھیتوں کا ذکر فرمایا کھیتوں اور کھیتیوں والے بھی اپنی فصل کو دیکھ دیکھ کر مست ہوتے ہیں اور خوشی میں پھولے نہیں سماتے اہل دنیا اپنی دنیا میں خوش ہیں اور اہل آخرت اپنی آخرت کی طرف متوجہ ہیں (انوار البیان)

وَالْحَرْثِ: کھیتی باڑی بھی انسانوں کے لیے مزین کی گئی ہے، لوگ گندم، مکئی، باجرہ، جوار، چاول، گنا، سبزیاں، فروٹ اور دیگر چیزیں اپنے کھیتوں میں اگاتے ہیں، آج کل تو زمیندارہ کرنے والے لوگ فخریہ کہتے ہیں کہ ہم جدی پشتی زمیندار ہیں۔

نکتہ: علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مال کی چار قسمیں ذکر کی ہیں اور مال کی ہر نوع کے سبب لوگوں کی ایک قسم خوشحال اور متمول ہوتی ہے، پس سونے اور چاندی سے تاجر لوگ خوشحال ہوتے ہیں اور نشان زدہ گھوڑوں کے سبب بادشاہ اور امراء خوشحال ہوتے ہیں اور رہے چوپائے تو ان سے شہروں میں بسنے والے خوشحال ہوتے ہیں اور جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے تو اس سے دیہات میں رہنے والے خوشحالی حاصل کرتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائش اسی نوع کے لیے ہوتی ہے جو اس سے خوشحال ہوتی ہے اور جہاں تک عورتوں اور اولاد کا تعلق ہے تو یہ تمام کے لیے آزمائش اور فتنہ ہیں۔

ذَالِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا: یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب سازوسامان عارضی ہے، فانی ہے، زوال

پذیر ہے، یہ سب کچھ متاع دنیا ہے، کچھ مدت تک ان اشیاء فانیہ سے لذت حاصل کرنا ہے پھر انہیں فنا ہو جانا ہے، جس طرح دنیا عارضی اور زوال پذیر ہے اس کی اشیاء کو بھی ایک دن فنا اور زوال پذیر ہونا ہے۔

وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ: اللہ کے پاس وہ وہ چیزیں انسانوں کے لیے رکھی گئی ہیں جو کبھی انسان نے اس دنیا میں نہیں دیکھیں، وہ چیزیں اس کے تصورات میں بھی نہیں ہیں، اللہ کے ہاں اس کو لوٹ کر جانا ہے، اللہ کے پاس اپنے معزز مہمانوں کے لیے جنت ہے، وہی اصل ٹھکانہ ہے۔ مآب لغت میں مرجع (لوٹنے کی جگہ) کو کہتے ہیں، عربی زبان میں جب کوئی کہیں جا کر واپس لوٹ آئے تو اس کے لفظ آب الرجل (آدمی لوٹ آیا) بولتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں پھر انہیں ہماری طرف (ایابھم) لوٹنا ہے۔

سوال ٹھکانے تو دو ہیں، ایک جنت انتہائی حسین ٹھکانہ، دوسرا دوزخ جو حسن سے خالی ہے، پھر یہاں مطلق مآب حسن (خوبصورت ٹھکانے) کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

جواب جو ٹھکانہ مقصود بالذات ہے وہ تو جنت ہے، رہی دوزخ تو وہ مقصود بالغرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو رحمت کے لیے پیدا کیا ہے عذاب کے لیے نہیں، جیسے فرمایا کہ میری رحمت میرے غصے پر سبقت رکھتی ہے، یہ ایسا راز ہے جس کے ذریعے گہرے راز پر مطلع کیا جاتا ہے۔

متقی لوگوں کا آخرت میں صلہ اور انعام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ {۱۵} الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ {۱۶} الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ {۱۷} شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ {۱۸} آل عمران

جواب ترجمہ: (میرے حبیب ﷺ) آپ فرما دیجیے کیا میں تمہیں اس سے بہتر بتادوں ؟ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور بیویاں ہیں پاکیزہ، اور رضامندی ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! بلاشبہ ہم ایمان لائے لہٰذا بخش دے ہمارے گناہوں کو اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا دے۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں اور سچے ہیں، اور حکم ماننے والے ہیں، اور خرچ کرنے والے ہیں اور راتوں کے پچھلے حصوں میں مغفرت طلب کرنے والے ہیں۔ اللہ نے گواہی دی کہ بلاشبہ کوئی معبود نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور اہل علم نے، وہ انصاف کے ساتھ قائم ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ غلبہ والا ہے حکمت والا ہے۔

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذَالِكُمْ: اللہ تعالیٰ نے لذّات دنیا کو بیان کرنے کے بعد انسانوں کو توجہ دلائی کہ یہ عارضی دنیا کی فانی چیزیں ہیں جب کہ آخرت کی دائمی زندگی میں لافانی لذّتیں اور نعمتیں ملیں گی، لیکن وہ لذّتیں اور نعمتیں دنیا کی لذّات اور نعمتوں سے بہت بہتر ہوں گی، دوسرے مقام پر سورۃ الاعلیٰ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ آخرت کی زندگانی دنیا کی زندگانی سے بہترین بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے۔

دنیا کی زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود آزمائشیں ہیں، پریشانیاں ہیں، دکھ ہیں، تکالیف ہیں، رنج والم ہیں، بہار کے بعد خزاں ہے، جوانی کے بعد بڑھاپا ہے، عیش وعشرت کے بعد فقر وفاقہ بھی آسکتا ہے، آج مسرت ہے تو کل کلاں غم والم کے پہاڑ بھی ٹوٹ سکتے ہیں، جب کہ آخرت کی زندگی بہترین ہے اور دنیا کی زندگی سے افضل واعلیٰ بھی ہے، جہاں ان میں سے کوئی امتحان وآزمائش نہیں آئے گی، بندے کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے ایک وقت ماں کے پیٹ میں بھی گزارا ہے، وہاں سے دنیا کے پیٹ میں آیا ہے جو ماں کے پیٹ کے مقابلے میں بہت ہی وسیع، عریض اور بہترین جہان تھا، اسی طرح دنیا کے مقابلے میں آخرت بہت ہی پاکیزہ، صاف ستھرا، وسیع بلکہ بہت ہی وسیع، عریض بلکہ بہت ہی عریض جہان ہے، جو غموں اور تکلیفوں سے بالکل پاک ہوگا، اللہ کا پسندیدہ بندہ نعمتوں اور لذتوں سے سرشار ہوگا۔

دنیا میں جس قدر نعمتیں مل جائیں کہیں نہ کہیں انسان دکھوں سے دوچار ضرور ہوتا ہے، اگر ایک موقع پر نعمت مل گئی تو دوسرے موقع پر وہ چھن بھی سکتی ہے، دنیا کی نعمتیں اور لذتیں نقصانات سے خالی نہیں ہیں، جب کہ آخرت کی نعمتیں یقینی طور پر باقی رہنے والی ہیں، ان پر کبھی زوال نہیں آئے گا، نعمت ملنے کے بعد کبھی چھنے گی نہیں، آسائش کے بعد کبھی تکلیف نہیں ہوگی، جوانی جیسی دولت ملے گی جس پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا، اس لیے آخرت کی نعمتیں اور لذتیں دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے بہت ہی بہتر ہیں، اس آیت میں اسی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔

لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ: تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں، تقویٰ ''وقا اوروقایہ'' سے ہے، اس کا معنیٰ ہے بہت زیادہ حفاظت کرنا، بہت زیادہ بچنا، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متقی لوگوں کا جہاں بھی ذکر فرمایا ہے ان کی مدح وتعریف ہی فرمائی ہے، یہاں بھی متقی لوگوں کی تعریف کی گئی ہے اور تقویٰ اختیار کرنے پر انہیں آخرت میں ملنے والے انعامات کا ذکر کیا گیا ہے، دنیا میں بھی متقی لوگوں کو ملنے والے انعامات اور صلوں میں کمی نہیں ہوتی، لیکن آخرت میں تو جو کچھ انہیں ملے گا وہ کمال ملے گا، متقی وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ کے احکامات کے مطابق عبادات بجالاتا ہے، جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے ان سے رک جاتا ہے، وہ کبائر (بڑے گناہوں) سے تو بچتا ہی بچتا ہے البتہ وہ صغائر (چھوٹے گناہوں) سے بھی کوسوں دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

تقویٰ کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ متقی وہ شخص ہے جو شرک سے بچتا ہے، کیونکہ تقویٰ قرآنی اصطلاح میں ایمان کے ساتھ مختص ہوتا ہے، اللہ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ تقویٰ ان کے لیے لازم کر دیا ہے، جس طرح باقی ممنوعات سے متقی کے لیے بچنا ضروری ہے شرک جیسے اکبر الکبائر (سب سے بڑے گناہ) سے بچنا بھی بہت ضروری ہے، کامل متقی وہی شخص ہے جو شرک وشرکیات سے بچتا ہے، یہاں ساتھ ہی یہ بات بھی ذکر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو شخص متقی ہوگا اسے یہ انعامات آخرت میں ملیں گے، کوئی منافق اور ریاکار کس قدر تصنع وتکلف سے اپنے کو متقی کیوں نہ ظاہر کرے وہ متقی نہیں ہے، وہ ان انعامات کا حقدار و مستحق نہیں ٹھہرایا جائے گا، البتہ مؤمن لوگ اس عظیم ثواب کے حقدار ہوں گے۔

جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: جنات جنت کی جمع ہے، جنت باغ کو کہا جاتا ہے، دنیا کے باغات سے ان باغات کو تشبیہ نہیں دی جاسکتی، جن جنات کا یہاں ذکر ہے یہ متقی اور پرہیز گار لوگوں کو دیے جانے والے صلے اور اجر کی جگہ ہے، جن میں نہریں رواں دواں ہوں گی، کہیں دودھ کی نہریں، کہیں شراب کی نہریں، کہیں پانی کی نہریں، دنیا میں رواں دواں نہروں سے زمین اور شہروں کے حسن وجمال میں بڑا اضافہ دکھائی دیتا ہے، جب کہ جنت کے باغات اور ان میں چلنے والی نہریں تو ہزار ہا گنا اس کے حسن وجمال، دلکشی اور دلربائی میں اضافہ کر رہی ہوں گی، یہاں جنت اور اس کی نہروں کا ذکر ہے لیکن اس کے تحت تمام ہی نعمتیں شامل ہیں، چاہے وہ کھانے پینے کی اشیاء سے متعلق ہوں، بیٹھنے اٹھنے کی نعمتوں سے متعلق ہوں، مجلس آرائی، گاؤ تکیے، حور وغلمان، بیش بہا نعمتوں کی شکل میں ہوں، اس کے حسین وجمیل مناظر والی نعمتیں ہوں، سبھی شامل ہیں، جو لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے انہیں وہاں ہر وہ چیز ملے گی جس کی انہیں طلب ہو گی، سورۃ الزخرف میں ارشاد ہے کہ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ (الزُّخرُف: ۷۱) جس چیز کی ان کے دل خواہش کریں گے وہ انہیں وہاں ملے گی، جس سے ان کی آنکھوں کو لذت ملے گی۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: یہاں یہ بتلایا جارہا ہے کہ اہل جنت کو رہنے کے لیے جنت ملے گی، جنت میں جاری وساری نہریں، بیش بہا نعمتیں ملیں گی، جو کبھی ختم نہیں ہوں گی، وہ ہمیشہ ہمیش ان کے پاس رہیں گی اور ملتی رہیں گی۔

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ: جنت میں اہل جنت کو جہاں بیش بہا نعمتوں سے نوازا جائے گا وہاں انہیں پاکیزہ بیویاں بھی عطا کی جائیں گی، نعمتوں کی برسات ہو، کتنے بڑے درجے کی نعمتیں کیوں نہ مل جائیں، اگر ان میں بیویاں شامل نہ ہوں تو انسان کو لذت حاصل نہیں ہوتی، اسے انس اگر ملنا ہے، پیار ملنا ہے تو بیویوں ہی سے ملنا ہے، اللہ تعالیٰ نے جہاں ان کی تخلیق کے اور مقاصد بیان کیے وہاں ایک مقصد انس حاصل کرنا بھی بیان فرمایا ہے، سب کچھ مل جائے اور بیوی نہ ملے تو سکون نہیں ملتا، جنت میں بیویاں ملیں گی اور پاکیزہ ملیں گی، یہ بیویوں کی ایک ایسی جامع صفت ذکر کی گئی ہے جس میں ان کی ساری خوبیاں بیان کر دی گئی ہیں، اس میں حیض ونفاس سے طہارت وپاکیزگی بھی شامل ہے، ان تمام

حالات کی گندگی سے صفائی اور پاکیزگی بھی شامل ہے جن سے عورتیں گزرتی ہیں، جن سے طبیعت میں نفرت پیدا ہوتی ہے، اس میں برے اخلاق اور شکل وصورت کے اعتبار سے بھی پاکیزگی اور ستھرائی شامل ہے، رہن سہن کی پاکیزگی بھی اس صفت میں شامل ہے۔

وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ: جنت کی بے شمار نعمتیں ہوں گی، ان میں ایک بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی، یہ بھی ان کے لیے ہمیشہ ہمیش رہے گی، اللہ ان سے راضی رہے گا، اس میں اللہ تعالیٰ اہل جنت کی تعریف وثناء کر رہے ہیں، یہ جنت کی لذتوں میں سب سے زیادہ اضافہ کرنے والی نعمت ہوگی اس سے اہل جنت کو بہت زیادہ خوشی، سرور اور شادمانی ملے گی، ارباب حکمت کہتے ہیں کہ جنات سے یہاں جسمانی جنت کی طرف اشارہ ہے، جب کہ رضوان میں روحانی جنت اور اعلیٰ مقامات کی طرف اشارہ ہے، جو کہ روحانی جنت ہے، یہ نور الٰہی کی وہ تجلی ہوگی جو بندے کی روح میں ہوتی ہے، جس کی بدولت بندہ اللہ کی معرفت میں ڈوبا رہتا ہے، ان مقامات میں پہلا مقام اللہ کی رضا ہے، آخری درجہ ان چیزوں کا ہے جو اللہ کے ہاں پسندیدہ ہیں، اسی کی طرف سورۃ الفجر میں اشارہ کیا گیا راضِيَةً مَرْضِيَّةً (الفجر: ۲۸) اس کی مثال قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التَّوْبَة: ۷۲) اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان مردوں اور اہل ایمان عورتوں سے ان جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، جنت عدن میں پاکیزہ رہائش گاہیں ہوں گی، اللہ کی طرف سے بڑی رضا ملے گی، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اللہ کی رضا جنت میں بڑی نعمت ہوگی، حدیث شریف ہے يَسْأَلُ أَهْلَ الْجَنَّةِ هَلْ رَضِيتُمْ؟ فَيَقُولُونَ: مَا لَنَا لَا نَرْضَى يَا رَبِّ وَقَدْ أَعْطَيْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ؟ فَيَقُولُ: أَلَا أُعْطِيكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ؟ فَيَقُولُونَ: يَا رَبِّ وَأَيُّ شَيْءٍ أَفْضَلَ مِنْ ذَالِكَ؟ قَالَ: أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ أَبَدًا (البحر المحیط فی التفسیر) اللہ تعالیٰ اہل جنت سے پوچھیں گے کہ کیا تم راضی ہو؟ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں کیا ہوا کہ ہم راضی نہ ہوں جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا میں تمہیں اس سے

بہتر چیز نہ دوں؟ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! اس سے بہتر کون سی چیز ہے؟ اللہ فرمائیں گے میری رضا تمہیں مل رہی ہے میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گا، جنت میں ملنے والی ساری نعمتیں عالی ہوں گی جب کہ اللہ کی رضا ملے گی تو یہ اعلیٰ نعمت ہو گی، قرآن کریم میں اسی بارے میں فرمایا گیا کہ اللہ کی رضا بہت بڑی چیز ہے۔

وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے، یعنی ان کے مصالح، ان کی منفعتوں کو خوب جانتا ہے، وہ ان کے حالات سے بخوبی آگاہ اور مطلع ہے، وہ انہیں ان کے نیک اعمال کا صلہ اور پھل عطا کرے گا، یہ جملہ وعدہ اور وعید دونوں کو شامل ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بندے اپنے لیے وہ پسند کر لیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آخرت میں نعمت پسند کی ہے، اللہ کی خوشنودی جن چیزوں میں ہے انہیں حاصل کریں، ان چیزوں سے گریز کریں جن سے دنیا میں انہیں دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ: اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ جنت متقی لوگوں کے لیے ہے، تو یہاں ان متقی لوگوں کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، ان صفات کی ابتدا ایمان سے ہوتی ہے، کیونکہ ایمان تقویٰ کی بنیاد ہے، تقویٰ کا سرچشمہ ایمان ہے، پھر اہل تقویٰ کی دعا ذکر کی ہے کہ اہل تقویٰ اپنے رب سے کیا راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں اور کیا عہد و پیمان کرتے ہیں، وہ اپنے حالات اللہ کے سامنے رکھتے جاتے ہیں، سب سے پہلی بات متقی لوگوں کی دعا میں یہ ہوتی ہے کہ وہ ایمان کی گواہی دیتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی چھوٹا بڑا عمل قابل قبول نہیں ہوتا، ایمان کا اکاؤنٹ جس بندے کا کھل جاتا ہے اس کے کھاتے میں ہر چھوٹی اور بڑی نیکی درج ہوتی جاتی ہے، ایمان کا اکاؤنٹ نہیں کھلا ہوا تو دنیا جہان کی نیکیاں سمیٹ لے، جمع کر لے اسے کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔

اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ بھی نظر رحمت ڈالتے ہیں، پھر اہل ایمان متقی اللہ سے عرض کرتے ہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دے، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، یہاں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مغفرت اور بخشش کے لیے ایمان ضروری ہے، ایمان شرط اول، پھر عرض معروض کرتا رہے کہ

ہمارے گناہ معاف کر دیئے جائیں، ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا جائے۔

الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ: حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ "الصابرین" سے وہ قوم مراد ہے جو اللہ کی اطاعت پر صبر کرے اور حرام کاموں سے بچنے پر صبر کرے اور "الصادقین" سے وہ قوم مراد ہے جو اپنی نیتوں میں سچے ہوں اور ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں میں استقامت ہو اور سچ بولیں چھپے ہوئے بھی اور اعلانیہ بھی اور "القانتین" سے مراد ہے اطاعت کرنے والے، طاعت اور ایمان پر ہمیشہ رہنے والے، ہمیشہ عبادات میں منہمک رہنے والے اور الْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ سے مراد ہے نمازی۔ (عبد بن حمید، در منثور)

ایمان کے بعد اہل ایمان اور اہل تقویٰ کی ایسی صفت بیان کی گئی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نفس کے لیے مشکلات، گراں اور تکلیف دہ باتوں پر اپنے آپ کو قابو کرنا یہ ان کی شان ہے، یہ اطاعت کرنے پر جمے رہتے ہیں، یہ حرام کا ارتکاب کرنے سے رکے رہتے ہیں، یہی تقویٰ کا مفہوم ہے، پھر ان کا وہ وصف بیان کیا کہ یہ اپنے عہد و پیمان اور اپنے قول و قرار میں سچے ہیں، یہ جب کہتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں تو سچ ہی کہتے ہیں، یہ ایمان والے ہیں، ان کے دل کی بات ہی زبان پر آتی ہے، ان کے قول و فعل میں یکسانیت ہوتی ہے، تضاد سے خالی ہوتے ہیں، ایمان والا جہاں اللہ کے احکامات ماننے اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے بچنے میں صبر سے کام لیتا ہے، وہاں ایمان والا اپنے مال میں سے اللہ کی رضاجوئی کے لیے وہاں وہاں اپنا مال خرچ کرتا ہے جہاں جہاں اللہ کے دین کو ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنے مال کو اللہ کی دی ہوئی امانت سمجھتا ہے، اللہ کے احکامات کے مطابق اسے جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے اور دل کھول کر خرچ بھی کرتا ہے، انہی لوگوں کی تعریف کی گئی ہے۔

ایمان والے جہاں صبر سے کام لیتے ہیں، جہاں سچ بولتے ہیں، جہاں کھرے ہوتے ہیں، جہاں اللہ کی راہ میں مال لٹاتے ہیں وہاں وہ اپنے گناہوں کی معافی بھی اللہ سے مانگتے ہیں، اول تو گناہ سے بچتے ہیں، انسان ہونے کے ناطے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر معافی و بخشش کی درخواست کرتے ہیں، اگرچہ ایمان والوں کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ توبہ اور استغفار نہ کرتے ہوں لیکن سحر کا یہاں خاص ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ سحر (رات کے آخری پہر) کا وقت ایسا ہے

جس میں قبولیت کی امید زیادہ رکھی جاسکتی ہے۔ حدیث شریف میں اس وقت کی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

فرمایا گیا کہ جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اجلال نزول فرماتے ہیں، اور اعلان کرتے ہیں مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبَ لَهُ؟ مَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيَهُ؟ مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ؟ فَلَا يَزَالُ كَذَلِكَ حَتَّى يَطْلُعَ الْفَجْرُ (البحر المحیط فی التفسیر) کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے؟ تو میں اس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے؟ تو میں اسے عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے استغفار کرے؟ تو میں اسے معاف کروں، یہ اعلان طلوع فجر تک رہتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس آخری پہر کو توبہ اور استغفار کے لیے تلاش کرتے تھے، اس وقت میں توبہ واستغفار کرنا مستحب ہے، اس وقت عبادت وبندگی بجالانا بڑا دشوار کام ہے، لیکن جو لوگ اس وقت کو قیمتی بناتے ہوئے توبہ واستغفار کرتے ہیں تو اس میں قبولیت کی امید رکھی جاسکتی ہے، دل ودماغ اس وقت الجھنوں سے خالی ہوتے ہیں، بدن میں چستی ہوتی ہے، اس وقت میں عبادت کی طرف خوب دل لگتا ہے۔

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ:

آیت کا شان نزول: کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں ظاہر ہوئے تو شام سے دو یہودی عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے جب انہوں نے مدینہ منورہ کو دیکھا تو ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ شہر اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شہر سے کس قدر ملتا جلتا ہے جو آخر زمانہ میں نکلیں گے، جب یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو انہوں نے آپ کو حلیے اور صورت سے پہچان لیا اور کہا آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا جی ہاں، انہوں نے پوچھا کہ آپ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں آپ نے فرمایا ہاں، انہوں نے کہا کہ ہم آپ سے ایک گواہی کے متعلق پوچھتے ہیں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس کی خبر دی تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کریں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پوچھو انہوں نے کہا کتاب اللہ میں سب سے بڑی شہادت کے بارے ہمیں بتلائیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے

سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی (گواہی دیتے ہیں کہ) اس غالب حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، یہ سن کر دونوں شخص آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کی تصدیق کی۔ (اسباب النزول، بحر المحیط، صفوۃ التفاسیر)

حضرت ابن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو وہ گر کر سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ (بحر المحیط فی التفسیر) بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جھگڑا کرنے آئے تھے۔ (بحر المحیط) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے اسلام کا نام چھوڑ کر یہودیت اور نصرانیت کا نام اختیار کیا تھا، (بحر المحیط فی التفسیر) بعض کہتے ہیں انہوں نے جب کہا تھا کہ ہمارا دین تمہارے دین سے افضل اور بہتر ہے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

فرشتوں کا یہاں پہلے ذکر فرمایا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور عجائبات کا بچشم خود نظارہ کرتے ہیں، اولوا العلم سے یہاں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور علماء کرام مراد ہیں، جو اللہ کی توحید و وحدانیت کو قطعی دلائل سے جانتے اور پہچانتے ہیں اور ایمان کی گواہی دیتے ہیں، قائماً بالقسط کا مطلب ہے تمام امور میں وہ عدل قائم کرتے ہیں، آخر میں لا الہ الا ھو تاکید کے لیے لایا گیا کہ معبود حق وہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام العزیز اور الحکیم ذکر کیے گئے ہیں، العزیز کا مطلب ہے کہ وہ غالب ہے اسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا، الحکیم کا مطلب ہے حکمت والا ہے، اس کی کوئی بات حق سے ہٹی ہوئی نہیں ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

دین اسلام کی سچائی

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے نیز بتائیے کہ سچا دین کون سا ہے؟

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ {۱۹} (آل عمران)

جواب ترجمہ: بیشک (سچا) دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آگیا محض ایک دوسرے کی ضد کی وجہ سے، اور جو شخص اللہ کی آیات کا انکار کرے سو اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللهِ الْإِسْلَامُ: عربی زبان میں لفظ دین کے چند معنٰی ہیں، جس میں ایک معنٰی ہیں طریقہ اور روش، قرآن کریم کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لیے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہیں، اور لفظ "شریعت" یا "منہاج" یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ "مذہب" فروعی احکام کے لیے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا (۴۲: ۱۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین جاری فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام کو اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار، روز قیامت اور اس میں حساب کتاب اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لائے ہوئے احکام پر اسی طرح ایمان لانا۔ (معارف القرآن للمفتیؒ)

اَلْإِسْلَامُ: لفظ اسلام کے اصلی معنٰی ہیں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا اور اس کے تابع فرمان ہونا، اس معنٰی کے اعتبار سے ہر نبی و رسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمان برداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے اور ان کا دین دین اسلام تھا۔ (معارف القرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں اسلام کے اصلی معنی سونپ دینے کے ہیں۔ مذہب اسلام کو بھی اسی لحاظ سے اسلام کہا جاتا ہے کہ ایک مسلم اپنے کو ہمہ تن خدائے واحد کے سپرد کر دینے اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دینے کا اقرار کرتا ہے۔ گویا اسلام، انقیاد و تسلیم کا اور مسلمانی حکمبرداری کا دوسرا نام ہوا، یوں تو شروع سے اخیر تک

تمام پیغمبر یہی مذہب اسلام لے کے آئے اور اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوم کو مناسب وقت احکام پہنچا کر طاعت و فرمانبرداری اور خالص خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلاتے رہے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے تمام دنیا کو جو اکمل، جامع ترین، عالمگیر اور ناقابلِ تنسیخ ہدایات دیں، وہ تمام شرائع سابقہ حقہ پر مع شے زائد مشتمل ہونے کی وجہ سے خصوصی رنگ میں اسلام کے نام سے موسوم وملقب ہوئیں۔

بہر حال اس آیت میں نصاریٰ نجران کے سامنے خصوصاً اور تمام اقوام و ملل کے سامنے عموماً اعلان کیا گیا ہے کہ دین ومذہب صرف ایک ہی چیز کا نام ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ بندہ دل وجان سے اپنے کو خداوند قدوس کے سپرد کر دے اور جس وقت جو حکم اس کی طرف سے پائے، بے چون وچرا گردن تسلیم جھکا دے اب جو لوگ خدا کے بیٹے، پوتے تجویز کریں، مسیح و مریم کی تصویروں اور صلیب کی لکڑی کو پوجیں، خنزیر کھائیں، آدمی کو خدا یا خدا کو آدمی بنادیں، انبیاء علیہم السلام و اولیاء کو قتل کر ڈالنا معمولی بات سمجھیں، دین حق کو مٹانے کی ناپاک کوششوں میں لگے رہیں، موسیٰ و مسیح کی بشارات کے موافق جو پیغمبر ان دونوں سے بڑھ کر شان و نشان دکھلاتا ہوا آیا، جان بوجھ کر اس کی تکذیب اور اس کے لائے ہوئے کلام و احکام سے ٹھٹھا کریں، یا جو بیوقوف پتھروں، درختوں، ستاروں اور چاند سورج کے آگے سجدہ کریں اور حلال و حرام کا معیار محض ہوائے نفس کو ٹھہرالیں، کیا ان میں کوئی جماعت اس لائق ہے کہ اپنے کو مسلم اور ملّت ابراہیمی کا پیرو کہہ سکے۔ العیاذ باللہ۔

علامہ عثمانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں کہ اسلام ایک واضح اور روشن چیز ہے، جس قسم کے دلائل سے مُوسیٰ و مسیح کی رسالت یا تورات و انجیل کا کتاب سماوی ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے، اس سے بہتر، مضبوط اور زندہ دلائل محمد ﷺ کی رسالت اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے موجود ہیں، بلکہ خود وہ کتابیں آپ ﷺ کی حقانیت کی شہادت دے رہی ہیں، توحید خالص ایک صاف مضمون ہے جس کے خلاف باپ بیٹے کا نظریہ محض ایک بے معنیٰ چیستاں ہو کر رہ جاتی ہے، جس کی کوئی علمی اُصول تائید نہیں کرتا، اب جو اہل کتاب مخالف اسلام ہو کر ان روشن حقائق کو جھٹلائیں اور حق تعالیٰ کی حکمبرداری سے سرتابی کریں بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ محض ضد، حسد، عناد اور جاہ ومال کی حرص میں ایسا کر

رہے ہیں"۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ: یہ اختلاف کرنے والے کون لوگ تھے؟ اس بارے میں ① ایک تفسیر تو یہ کی گئی ہے کہ ان اختلاف کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں، ان کا اختلاف یہ تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آگیا تو انہوں نے تورات ستر (۷۰) یہودی علماء کے سپرد کر دی، انہیں تورات کا امین بنا دیا تھا، ان کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام خلیفہ بنے، جب ایک زمانے کے بعد دوسرا زمانہ آیا تو ان ستر یہودی علماء کی اولاد نے اختلاف کیا، یہ اختلاف انہوں نے تورات کا علم آجانے کے بعد کیا، اختلاف کی وجہ ان کا باہمی بغض تھا، دنیا کی طلب میں ایک دوسرے کے ساتھ حسد کی وجہ سے یہ اختلاف ان میں رونما ہوا۔ ② دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان اختلاف کرنے والوں سے مراد نصاریٰ ہیں، یہ اختلاف انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا، اس وقت جب انہیں پتہ چل گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔

③ تیسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہیں، ان کا اختلاف یہ ہوا تھا کہ یہودی کہتے تھے حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، نصاریٰ کہتے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، ان دونوں گروہوں نے نبی کریم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا اور یہ کہنے لگے کہ ہم قریش سے زیادہ نبوت کے حقدار ہیں، کیونکہ قریش اُمّی (جنہوں نے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو) ہیں، جب کہ ہم لوگ تو اہل کتاب ہیں۔

④ المقتطف فی عیون التفاسیر میں اس کی ایک عمدہ توجیہ پیش کی گئی ہے، کہ ان سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، انہوں نے جس چیز میں اختلاف کیا وہ اسلام ہے، اس عنوان سے ان کو تعبیر کرنا یہ ان کی زیادہ قباحت بیان کرنے کے لیے ہے، اور کتاب آنے کے بعد اختلاف کرنا تو اور بھی زیادہ قبیح ہے، پھر ان کا دین اسلام کے بارے میں اختلاف یوں تھا کہ ایک گروہ نے کہا کہ دین اسلام سچا ہے، دوسرے گروہ نے کہا کہ دین اسلام تو عربوں کے ساتھ مخصوص ہے، کچھ لوگوں نے اس کی نفی کر دی، انہوں نے توحید میں اختلاف کیا، نصاریٰ نے تین خداؤں کا اعلان کر دیا، یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیا۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ: جو شخص اللہ کی آیات کا انکار کرے گا تو وہ سن لے کہ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کو خبر دار کیا جارہا ہے، جو آیات اللہ کا انکار کرتے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جلد اللہ کے ہاں پیش ہوں گے، وہ ان کا حساب لے گا اور ان کے کفر پر انہیں سزا دے گا، دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کی خبر دے گا، ان کی نافرمانیوں سے انہیں مطلع کرے گا، ان کے کثرت اعمال کے باوجود جلد ہی ان کے برے اعمال کی گنتی ان کے سامنے پیش کرے گا۔

ایک مفہوم یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کے ان مذموم احوال میں مسلمانوں کو خبر دار کیا جارہا ہے، کہ وہ کہیں اہل کتاب جیسے حالات وواقعات سے دوچار نہ ہوں، وہ اختلافی چیزوں میں نہ پڑیں جس طرح وہ پڑ گئے تھے، اگرچہ مسلمانوں میں بہت سی چیزوں میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ یہ علمی اور فروعی اختلافات ہیں، ان کے مابین وہ اختلافات نہیں ہیں جن سے اصول دین ٹوٹ پھوٹ جائیں، بلکہ ان کے اختلافات کی غایت اور انتہا حق تک رسائی ہے، ایک ہی منزل کی سمت تمام آراء کے حاملین رواں دواں ہیں، ان کے اختلافات کا مقصد شریعت مطہرہ کی خدمت کے سوا کچھ نہیں ہے، جب کہ بنی اسرائیل نے اس وقت بچھڑے کی پوجا پاٹ شروع کر دی تھی جب اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے بیچ میں موجود تھے، بہت سی امتوں نے معبودانِ باطلہ کی پوجا کی، نصاریٰ نے حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کی، ان ظالموں نے اللہ کی توحید کے اصول وضابطے توڑے، انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ خالق نے مخلوق کے اندر حلول کیا ہوا ہے، ان کے برعکس ایک بار جب مسلمانوں میں کسی نے حلول کا اعلان کیا تو مسلمانوں نے اسے قابل گردن زدنی قرار دیا تھا۔ (التحریر والتنویر)

مخالفین اسلام پر اِتمام حجت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ

أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ {۲۰} آل عمران

جواب ترجمہ: پھر اگر وہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرما دیجیے کہ میں نے اپنے آپ کو اللہ کا حکم ماننے میں لگا دیا اور ان لوگوں نے بھی جنہوں نے میری پیروی کی ااور جن لوگوں کو کتاب دی گئی آپ ان سے اور اَن پڑھوں سے کہہ دیجیے کیا تم اللہ کا حکم مانتے ہو؟ پس اگر وہ حکم مانیں تو انہوں نے راہ پالی، اور اگر وہ منہ پھیریں تو آپ کے ذمہ پس پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہل کتاب نے علم آجانے کے بعد اختلاف کیا ہے، انہوں نے کفر پر اصرار کیا ہے باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کے لیے وہ کچھ واضح کر دیا جو وہ لوگ اپنے مباحثوں میں کہتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ سے بحث مباحثہ کریں تو آپ ﷺ انہیں فرمادیں کہ میں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے تابع فرمان کر دیا ہے، میرے پیروکاروں نے بھی اپنے آپ کو اللہ کے زیر فرمان کر دیا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کلام کو وارد کرنے کے دو طریقے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ یہ کلام بحث مباحثہ سے اعراض وروگردانی ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اس آیت کے نزول سے پہلے اپنی سچائی اور صداقت کے دلائل ظاہر فرمائے، ایک بار نہیں کئی بار ظاہر فرمائے، وہ اس طرح کہ یہ سورت مدنی ہے، آپ ﷺ نے قرآنی معجزات دکھائے، درخت کو آپ نے بلایا، بھیڑیے سے کلام کیا، اس کے علاوہ بھی معجزات دکھائے، اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ دلیل ذکر کی کہ اللہ حیّ اور قیّوم ہے، یہ نصاریٰ کے اس قول کے جواب میں فرمایا جس میں وہ عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ (معبود) ماننے کی بات کرتے تھے، پھر اللہ نے یہ آیت اُتاری کہ ہم نے آپ ﷺ پر حق کے ساتھ کتاب اُتاری ہے، یہ آپ ﷺ کی صحت نبوت پر دلیل تھی، نصاریٰ نے جو جو شبہات پیش کیے ان کے جوابات کامل طریقے سے دیے گئے۔

پھر ان کے لیے دوسرے معجزات پیش کیے گئے، یہ معجزات انہوں نے میدان بدر میں دیکھ لیے، جب دو گروہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے، پھر قول توحید کی صداقت بیان کر کے اللہ

تعالیٰ کے مقابلے میں آنے والوں کی نفی کی، اللہ کے شریک کی نفی کی، اللہ کی بیوی ہونے کی نفی کی، اللہ کا بیٹا ہونے کی نفی کی، واضح کیا کہ اللہ ہی الٰہ (معبود) ہے، پھر واضح کیا گیا کہ نصاریٰ دین سے ہٹ چکے ہیں انہوں نے دین میں اختلاف کیا ہے، یہ اختلاف کوئی دلائل اور اصول کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ یہ ان کی سرکشی اور حسد کی بنیاد پر تھا، یہی وہ چیزیں تھیں جو انہیں حق سچ کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور دلائل پر غور و فکر نہیں کرنے دیتی تھیں۔

اگر یہ لوگ مخلص ہوتے تو سمجھ جاتے کہ اب کوئی دلیل ایسی نہیں بچی جو ہم پر کارگر نہ ہو، مگر وہ لوگ ان دلائل سے دور بھاگے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ ﷺ سے بحث مباحثہ کریں، جھگڑا کریں تو آپ ﷺ انہیں واضح کر دیں کہ میں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے، میرے پیروکاروں نے بھی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے، یعنی ہم لوگ تو دلائل کے ثبوت تک پہنچ چکے، ہم تو دلائل کی وضاحت جان چکے، اگر تم لوگ ان باتوں کو اپنی اَنا اور حسد کی بھینٹ نہ چڑھاتے تو تم بھی راہ راست پر آجاتے، اگر تم لوگ روگردانی کر رہے ہو تو اس کی سزا تمہیں اللہ تعالیٰ دے گا۔

جب کوئی حق کا نمائندہ باطل والوں میں پھنس جائے تو وہ اپنے حق و سچ ہونے پر دلائل پر دلائل پیش کرتا ہے، مختلف دلائل سے فریق مخالف کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، بالآخر وہ پکار اٹھتا ہے کہ میں تو حق کو تسلیم کرتا ہوں، اللہ کی عبودیت پر سر تسلیم خم کرتا ہوں، اگر تم لوگ اتفاق کرتے ہوئے حق کی پیروی کرو گے تو تم بھی ہدایت پا جاؤ گے، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے گھات لگائے ہوئے ہے وہ تمہیں دیکھ لے گا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے دوسرے طریقے کی پانچ تعبیرات پیش فرمائی ہیں، پہلی وجہ: جو لوگ پیدا کرنے والے کے وجود کا اقرار کرتے ہیں، اسے ہی مستحق عبادت سمجھتے ہیں، گویا آپ ﷺ لوگوں سے یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اس بات پر تو سب لوگ متفق ہیں، اس لیے جس چیز پر سب کا اتفاق ہے میں اس متفق علیہ چیز کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں، مخلوق کو بھی اسی کو مضبوطی سے تھامنے کی دعوت دے رہا ہوں، جن چیزوں میں اختلاف ہے وہ اس کے علاوہ ہیں، تم جب ان چیزوں کے

دعویدار ہو تو ان کا ثبوت بھی تمہارے ذمہ ہے، یہود تشبیہ اور جسمانیت کے دعویدار ہیں، نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت کے دعویدار ہیں، مشرکین بتوں کے معبود ہونے کے دعویدار ہیں، جب یہ لوگ ان چیزوں کے دعویدار ہیں تو ان چیزوں کا ثبوت بھی انہی کے ذمہ ہے، لیکن میں تو اللہ کی اطاعت کو ضروری سمجھتا ہوں، میں تو اسی کی عبودیت و بندگی کو ضروری خیال کرتا ہوں، اتنی بات پر اتفاق ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم میں اشارہ موجود ہے کہ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً (آلِ عِمْرَانَ: ٦٤) اے اہل کتاب! آجاؤ اس بات کی طرف جس میں ہمارے اور تمہارے درمیان اتفاق ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں۔

دوسری وجہ استدلال کی کیفیت ہے، جسے ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور بت پرست حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعظیم کا اقرار کرتے ہیں، وہ انہیں ان کے قول و دین میں سچا مانتے اور جانتے ہیں، مگر کچھ شرعی باتوں اور احکامات میں وہ ایسا نہیں مانتے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ملت ابراہیمی کی پیروی کریں، ارشاد ہے ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً (النَّحل:١٢٣) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ملت ابراہیم کی اتباع کیجیے جو سب کو چھوڑ کر ایک طرف ہو رہے تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے، پھر یہاں اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ یوں کہیں جیسے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّماواتِ وَالْأَرْضَ (الْأَنْعَامِ: ٧٩) میں نے اپنے آپ کو اس ذات کی طرف متوجہ کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے، تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہاں کہلوایا گیا کہ میں نے اپنے آپ کو سپرد کیا جیسے ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو متوجہ کیا اللہ کی طرف، اللہ کی ذات کے سوا ہر طرف سے منہ موڑ لیا ہے، میں نے اسی کی عبادت کا ارادہ کیا ہے، میں نے اسی کے لیے اپنے آپ کو خالص کیا ہے، یہاں تقدیر عبارت یوں ہو گی کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ لوگ ان تفاصیل میں اختلافات کریں تو آپ انہیں کہہ دیجیے کہ میں تو ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں، تم لوگ اس بات کا اعتراف کرتے ہو کہ ان کا

راستہ حق ہے، ہر شبہے اور تہمت سے دور ہے، یہ طریقہ کار تمسک بالالزامات کے باب سے ہے اور یہ اس آیت مبارکہ کے تحت آتا ہے کہ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النَّحْلِ: ۱۲۵) آپ ان لوگوں سے اچھے طریقے سے جھگڑا کریں۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تیسرے استدلال کی تعبیر میرے دل پر اس وقت کھٹکی جب میں اس مقام پہ لکھ رہا تھا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے پہلی آیت میں دعویٰ کیا تھا کہ اللہ کے نزدیک سچا دین اسلام ہے، کوئی اور نہیں ہے، اس کے باوجود اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں، کٹ حجتی کریں، بحث مباحثہ کریں، دین اسلام کی صداقت پر کوئی نزاع کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما دیجیے کہ اس پر دلیل یہی ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اپنے اللہ کے سپرد کیا ہے، کیونکہ دین سے مقصود اور مطلوب یہی ہے کہ لوازم ربوبیت کے ساتھ وفاداری کی جائے، جب میں نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے تو میں اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کروں گا، میں اس کی ذات کے سوا کسی سے خیر کی امید اور توقع نہیں رکھوں گا، میں تو اسی کے قہر و سطوت سے خوف زدہ ہوں، میں اس کا کسی کو شریک و سہیم نہیں ٹھہراؤں گا، یہی عبودیت اور ربوبیت کے لوازم کے ساتھ وفاداری نبھانا ہے، تو یہ بات بالکل درست ہو گئی کہ دین کامل و اکمل دین اسلام ہی ہے اور یہی بات اس آیت کے مناسب لگتی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چوتھی بات جو میرے دل پر مچلتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مناسب ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئاً (مَرْيَمَ: ۴۲) آپ ان کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو سنتے نہیں اور دیکھتے نہیں اور تمہیں کچھ بھی کام آنے والے نہیں ہیں، یعنی عبادت اسی کے لیے جائز ہے جو نفع دینے والا اور نقصان دینے والا ہو، میرا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہے، میرا حکم اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، جب سارے لوگ جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان چیزوں پر قادر نہیں ہیں تو عقل اس بات کے راستے میں رکاوٹ ہے کہ میں اپنے آپ کو ان کے سپرد کروں اور ان کی تابعداری کروں، میں تو اپنے آپ کو اسی ذات کے سپرد کروں گا جو سرچشمہ خیر و شر، نافع اور ضار

ہے، تدبیر اور تقدیر جس کے ہاتھ میں ہے۔ (تفسیر کبیر تفسیر سورۃ آل عمران)

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّيْنَ أَأَسْلَمْتُمْ: یہ آیت دین محمدی کے تمام مخالفین سے مخاطب ہے، چاہے وہ اہل کتاب ہوں، خواہ وہ اس دعویٰ کو حق سمجھتے ہوں جیسے یہود و نصاریٰ یا اس دعویٰ کو جھٹلاتے ہوں جیسے مجوسی، ان میں سے کچھ وہ بھی اس کے مخاطب ہیں جو اہل کتاب نہیں ہیں جیسے بت پرست، یہاں عرب کے مشرکوں کی تعریف اُمّیون کے ساتھ کی گئی ہے، اس کی دو وجوہات ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ نہیں مانتے، اس لیے ان کے اُمّی ہونے کا وصف بیان کیا گیا ہے، انہیں ان لوگوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو لکھتے اور پڑھتے نہیں ہیں، دوسری وجہ یہ ہے اُمّیون ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو لکھنے پڑھنے والے لوگوں میں سے نہیں ہیں، یہ صفت ان کے عام لوگوں میں پائی جاتی تھی، اگر ان میں کوئی لکھنے پڑھنے والا تھا تو بہت ہی کم تھا۔

أَأَسْلَمْتُمْ: کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ یہ اُسلوب دھمکی اور دعوت دونوں پر مشتمل ہے بلکہ فی الجملہ اس سے بیزاری کا بھی اظہار ہو رہا ہے یعنی تم بھی اسلام لانا چاہتے ہو تو لاؤ، ہم اپنا وقت اب تمہارے ساتھ مناظرہ بازی میں ضائع کرنا نہیں چاہتے، ہم نے تو اپنی راہ اختیار کر لی ہے، اب اپنی منزل کھوٹی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ (تدبر قرآن)

فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا: اگر یہ لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں، اسلامی پرچم تھام لیتے ہیں، اسلام کے ساتھ جڑ جاتے ہیں تو یہ راہ راست پر آجائیں گے، منسوخ ادیان کو چھوڑ کر دین حق کے دامن عافیت میں آجاتے ہیں تو ہدایت پر آجائیں گے، پھر یہ لوگ چاہِ ضلالت سے ہدایت کے دامن میں آجائیں گے، اندھیروں سے روشنی میں آجائیں گے، جب ہدایت پر آجائیں گے تو کامیابی و کامرانی ان کا مقدر بن جائے گی، آخرت میں کامران ٹھہریں گے۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ: اگر یہ لوگ دین اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی اتباع اور پیروی سے روگردانی کرتے ہیں تو اس میں نبی کریم ﷺ کا کوئی نقصان نہیں ہے، آپ کی ذمہ داری تو صرف دین پہنچانے کی ہے، ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ آپ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کیونکہ آپ ﷺ اس پر بہت کڑھتے تھے کہ لوگ ہدایت پر کیوں نہیں آتے، آپ کو فرمایا گیا کہ آپ پیغام

پہنچانے کے مکلف ہیں، دلائل پیش کرنا آپ ﷺ کا کام تھا، حجت تمام کرنا آپ کا مشن تھا، جو کچھ آپ کے سپرد کر دیا گیا اسے آپ نے پہنچا دیا تو آپ نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے آپ کے ذمہ یہ نہیں ہے کہ یہ اسے قبول بھی کر لیں، دوسرے مقام پر اسی پر فرمایا کہ آپ ﷺ ان پر داروغہ نہیں۔

وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ: اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو جانتے ہیں، اللہ ان کے کیے کی انہیں جزا اور سزا دیں گے، اس میں وعدہ اور وعید دونوں پائے جاتے ہیں۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور علماء کرام کے قاتل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ {۲۱} أُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ {۲۲} آل عمران

جواب ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور ناحق نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں سو ان کو آپ دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے اور ان کی کوئی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔

پچھلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا تھا جو اسلام قبول کرنے سے روگردانی کرنے والے تھے، یہاں ان منکرین کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں، ایک وہ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، دوسرے وہ جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے ہیں، تیسرے وہ جو علماء کرام کو ناحق قتل کرتے ہیں، انہیں دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، ان کی دونوں جہان میں ناکامی کی اطلاع دی گئی ہے، ان کی نامرادی کی یوں اطلاع دی گئی کہ ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی خبر دی ہے، عظیم ترین جرائم کے مرتکب ہیں، اس سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ کی ان آیات کا انکار کیا جائے جو اس حق کا

قطعی ثبوت پیش کرتی ہیں، جس کا انکار کرنے والا انتہائی درجے کے کفر وعناد میں مبتلا ہے۔(سعدی)
اس آیت شریفہ میں وعید ہے تمام کافروں کے لیے جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں جن میں یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں۔(انوار البیان)

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ: یہ ظالم وہ ہیں جنہوں نے نبیوں کا ناحق قتل کیا، انصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کیا، بغیر حق "یعنی خود قاتلوں کے بھی آئین، قانون وضابطہ کے خلاف، ورنہ قتل انبیاء علیہم السلام فی الحقیقت اور عند اللہ تو ہمیشہ ہی ناحق رہے گا۔(تفسیر ماجدی)

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ قیامت کے دن کن لوگوں کو سب سے زیادہ عذاب ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے نبی کو قتل کیا یا نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے کو قتل کیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: بیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے ہیں اور عدل و انصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کرتے ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوعبیدہ! قَتَلَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ ثَلَاثَةً وَأَرْبَعِينَ نَبِيًّا مِنْ أَوَّلِ النَّهَارِ فِي سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ، فَقَامَ مِائَةُ رَجُلٍ وَاثْنَا عَشَرَ رَجُلًا مِنْ عُبَّادِ بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَأَمَرُوا مَنْ قَتَلَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ فَقُتِلُوا جَمِيعًا مِنْ آخِرِ النَّهَارِ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ بنو اسرائیل نے صبح کے اول وقت میں تینتالیس نبیوں کو قتل کر دیا تو بنو اسرائیل کے ایک سو بارہ عبادت گزار علماء کھڑے ہوئے انہوں نے ان کو نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا تو بنو اسرائیل نے اس دن کے آخری حصہ میں ان سب کو قتل کر دیا۔(کبیر) یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ہے، اسی طرح وہ لوگ بھی اس میں شامل ہیں جنہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بارہ حواریوں کے ساتھ یحییٰ علیہ السلام کو بھیجا کہ وہ لوگوں کو (دین) سکھائیں وہ بھائی کی بیٹی (یعنی بھتیجی) سے نکاح کرنے کو روکتے تھے اور بادشاہ کو اپنی بھتیجی اچھی لگتی تھی، اس نے اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا اور ہر دن بادشاہ لڑکی کی جو بھی

حاجت ہوتی تھی پوری کرتا تھا اس لڑکی کی ماں نے کہا جب وہ تجھ سے تیری حاجت کے بارے میں پوچھے تو تو کہنا کہ میری حاجت یہ ہے کہ تو یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کر دے، بادشاہ نے کہا اس کے علاوہ اور سوال کر، اس نے کہا اس کے علاوہ میں اور سوال نہیں کرتی جب اس لڑکی نے انکار کیا تو بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم دے دیا اور ان کو ایک طشت میں ذبح کر دیا گیا، ایک قطرہ اس کے خون میں جلدی نکلا اور وہ برابر جوش مارتا رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو بھیجا، ایک بڑھیا نے اس کو یہ سارا واقعہ سنایا تو بخت نصر نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ برابر (یعنی لگاتار) قتل کرتا رہے گا یہاں تک کہ یہ خون جوش مارنا چھوڑ دے، تو اس نے ایک ہی دن میں ایک ہی ضرب سے اور ایک ہی برچھے سے ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر دیا یہاں تک کہ وہ خون ٹھہر گیا۔ (من عاش بعد الموت، لابن ابی الدنیا، تفسیر در منثور للسیوطی)

ابن المنذر نے معقل بن ابی مسکین رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس وحی آئی تھی تو انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کرتے تھے کوئی کتاب لے آتا تو اسے قتل کر دیتے تھے پھر وہ آدمی کھڑے ہوئے جنہوں نے ان کا اتباع کیا اور ان کی تصدیق کی انہوں نے بھی اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کی تو وہ بھی قتل کر دیئے گئے یہ یہی لوگ تھے جو لوگوں کو انصاف کے ساتھ حکم کیا کرتے تھے۔ (تفسیر در منثور)

سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بنو اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کے زمانہ میں لوگ بہت زیادہ قحط زدہ ہو گئے بادشاہ نے کہا کہ (اللہ تعالیٰ) ہم پر ضرور بارش بھیج دیں گے یا ہم ضرور اس کو تکلیف دیں گے، اس کے پاس بیٹھنے والوں نے کہا تو کس طرح اللہ تعالیٰ کو تکلیف دے گا یا اس پر ناراضگی کا اظہار کرے گا حالانکہ وہ تو آسمان میں ہے؟ اس نے کہا میں زمین والوں میں سے اس کے دوستوں کو قتل کروں گا تو اس کو تکلیف ہو گی، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے بارش بھیج دی۔ (ابن منذر بحوالہ تفسیر در منثور للسیوطی)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بری قوم وہ قوم ہے جو ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں اور کتنی بری ہے وہ

قوم جو نیکی کا حکم نہیں دیتے اور برائی سے منع نہیں کرتے اور کتنی بری قوم ہے وہ جس میں بندہ مومن احتیاط اور پرہیز کے ساتھ چلتا ہے۔ (الفردوس بماثور الخطاب، تفسیر قرطبی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا سابقہ امتوں میں واجب تھا اور یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی خلافت ہے، حسن رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے نیکی کا حکم دیا یا برائی سے روکا تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے (کنز العمال، تفسیر قرطبی)

درّہ بنت ابی لہب نے بیان کیا ہے ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے تو اس نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (وہ) جس نے انہیں نیکی کا حکم دیا اور انہیں برائی سے منع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لیے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب انہیں جمع اور اکٹھا کیا (مسند احمد، تفسیر قرطبی)

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ: فرمایا انبیاء علیہم السلام کے قاتلوں اور حق و انصاف کے دشمنوں کے متعلق حکم یہ ہے، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے، یہاں پر خوشخبری کا لفظ تھکم کے طور پر آیا ہے مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر واضح کر دیجئے کہ تمہارا انجام دنیا میں بھی برا ہو گا، ایسے لوگ دنیا میں گھاس پھونس کی طرح کاٹ دیے جاتے ہیں، ظالم سمجھتا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسل دنیا میں قائم رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا ہے، یزید کا واقعہ آپ کے سامنے ہے، وہ خاندان سادات کا مکمل خاتمہ چاہتا تھا، صرف ایک فرد بیمار ہو جانے کی وجہ سے بچ گیا، ورنہ وہ بھی تلوار کی زد میں تھا، آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک فرد سے امام حسین رضی اللہ عنہ کی نسل کو کس طرح چلایا، آج جگہ جگہ حسینی موجود ہیں، بر خلاف اس کے یزید کے پندرہ ربیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا آگے کوئی نسل نہ چل سکی۔ خود بائبل میں لکھا ہے کہ اہل بابل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ختم کرنا چاہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیم! لوگ تجھے مٹانا چاہتے ہیں، مگر میں تیری اولاد کو ریت کے ذرّات

سے زیادہ پھیلاؤں گا، ظالم کچھ چاہتا ہے مگر اللہ کی مشیّت کچھ اور ہوتی ہے، اسی لیے فرمایا ظالموں کی سزا دردناک عذاب ہے۔ (تفسیر معالم العرفان)

أُولَئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ: یہ لوگ جو اس قبیح اور بری حرکت کے ساتھ متصف ہیں، منکرین آیات ہیں، قاتلین انبیاء علیہم السلام ہیں، قاتلین علماء ہیں، ان کے اعمال خواہ وہ اچھے اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں سب برباد ہو گئے، دنیا میں کیا کرایا کچھ کام نہیں آئے گا، آخرت میں بدرجہ اَولیٰ کام نہیں آئے گا، نہ ہی ان کا کوئی حمایتی اور مددگار ہو گا جو انہیں جہنم کی دھکتی آگ کی لپٹ سے بچا سکے گا، سب کچھ غارت ہو گیا، ان لوگوں کے سارے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت چلے گئے، دنیا میں ان کے جان و مال محفوظ نہ رہے اور کسی طرح کی مدح اور تعریف کے مستحق نہ ہوئے اور آخرت میں بھی ان کے اعمال نے کچھ کام نہ دیا کیونکہ ان اعمال کا کوئی ثواب نہ ملا اور ان کے اعمال عذاب دفع کرنے کا ذریعہ نہ بن سکے، آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا جو کسی طرح کی مدد یا سفارش کر سکے۔ (انوار البیان)

یہودیوں کی تورات سے روگردانی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ {۲۳} ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ {۲۴} فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ {۲۵} آل عمران

جواب ترجمہ: اے مخاطب کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر ان میں سے ایک فریق اعراض کرتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ ہرگز ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند گنے چنے دنوں میں، اور ان کو دھوکے میں ڈال دیا ان کے دین کے بارے میں اس چیز نے جس کو وہ افترا کرتے تھے۔ پس کیا حال ہو گا جب ہم ان کو جمع کریں گے اس دن جس میں کوئی شک نہیں،

اور ہر جان کو اس عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کیا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ: اس سے پہلے یہودیوں کے ابتدائی عناد کو بیان کیا گیا تھا، جب کہ یہاں ان کے انتہائی عناد کو بیان کیا گیا کہ جن لوگوں کو کتاب دی گئی جب انہیں کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو سرکشی، تمرد اور عناد ظاہر کرتے ہیں، یہاں سارے اہل کتاب مراد نہیں ہیں، کیونکہ اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں انصاف پر رہنے والے کہا گیا، دن رات آیات کی تلاوت کرنے والے قرار دیے گئے، یہاں ضدی وعنادی یہودیوں کا ذکر کیا گیا ہے، یہاں کتاب کا حصہ دیے جانے کا جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا وہ یہودی علماء تھے، جنہیں تورات کی طرف آنے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

شان نزول: اس آیت کے شان نزول کے بارے میں کچھ اختلاف پایا گیا ہے، ① سدی کہتے ہیں کہ نبی نے یہود کو اسلام کی دعوت دی تو نعمان بن اوفی نے آپ ﷺ سے کہا آجاؤ اے محمد ہم اپنے جھگڑے کو احبار (یہودی علماء) کے پاس لے کر جاتے ہیں اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ کتاب اللہ کو فیصل بناتے ہیں، اس نے پھر کہا کہ احبار کی طرف جھگڑا لے کر جاتے ہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (اسباب النزول للنیشاپوری)۔

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ یہود کی تعلیم گاہ میں ان کی ایک جماعت کے پاس آئے اور آپ ﷺ نے انہیں اللہ کی طرف بلایا تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید کہنے لگا کہ اے محمد! تم کس دین پر ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں انہوں نے کہا وہ تو یہودی تھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آؤ تورات میں دیکھ لیں یہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی، انہوں نے انکار کر دیا اس موقع پر اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ (الجامع لاحکام القرآن)

③ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہودیوں میں سے ایک مرد اور عورت نے زنا کیا، یہ دونوں معزز لوگ تھے، یہودیوں کی کتاب میں ان کی سزا رجم (سنگ سار کرنا) تھی، وہ لوگ انہیں ان کے معزز ہونے کی وجہ سے رجم (سنگسار) کرنا ناپسند کرتے تھے، اس سلسلہ میں وہ نبی

کریم ﷺ کے پاس ایک امید لے کر آئے کہ آپ ﷺ کے پاس رجم کو چھوڑنے کی کوئی رخصت مل جائے گی، آپ ﷺ نے رجم کرنے کا حکم دے دیا، انہوں نے اس کا انکار کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے اور تمہارے درمیان تورات پر فیصلہ ہو گا، کیونکہ تورات میں ان کی سزا رجم (سنگسار کرنا) ہے، آپ ﷺ نے پوچھا تم میں کون بڑا عالم ہے؟ انہوں نے کہا کہ عبد اللہ بن صوریا فدکی، چنانچہ وہ انہیں لائے، انہوں نے تورات بھی پیش کی، جب رجم کی آیت پر پہنچے تو اس نے رجم والی آیت پر ہاتھ رکھ دیا، حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا یا رسول اللہ! رجم کی آیت چھوڑ گیا ہے، جب اس کی ہتھیلی وہاں سے ہٹائی تو انہوں نے رجم کی آیت دیکھ لی، پھر آپ ﷺ نے ان دونوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں سنگسار کیا جائے، اس پر یہودیوں کو غصہ آگیا، اس پر یہ آیت نازل کی گئی۔ (تفسیر کبیر)

④ نبی کریم ﷺ کی بعثت کی نشانیاں تورات میں موجود تھیں، آپ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایسے دلائل تھے جو آپ ﷺ کی رسالت کے صحیح ہونے کا پتہ دیتے تھے، نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کو تورات کی طرف آنے کی دعوت دی، اپنی نبوت پر دلالت کرنے والی ان آیات کی طرف آنے کی دعوت دی، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (کبیر)

يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ: یہاں یہودیوں کے پاس موجود کتاب کو "کتاب اللہ" کہا گیا، جو تورات کی عظمت شان پر دلالت ہے، کیونکہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے، اشارہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے، اس لیے اس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، تاکہ آپ ﷺ ان کے درمیان فیصلہ کریں، یہاں اسی قضیہ کے فیصلہ کی طرف اشارہ ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے تورات کے حکم کی روشنی میں خیبر کے مرد اور عورت پر سنگساری کا حکم دیا تھا جب انہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا، یہودی اپنی کتاب چھوڑ کر نبی کریم ﷺ سے اس فیصلے میں نرمی کرنے کی امید لگائے ہوئے تھے، اسی لیے وہ اس قضیہ کو حضور ﷺ کے پاس لائے تھے، حضور ﷺ نے یہودی علماء کی مزاحمت پر تورات کو فیصل قرار دے کر اس کے مطابق

رجم کا حکم جاری کیا تھا، جس کا ان لوگوں نے انکار کر دیا تھا، ایک گروہ نے تورات میں واضح طور پر زنا کی سزا رجم دیکھ کر اعراض اور روگردانی کی تھی، انہی کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ان کی دیدہ دلیری ہے، یہ حق بات دیکھ کر بھی روگردانی کرتے ہیں۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ: یہودی اس قدر جرأت اور جسارت کیونکر کرتے تھے؟ کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجی گئی کتاب کا انکار کر دیں، اس کو پیش کیا جائے تو روگردانی کریں، حکم ماننے سے انکار کر دیں، اس کی وجہ اور سبب یہاں بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے ہمیں چند دن دوزخ کی آگ نے چھونا ہے پھر ہمیں جہنم سے رہائی مل جائے گی، یہ یہودیوں کو بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی، وہ اپنے گمان کے مطابق اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا اور اللہ کا دوست قرار دیتے تھے، اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہمیں دوزخ کی آگ زیادہ دیر نہیں جلائے گی، پھر ان کا یہ باطل خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی اولاد کو نہیں جلائے گا۔ (المقتطف)

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ: یہودیوں کو دھوکہ کیا لگا تھا، ایک دھوکہ تو یہی تھا کہ انہیں دوزخ کی آگ زیادہ عرصہ نہیں جلائے گی، دوسرا دھوکہ یہ لگ گیا تھا کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں، اللہ اپنے بیٹوں اور دوستوں کو دوزخ میں نہیں جلائے گا، تیسرا دھوکہ انہیں یہ لگ گیا تھا کہ آپ لوگ باطل پر ہیں اور ہم حق پر ہیں۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ: یہودی جس خوش فہمی میں مبتلا تھے اس پر انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جب قیامت کے دن انہیں میدان محشر میں لایا جائے گا تو ان کی صورتیں کیسی ہوں گے، ان کے حالات کیسے ہوں گے؟ یہاں ان کی خود ساختہ خوش گمانیوں کی قلعی کھولی جا رہی ہے، ان کا لاڈلا پن دور کیا جا رہا ہے، لِيَوْمٍ سے مراد قیامت کا دن ہے، جس دن ہر شخص کو اس کے کیے کا حساب دینا پڑے گا، گناہگاروں کو سزا اور نیکو کاروں کو جزا ملے گی، اس دن کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے، یہودیوں کو علی رؤس الاشہاد اللہ تعالیٰ وہاں ذلیل کرے گا، ذلت کا طوق یہودیوں کو دنیا میں بھی پہنایا گیا ہے، آخرت میں رسوائی والا عذاب دیا جائے گا، کسی کے ساتھ وہاں زیادتی نہیں کی جائے گی۔

اللہ جسے چاہے بادشاہی دے جس سے چاہے چھین لے

سوال آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۲۶} تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ {۲۷} آل عمران.

جواب ترجمہ: آپ فرما دیجیے اے اللہ! اے تمام جہان کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دے جس سے چاہے بادشاہت چھین لے تو جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ میں سب بھلائیاں ہیں بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور تو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو جس کو چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

شان نزول: ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ افْتَتَحَ مَكَّةَ وَعَدَ أُمَّتَهُ مُلْكَ فَارِسٍ وَالرُّومِ فَقَالَ الْمُنَافِقُونَ وَالْيَهُودُ: هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ مِن أَيْنَ لِمُحَمَّدٍ مُلْكَ فَارِسٍ وَالرُّومِ؟ هُمْ أَعَزُّ وَأَمْنَعُ مِن ذٰلِكَ فَنَزَلَتِ الْآيَةُ. جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا اور اپنی امت سے ملک فارس اور روم کی فتح کا وعدہ فرمایا تو منافقین اور یہود کہنے لگے بہت دور ہے بہت دور ہے محمد کے لیے ملک فارس اور روم کہاں مقدور ہے؟ وہ ان کے قبضہ میں آنے سے بہت بلند تر ہے کیا محمد کو مکہ اور مدینہ کافی نہیں ہوا کہ روم اور فارس میں طمع کرنے لگے؟ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول، سیوطی، تفسیر طبری، قرطبی، تفسیر کبیر)

② اور ایک روایت یہ ہے کہ جب غزوہ احزاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے نشان لگائے اور ہر دس آدمیوں کی جماعت کو چالیس ہاتھ خندق کھودنے کا حکم دیا تو خندق کھودتے ہوئے ایک چٹان آگئی جو کسی کدال اور پھاوڑے سے نہ ٹوٹتی تھی، تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت سلمان فارسی

رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور انہوں نے آکر آپ کو بتایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے کدال لے کر چٹان پر ایک ضرب لگائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرب سے چنگاریاں اُڑیں اور اندھیری رات میں بجلی کی طرح روشنی پیدا ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعرہ تکبیر بلند کیا مسلمانوں نے بھی بلند آواز سے اللہ اکبر کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس روشنی میں مجھے حیرہ کے محلات نظر آئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری ضرب لگائی تو فرمایا کہ اس کی روشنی میں مجھے روم کے محلات نظر آئے، پھر تیسری ضرب لگائی تو فرمایا اس روشنی میں مجھے صنعاء کے محلات نظر آئے اور أَخْبَرَنِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنَّ أُمَّتِي ظَاهِرَةٌ عَلَى كُلِّهَا فَأَبْشِرُوا مجھے حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر خبر دی کہ میری امت ان تمام ملکوں پر قابض اور غالب ہو گی سو تمہیں خوش خبری ہو، یہ سن کر منافقوں نے کہا تم کو اپنے نبی پر تعجب نہیں ہوتا وہ تم سے جھوٹے وعدے کرتا ہے اور وہ تمہیں خبر دیتا ہے کہ وہ یثرب سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات کو دیکھ رہا ہے اور وہ ملک تمہارے لیے فتح ہوں گے حالانکہ تم مارے خوف کے خندقیں کھود رہے ہو اور تم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ ان خندقوں سے باہر نکل کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکو تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر)

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ: حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کریں کہ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فارس اور روم کے ملکوں پر غلبہ عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ کا یہ حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی یہ دعا قبول فرمائے گا اور انبیاء علیہم السلام کے مقامات اسی طرح ہیں، انہیں جب کسی دعا کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ دعا قبول کی جاتی ہے۔ (تفسیر کبیر) س حدیث میں آپ کے کئی معجزات کا بیان ہے جو چٹان کسی سے نہ ٹوٹتی تھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ضرب سے ٹوٹ کر بکھر گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ضرب سے پیدا ہونے والی چمک میں دور دراز ملکوں کے محلات دیکھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو روم اور فارس پر فتح کی جو بشارت دی تھی وہ پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مستجاب فرمائی۔ (تفسیر کبیر)

مالک الملک: میں ملک سے مراد سلطنت اور غلبہ ہے، ایک قول ہے اس سے مراد مال اور غلام ہیں اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا اس سے مراد نبوت ہے، مالک سے نبوت مراد ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ علماء

ربانیین کی مخلوق کے باطن پر حکومت ہوتی ہے اور بادشاہوں کی مخلوق کے ظاہر پر حکومت ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کا حکم مخلوق کے ظاہر اور باطن دونوں پر نافذ ہوتا ہے اور علماء ہوں یا حکام دونوں نبی علیہ السلام کے حکم کے تابع ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کا ملک بادشاہوں کے ملک سے زیادہ عظیم اور وقیع ہے۔ (تبیان القرآن)

ادھر مشرکین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ وہ بشریت کو نبوت کے منافی سمجھتے تھے وہ تعجب سے کہتے تھے کہ أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُولًا (الإسراء:۹۴) کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں فرمایا وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا (الأنعام:۹) اگر اللہ تعالیٰ فرشتہ کو رسول بناتا تب بھی اس کو کسی پیکر انسانی میں بھیجتا اور وہ پھر اسی شبہ میں مبتلا ہوتے اور بعض مشرک یہ کہتے تھے کہ لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (الزخرف:۳۱) اگر کسی بشر نے ہی رسول ہونا تھا تو اللہ تعالیٰ کسی بہت بڑے دولتمند یا کسی بہت بڑے سردار کو رسول بناتا ایک خاک نشیں یتیم کو اللہ نے رسول کیسے بنا دیا؟ یہود کہتے تھے کہ نبوت تو ہمارے آباء اور اسلاف میں تھی قریش ان پڑھ لوگ ہیں ان میں نبی کیسے مبعوث ہو گیا؟ جب کہ منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرتے تھے، اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم میں دی ہے کہ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ (النساء:۵۴) کیا وہ اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا فضل عطا کیا ہے، یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بڑائی اور تکبر کا اظہار کرتے تھے، اپنی کثرت پر اِتراتے تھے، اپنے مال و دولت پر غرور کرتے تھے، اپنے اسلحہ پر انہیں غرور تھا، اللہ تعالیٰ نے ان تمام منکروں کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ سبحانہ مالک الملک ہے، نبوت کا مالک ہے وہ جس کو چاہے نبوت عطا فرمائے۔ (تفسیر کبیر)

تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ: اصل بادشاہی اسی ذات وحدہ لاشریک کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے تخت پر بٹھا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تخت سے اتار دیتا ہے، جب سے یہ سلسلہ دنیا میں جاری ہوا تب سے اب تک اور ہنگامہ یوم النشور تک یہ تماشہ شب و روز جاری رہے گا، جن لوگوں

کے سامنے یہ آیات نازل ہوئیں انہوں نے اپنی نگاہوں سے نظارہ کیا کہ مکہ مکرمہ سے لٹ پٹ کر مدینہ میں بسیرے کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے رحمت للعالمین ﷺ کی رحلت کے بعد خلافت کی پوشاک پہنائی، تیس سال تک خلافت راشدہ کا دور رہا، ان کے بعد آج تک کتنے بادشاہ سریر آرائے حکومت ہوئے اور حکومتوں سے سبکدوش ہوئے، یہ حقیقت ہے کہ ملک ومال وجاہ یہ اللہ کی طرف سے ملتا ہے اوراسی کے اشارہ سے چھن بھی جاتا ہے، ان ساری چیزوں میں انسانی آزمائش ہے، وہ دے کر بھی آزماتا ہے اورواپس لے کر بھی آزماتا ہے۔

دنیامیں بہت سی قوموں میں بادشاہ پرستی کا طریقہ مروج رہا ہے، لوگ بادشاہ کو خدا یا خدا کے کنبہ کا ایک فرد تصور کرتے تھے، مصر میں فرعون اور عراق میں نمرود کی پرستش ہوا کرتی تھی، اسلام کی آمد کے وقت ایرانی بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ بادشاہ خدا کے کنبہ کا ایک فرد ہوتا ہے، جاپان وہندوستان میں بھی اس قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے، قرآن مجید نے اسی کی تردید کے لیے غالباً یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ حکومت واقتدار کی کنجی اصل میں خدا کے ہاتھ میں ہے، جن بادشاہوں اور حکمرانوں کو تم خدا سمجھتے ہو وہ حکومت واقتدار اور عزت وذلت کے سلسلے میں عاجز محض ہیں۔ (آسان تفسیر)

امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ سلطنت عطا کرنے کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے انصاف قائم کرنے والوں کے ساتھ کیا ہے، کافر، مشرک، اور ظالم شخص امت کی راہنمائی نہیں کر سکتا، کیونکہ کافر اس کا اہل نہیں اور فاسق اس کا پابند نہیں، ایسے لوگوں سے حق وانصاف کی بجائے ملوکیت، شہنشاہیت، ڈکٹیٹر شپ اور ظلم وجور کی توقع ہی کی جاسکتی ہے، امت کی راہنمائی کے لیے ایماندار اور عادل لوگوں کی ضرورت ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایران کے کسریٰ وغیرہ اور ان کے حواری عام لوگوں سے بیل اور گدھے کی طرح مشقت لیتے تھے اور انہیں اپنی فلاح وبہبود یا آخرت کے متعلق سوچنے کا موقع ہی نہ دیتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں تھی کہ اس ظالمانہ نظام کو ختم کیا جائے اور نبی آخر الزمان ﷺ کو مبعوث کیا جائے جو اسلام کا عادلانہ، توحید اور اطاعت پر مبنی نظام قائم کریں، چنانچہ جب تک مسلمان ان اصولوں پر قائم رہے، کوئی دوسری قوم ان کے مقابلے پر نہیں آئی اور ساڑھے

چھ سو سال تک مسلمان دنیا میں غالب رہے، پھر جب خود انہوں نے مجموعی طور پر اس نظام سے روگردانی کرلی، تو ان کی حالت بگڑنا شروع ہوگئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری قومیں ان کے مقابلہ میں کھڑی ہوگئیں۔ (معالم العرفان)

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ: اور جس کو چاہتا ہے دنیا یا آخرت یا دونوں جہان میں عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے یعنی اپنی مدد، توفیق اور ثواب عطا کرکے جس کو چاہتا ہے دنیا اور آخرت میں عزت بخشتا ہے، بدبختی عدم توفیق اور عذاب کی وجہ سے جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔

بِيَدِكَ الْخَيْرُ: تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے بعض علماء نے کہا کہ اصل کلام بیدک الخیر والشر تھا لیکن شر کو حذف کرکے صرف خیر کے ذکر پر اکتفا کیا جیسے آیت: وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ میں والبرد کو ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا، بعض علماء نے کہا کہ خیر کو خصوصیت کے ساتھ صرف اس لیے ذکر کیا کہ کلام کی رفتار کا تقاضا یہی تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو رُوم وفارس کی حکومت حاصل ہونے کی بشارت دی تھی۔ (تفسیر مظہری) شر مقصود بالذات نہیں ہے، شر کا فیصلہ حکمت و مصلحت کے تحت کیا جاتا ہے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حجامہ کروانے، زخم لگانے، کڑوی دوا پینے اور اس جیسے اور بہت سے تکلیف دہ معاملات وہ ہیں جو صحت حاصل ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لیے خیر کو ذکر کیا گیا شر کو ذکر نہیں کیا گیا۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ تیرے قابو میں ہے، تیرے سوا کسی کا کسی چیز پر کوئی قابو نہیں، بندوں کی قدرت ایک وہمی چیز ہے، جس کی وجہ سے ان کو کاسب (اور عامل) کہہ دیا جاتا ہے ورنہ بندوں کا اور ان کے اعمال کا خالق اللہ ہی ہے وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ شر بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے ہم کہتے ہیں بیشک اللہ کو شر پر قدرت حاصل ہے اور شر اس کے ہاتھ میں ہے مگر اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ (جس طرح خیر عطا کرنے پر قادر ہے اسی طرح) خیر نہ دینے پر بھی قادر ہے کیونکہ قدرت کا معنی ہی یہ ہے کہ اگر چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے پس اللہ جب خیر عطا نہ کرے تو ممکن اپنے اصلی شر پر رہ جائے گا یہی معنی قدرت علی الشر کا ہے۔ (تفسیر مظہری)

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ: تورات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو دن کو رات میں داخل کرتا ہے، تولج ایلاج سے باب افعال ہے، اس کا معنیٰ داخل کرنا۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یعنی کبھی رات کو گھٹا کر دن کو بڑھا دیتا ہے، کبھی اس کا عکس کرتا ہے، مثلاً ایک موسم میں ۱۴ گھنٹہ کی رات اور دس گھنٹہ کا دن ہے، چند ماہ بعد رات کے چار گھنٹہ کاٹ کر دن میں داخل کر دیئے، اب رات دس گھنٹہ کی رہ گئی اور دن ۱۴ گھنٹہ کا ہو گیا، یہ سب الٹ پھیر تیرے ہاتھ میں ہیں، کیونکہ شمس و قمر وغیرہ تمام سیارات بدون تیرے ارادہ کے ذرا حرکت نہیں کر سکتے، خلاصہ یہ ہوا کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی رات۔ (عثمانی)

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ: وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے، حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا اس کا معنی ہے تو مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے نکالتا ہے، حضرت زہری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عورتوں کے پاس تشریف لے گئے تو وہاں ایک حسین و جمیل عورت موجود تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے عرض کیا یہ آپ کی خالاؤں میں سے ایک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا یہ کون ہے؟ انہوں نے عرض کیا یہ خالدہ بنت اسود بن عبد یغوث ہے، تب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُبْحَانَ الَّذِي يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ پاک ہے وہ ذات جو زندہ کو مردہ سے نکالتی ہے، وہ عورت نیک اور صالحہ تھی اور اس کا باپ کافر تھا، تو اس قول کی بنا پر مراد یہ ہے کہ کافر کا دل مردہ ہے اور مومن کا دل زندہ ہے، پس موت اور حیات دونوں مستعار ہیں اور اکثر علماء نے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ آیت میں حیات اور موت دونوں حقیقت ہیں، اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مرغی کو انڈے سے نکالنا ہے اس میں مرغی زندہ ہے اور انڈا مردہ ہے اور انڈا جو کہ مردہ ہے اس سے مرغی نکالتا ہے جو کہ زندہ ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد نطفہ ہے جو آدمی سے خارج ہوتا ہے اور اس میں نطفہ مردہ ہے اور آدمی زندہ ہے اور آدمی نطفہ سے زندہ نکلتا ہے حالانکہ نطفہ مردہ ہے اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: مراد دانہ ہے جو بالی سے نکلتا ہے اور بالی دانے سے نکلتی ہے اور گٹھلی کھجور سے نکلتی ہے اور کھجور گٹھلی سے نکلتی ہے اور کھجور اور بالی میں

حیات تشبیہا موجود ہے۔(قرطبی)

وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: تو جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے، اس وقت شرق تا غرب، شمال تا جنوب کروڑوں انسان دنیا میں آباد ہیں، حیوانات کی انواع واقسام موجود ہیں، فضاؤں میں اڑتے پرندے موجود ہیں، سمندروں میں اچھلتی کودتی مچھلیاں موجود ہیں، دنیا بھر کے بڑے بڑے جنگلات میں ڈیرے لگائی ہوئی عجیب وغریب شکل کی مخلوقات موجود ہیں، ان سب کو روزی اور روٹی دینے والا اللہ ہی ہے، کہیں لوگ نان شبینہ کو ترستے ہیں اور کہیں رزق کی فراوانی ہے، جنہیں رب نے دیا ہے وہ اللہ کی عطا کردہ روٹی روزی تقسیم بھی کرتے ہیں، جگہ جگہ دستر خوان لگا کر ان پر انواع واقسام کے کھانے سجا کر اللہ کی مخلوق کو کھلاتے ہیں۔

صاحب تدبر قرآن لکھتے ہیں "رزق یہاں فضل وانعام کی تعبیر ہے، روزی کے محدود مفہوم میں نہیں ہے، بِغَيْرِ حِسَابٍ یہاں دو مفہوموں پر مشتمل ہے، ایک کثرت کے مفہوم پر یعنی وہ جس کو چاہتا ہے بے اندازہ فضل وانعام سے نوازتا ہے جس کی کوئی حد ونہایت نہیں، جیسا کہ فرمایا ہے وَاِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ صابروں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر ملے گا۔ دوسرے بے سان گمان کے مفہوم پر، جیسا کہ فرمایا ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا "(طلاق)۔(تدبر قرآن) ابوالبرکات محمود نسفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں " مخلوق اس رزق کی مقدار وکمیت نہیں جانتی اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے تاکہ یہ دلالت ہو کہ جو ذات ان عقول کو حیرت زدہ کرنے والے افعال کی قدرت رکھتی ہے پھر وہ اپنے بندوں میں سے جن کو چاہے بغیر حساب کے رزق دیتی ہے وہ ذات اس بات پر قادر ہے کہ عجم سے بادشاہی چھین لے اور ان کو ذلیل کر دے اور عربوں کو دے کر عزت دے دے۔(مدارک)

آیت مبارکہ کی چند خاصیات: ① ایک جمعہ کو نبی کریم ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نماز میں نہ دیکھا تو خود ان کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا اے معاذ! کیا بات ہے آج میں نے تم کو نہیں دیکھا عرض کیا یارسول اللہ! ایک یہودی کا میرے ذمہ ایک اوقیہ (چالیس درہم) قرض تھا میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے گھر سے نکلا راستہ میں اور اس یہودی نے مجھ کو روک لیا آپ نے

ارشاد فرمایا کہ اے معاذ! کیا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں کہ اگر تمہارے ذمہ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ادا کر دے وہ دعا یہ ہے، قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶) تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۷) (معجم کبیر طبرانی)

② بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس آیت کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس پر مداومت کرے اللہ تعالیٰ اس کو قرض سے سبکدوش فرماتا ہے۔ ③ بعض بزرگوں نے یہ تخصیص بھی کی ہے ہر نماز کے بعد سات سات بار پڑھے اور بزرگوں نے اس عمل کو مجرب لکھا ہے۔ ④ معجم طبرانی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسم اعظم جس کے ذریعہ سے دعا قبول ہوتی ہے وہ آل عمران کی اس آیت میں ہے، اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ الخ (ابن کثیر، معارف القرآن للکاندھلوی)

اہل ایمان کافروں کو دوست نہ بنائیں

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ {۲۸} قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۲۹} آل عمران

جواب ترجمہ: نہ بنائیں ایمان والے کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر، اور جو شخص یہ کام کرے گا تو اللہ سے دوستی کرنے کے کسی شمار میں نہیں۔ مگر اس حالت میں کہ دشمنوں سے کچھ بچاؤ کرنا ہو، اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ آپ فرما دیجیے اگر تم چھپاؤ گے جو تمہارے سینوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو گے تو اللہ اس کو جان لے گا، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ الحجاج بن عمرو کہمس بن ابی الحقیق اور قیس بن زید یہ لوگ یہود تھے یہ انصار کے کچھ لوگوں کو خفیہ طور پر ان کے دین سے ورغلاتے تھے چنانچہ رفاعہ بن منذر، عبد اللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ نے ان لوگوں سے کہا کہ ان یہودیوں سے دور رہو ان کے ساتھ میل ملاپ اور خفیہ ملاقاتوں سے پرہیز کرو وہ تمہیں کہیں تمہارے دین سے فتنے میں نہ مبتلا کر دیں ان لوگوں نے ان یہود کے ساتھ میل ملاپ اور خفیہ طور پر ملنا جلنا ترک کرنے سے انکار کر دیا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی (اسباب النزول، العجاب فی بیان الاسباب) یہاں امام رازی رحمہ اللہ نے شان نزول بیان کرتے ہوئے عبد اللہ بن جبیر کی جگہ عبد الرحمان بن جبیر کا نام لکھا ہے۔ (کبیر)

② الکلبی کا قول ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابیّ منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ان لوگوں کی یہود اور مشرکین سے دوستی تھی یہ انہیں اطلاعات اور معلومات فراہم کرتے تھے اور اس بات کے خواہش مند رہتے تھے کہ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فتح ہو اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی اور مومنوں کو ان جیسے کام کرنے سے منع فرما دیا۔ (اسباب النزول، العجاب)

③ جویبر نے الضحاک سے اس نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ یہ آیت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، یہ بدری سردار تھے، ان کے حلیف کچھ یہودی تھے جس روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احزاب (جنگ خندق) کے لیے نکلے تو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے ساتھ پانچ سو یہودی جو انمرد ہیں میری رائے ہے کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور شریک جہاد ہوں تو میں دشمن پر غلبہ پالوں گا، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (اسباب النزول، العجاب فی بیان الاسباب)

④ یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اہل مکہ سے محبت و مودّت کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ اس آیت میں منع کر دیا گیا کہ کافروں سے محبت و مودت نہ رکھی جائے۔ (معارف النزول، العجاب فی بیان الاسباب)

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر سرسری نگاہ دوڑائیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے

ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور فرمایا روضہ خاخ (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام) میں جاؤ وہاں ایک عورت سفر کر رہی ہو گی اس کے پاس ایک خط ہو گا وہ اس سے لے لو، ہم اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے روانہ ہوئے حتی کہ ہم روضہ میں پہنچ گئے تو وہاں وہ مسافرہ تھی ہم نے اس سے کہا وہ خط نکالو اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، ہم نے کہا وہ خط نکالو ورنہ تمہارے کپڑے اتار دیئے جائیں گے، تب اس نے اپنے بالوں کے گچھے سے وہ خط نکالا۔

ہم وہ خط لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اس خط میں لکھا ہوا تھا کہ یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکین مکہ کی طرف ہے، اس خط میں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے مکہ کے مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ کے بعض اقدامات کی خبر دی تھی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے حاطب! یہ کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! میرے متعلق فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں میں قریش کے قرابت داروں میں سے نہیں ہوں، میں ان سے مل جل کر رہنے والا ہوں، آپ ﷺ کے ساتھ جو مہاجرین ہیں ان کی مکہ والوں کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں جس کی وجہ سے وہ مکہ میں اپنے رشتہ داروں اور اپنے اموال کی حفاظت کر لیں گے تو میں نے یہ چاہا کہ جب مکہ والوں کے ساتھ میری کوئی رشتہ داری نہیں ہے تو میں ان پر کوئی احسان کر دوں اور اس احسان کی وجہ سے وہ میرے رشتہ داروں کی حفاظت کریں گے، میں نے یہ فعل کسی کفر یا ارتداد یا اسلام کے بعد کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے نہیں کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نے تم سے سچ کہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں، آپ ﷺ نے فرمایا یہ شخص بدر میں حاضر ہو چکا ہے تمہیں کیا پتا ہے کہ بیشک اللہ اہل بدر کی طرف متوجہ ہوا اور فرمایا تم جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا۔ (صحیح بخاری)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ: اہل اسلام و ایمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ارشاد ہے کہ وہ اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی اور تعلق داری نہ رکھیں، جو خوش

نصیب اور سعادت مند قرآن کریم کی ہمہ وقت تلاوت کرتے ہیں، اس کے معانی، مطالب ومفاہیم پر نگاہ رکھتے ہیں، اس سمندر کی تہوں میں غوطہ زن ہیں وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس مقام کے علاوہ باقی کئی مقامات پر بھی قرآن کریم نے اہل ایمان کو منع کیا ہے کہ وہ کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات سے اجتناب کریں۔

سورۃ آل عمران ہی میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ (آلِ عِمْرَانَ: ۱۱۸) اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو اپنا راز دار مت بناؤ وہ لوگ تمہارے بگاڑ میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے ان کو وہ چیز پسند ہے جس سے تمہیں تکلیف ہو بغض ظاہر ہو چکا ہے، ان کے مونہوں سے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے، بھیدی اور راز دار کسی عام شخص کو نہیں بنایا جاتا، اسی کو بنایا جاتا ہے جس پر اعتماد ہو اور اس کے ساتھ دوستانہ مراسم ہوں، کافروں سے دوستی کیوں نہ کی جائے اس کی وجہ بھی اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمادی ہے کہ وہ تمہارے نقصان میں، تمہارے بگاڑ میں ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔

سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَجِدُ قَوْماً يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (الْمُجَادَلَةِ: ۲۲) جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو ایسا نہیں پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستیاں کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، یہ اہل ایمان کی کوالٹی اور صفت بیان کی گئی ہے کہ ان کا مقصود ومطلوب حقیقی اللہ اور رسول اللہ ﷺ ہیں، یہ آخرت کے طلب گار لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے مخالفین و معاندین سے دوستی و قلبی تعلق داری قائم نہیں کرتے۔

سورۃ المائدہ میں ارشاد ربانی ہے يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ (المائدہ۵۱) اے اہل ایمان! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو ان کو دوست بنائے گا تو

وہ انہی میں شمار ہو گا، واضح پیغام ہے کہ یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اور تعلق رکھتے ہیں، انہیں اہل ایمان واسلام کے ساتھ دوستی اور تعلق سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ جو ان کے ساتھ دوستی رکھے گا اس کا شمار انہی یہود و نصاریٰ میں ہو گا۔

سورۃ الممتحنہ میں ارشاد فرمایا کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ (الْمُمْتَحِنَةِ: ۱) اے اہل ایمان! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، اگرچہ قرآن کریم کی اطلاع کے مطابق یہود و نصاریٰ اپنے کو اللہ کا محبوب اور لاڈلا سمجھتے تھے، وہ اسی بناء پر اپنے کو احباء اللہ (اللہ کے دوست) اور ابناء اللہ (اللہ کے بیٹے) کہتے تھے، لیکن جو کچھ قرآن کریم ان کے بارے میں بتاتا ہے اس کو سن پڑھ کر انسان کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے کہ ان قسمت کے ماروں کی اللہ کے ساتھ کس طرح کی دوستی تھی، یہ کیسے اللہ کے دوست تھے، جو ہر بات پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں، اللہ کی باتوں کا استہزا کرتے اور مزاق اڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں میدان تیہ میں چالیس سال تک ذلیل و رسوا کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل بندر اور خنزیر بنا دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور مسکنت ڈال دی تھی، قیامت کی صبح تک یہ ذلیل و رسوا رہیں گے اور پھر انہیں دوزخ میں پھینک دیا جائے گا، جس کے بارے میں یہ دعوے دار تھے کہ چند دن تک ہم دوزخ میں رہیں گے، انہیں وہاں ہمیشہ رہنا پڑے گا، کیا اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں سے ایسا کرتے ہیں، بالکل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان پر کبھی غم و حزن نہیں ہو گا، انہیں کوئی خوف و ڈر دامن گیر نہیں ہو گا، اللہ کے دوست جنت میں خوش عیشی کریں گے، آرام و راحت کی زندگی پائیں گے۔

جہاں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو ایک دوسرے کا دوست قرار دیا وہاں اہل ایمان کی یہ خوبی بیان کی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے تعلق داری و قلبی دوستی نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں، جیسا کہ سورۃ توبہ میں ارشاد ہے وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (التَّوْبَةِ: ۷۱) ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ دوستی و قلبی تعلق رکھنے سے کیوں منع فرمایا ہے، اس کی ارباب تفسیر نے ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے جب مسلمان ان کے ساتھ قلبی دوستی رکھے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے کفر کو پسند کرتا ہے اسی لیے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتا ہے، جب کہ اہل ایمان کے لیے کفر کو پسند کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، کیونکہ کفر کو پسند کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان کے کفریات کو درست تسلیم کرتا ہے، تو کفر کو پسند کرنے والا، کفر کو درست سمجھنے والا گویا کفر کو صحیح سمجھ رہا ہے ایسا سمجھنا یہ کفر ہے، کفر کے ساتھ راضی ہونا یہ بھی کفر ہے، کفر کو درست تسلیم کرنا یہ بھی کفر ہی ہے، ایسی صورت میں یہ بات محال ہے کہ کوئی مؤمن مؤمن رہے۔

صاحب تبیان القرآن لکھتے ہیں ”اس آیت میں کفار کے ساتھ موالات سے منع فرمایا ہے، موالات کا معنی ہے محبت اور قلبی لگاؤ یہ محبت رشتہ داری کی وجہ سے ہوتی ہے یا پرانی دوستی کی وجہ سے ہوتی ہے یا نئی شناسائی کی وجہ سے ہوتی ہے جو غیر اختیاری ہوتی ہے اور جو چیز غیر اختیاری ہو وہ شرعاً معاف ہے اور درجہ اعتبار سے ساقط ہے اس لیے یہاں نفس محبت سے ممانعت مراد نہیں ہے بلکہ انسان محبت کی بناء پر جو معاملہ اپنے محبوب کے ساتھ کرتا ہے اور محبت کے جن تقاضوں پر عمل کرتا ہے ان معاملات اور تقاضوں پر عمل کرنے سے ممانعت مراد ہے، مثلاً محبوب کی تعظیم اور تکریم کرنا، محبوب کے حکم کو باقی احکام پر ترجیح دینا اور اس کی تعریف و توصیف کرنا، اس کا بہ کثرت ذکر کرنا اور اس کی رضاجوئی کی کوشش کرنا۔

سو کفار کی تعظیم و تکریم کرنا ان کی تعریف و توصیف کرنا، ان کا بہ کثرت ذکر کرنا اور ان کے احکام کو باقی احکام پر ترجیح دینا، ان کی رضاجوئی کی کوشش کرنا اپنے دین اور عبادت کے معاملات میں ان سے مدد حاصل کرنا اور ان کو ہم راز بنانا، ان کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلق استوار کرنا یہ تمام امور ان کے ساتھ جائز نہیں ہیں، البتہ کفار کو اپنا نوکر اور غلام بنانا اور ان سے اس طرح مدد لینا جس طرح مالک نوکروں سے مدد لیتا ہے اور تفوق اور برتری کے ساتھ ان سے تعلق رکھنا جائز ہے اسی وجہ سے اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے اور ان کے مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا

نکاح کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح بغیر کسی معاشی مجبوری اور اضطرار کے ان کی نوکری اور ملازمت کرنا جائز نہیں ہے۔

امام مسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف جارہے تھے جب آپ بحرۃ الوبرہ (مدینہ سے چار میل دور ایک مقام) پر پہنچے تو ایک شخص ملا جس کی جرأت اور طاقت کا بہت چرچا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس نے کہا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے آیا ہوں تاکہ مال غنیمت میں سے مجھے بھی حصہ ملے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہو؟ اس نے کہا نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واپس چلے جاؤ میں کسی مشرک کی مدد ہرگز طلب نہیں کروں گا وہ دوبارہ پھر آیا اور مدد کی پیش کش کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا میں کسی مشرک سے مدد ہرگز طلب نہیں کروں گا بالآخر وہ مسلمان ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ساتھ لے لیا، خلاصہ یہ ہے کہ عزت، وقار اور غلبہ کے ساتھ مشرکین کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے اور ذلت اور خواری کے ساتھ مشرکوں کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (صحیح مسلم بحوالہ تبیان القرآن)

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی ایمان والا ایمان والے سے تو دوستی نہ کرے، مسلمان مسلمان سے تو دوستی نہ کرے اور انہیں چھوڑ کر کافروں سے دوستانہ مراسم قائم کرے یہ بات اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے، اس میں اس پر خاص تنبیہ ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ کریں، اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ مسلمانوں کو نہ چھوڑے ان سے بھی دوستی رکھے اور کافروں سے بھی، کیونکہ مقصود کافروں کی دوستی سے منع کرنا ہے اور حقیقت میں بات یہ ہے کہ کافروں سے قلبی دوستی جبھی ہو سکتی ہے جبکہ مسلمانوں کی دوستی کو نظر انداز کر دیا جائے، خواہ مستقل طور پر مسلمانوں سے بے تعلقی اختیار کی جائے خواہ عارضی طور پر ہر حال میں کافروں سے قلبی محبت ہو گی تو وہ ضرور مسلمانوں سے کسی نہ کسی درجہ میں تعلق کم کرنے یا تعلق توڑنے پر مجبور کرے گی۔ (انوار البیان)

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ: اور جو ایسا کرے گا یعنی کافروں سے اندرونی دوستی رکھے گا، تو اللہ سے اس کا کچھ بھی دوستی کا تعلق نہیں، شَيْءٍ کی تنوین اظہار تحقیر کے لیے ہے مطلب یہ ہے

کہ اللہ کی دوستی یا اللہ کے دین کی کم سے کم مقدار میں بھی اس کا دخل نہیں یعنی کافروں کی دوستی جس طرح مومنوں کی دوستی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دوستی کے ساتھ بھی نہیں ہوسکتی، اگر شروع میں ہی بجائے، من دون المومنین کے من دون اللہ والمومنین کہہ دیا جاتا تو بیان کردہ مطلب ادا ہو جاتا لیکن اللہ کی دوستی سے محرومی کا اظہار پرزور عبارت میں نہ ہوتا اس لیے آیت: فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ کو (مستقل طور پر) ذکر کیا۔ (تفسیر مظہری)

تَوَدُّ عَدُوِّي ثُمَّ تَزْعُمُ أَنَّنِي ... صَدِيقُكَ لَيْسَ النَّوْكُ عَنْكَ بِعَازِبِ

وَإِذَا وَالَى صَدِيقُكَ مَن تُعَادِي فَقَدْ عَادَاكَ وَانقَطَعَ الكَلَامُ

تم میرے دشمن سے محبت رکھتے ہو اور پھر دعویٰ کرتے ہو کہ میں تمہارا دوست ہوں، حماقت تم سے دور نہیں ہے۔ اور جب تمہارے دوست نے تمہارے دشمن کے ساتھ دوستی کرلی تو اس نے آپ کے ساتھ دشمنی کرلی اور معاملہ ختم کردیا۔ دوست اسے کہتے ہیں جو آپ سے محبت رکھے اور آپ کے دشمن سے بغض رکھے، دشمنوں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو آپ کا دشمن ہے، دوسرا وہ جو آپ کے دوست کا دشمن ہے، تیسرا وہ جو آپ کے دشمن کا دوست ہے۔

إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً: میں یہ بتایا ہے کہ کوئی مسلمان کافروں میں پھنس جائے، مثلاً محبوس ہو یا محبوسوں کی طرح ہو (جیسے اندھے اپاہج، لنگڑے لولے اور بیمار) اور کافر کفریہ کلمہ کہلوانے پر کسی ایسی تکلیف دینے کی دھمکی دیں جو ناقابل برداشت ہو اور وہ جو دھمکی دے رہے ہیں اس پر وہ قادر بھی ہوں تو زبان سے کلمہ کفر کے کہنے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ سورۃ نحل کی آیت إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ میں اجازت دی ہے۔ (انوار البیان)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً میں تقیہ زبان کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے کہ کوئی آدمی مجبور کیا جائے ایسے کام پر جو اللہ کی نافرمانی ہو مگر وہ لوگوں کے ڈر سے زبان سے وہ بات کرتا ہے لیکن اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے مگر یہ بات اس کو نقصان نہیں دے گی کیونکہ وہ زبان کا تقیہ ہے (تفسیر در منثور لجلال الدین السیوطی) یاد رہے یہاں وہ تقیہ مراد نہیں ہے جو روافض کا شعار ہے۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ: اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اس میں کمزور مسلمانوں یا منافقین کو تنبیہ ہے کہ تم غیر مسلم قوتوں سے اس لیے ترک تعلق کرنے سے ڈرتے ہو کہ کہیں تم کسی مشکل میں مبتلا نہ ہو جاؤ، مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اصل تعلق اللہ سے ہونا چاہیے، تم اسی سے ڈرو اور اسی سے امیدیں رکھو لیکن تم انسانی قوتوں سے اللہ سے بڑھ کے ڈرتے ہو اور اصل قوت و طاقت کا سرچشمہ انہیں سمجھتے ہو، تو ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ وہ کس قدر قوتوں اور قدرتوں کا مالک ہے، اس نے تمہیں مہلت عمل دے رکھی ہے اور اپنی رحمت کی وجہ سے تمہاری بد اعمالیوں کے باوجود تمہیں ڈھیل دے رہا ہے، تو تمہیں اس کی شان کریمی سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

وہ جس طرح رحیم و کریم ہے اسی طرح عادل بھی ہے، جب اس کی صفت عدل کا ظہور ہو گا تو پھر تمہیں پچھتاوے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ اس وقت مہلت عمل ختم ہو چکی ہو گی، تم پلٹنا چاہو گے لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا ہو گا، اس لیے اب تمہیں موقع ہے کہ اللہ کی ذات کا ڈر اپنے اندر پیدا کرو اور باقی ہر طرح کے خوف سے اپنے آپ کو نجات دے دو اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہاں ہمیشہ کسی کو زندہ نہیں رہنا، ایک نہ ایک دن اس زندگی کا خاتمہ ہونا ہے، وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانا ہے، اگر اس نے یہاں گرفت نہ فرمائی تو قیامت کے دن تو ہر صورت میں اس کے عدل کا ظہور ہو گا، ہر ایک کے ایمان و عمل کی جانچ ہو گی، اعمال تولے جائیں گے، اس دن تم اگر ایمان سے محروم رہے تو یہود سے تمہارے تعلقات تمہیں سزا سے بچا نہیں سکیں گے، اس دن تو اسے پناہ ملے گی جس پر اللہ رحم فرمائے گا، اس دن اندازہ ہو گا کہ اللہ کی ذات کتنی عظیم ہے اور تم نے اس کے مقابلے میں دوسری قوتوں کو بڑا سمجھ کر کیسی حماقت کی تھی اور آج کوئی قوت اس کے غضب سے تمہیں بچا نہیں سکے گی۔ (روح القرآن)

قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ: میرے حبیب ﷺ! فرما دیجیے کہ کافروں کی دوستی، مودّت خواہ تم اپنے سینوں کے سفینوں میں چھپائے رکھو یا قول و عمل سے اسے ظاہر کر دو ہر حال میں اللہ اس کو جانتا ہے، پوشیدہ رکھو یا ظاہر کر دو دونوں صورتوں میں اس سے کوئی چیز مخفی نہیں

رہ سکتی، اسے ہر چیز کا علم ہوتا ہے، یہاں قلوب کی جگہ صدور لایا گیا ہے کیونکہ یہ قلب کا برتن ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: یہ مستقل جملہ لایا گیا ہے اور واضح کیا گیا کہ زمین کی تہوں میں، پرت در پرت میں پوشیدہ چیزوں کو اللہ جانتا ہے، وہ بڑی اشیاء ہوں یا چھوٹی سب کے بارے اسے آگاہی حاصل ہے، آسمان کی بلندیوں میں موجود اشیاء کے بارے میں بھی وہ خوب واقف ہے، جب ساری کائنات سے وہ باخبر ہے تو انسانی قلوب و صدور تو چھوٹی سی چیز ہیں، ان میں چھپی باتیں وہ کیوں نہیں جان سکتا۔

وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: وہ علم ذاتی کے ساتھ موصوف ہے، تمام معلومات کا اس نے احاطہ کر رکھا ہے، اس لیے اس کی نافرمانی پر جرأت مندی نہ کرو، اس کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں نہ بڑھاؤ، اس کے نزدیک کوئی ایسی معصیت نہیں ہے جس سے وہ باخبر نہ ہو، جو اس کا ارتکاب کرے گا وہ اسے سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

روز قیامت اور عمر بھر کا اعمالنامہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَراً وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَداً بَعِيداً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ {۳۰} آل عمران

جواب ترجمہ: جس دن ہر شخص اپنے نیک عمل کو حاضر پائے گا اور ان کاموں کو بھی پالے گا جو برے تھے اس کی خواہش ہو گی کہ کاش اس کے اور اس دن کے درمیان بہت دور کی مسافت ہوتی، اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَراً: اس آیت کریمہ کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں نیک اعمال کی ترغیب (اعمال کا شوق دلانا) ہے جب کہ دوسرے حصہ میں برے اعمال سے ترہیب (اعمال بد کے انجام سے ڈرانا) ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لینا چاہیے کہ انسانی عمل تو باقی نہیں رہتا اور نہ ہی اس کا قیامت کے دن پایا جانا ممکن ہو گا، اس میں لازمی طور پر تاویل سے

کام لیا جائے گا، اس کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ بندہ صحائف الاعمال پائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (الْجَاثِيَةِ: ۲۹) بیشک ہم لکھتے رہے جو کچھ تم کرتے تھے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (الْمُجَادَلَةِ: ٦) جس دن اللہ سب کو جمع کرے گا پھر ان کے کئے ہوئے کاموں کی ان کو خبر دے گا اللہ نے ان سب کو محفوظ کر لیا ہے اور وہ انہیں بھول چکے ہیں اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے، دوسری تاویل یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ اعمال کی جزا پائے گا، یہاں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیک اعمال کرنے والا اپنے اعمال کو حاضر پائے گا اس سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ان صحائف کو قیامت کے دن حاضر پائے گا، یہ بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے کہ وہ اعمال کی جزا کو حاضر پائے گا، جیسے قرآن کریم کی سورۃ الکہف میں ارشاد ہے وَوَجَدُوا ما عَمِلُوا حاضِراً (الکھف: ۴۹) اور اس نے جو کچھ کیا ہو گا اسے حاضر پائے گا۔

وَما عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَداً بَعِيداً: یہ ایک ایسا خطاب ہے، جو قلب انسانی کی گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے، انسان کا کل سرمایہ اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ ایک دن وہ بذات خود اپنے اس سرمائے کے سامنے کھڑا ہو گا اور وہ پسند کرے گا اس کا یہ سرمایہ اس سے دور ہوتا لیکن افسوس کہ اس کی یہ خواہش ہر گز پوری نہ ہو سکے گی، یا وہ یہ خواہش کرے گا کہ یہ دن ہی نہ آتا، لیکن وہ تو آگیا ہے، وہ اسے دیکھ رہا ہے، وہ پکڑا گیا ہے، اب کوئی چھٹکارا نہیں ہے، اب کوئی جائے فرار نہیں ہے۔ (فی ظلال القرآن)

وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ: اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، یہ جملہ تکرار کے ساتھ لایا گیا ہے، اس سے پہلے جب فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے وہ اس وقت فرمایا تھا جب اہل ایمان سے کہا گیا تھا کہ وہ کفار کے ساتھ موالات، دوستی اور قلبی لگاؤ پیدا نہ کریں، یہاں جب فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے تو یہاں نیک اعمال بجالانے کی ترغیب اور برے اعمال سے بچنے کی ترہیب دی جارہی ہے۔

وَاللَّهُ رَؤُفٌ بِالْعِبادِ: باوجود یکہ اللہ تعالیٰ رحمان ہیں، رحیم ہیں، اپنے بندوں پر مہربان اور شفیق

ہیں، اس کے باوجود اپنی ذات سے جو انہیں ڈرایا جاتا ہے یہ ڈرائے جانے والوں کی مصلحت کے لیے ہے، یہاں العباد جو معرفہ لایا گیا ہے یہ استغراق کے لیے ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی مہربانی اور رأفت اس کے تمامی بندوں کو شامل ہے، چاہے وہ مسلمان ہیں یا کافر ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (فاطر: ۴۵) اگر اللہ بندوں کے کرتوتوں پر انہیں پکڑتا تو زمین کی پشت پر کسی جانور کو نہ چھوڑتا، اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ اللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ (الشوریٰ: ۱۹) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو باریک بینی کے ساتھ دیکھ رہا ہے، اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے تو اس میں انہی کی بھلائی ہے، انہی کا فائدہ ہے۔

رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اتباع کے فوائد

سوال ان آیات مبارکہ کا ترجمہ، تفسیر اور شان نزول بیان کیجیے

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۳۱} قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ {۳۲} آل عمران.

جواب ترجمہ: فرمادیجئے میرے حبیب! اگر تم لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ آپ فرمادیجیے کہ اللہ اور رسول کی بات مانو پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو اللہ انکار کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

شان نزول: ① ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کچھ جماعتوں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ میں یہ گمان کیا کہ وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور انہوں نے کہا اے محمد! ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہود نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہود کے سامنے اس آیت کو پیش کیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

③ مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف اوراس کے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اوراس کے دوست ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں اس چیز سے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

④ محمد بن اسحاق نے مغازی میں نقل کیا کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں سے متعلق نازل ہوئی ہے، نجرانی عیسائیوں نے کہا تھا کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم کرتے ہیں اوراللہ کی محبت اور تعظیم کے لیے ان کی عبادت کرتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر میری پیروی کرو۔

⑤ ابن جریج سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اے محمد! ہم اپنے رب سے محبت رکھتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی نشانی اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی ہے۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

⑥ جب آیت کریمہ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي نازل ہوئی تو رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابیّ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کی طرح بنادیا ہے، وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم ان کی اس طرح عبادت کریں جس طرح نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کرتے ہیں، اس پر آیت قُلْ أَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ نازل ہوئی۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

علامہ رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں یہاں جو شان نزول بیان کیا ہے اس میں عبادت کی بجائے محبت کا ذکر ہے کہ عبد اللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ ہم ان سے اس طرح محبت کریں جس طرح نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام سے محبت کرتے ہیں۔

⑦ مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (العجاب فی بیان الاسباب) علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اسی قول کو راجح قرار دیتے ہیں۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ: یہود دعوے دار تھے کہ وہ اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں، نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم حضرت مسیح کی تعظیم وعبادت اللہ کی محبت میں کرتے ہیں، مشرکین مکہ کہتے تھے کہ ہم بتوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتے

ہیں، اپنی اپنی جگہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی محبت کے دعوے دار تھے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے متلاشی تھے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے دعوے دار تھے، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کا اس قدر مقرب سمجھتے تھے کہ دوسرے کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے فرمایا کہ ان لوگوں سے فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں سچے اور مخلص ہو تو پھر اس کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر لو، اس کی مخالفت سے باز آجاؤ، کیونکہ جو اللہ کی محبت کا دعویدار ہے تو اس کے لیے لازم و ضروری ہے کہ وہ ہر اس کام سے بچے اور گریزاں ہو جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے، جب نبی کریم ﷺ کی رسالت اور نبوت پر روشن دلائل موجود ہیں تو پھر ان کی اتباع ضروری ہو گئی، اگر آپ ﷺ کی اتباع و پیروی نہیں کی جاتی تو یہ اس بات کی علامت اور دلیل ہے کہ ان لوگوں کو یہ محبت حاصل نہیں ہوئی۔

ابو البرکات علامہ محمود نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ کے بندے سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ بندے پر راضی ہو اور اس کے فعل کی تعریف فرمائے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گمان کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں پس رسول اکرم ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ ان کے اس قول کی عمل سے تصدیق مقرر کر دیں، اس لیے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعوے دار ہو اور سنت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے وہ جھوٹا ہے اور کتاب اللہ اس کی تکذیب کر رہی ہے۔

بعض نے کہا اللہ تعالیٰ کی محبت کا مطلب اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی دائمی خشیت اور دل کا ہمیشہ اس کی ذات اور یاد میں مصروف رہنا اور ہمیشہ اس سے موانست کا اظہار کرنا ہے۔ بعض نے کہا، اللہ تعالیٰ کی محبت در حقیقت نبوت کی اس کے اقوال، افعال، احوال میں اتباع کا نام ہے، البتہ احوال مخصوصہ بالذات اس سے مستثنیٰ رہیں گے، ایک اور قول یہ ہے محبت کی علامت ہمیشہ سوچ و بچار، کثرت خلوت دائمی خاموشی اختیار کرنا ہے جس میں حال یہ ہو کہ جب نگاہ اٹھائے تو کچھ نہ دیکھے، جب آواز دیں تو کچھ نہ سنے اور جب دکھ پہنچے تو غم زدہ نہ ہو اور جب کوئی چیز پالے تو اترائے نہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے اور نہ کسی سے امید لگائے۔ (مدارک)

میرے بہت ہی محبوب استاذ حضرت مولانا عبد الرحمٰن اشرفی رحمہ اللہ اپنی تفسیر نکات القرآن میں لکھتے ہیں ”محبت ایک مخفی چیز ہے کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں اور کم ہے یا زیادہ ہے، اس کا کوئی پیمانہ بجز اس کے نہیں کہ حالات اور معاملات سے اندازہ کیا جائے، محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں ان سے پہچانا جائے، یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار اور محبوبیت کے متمنی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان آیات میں اپنی محبت کا معیار بتلایا ہے، یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعوی ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ اس کو اتباع محمدی ﷺ کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا جو شخص اپنے دعوی میں جتنا سچا ہو گا اتنا ہی حضور اکرم ﷺ کی اتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بنائے گا اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہو گا اسی قدر آپ ﷺ کی اطاعت میں سستی اور کمزوری دیکھی جائے گی، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ”جس نے محمد ﷺ کا اتباع کیا اس نے در حقیقت اللہ کا اتباع کیا اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی گویا اس نے اللہ کی نافرمانی کی (نکات القرآن)

مولانا سعید احمد دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”محبت کے معنی ہیں کسی چیز کے کمال کی وجہ سے نفس کا اس چیز کی طرف مائل ہونا، یعنی نفس کسی چیز میں کمال کا ادراک کرے پھر اس چیز کی طرف مائل ہو اور اس چیز کا تقرب اور اس سے قربت حاصل کرنے کے ذرائع اختیار کرے لیکن یہاں عام محبت زیر بحث نہیں ہے بلکہ یہاں جو محبت زیر بحث ہے وہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا اور اللہ تعالیٰ کا بندے سے محبت کرنا ہے بندے کی محبت میں تو لغوی معنی کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے رہا حضرت حق تعالیٰ کی جانب سے محبت کا اظہار تو اس محبت میں لغوی معنی کی گنجائش نہیں ہے، اسی لیے اس موقع پر اہل علم نے بہت سے معنی کئے ہیں اور بعض نے مقتضائے محبت کو محبت کا ہم معنی قرار دے لیا ہے۔

محبت کے جو معنی ہم نے عرض کئے ہیں وہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ کے بیان کردہ معنی ہیں، ورنہ راغب نے تو لغوی معنی صرف اس قدر بیان کئے ہیں کہ کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنا، اس قسم کی بحث کے مختلف درجے اور مراتب ہیں، بہر حال جو محبت یہاں زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ محبت

کرینوالے کا قلب محبوب کے ساتھ اس قدر مشغول ہو اور محبوب کا انس اس قدر غالب ہو کہ کسی دوسری جانب التفات نہ کر سکے اور غیر کا دھیان نہ کرے اور ہر وقت توجہ محبوب کی جانب رہے۔

حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کا قول ہے اَلعِشقُ نَارٌ فِی القُلُوبِ تُحرِقُ مَا سِوَی المَحبُوبِ یعنی محبت اور عشق قلب کی ایک آگ ہے، جو محبوب کے سوا ہر چیز کو پھونک ڈالتی ہے یعنی قلب کی توجہ کو غیر اللہ سے بالکل منقطع کر دیتی ہے اور غیر اللہ کو ایسا نسیاً منسیاً کر دیتی ہے کہ گویا غیر کا وجود ہی نہیں ہے یہاں تک کہ خود انسان اپنے وجود کو بھی فراموش کر دے۔

اس محبت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی مرضی اور اس کی رضاجوئی میں لگا رہتا ہے اور محبوب کی ہر ناپسند چیز کو برا سمجھتا ہے قطع نظر کسی خوف یا طمع کے یعنی بالذات نہ کوئی لالچ مقصود ہوتا ہے نہ کوئی خوف دامن گیر ہوتا ہے، اگرچہ خوف و طمع ہو لیکن مقصود بالذات ادھر توجہ نہ ہو یہ وہ محبت ہے جو بندہ کی جانب منسوب ہوتی ہے اور یہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت پر یہ باتیں چسپاں نہیں ہوتیں نہ وہ کسی سے غافل ہوتا ہے اور نہ کسی جانب ایسا متوجہ ہوتا ہے کہ دوسری جانب کی خبر نہ رہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی محبت ایک خالص انس ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ بندے کو اپنی جانب متوجہ رکھیں اور غیر کی جانب متوجہ ہونے کی اس کو مہلت اور فرصت نہ دیں، مطلب یہ کہ اس کو اپنے ہی کام میں لگائے رکھیں۔

اسی محبت کو حضرات صوفیہ رحمہم اللہ کی اصطلاح میں محبت ذاتیہ کہتے ہیں، اس محبت کی مزید تشریح یوں ہو سکتی ہے کہ جیسے ماں اپنے بیٹے سے بغیر کسی کمال کا لحاظ کئے ہوئے محبت کرتی ہے، گویا ماں کی محبت بھی بعینہٖ محبت ذاتیہ نہیں ہے۔

اس تقریر کے بعد قاضی بیضاوی کی تعریف کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ قاضی نے جو کچھ کہا اس سے وہ محبت مراد ہو سکتی ہے جس کو محبت صفاتیہ کہا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم) خلاصہ یہ ہے کہ اگر محض محبوب کی ذات بدون کسی کمال کا لحاظ کئے سبب محبت ہو تو محبت ذاتیہ کہلاتی ہے اور اگر محبوب کے بعض کمال کو مرآۃ محبت اور سبب محبت قرار دیں تو اس کو محبت صفاتیہ کہتے ہیں۔

بغوی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کریں اور اس کی اطاعت بجالائیں اور مرضیات الٰہی کی تلاش و جستجو کریں اور اللہ کی محبت بندوں سے یہ ہے کہ وہ ان کو اطاعت و فرمان برداری کا بدلہ دے اور ان کی محبت کو سراہے اسی طرح اور بھی مفسرین رحمہم اللہ نے بہت سی باتیں فرمائی ہیں لیکن ان سب کو محبت کا مقتضا کہا جاسکتا ہے اور جب یہ سلسلہ محبت کسی بندے کے ساتھ قائم ہوتا ہے تو اس کے بہت سے اثرات ظاہر و نمایاں ہوتے ہیں جن کا یہاں احاطہ کرنا مشکل ہے اور چونکہ محبت کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ عاشق محبوب کی مرضی اور اس کی رضا کا جویاں رہتا ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتا اور حضرت حق تعالیٰ کی مرضی اور غیر مرضی کو معلوم کرنے میں قیاس اور رائے کو دخل نہیں، کوئی شخص اپنے قیاس سے یہ بات متعین نہیں کر سکتا ہے کہ حضرت حق تعالیٰ کو کیا بات پسندیدہ ہے اور کون سی بات ناپسندیدہ ہے۔

یہ امر موقوف ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر اس لیے فرمایا جو لوگ محبت خداوندی کے مدعی ہیں ان کو میری اتباع لازم ہے اگر میری اتباع نہیں کریں گے تو وہ اپنے دعوؤں میں جھوٹے اور کذاب ہوں گے کیونکہ محبت کا سب سے بڑا کام رضائے مولا اور اس کی ناراضگی سے بچنا ہے اور یہ بات بدون میری اتباع کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا میری اتباع کرو اور چونکہ محبت الٰہی کی بڑی غرض یہ ہوتی ہے کہ حضرت حق تعالیٰ بندے کو اپنی خاص توجہ سے بہرہ مند فرمائیں جس کو اللہ کی محبت کرنے سے تعبیر فرمایا ہے تو یہ بھی میری اتباع پر موقوف ہے اس لیے اگر تم میری اتباع کروگے تو میں ہی تم کو وہ طریقہ تعلیم کروں گا جن سے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ محبت کرے گا، لہٰذا تمہارا یہ مقصد بھی میری اتباع ہی سے پورا ہو سکے گا۔

اس لیے فرمایا يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور اسی طرح وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ کا مطلب سمجھ لینا چاہیے کیونکہ گناہوں کی معافی کا طریقہ بھی میں ہی تعلیم کر سکتا ہوں۔ خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ اے پیغمبر! جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کے مدعی ہیں اور ان کا یہ گمان ہے کہ ہماری محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی ہم سے محبت فرماتا ہے اور ہمارے گناہ معاف کر دیتا ہے ان سے کہہ دو کہ یہ سب امور میری اتباع پر

موقوف ہیں جب تک میری اتباع نہ کروگے تم کو کچھ حاصل نہ ہوگا اور تمہارے سب دعوے جھوٹے اور باطل ہیں، اگر تم میری پیروی کروگے اور میرے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کروگے تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت بھی کرے گا اور تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور بڑی مہربانی کرنے والا ہے۔ (کشف الرحمٰن)

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص نبی کریم ﷺ کی اتباع اور پیروی کرتا ہے اس کو یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ① اللہ اتباع کرنے والے کو اپنا محبوب بنالیتا ہے۔ ② اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے سچی محبت کی دلیل یہ ہے کہ امر و نہی میں شریعت کی پیروی کی جائے، اتباع کے بغیر محبت کا دعویٰ قطعاً نفع بخش نہیں۔ (المختصر فی تفسیر القرآن) ③ اللہ نبی کریم ﷺ کی پیروی کرنے والے کے گناہ معاف کردیتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ چونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری اور لاڈلے رسول ہیں، آپ ﷺ کی ادائیں ہی ایسی تھیں جو اللہ کو محبوب ہیں، جو ان اداؤں کو اختیار کرے گا اللہ اسے اپنا محبوب بنالے گا، جو شخص آپ ﷺ کا جتنا مرضی نام لیتا رہے مگر آپ ﷺ کی ادائیں اختیار نہیں کرے گا تو زندگی کے امتحانات میں فیل ہی ہوتا رہے گا، کامیابی کی ضمانت آپ ﷺ کی سنتوں کی پیروی ہے، بجز اس کے ہے ہی کیا۔

قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ: اس سے پہلے والی آیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع ضروری ہے، اس پر عبداللہ بن ابی منافق نے شکوک وشبہات کے بیج بونے کی ناپاک کوشش کی کہ حضرت محمد ﷺ ہم سے اللہ کی اطاعت کی طرح اطاعت کے خواہاں ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایسی محبت کی جائے جیسے نصاریٰ عیسیٰ کے ساتھ محبت رکھتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں منافقین کے اس شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ آپ ﷺ فرمادیں کہ تم لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو، یہ حکم اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے، حضور ﷺ کا تقاضا نہیں تھا، میری اتباع و پیروی اللہ نے تم پر واجب وضروری قرار دی ہے، یہ وہ بات نہیں ہے جو نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے طور پر کہتے پھرتے ہیں، یہ فرمان تو اس لیے ہے

کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہوں، جب میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں تو لازم اور واجب ہے کہ میری اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔

پیغمبر کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ ذکر فرمایا تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی صحیح اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے کیونکہ رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہی مطاع قرار دیا ہے اور جو ان کے مطاع کی اطاعت بجالاتا ہے وہ درحقیقت خدا ہی کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ (کشف الرحمٰن)

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ: اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری نہیں کرتے، اللہ سے سچی محبت نہیں رکھتے، روگردانی اور اعراض کرتے ہیں تو پھر یہ لوگ کافر ہو گئے اور کافروں سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے، اللہ کا محبوب بننے کے لیے یہ بنیادی چیزیں ہیں اگر ان میں یہی نہیں پائی جاتیں تو یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم احباء اللہ (اللہ کے دوست) ہیں، تعریف وستائش تو اطاعت گزاروں اور پیروکاروں کے لیے ہے، جو انکار کرتا ہے اس کے لیے ذلت و رسوائی اور روسیائی ہے، یہ بات محبت کے بالکل خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کے مستحق اہل ایمان اور اہل طاعت ہیں، اہل اطاعت و سچے حبدار ہی جنت میں داخل ہوں گے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، وَمَنْ يَأْبَى؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى میری ساری امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ نے عرض کیا کہ کون انکار کرتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (بخاری، المقتطف من عیون التفاسیر)

اطاعت واتباع: اطاعت اور طاعت دونوں کا مادہ ط و ع ہے، طاعت اور اطاعت دونوں مصدر ہیں، تابعداری اور سر تسلیم خم کرنے کے معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں، اہل سنت کے نزدیک اطاعت حکم ماننے کو کہا جاتا ہے، من و عن قبول کرنے کو کہا جاتا ہے، جب کہ معتزلہ کے نزدیک اطاعت کسی

کے ارادے کے مطابق کام کرنے کو کہا جاتا ہے۔ (نضرۃ النعیم) اتباع کا معنیٰ کسی کے نشان قدم پر چلنا، جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا وہاں قدم رکھنا، علامہ کفوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ طاعت واطاعت مامورات بجالانے کا نام ہے خواہ وہ مستحبات ہی کیوں نہ ہوں، طاعت منہیات سے رکنے کا نام ہے چاہے وہ مکروہات ہی کیوں نہ ہوں۔ قرضے کی ادائی، بیوی اور محارم پر خرچ کرنا یہ اللہ کی اطاعت ہے عبادت نہیں ہے۔ (نضرۃ النعیم) علامہ مناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اطاعت ہر وہ بات ماننا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور تقرب ملے۔ علامہ ابن علان فرماتے ہیں کہ اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو ظاہری طور پر ماننے اور باطنی طور پر رضاجوئی کو کہا جاتا ہے۔ (نضرۃ النعیم)

امام ابوالحسن آمدی رحمہ اللہ نے "اتباع" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ اَلاِتِّبَاعُ فِي الفِعلِ هُوَ التَّاسِي بِعَينِهِ وَالتَّاسِي اَن تَفعَلَ مِثلَ فِعلِهِ عَلَى وَجهِهِ مِن اَجلِهِ: کسی کے فعل کے اتباع کا یہ معنی ہے کہ اس کے اس فعل کو اس طرح کیا جائے جس طرح وہ کرتا ہے اور اس لیے کیا جائے کیونکہ وہ کرتا ہے۔ اور امام آمدی رحمہ اللہ اطاعت کے مفہوم کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں وَمَن اَتَى بِمِثلِ فِعلِ الغَيرِ عَلَى قَصدِ اِعظَامِهِ فَهُوَ مُطِيعٌ لَّهُ: جب کوئی شخص کسی دوسرے کی عزت واحترام کے باعث بعینہ اس کے فعل کی طرح کوئی فعل کرے تو وہ اس کا مطیع کہلاتا ہے۔ اتباع وطاعت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو حکم قرآن نے ہم کو دیا ہے (جس کی اطاعت وہ بھی فرض سمجھتے ہیں) اس کی تعمیل کی صرف یہی صورت ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کو بالکل اسی طرح ادا کریں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمائے اور صرف اس لیے ادا کریں کہ یہ افعال اس ذات اطہر واقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور پذیر ہوئے ہیں جو جمال و کمال کا وہ پیکر ہے جس سے حسین تر اور جمیل تر چیز کا تصور تک ممکن نہیں۔ (ضیاء القرآن)

عالمین کے لیے منتخب کیے گئے لوگ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى آدَمَ وَنُوحاً وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ {۳۳} ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ

بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ {۳۴} آل عمران.

جواب ترجمہ: بے شک اللہ نے آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کی اولاد کو اور عمران کی اولاد کو سارے جہان سے پسند کیا ہے۔ بعض ان میں بعض کی اولاد ہیں، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں "جب یہ بات بیان کر دی کہ رسولوں کی اتباع کے بغیر اللہ کی محبت مکمل نہیں ہوتی، اب رسولوں کے بلند درجات اور اونچے مناصب بیان کیے جا رہے ہیں، اس کے بعد علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مخلوقات دو قسم پر ہیں، ایک مکلّف اور دوسری غیر مکلّف، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مکلّف مخلوق غیر مکلّف مخلوق سے افضل ہے، اس پر بھی اتفاق ہے کہ مکلّف مخلوق کی چار قسمیں ہیں، ملائکہ (فرشتے) انسان، جنات اور شیاطین، فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے ہوا سے پیدا کیا ہے، اسی بناء پر وہ بہت تیزی سے دوڑنے کی طاقت رکھتے ہیں، اسی بناء پر وہ عرش کو اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں، کیونکہ ہوا میں اشیاء کو اٹھانے کی طاقت ہے، اسی بناء پر فرشتوں کو روحانی بھی کہا جاتا ہے، ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں، امام رازی رحمہ اللہ دونوں باتوں میں یوں تطبیق پیش کرتے ہیں کہ ان کے جسم تو ہوا سے بنے ہیں اور ان کی روحیں نور سے بنی ہیں، فرشتے آسمانوں کے باشندے ہیں، شیاطین کافر ہیں، ان میں ابلیس کا کفر تو واضح ہے، اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں فرمایا کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا، رہے باقی شیاطین تو وہ بھی کافر ہیں، کیونکہ ارشاد ربانی ہے کہ شیاطین اپنے دوستوں کی طرف پیغامات بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم سے لڑائی کریں اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

شیطان کے خواص مکمل طور پر انسانوں کے دشمن ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی ہے کیا تم اسے اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو جب کہ وہ تمہارے دشمن ہیں، اللہ تعالیٰ نے شیطانوں اور انسانوں میں سے انبیاء کے بھی دشمن بنائے ہیں، شیاطین کے خواص میں سے یہ ہے کہ یہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں، قرآن کریم کی مختلف آیات میں اس بات کا ذکر موجود ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی) انسانوں کے والد حضرت آدم ہیں اور وہی پہلے انسان ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا ہے، اس کا ذکر بھی قرآن کریم میں موجود ہے۔

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ انسان جنات وشیاطین سے افضل ہے، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ انسان افضل ہے یا فرشتے، جو لوگ کہتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے افضل ہے وہ قرآن کریم کی اس آیت سے دلیل پکڑتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ آدم علیہ السلام کا انتخاب کیا گیا یہ انتخاب ان کی بزرگی اور بلندی مرتبہ کو چار چاند لگاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے آدم علیہ السلام کا انتخاب کیا ہے اور ان کی اولاد میں سے انبیاء کا جہانوں پر انتخاب کیا ہے، تو ضروری ہے کہ یہ مخلوق فرشتوں سے افضل واعلیٰ ہو۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِينَ: جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے دور میں عالمین کے لئے منتخب کیا تھا، وہ چار تھے، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، آلِ ابراہیم علیہ السلام اور آلِ عمران، ارشاد ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان بزرگ ہستیوں کو تمام جہان پر فضیلت، دی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اپنی روح ان میں پھونکی ہر چیز کے نام انہیں بتلائے، جنت میں انہیں بسایا، پھر اپنی حکمت کے اظہار کے لئے زمین پر اُتارا، یہاں اللہ تعالیٰ نے اصطفٰے کا لفظ ذکر فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو بری صفات سے صاف وپاک کیا اور انہیں عمدہ صفات سے مزین فرمایا۔

جب زمین پر بت پرستی قائم ہو گئی تو حضرت نوح علیہ السلام کو سب سے پہلا رسول بنا کر بھیجا، پھر جب ان کی قوم نے سرکشی کی، پیغمبر کی ہدایت پر عمل نہ کیا، حضرت نوح علیہ السلام نے دن رات خفیہ اور اعلانیہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، لیکن قوم نے ایک نہ سنی تو نوح علیہ السلام کے فرماں برداروں کے سوا باقی سب کو پانی کے عذاب یعنی طوفان نوح بھیج کر ڈبو دیا، حضرت نوح علیہ السلام کی فضیلتوں میں سے یہ ہے کہ زمین پر وہ پہلے تشریعی نبی ہیں، بیٹوں، بہنوں، پھوپھیوں، خالاؤں اور دیگر تمام ذوی الارحام کے ساتھ نکاح کی تحریم کا حکم سب سے پہلے ان پر نازل ہوا حضرت آدم علیہ السلام کے بعد روئے زمین کے تمام انسانوں کے والد ہیں۔

خاندان خلیل اللہ علیہ صلوات اللہ کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدگی عنایت فرمائی، اسی خاندان میں سے سید البشر خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، عمران کے خاندان کو بھی اس نے منتخب کر لیا، عمران

حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا نام ہے، مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں، ان لوگوں کو اپنے دور میں جہان کے لیے چنا، جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کی صبح تک آنے والے انسانوں کے لیے چنا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد قیامت کی صبح تک کوئی اور نبی اور رسول نہیں آئے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت اور دین قیامت تک رہے گا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی جسمانی اور روحانی خصوصیات

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام جہان پر انبیاء علیہم السلام کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے علامہ حلیمی رحمہ اللہ کی کتاب المنہاج سے یہ نقل کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جسمانی قوتیں عام انسان کی جسمانی قوتوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، انہوں نے پہلے حواس خمسہ کا ذکر کیا ہے اس کا بیان حسب ذیل ہے: ① قوت باصرہ: ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت باصرہ منتہاء کمال کو پہنچی ہوئی تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زُوِيَتْ لِيَ الْأَرْضُ فَأُرِيتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لیے سمیٹ دیا اور میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا۔ (صحیح مسلم)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ وَتَرَاصُّوا فَإِنِّي أَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي اپنی صفوں کو قائم کرو اور مل کر کھڑے ہو کیونکہ میں تم کو پس پشت سے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔ (صحیح بخاری) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الانعام: ۷۵) اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نگاہ اتنی قوی کر دی کہ انہوں نے تمام ملکوت کو اوپر سے نیچے تک دیکھ لیا، علامہ حلیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات کوئی بعید نہیں ہے، کیونکہ اہل نگاہ مختلف ہوتے ہیں، بتایا جاتا ہے کہ زرقاء یمامہ تین دن کی مسافت سے دیکھ لیا کرتی تھی، یہ بات کوئی بعید نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ زرقاء یمامہ کی نگاہ سے زیادہ قوی ہو۔

② قوت سامعہ: ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت تمام انسانوں سے زیادہ قوی تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيهَا مَوْضِعُ قَدَمٍ إِلَّا وَفِيهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ

لِلّٰہِ تَعَالٰی آسمان چرچراتا ہے اور اسے چرچرانے کا حق ہے، آسمان میں ہر قدم پر ایک فرشتہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہے (ترمذی) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے آسمان کے چرچرانے کی آواز سنی، نیز نبی کریم ﷺ نے پتھروں اور درختوں کا کلام سنا، اونٹ، گوہ اور ہرنی کا کلام سنا، جنات اور فرشتوں کا کلام سنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ عزوجل کا کلام سنا، اسی طرح قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کا کلام سنا، قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ (النمل ۱۸) یہاں تک کہ جب چیونٹی بولی اے چیونٹیو! تم اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ (کہیں) سلیمان اور اس کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے، درآں حالیکہ انہیں خبر نہ ہو، تو (سلیمان) اس کی بات پر مسکرا کر ہنس پڑے۔

③ قوت شامہ: جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کی سونگھنے کی قوت تھی کیونکہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا: اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ (۹۳) وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ (۹۴) (یوسف) میرے اس کُرتے کو لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، اور جب قافلہ (مصر سے) چلا تو ان کے باپ نے (گھر والوں سے) کہا بیشک میں ضرور یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں اگر تم مجھے بڑھاپے کی وجہ سے ناقص العقل نہ کہو، ان آیات سے معلوم ہوا کہ ادھر قافلہ مصر سے روانہ ہوا اور ادھر حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کُرتے سے ان کی خوشبو آگئی، یہ خوشبو کئی ایام کی مسافت پر محسوس کی گئی تھی۔

④ قوت ذائقہ: ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کو خیبر میں ایک یہودی عورت نے زہر آلود لقمہ کھلایا تو اس لقمہ نے آپ ﷺ سے کہا مجھ میں زہر ملا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا إِنَّ هَذَا الذِّرَاعَ يُخْبِرُنِي أَنَّهُ مَسْمُومٌ اور اسی باب سے یہ واقعات ہیں کہ جب آپ ﷺ نے اپنا لعاب دہن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی زہر خوردہ ایڑی میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دکھتی ہوئی آنکھوں میں، حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی میں ڈالا تو ان کو شفاء ہو

گئی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ہنڈیا میں لعاب دہن ڈالا تو کم کھانا بہت زیادہ آدمیوں کو کافی ہو گیا اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں۔ (تفسیر کبیر للرازی، تبیان القرآن)

⑤ قوت لامسہ: جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو وہ گلزار ہو گئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام برص کے مریضوں اور مادر زاد اندھوں پر ہاتھ پھیرتے تو وہ شفایاب ہو جاتے اور ہمارے نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کجھور کے ستون سے ٹیک لگائی تو اس میں حیات آ گئی، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے چھوڑ کر منبر پر بیٹھے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں اونٹنی کی طرح چیخنے لگا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد پہاڑ پر قدم رکھا تو اس میں حیات آ گئی، وہ ہلنے لگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اُحد! پر سکون ہو جا تو وہ ساکن ہو گیا، یہ تو حواس خمسہ ظاہرہ کا بیان ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حواس باطنہ کی غیر معمولی قوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ان حواس باطنہ میں سے ایک قوت حافظہ ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (الاعلیٰ: ۶) اب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھائیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بھولیں گے۔

اور ان حواس میں سے ایک قوت ذکاوت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں عَلَّمَنِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْفَ بَابٍ مِنَ الْعِلْمِ وَاسْتَنْبَطْتُ مِنْ كُلِّ بَابٍ أَلْفَ بَابٍ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے ایک ہزار باب سکھائے ہیں اور میں نے ہر باب سے ایک ہزار باب مستنبط کر لیے ہیں جب ایک ولی کی قوت ذکاوت کا یہ عالم ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت ذکاوت کا کیا عالم ہو گا۔

قوت محرکہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج پر جانا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا، حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اور قرآن مجید میں ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مصاحب نے پلک جھپکنے سے پہلے تخت ان کے سامنے حاضر کر دیا، قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ (النمل: ۴۰) جس کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا میں اس (تخت) کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ (جب نبی سلیمان کے ایک مصاحب کی قوت محرکہ کا یہ عالم تھا تو اللہ کے نبی سلیمان کی قوت محرکہ کا کیا عالم ہو گا، جب ان کی قوت محرکہ باکمال تھی تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت محرکہ کا کیا عالم ہو گا)

جب انبیاء علیہم السلام کی جسمانی قوتیں اس قدر کامل ہوتی ہیں تو ان کی روحانی اور عقلی قوتیں بھی منتہاء

کمال پر ہوتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا نفس قدسیہ تمام انسانوں کے نفوس سے اپنی ماہیت میں مختلف ہوتا ہے اور ان کے کمال نفس کے لوازم سے یہ ہے کہ وہ ذکاوت، ذہانت اور قوت عقلیہ میں عام انسانوں سے بہت بلند و برتر ہوں اور جسمانیات اور شہوات سے تنزہ میں بھی عام لوگوں سے بہت فائق ہوں اور جب ان کی روح انتہائی صاف اور مشرف ہو اور بدن بھی بہت منزہ اور پاکیزہ ہو تو ان کی قوت محرکہ اور قوت عاقلہ انتہائی کامل ہوں گی، کیونکہ روح فاعل ہے اور بدن قابل ہے اور روح کے انوار بدن تک پہنچتے ہیں اور جب فاعل اور قابل دونوں کامل ہوں تو ان کے آثار بھی بہت قوی اور بہت مشرف ہوں گے۔ (تفسیر کبیر للرازی، تبیان القرآن)

آل عمران سے کون مراد ہیں؟ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں عمران دو ہیں، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد، دوسرے حضرت مریم کے والد، اکثر سلف و خلف نے یہاں عمران ثانی مراد لیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ: اب اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم علوی کے ساکنین پر حضرت آدم علیہ السلام کو فضیلت دی پھر قوت روحانیہ کے کمال کو ان کی اولاد میں سے حضرت شیث علیہ السلام میں رکھا اور ان کی اولاد میں سے حضرت نوح علیہ السلام میں پھر ان کی اولاد میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اس کمال کو رکھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دو شاخیں ظاہر ہوئیں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح قدسیہ کے ظہور کے لیے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مبدء بنایا اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو دو شاخوں کا مبدء بنایا حضرت یعقوب علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل میں نبوت رکھی اور عیسو کی نسل میں بادشاہت رکھی اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور جب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو نبوت کا نور اور بادشاہت کا نور دونوں حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منتقل کر دیئے گئے اور قیامت تک کے لیے دین کی امامت اور ریاست کی فرماں روائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو سونپ دی گئی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والے خلفاء ریاست کے سربراہ بھی تھے اور دین کے امام بھی تھے۔ (تفسیر کبیر، تبیان القرآن)

وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی باتوں کو خوب خوب سننے والے ہیں، ان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو خوب خوب جاننے والے ہیں، انہی بندوں میں سے اپنی باتوں اور اپنے عمل پر مضبوطی سے کھڑے ہونے والے لوگوں کا اللہ تعالیٰ چناؤ کرتے ہیں، پھر کسی کے سر پر تاج نبوت سجا دیتے ہیں اور کسی کو رسالت کے جھومر سے مزین کرتے ہیں۔

زوجۂ عمران کی بیٹے کے لیے دعا

سوال ان آیات کریمات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ {۳۵} فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ {۳۶} فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ {۳۷} آل عمران

جواب ترجمہ: وہ وقت یاد کرنے کے لائق ہے جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے پروردگا جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے اس کو تیری نذر کرتی ہوں اسے دنیا کے کاموں سے آزاد رکھوں گی تو (اسے) میری طرف سے قبول فرما تو تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ پس جب اس کو جنا تو کہنے لگیں اے میرے رب بلاشبہ میں نے اس کو لڑکی جنا ہے، اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ اس نے جنا، اور نہیں ہے بیٹا بیٹی کی طرح سے، اور میں نے اس کا نام رکھ دیا ہے مریم اور بیشک میں اس کو اور اس کی ذریت کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔ سو اس کے رب نے قبول فرمالیا اس بچی کو اچھی طرح کا قبول فرمانا اور اس کو بڑھانا اور اس کو زکریا کی کفالت میں دے دیا۔ جب زکریا داخل ہوئے ان پر محراب میں تو پایا ان کے پاس رزق، تو انہوں نے کہا کہ اے مریم کہاں سے ہے یہ تیرے لیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بیشک اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے حساب۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ: حضرت عمران کی بیوی کا نام حنہ بنت فاقوذ تھا، حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ تھیں، ان کی اولاد نہیں ہوتی تھی، یہ بانجھ تھیں، وہ اولاد والی عورتوں پر بہت رشک کیا کرتی تھیں، ایک دن ایک درخت کے سایہ کے نیچے ایک پرندے کو دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کو چوغہ دے رہی ہے، تو ان کے دل میں لڑکے کی خواہش پیدا ہوئی اور اللہ تعالیٰ سے اسی وقت دعا کی اور خلوص کے ساتھ اللہ کو پکارا، اللّٰهُمَّ إِنَّ لَكَ عَلَيَّ نَذْرًا إِنْ رَزَقْتَنِي وَلَدًا أَنْ أَتَصَدَّقَ بِهِ عَلَى بَيْتِ الْمَقْدِسِ لِيَكُونَ مِنْ سَدَنَتِهِ اے اللہ! بے شک تیرے لیے مجھ پر ایک نذر ہے، اگر تو نے مجھے بیٹا دیا تو میں اسے بیت المقدس پر قربان کروں گی تاکہ وہ اس کی خدمت کرے، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی اور اسی رات انہیں حمل ٹھہر گیا، جب حمل کا یقین ہو گیا تو نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ مجھے جو اولاد دے گا اسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے اللہ کے نام پر آزاد کر دوں گی، پھر اللہ سے دعا کی کہ پروردگار! تو میری اس مخلصانہ نذر کو قبول فرما، تو میری دعا کو سن رہا ہے اور تو میری نیت کو بھی خوب جان رہا ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَى وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَى وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ: اب یہ معلوم نہ تھا کہ لڑکا ہو گا یا لڑکی، جب پیدا ہوا تو دیکھا کہ وہ لڑکی ہے اور لڑکی تو اس قابل نہیں کہ وہ مسجد مقدس کی خدمت انجام دے سکے اس کے لئے تو لڑکا ہونا چاہئے، تو عاجزی کے طور پر اپنی مجبوری جناب باری میں ظاہر کی کہ اے اللہ! میں تو اسے تیرے نام پر وقف کر چکی تھی لیکن مجھے تو لڑکی ہوئی ہے، وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ بھی پڑھا گیا یعنی یہ قول بھی حضرت حنہ بنت فاقوذا کا تھا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میرے ہاں لڑکی ہوئی اور "تا" کے جزم کے ساتھ بھی آیا ہے، یعنی اللہ کا یہ فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بخوبی معلوم ہے کہ کیا اولاد ہوئی ہے۔

اس زمانہ میں لڑکوں کو خدمتِ بیتُ المقدِس کے لئے دیا جاتا تھا اور لڑکیاں نسوانی عوارض اور کمزوریوں کی وجہ سے یہ کام نہیں کر سکتی تھیں اور مردوں کے ساتھ نہ رہ سکنے کی وجہ سے اس قابل نہیں سمجھی جاتی تھیں اس لئے ان لوگوں کو بہت زیادہ فکر لاحق ہوئی، ولادت سے پہلے بچی کے والد

عمران کا انتقال ہو گیا تھا۔ مریم علیہا السلام کی والدہ کے اخلاص کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بچی کی پیدائش کے بعد اس کا نام مریم رکھا، مریم ان کی زبان میں عبادت کرنے والی لڑکی کو کہا جاتا تھا، ان کی نیت یہی تھی کہ یہ بچی بس اللہ کی عبادت میں مصروف رہے گی، ان کے اخلاص ہی کی برکت تھی کہ اس زمانے میں چار ہزار بچے پیدا ہوئے مگر جس قدر شہرت حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش پر ان کو ملی کسی اور کے نصیب میں نہیں تھی۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو قبول فرمالیا، لڑکے کی بجائے انہی کی نذر قبول کرنے میں راضی ہو گیا، رب سے مراد وہ ذات عالی جو ان کی مالک ہے اور انہیں کمال تک پہنچانے والی ہستی ہے، امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو عبادت گاہ کی خدمت کے لیے وقف کئے جانے کو قبول فرما لیا۔ (جامع البیان) مریم علیہا السلام کو لڑکی تھی مگر حق تعالیٰ نے لڑکے سے بڑھ کر اسے قبول فرمایا۔ بیت المقدس کے مجاورین کے دلوں میں ڈال دیا کہ عام دستور کے خلاف لڑکی کو قبول کرلیں۔ (عثمانی) والدہ مریم علیہا السلام کی نذر کو اس لڑکی کی شکل میں بھی اللہ نے قبول کرلیا، جو تاریخ خدمت ہیکل میں ایک نئی بات تھی، مسیحی نوشتوں کے بہ موجب حضرت مریم علیہا السلام تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کرلی گئی تھیں اور معبد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ (تفسیر ماجدی)

قبول حسن کی تعبیرات: حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے قبول حسن کی مختلف تعبیرات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ① ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رحمہا اللہ اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان کے کچوکے سے محفوظ فرمایا، کیونکہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے کچوکا لگاتا ہے، اسی کچوکے کی وجہ سے بچہ روتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے دونوں ماں بیٹے کو اس کچوکے سے محفوظ فرمایا۔ (تفسیر کبیر)

② دوسری تعبیر قبول حسن کی یہ کی گئی ہے، جب حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہو گئیں تو ان کی والدہ جن کا نام حنہ تھا ان کو کپڑے میں لپیٹ کر بیت المقدس میں لے گئیں اور وہاں جو عبادت میں مشغول رہنے

والے حضرات مقیم تھے ان کے سامنے رکھ دیا (اور پوری کیفیت بتادی کہ میری یہ نذر تھی اور لڑکی پیدا ہوئی ہے) زمانہ حمل میں لڑکی کے والد جناب عمران کی وفات ہوچکی تھی وہ وہاں کے امام بھی تھے، وہ ہوتے تو پرورش کے زیادہ مستحق تھے، مریم علیہا السلام کی والدہ نے مریم (عابدہ) نام رکھا جس میں یہ اشارہ ہے کہ میں اپنی نذر پر اب بھی قائم ہوں، خدمت کے لیے نہیں تو عبادت ہی کے لیے سہی اسی نذر کی وجہ سے وہ بیت المقدس کے مقیمین کے پاس لے گئیں۔ (روح المعانی، انوار البیان)

③ تیسری تعبیر یہ ہے جو قفال نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے نقل فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام نے اپنے بچپن میں گفتگو کی جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گفتگو کی تھی، وہ اپنی چھاتی سے حضرت عیسیٰ کو بالکل دودھ نہیں پلاتی تھیں، ان کی غذا جنت سے آتی تھی۔ (تفسیر کبیر)

④ چوتھی تعبیر یہ ہے اس زمانے کی شریعت میں بیت المقدس کی خدمت کے لیے لڑکے کو اس وقت قبول کیا جاتا تھا جب وہ عاقل اور مسجد کی خدمت پر قادر ہو جاتا تھا، لیکن یہاں ایسی بات نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے مریم کی والدہ کی فریاد و تضرع دیکھتے ہوئے اس چھوٹی بچی کی ہی نذر قبول فرمالی، باوجودیکہ وہ مسجد کی خدمت پر قدرت نہیں رکھتی تھی، یہ سب تعبیرات قبول حسن کی ہیں۔

وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا: حضرت مریم علیہا السلام کی عمدہ پرورش کے متعلق امام رازی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ایک دن میں حضرت مریم علیہا السلام کی نشو و نما اتنی ہوتی تھی جتنی عام بچوں کی ایک سال میں ہوتی ہے اور دین داری میں بھی ان کی تربیت بہت اچھی تھی وہ بہت زیادہ نیک کام کرتی تھیں، پاکباز رہتی تھیں اور عبادت کرتی تھی۔ (تفسیر کبیر) ان کی کامل تربیت کی۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا: عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں تو ان کی ماں نے ان کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور ان کو کاہن بن عمران کے بیٹے کے پاس لے گئیں، جو اس زمانہ میں بیت المقدس کے دربان تھے اور ان سے کہا نذر میں مانی ہوئی اس لڑکی کو سنبھالو، یہ میری بیٹی ہے میں اس کو اپنے گھر نہیں لے جاؤں گی، انہوں نے کہا یہ ہمارے امام کی بیٹی ہے اور عمران ان کو نمازیں پڑھاتے تھے اور ان کی قربانیوں کے منتظم تھے، حضرت زکریا علیہ السلام نے کہا یہ لڑکی مجھے دے دو کیونکہ اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے، باقی لوگوں نے کہا ہم اس فیصلہ پر خوش نہیں ہیں یہ ہمارے امام کی

بیٹی ہے، پھر انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کے لیے قلموں کے ساتھ قرعہ اندازی کی، یہ وہ قلم تھے جن کے ساتھ وہ تورات لکھتے تھے، حضرت زکریا علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکل آیا اور انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کی۔

سدی رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ وہ لوگ دریائے اُردن میں گئے اور جن قلموں سے توراۃ لکھتے تھے وہ دریا میں ڈال دیئے کہ جس کا قلم پانی میں اس طرح کھڑا رہا جس طرح زمین میں نیزہ گاڑ دیتے ہیں، اس کے سپرد کی جائیں گی، تب انہوں نے حضرت مریم رحمہا اللہ کو لے لیا اور ان کی کفالت کی، (جامع البیان، تبیان القرآن)

بیت المقدس کے جن مجاوروں کے پاس حضرت مریم علیہا السلام کو چھوڑا گیا تھا وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کے احبار (علماء) تھے۔ (کبیر) نہر اُردن کی طرف قرعے ڈالنے کے لیے جانے والے ستائیس لوگ تھے۔ (کبیر) تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور تینوں بار حضرت زکریا علیہ السلام کا نام نکلا کہ وہ اس بچی کی کفالت کریں گے، چنانچہ اس قرعہ اندازی کے نتیجہ میں حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ (کبیر) یوں حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم رحمہا اللہ کے کفیل بن گئے، کفیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی انسان پر خرچ کرے اور اس کے مصالح کی دیکھ بھال کرے۔ (کبیر) حضرت زکریا علیہ السلام نے چھوٹی عمر میں اس بچی کی کفالت کی، بعض فرماتے ہیں کہ دودھ چھڑانے کی عمر کے بعد کفالت کی، قرآنی آیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کفالت کی عمر وہ تھی جب آپ کو رضاعت کی عمر کے بعد بے موسم پھل ملنے شروع ہوئے۔ (کبیر) بعض روایات کے مطابق ایک انا کو نوکر رکھ کر دودھ پلوایا گیا۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ: محراب سے مراد وہ بالا خانہ ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کے لیے بنوا دیا تھا، محراب (لغت میں) سب سے اونچی اور اعلیٰ نشست گاہ کو کہتے ہیں، مسجد کو بھی محراب کہا جاتا ہے کیونکہ مسجد شیطان سے جنگ کرنے کا مقام ہے، مبرد کا قول ہے کہ محراب کا اطلاق اس کمرہ پر ہوتا ہے جس پر زینہ کے ذریعہ سے چڑھا جاتا ہو۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے ربیع بن انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ زکریا علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کو سات دروازوں کے اندر رکھا تھا۔ (مظہری)

انہوں نے ایک جالی دار چوبارہ بنوایا ہوا تھا جس سے نیچے کا منظر دور دور تک نظر آتا تھا حضرت زکریا علیہ السلام کہیں جاتے تھے تو تالا لگا کر چابی ساتھ لے جاتے تھے۔ (ذخیرۃ الجنان)

محراب کا لغوی معنی ہے اَکرَمَ مَوضِعٍ فِي المَجلِسِ مجلس میں جو سب سے باعزت جگہ ہو اس کو محراب کہتے ہیں، عموماً اس حجرہ عبادت کو محراب کہا جاتا ہے، جو سطح زمین سے کچھ بلند بنایا جاتا ہے اور جس میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی ضرورت پڑتی ہے، ہیکل سلیمانی کے ارد گرد ہیکل کے خادموں اور چلہ کشوں کے لیے جو کمرے بنے ہوئے تھے انہی میں سے ایک میں حضرت مریم علیہا السلام مشغول عبادت رہا کرتی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام چونکہ ان کے سرپرست تھے اس لیے اکثر ان کی خبر گیری کے لیے ان کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ (ضیاء القرآن) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اَلْمِحْرَابُ أَشْرَفُ الْمَجَالِسِ وَأَرْفَعُهَا محراب سب سے زیادہ شرافت والی اور اونچی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ (تفسیر کبیر) یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام جوان ہو گئیں تو حضرت زکریا علیہ السلام نے مسجد میں ان کے لیے ایک کمرہ بنوایا، جس کا دروازہ درمیان میں رکھا گیا تھا، جس تک سیڑھی کے بغیر نہیں جایا جا سکتا تھا۔ (تفسیر کبیر) جب حضرت زکریا علیہ السلام باہر جاتے تھے حضرت مریم علیہا السلام کو جن سات دروازوں کے اندر رکھا گیا تھا انہیں بند کر کے جاتے تھے۔ (کبیر)

وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا: امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں، ضحاک بیان کرتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے پاس سردیوں میں گرمیوں کے اور گرمیوں میں سردیوں کے پھل دیکھتے تھے مجاہد رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے وہ ان کے پاس بے موسمی انگور دیکھتے تھے۔ (جامع البیان، تبیان القرآن)

قَالَ يَامَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللهِ: حضرت زکریا علیہ السلام نے جب رزق کی یہ فراوانی دیکھی تو پوچھا اے مریم! یہ رزق کہاں سے آیا؟ حضرت مریم علیہا السلام نے کہا، یہ اللہ تعالیٰ کے بیش بہا خزانوں سے آیا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ اَنّٰى لَكِ هٰذَا: یہ چیز تمہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟ بغرض استفسار و تحقیق نہیں بلکہ بطور استعجاب و تحسین کے ہے، جب کسی کا کمال اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ اور متکلم کے گمان و خیال سے بہت بڑھ کر ہو تو

اس طرح کا استعجاب قدرتی ہے، یہ استعجاب اظہار تحسین کا ایک اسلوب ہے، اس سے حضرت زکریا علیہ السلام کی تواضع اور قدر دانی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اپنی ایک زیر تربیت لڑکی کو، جس کی عمر ابھی کچھ بھی نہیں ہے، اس کی صلاحیتوں پر کس فیاضی سے داد دے رہے ہیں۔

حضرت مریم کا جواب، هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، بھی اس کم سنی میں ان کی پختگی عقل کا شاہد ہے کہ انہوں نے اس سب کو اللہ کا فضل و احسان قرار دیا، اس کو اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ نہیں قرار دیا۔

حضرت مریم رحمہا اللہ سے زکریا علیہ السلام نے جو سوال کیا تھا اس کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزق دنیا کا نہیں تھا، ورنہ سوال نہ کرتے، انہوں نے سوال اس طرح کیا کہ یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے جو دنیا کے رزق کے ساتھ میل نہیں کھاتا؟ اس سوال کے جواب میں حضرت مریم نے جو الفاظ استعمال کیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس سے اشارہ جنتی رزق کی طرف تھا۔

قرآنی آیت پر اگر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو اس سے اسی تفسیر کو تقویت ملتی ہے جو عام مفسرین کرام رحمہم اللہ نے بیان فرمائی ہے کہ حضرت مریم کے پاس بے موسی پھل آتا تھا، قرآن کریم کہتا ہے وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا جب بھی وہ مریم رحمہا اللہ کے پاس جاتے تو وہاں رزق پاتے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تازہ پھل کی بات کرتے ہیں، جو کسی کے پاس نہیں پایا جاتا تھا، ان کی روایت میں اس ٹوکری کا بھی ذکر ہے جس میں یہ پھل ہوتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سردی میں گرمی کے اور گرمی میں سردی کے پھل حضرت جبریل علیہ السلام مریم رحمہا اللہ کے پاس لاتے تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حضرت مریم رحمہا اللہ کا جملہ بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہو سکتا ہے، اس میں دونوں احتمال ہیں۔ (تفسیر کبیر) مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں رزق سے مراد علم ہے، مجاہد ہی فرماتے ہیں کہ رزق سے علمی صحیفے بھی مراد ہیں جسے روحانی غذا سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی) علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے مریم علیہا السلام کو ملنے والے اس رزق کو خرق عادت قرار دیا ہے۔ (تفسیر کبیر)

بیٹے کے لیے دعائے زکریا علیہ السلام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ {۳۸} فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ {۳۹} قَالَ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَلِكَ اللهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ {۴۰} قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ {۴۱} آل عمران

جواب ترجمہ: وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! اپنے پاس سے مجھے اچھی اولاد عطا فرما بیشک تو دعا کا خوب سننے والا ہے۔ پھر ایک دن) جب وہ حجرہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو فرشتوں نے انہیں آواز دی کہ اللہ آپ کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے، پیشوا ہوں گے اور نفس پر بڑا قابو رکھنے والے ہوں گے اور نیکوں میں ایک نبی ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ اے میرے رب! میرے لڑکا کیسے ہو گا؟ جب کہ میں بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بانجھ ہے اس نے فرمایا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بنا دیجیے اس نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہ ہے کہ تین دن لوگوں سے سوائے اشارہ کے بات نہ کر سکو گے اور اپنے رب کا ذکر کثرت سے کرو اور شام اور صبح اس کی پاکی بیان کرو۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ: مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو بے موسم پھل عطا فرما رکھا ہے، سردی میں گرمی کا، گرمی میں سردی کا، تو اس وقت ان کے دل میں بیٹے کی خواہش پیدا ہوئی، اگرچہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے، ہڈیاں کمزور ہو چکی تھیں، بڑھاپے کی وجہ سے ان کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے، ان کی بیوی بڑی عمر کی ہو چکی تھی، معاًوہ بانجھ بھی تھیں، اس سب کچھ کے باوجود انہوں نے اپنے رب سے بیٹے کا سوال کیا، چپکے چپکے اپنے رب کو پکارا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ (ابن کثیر)

قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں" جب حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم رحمہا اللہ کی کرامت اور رحمت خدا کی وسعت دیکھی اور محسوس کیا کہ خاندان والے سب ختم ہوگئے اور میرا کوئی ایسا بچہ نہیں جو علم و نبوت کا وارث بنے اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ چچا کی اولاد میرے بعد دین کو کھو بیٹھے گی تو ایسے وقت میں یا اس جگہ دروازے بند کرکے اپنے مالک سے دعا کی۔(تفسیر مظہری) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھل دیکھ کر غسل کیا اور دعا میں زاری کرنے لگے۔(المقتطف من عیون التفاسیر)

دعائے زکریا علیہ السلام: حضرت زکریا نے جو دعا مانگی اسے قرآن کریم نے یہاں نقل فرمایا ہے، دعا یہ ہے قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے نیک اولاد عطا فرما، بے شک آپ ہی دعاء کے سننے والے ہیں۔ یہ دعا کہاں مانگی؟ اس کے لیے قرآن کریم نے ھنالک اسم اشارہ استعمال کیا، ھنالک اور ھناک یہ اسم اشارہ زمان اور مکان دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اگر اسے زمان کے لیے مانیں تو بھی ٹھیک ہے کہ جب مریم بتول کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو اسی وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی اور اگر اسے مکان کے لیے مانیں تو بھی درست ہے کہ جس جگہ پر مریم بتول کے پاس وہ پھل دیکھے اسی جگہ پر دعا مانگی۔(کبیر) ابو محمد عبد الحق حقانی نے یہاں ھنالک کو ظرف زمان کے لیے مانا ہے۔(حقانی) پاکیزہ اولاد سے مراد نیک اور صالح اولاد ہے۔(المقتطف من عیون التفاسیر)

لفظ ھبہ استعمال فرمایا، کیونکہ ہبہ احسان محض ہوتا ہے، اس میں والد کے لیے بوڑھا اور والدہ کے لیے عاقر (بانجھ) ہونے کو دخل نہیں ہوتا، گویا کہ یوں دعا فرما رہے ہیں کہ مجھے اپنی جناب سے اولاد عطا فرمائیے، جو عام عادت کے برخلاف ہو، ذریت سے مراد یہاں ایک بیٹے کی درخواست تھی، یہاں دعا میں حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی تعریف وثناء کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ بہت زیادہ دعا سننے والے ہیں، یہاں صرف سننے کی بات ہی نہیں تھی بلکہ دعا قبول کرنے کی طرف بھی اشارہ تھا، یہاں زکریا علیہ السلام نے اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اقتدا کی ہے، کیونکہ انہوں نے بھی اپنے اللہ سے بیٹے کی درخواست کی تھی اور بڑھاپے میں کی تھی، جب انہوں نے چھیاسی اور چھیانوے سال کی عمر میں

اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے لیے دعا مانگی تھی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلآئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَى مُصَدِّقاً بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّهِ وَسَيِّداً وَحَصُوراً وَنَبِيّاً مِّنَ الصَّالِحِينَ: اسی مقام پر جب مریم بتول کے پاس بے موسم پھل دیکھے تو پکار اٹھے،، حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتے کے ذریعے بیٹے کی خوشخبری سنائی جب کہ وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، جس کا ذکر یوں فرمایا پھر فرشتوں نے اس کو آواز دی جب وہ حجرے کے اندر نماز میں کھڑے تھے کہ بیشک اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو اللہ کے ایک حکم کی گواہی دے گا اور سردار ہو گا اور عورت کے پاس نہ جائے گا اور صالحین میں سے نبی ہو گا۔ یہاں ملائکہ (فرشتوں) اگرچہ جمع استعمال فرمایا سے مراد صرف جبریل امین ہیں، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت زکریا علیہ السلام کو خوشخبری سنائی تھی، یہاں ملائکہ جمع استعمال کیا گیا ہے تعظیم کے لیے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹے کا نام یحییٰ رکھا گیا، اس میں ایک باریک اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو ایمان واطاعت کے ساتھ زندہ رکھا، زندگی بھر کبھی ان سے کوئی نافرمانی کا کام نہیں ہوا، اس میں ایک باریک اشارہ یہ بھی دیا گیا کہ نماز میں مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے، جو حاجات اللہ کے سامنے رکھی جاتی ہیں وہ پوری ہوتی ہیں۔

یہاں بتایا گیا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں گے، کلمۃ اللہ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی عادی سبب کے بغیر کلمہ کن سے پیدا فرمایا تھا، حضرت یحییٰ علیہ السلام پہلے وہ شخص تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ مہینے بڑے تھے، جب یہ دونوں اپنی اپنی ماؤں کے پیٹوں میں تھے تو اس وقت ان کی ماؤں نے ایک دوسری سے ملاقات کی تھی، اس دوران جو ان میں گفتگو ہوئی تھی اس میں ان دونوں عورتوں نے ایک دوسرے سے کہا تھا کہ وہ حاملہ ہیں، ایک کے پیٹ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام تھے تو دوسری کے پیٹ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہاں سید کا معنیٰ حلیم یعنی بردبار کیا ہے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے سید کا معنیٰ کریم یعنی شریف کیا ہے، سید اصل میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنے لوگوں کی قیادت

کرے، جس کے پیروکار اور اتباع ہوں، جس کے معاونین و مساعدین ہوں، پھر سید کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو دین میں دوسروں سے فوقیت رکھتا ہو، حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سردار تھے اور انہی میں ان کے پیروکار اور اتباع تھے، جبائی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ اہل ایمان کے سردار تھے، علم، حلم، عبادت اور تقویٰ میں ان کے سردار تھے، ابن مسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ فقیہ عالم تھے، عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہیں غصہ نہیں آتا تھا، قاضی عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سید اسے کہا جاتا ہے جو سب سے آگے ہو اور اس کی طرف لوگوں کا رجوع ہو، وہ لوگوں کے لیے دین میں قدوہ اور پیشوا تھے، ان میں علم، حلم، کرم، عفت، زہد اور ورع کی تمامی صفات موجود تھیں۔

حصور حصر سے ہے، اس کا معنیٰ روکنا ہوتا ہے، حصور اس شخص کو کہا جاتا ہے جو راز دان ہو، راز کو چھپائے رکھے، حصور اس شخص کو کہا جاتا ہے جو قدرت و طاقت ہونے کے باوجود عورتوں کے قریب تک نہ جائے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نامرد تھے، کیونکہ نامردی یہ عیب ہے جس سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام پاک تھے، امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حصور کے ذیل میں ان لوگوں کے وہ اقوال بھی نقل کیے ہیں جو حصور کی وضاحت میں لکھے گئے ہیں، مگر انہیں امام رازی رحمہ اللہ نے فاسد قرار دیا ہے، کیونکہ یہ مقام حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تعریف و ستائش کا ہے، یہاں عیوب بیان کرنے کا کوئی مقام و موقع ہی نہیں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ وہ نامرد تھے تو یہ قول باطل ہے، ارباب تحقیق فرماتے ہیں کہ وہ زہد اور عفت کی وجہ سے عورتوں کے پاس نہیں جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں سیادت، حصارت (زُہدِ تام) کے بعد نبوت عطا فرمائی تھی۔

نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ: حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات بتاتے ہوئے نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ بھی فرمایا کہ یہ بچہ جس کی پیدائش کی بشارت دی جا رہی ہے نبی ہو گا اور صالحین میں سے ہو گا، صالح صلاح سے مشتق ہے جو شخص گناہوں سے بچتا ہو اور نیکیوں سے آراستہ ہو اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع رکھتا ہو وہ صالح ہے اور اس کے بہت سے درجات ہیں اور مراتب ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کرتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ اور سورۃ انبیاء میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ

اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کرلیا، بیشک وہ صالحین میں سے تھے، معلوم ہوا کہ صالحیت بہت بڑی بلکہ اہل خیر کی مرکزی صفت ہے، صالح ہونا بہت بڑی چیز ہے۔(انوارالبیان) اگر طبقہ انبیاء میں صالحیت ونیکوکاری نہ ہو تو نبوت کا معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی حیرانی: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت دی تو انہوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیوں کیا؟ اس تعجب کا ذکر سورۃ آل عمران کی اگلی آیت میں یوں ہے

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، اے میرے پروردگار! میرے لیے بیٹا کہاں سے ہوگا؟ جب کہ میں بڑھاپے کو پہنچ گیا ہوں، اولاد تو جوانی میں ہوتی ہے، میری بیوی بانجھ ہے جو اولاد جننے کے قابل ہی نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ جو چاہتا ہے وہ کر دیتا ہے، بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت زکریا علیہ السلام ایک سو بیس سال کے ہوگئے تھے، ایک تفسیر کے مطابق وہ ننانوے سال کے تھے، ان کی بیوی بانجھ تھیں، وہ عمر کے اٹھانوے سال کو پہنچ چکی تھیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ جواب دیا کہ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے فرشتے کی طرف سے خوشخبری دیے جانے کے بعد فرشتے کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ حسب سابق اللہ ہی کی طرف روئے سخن متوجہ کیا، یہ تضرع اور مناجات میں مبالغے کو ظاہر کرتا ہے۔ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ کیف کے معنیٰ میں ہے کہ لڑکا کیسے ہوگا؟ وہ اپنی عمر اور اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے لڑکے کی پیدائش کو خارج از امکان سمجھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے اس تعجب بھرے کلام کے جواب میں فرمایا کہ ہم جو افعال عجیبہ وغریبہ میں سے چاہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّيَ آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت سنائی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے، فرط مسرت وشادمانی میں انہوں نے اللہ سے عرض کی کہ کوئی نشانی بتایئے، حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے اپنی بیوی کے حاملہ ہونے کی نشانی کے بارے میں سوال کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو اس نشانی

سے آگاہ فرمایا، وہ نشانی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ کسی سے تین دن بات نہیں کر سکیں گے، سورۃ مریم میں تین راتوں کا ذکر ہے، ان میں کوئی تضاد نہیں ہے، مقصد دن اور رات دونوں میں بات نہیں کر سکیں گے، مگر اشارے ہی اشارے میں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آدمیوں کے ساتھ گفتگو کرنے سے زبان مبارک تین روز تک بند رہی، لوگوں سے ان تین دنوں میں بات کرنے کی قدرت نہیں تھی اور تسبیح و ذکر پر آپ قادر رہے اور یہ ایک عظیم معجزہ ہے کہ جس میں جوارح صحیح وسالم ہوں اور زبان سے تسبیح و تقدیس کے کلمات ادا ہوتے رہیں، مگر لوگوں کے ساتھ گفتگو نہ ہو سکے اور یہ علامت اس لئے مقرر کی گئی کہ اس نعمتِ عظیمہ کے ادائے حق میں زبان ذکر و شکر کے سوا اور کسی بات میں مشغول نہ ہو۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق یہ امتحان تھا، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹے کی بشارت ملنے کے بعد آپ نے نشانی کا سوال کیا تو ان کی زبان سے قوت گویائی لے لی گئی، وہ بات کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے، وہ رمز یعنی اشاروں سے بات کرتے تھے، ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے، سر اور پلکوں سے اشارہ کرتے تھے، آنکھوں اور ہونٹوں سے اشارہ کرتے تھے، یہاں رمز کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا کہ وہ دونوں ہونٹ ہلاتے تھے، مگر بات نہیں کر سکتے تھے، ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا کہ وہ بات تو کرتے تھے مگر بہت ہی آہستہ کرتے تھے، آواز بلند نہیں ہوتی تھی۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ: اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر۔ جس زمانے اور جن ایام میں زبان کی بندش رہے اس زمانے میں اپنے رب کا بہت زیادہ ذکر کرو، یہاں ذکر سے مراد زبان کے ساتھ ذکر کرنا ہے، تسبیح کیجیے سے مراد نماز ادا کیجیے ہے، نماز کو یہاں تسبیح کہا گیا ہے، عشی زوال کے وقت سے لے کر صبح صادق یا رات کے کچھ حصہ تک کے وقت کو کہتے ہیں، یہ لفظ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے وقت تک کو شامل ہے۔ ابکار صبح صادق سے لے کر چاشت تک کے وقت کو شامل ہے۔ عربی زبان میں جب کوئی شخص کسی کام کے لیے دن کے ابتدائی حصے میں نکلے تو اس کے لیے بَكَّرَ يُبَكِّرُ بولا جاتا ہے، پہلے پہلے پھل کو عربی میں بَاكُورَةٌ کہا جاتا ہے، پھر طلوع فجر سے چاشت کے وقت تک پر ابکار کا لفظ بولا جانے لگا۔

حضرت زکریا علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام کے والد کا نام برخیا تھا، آپ کی کنیت ابو یحییٰ تھی، حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد عمران بن ماثان دونوں ہم زلف تھے، حضرت زکریا علیہ السلام کی گھر والی اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ دونوں بہنیں تھیں، حضرت مریم علیہا السلام کی ولادت ہوئی تو ان کی والدہ کی وفات کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کی پرورش کی، کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم رحمہا اللہ کے خالو تھے، آپ بڑھئی (نجار) کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے، اپنے ہاتھ سے کماتے اور کھاتے تھے، آپ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، ان کی بیوی ایشاع یا الیشع حضرت ہارون کی ذریت میں سے تھیں۔ (تاریخ ابن کثیر بحوالہ قصص القرآن)

علامہ حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں کاہن ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرۃ بیت المقدس) کی مقدس رسوم ادا کیا کرے، اس کے لیے مختلف قبائل میں سے الگ کاہن منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے، چنانچہ زکریا بنی اسرائیل کے معزز کاہن بھی تھے، جلیل القدر پیغمبر بھی، چنانچہ قرآن عزیز نے آپ کو انبیاء کی فہرست میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "اور زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور الیاس یہ سب نیکوکاروں میں سے ہیں"۔ لوقا کی انجیل میں ان کو کاہن کہا گیا ہے، انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔

حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش کے بعد کفالت کا قرعہ نیک فال انہی کے نام نکلا، انہوں نے مریم کی پرورش فرمائی، آپ کو حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کا حقدار قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان کی بیوی ایشاع اور حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں اور خالہ بمنزلہ والدہ کے ہوتی ہے۔ (قصص القرآن ج ۲)

حضرت مریم علیہا السلام سمجھ دار ہو گئیں تو زکریا علیہ السلام نے ان کے لیے ہیکل کے قریب ایک حجرہ (خلوہ) مخصوص کر دیا، جہاں وہ دن میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتیں اور رات اپنی خالہ کے پاس گزارتی

تھیں۔(قصص)جب حضرت زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے حجرے میں داخل ہوتے تو وہاں بے موسم پھل دیکھتے تھے،انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے ایک بار تعجب سے پوچھا کہ یہاں کہاں سے آئے ہیں؟انہوں نے جواب دیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں،اسی وقت یااس موقع پر حضرت زکریا علیہ السلام نے بڑھاپے میں بیٹے کی دعا کر دی، جس پر اللہ نے دعا قبول کرتے ہوئے بیٹا یحییٰ عطا فرمایا۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اپنی قوم سے بھاگے اور ایک درخت کے خلاء میں داخل ہو گئے تو آپ کی قوم آئی اور انہوں نے درخت پر آرار کھ کر چلا دیا،جب آرا آپ کی پسلیوں کو پہنچا تو آپ رو پڑے تو اللہ عزوجل نے ان کی طرف وحی کی کہ اگر آپ کی آواز بند نہ ہوئی تو میں زمین اور زمین والوں کو الٹ پلٹ کر دوں گا(تاکہ انہیں آپ پر کیے گئے ظلم کی سزا ملے) پھر آپ کا رونا ختم ہو گیا، یہاں تک کہ آپ دو ٹکڑے ہو گئے۔(البدایہ والنہایہ ۲)ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ میں ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ ہے کہ جن کے درخت پھٹا وہ شعیب تھے اور جو اپنی موت فوت ہوئے وہ زکریا تھے۔(البدایہ ۲)اس کی حقیقت اللہ کی جانتا ہے کہ آرا سے کس پیغمبر کو شہید کیا گیا ہے؟لیکن حضرت زکریا والی بات درست لگتی ہے اور یہی مشہور بھی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاؤں اور زاریوں سے اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام عطا فرمائے، ان کی بشارت جبریل امین علیہ السلام نے آپ کو دی، آپ کو عہد شباب میں ہی نبوت سے سرفراز فرما دیا گیا تھا، آپ کو کتاب بھی دی گئی تھی، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام معاصر تھے، ان کی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میرے لیے استغفار کریں، کیونکہ آپ مجھ سے بہتر ہیں، حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بھی عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ میرے لیے استغفار کریں، کیونکہ آپ مجھ سے بہتر ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ آپ ہی مجھ سے بہتر ہیں، کیونکہ میں نے اپنے اوپر سلامتی کی بات کی تھی، جب کہ آپ پر خود اللہ تعالیٰ نے سلام بھیجا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اولاد آدم میں سے کوئی ایسا نہیں جس سے خطا سرزد نہ ہوئی ہو یا (کم از کم) اس نے خطا کا ارادہ نہ کیا ہو، سوائے حضرت یحییٰ علیہ السلام ابن زکریا کے، (البدایہ والنہایہ ج ۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شان میں فرمایا کہاں گئے شہید بن شہید جو بالوں کا لباس پہنتے اور درخت کے پتے کھا کر گزر بسر کرتے کہ کہیں کوئی گناہ سرزد نہ ہو جائے۔ (مسند احمد، البدایہ والنہایہ ۲) ایک شہید سے مراد زکریا علیہ السلام اور دوسرے شہید سے مراد حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں۔

ابن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے آدم کا ہر بیٹا قیامت کے دن آئے گا تو اس کے ساتھ ضرور کوئی گناہ ہو گا سوائے حضرت یحییٰ علیہ السلام ابن زکریا کے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲) یہاں گناہ سے مراد خطائے اجتہادی یا لغزش ہے، کیونکہ اہل سنت والجماعت کے عقائد میں انبیاء کرام علیہم السلام نبوت سے پہلے اور بعد معصوم ہوتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام سے کوئی چھوٹا اور بڑا گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ جنتی جوانوں کے سردار ہیں سوائے دو خالہ زاد بھائیوں کے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے یعنی ان کے سردار نہ ہوں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُون کا لباس زیب تن کرتے تھے جب کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جانوروں کے بالوں کا لباس پہنتے تھے اور کسی کے پاس کوئی دینار درہم نہیں تھا، نہ کوئی غلام نہ کوئی لونڈی، نہ کوئی ٹھکانہ جس میں وہ ٹھہرتے، جہاں کہیں رات آجاتی وہیں ٹھہر جاتے، جب بچھڑنے لگے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے کوئی نصیحت کرتے جایئے، فرمایا غصہ مت کرنا، حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا میں طاقت نہیں رکھتا کہ غصہ نہ کروں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مال کے دھوکے میں نہ پڑنا، تو فرمایا یہ ہو سکتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۲)

حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ باتوں کا حکم فرمایا کہ ان پر پوری طرح عمل پیرا رہو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کرو تو قریب تھا کہ آپ ان پر عمل میں سستی کرتے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کو فرمایا آپ کو پانچ باتوں کا حکم ملا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو، تو

آپ ان کو یہ باتیں پہنچائیں یا میں پہنچاؤں گا، تو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میرے بھائی! مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے عذاب میں نہ پکڑ لیا جائے یا مجھے دھنسا دیا جائے پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور بیت المقدس میں سب کو بلا لیا، پھر مسجد لوگوں کے ہجوم سے بھر گئی تو آپ شرف و اعزاز کے ساتھ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ کی حمد و ثناء بیان کی، پھر فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ خود بھی عمل کروں اور تم کو بھی ان کا حکم دوں۔

ان پانچ باتوں میں سب سے ① پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، صرف اسی اکیلے کی عبادت کرو، اس کی مثال ایسی ہے گویا کسی نے کوئی غلام خریدا اور اپنے مال، سونے یا چاندی کے ساتھ خریدا، پھر وہ غلام کام کر کے محنت مزدوری کا پیسہ دوسرے کو دے دیتا ہے تو تم بتاؤ کہ کون ایسے غلام کو پسند کرتا ہے؟ اور بے شک اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے وہی تمہارا روزی رساں ہے، اس لیے اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور تمہیں نماز کا حکم دیتا ہوں جب تم نماز ادا کرتے ہو تو اللہ عزوجل اپنا رخ اس کی طرف متعین کر لیتا ہے، اس لیے جب تم نماز پڑھو تو نماز میں کسی اور طرف دھیان مت لگاؤ اور میں تمہیں روزوں کا حکم دیتا ہوں اور اللہ نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ کسی جماعت میں ایک شخص کے پاس مشک کی پوٹلی ہے اور بے شک روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے اور میں تم کو صدقے کا حکم دیتا ہوں اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص کو اس کے دشمنوں نے قید کر لیا ہے پھر اس کے ہاتھ گردنوں کے ساتھ باندھ دیے اور پاؤں بھی باندھ دیے ہیں تاکہ اس کی گردن اُڑا دیں تو وہ قیدی شخص کہتا ہے کیا تمہیں مال کی ضرورت ہے جو میں تم کو دوں اور تم مجھے آزاد کر دو؟ پھر وہ مال دیتا رہتا ہے تھوڑا بھی زیادہ بھی حتی کہ وہ اپنی جان کو رہا کرا لیتا ہے اور میں تم کو اللہ کے ذکر کی کثرت کا حکم دیتا ہوں، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شخص کے پیچھے اس کے دشمن تعاقب میں ہیں اور بہت تیز ہیں تو وہ ایک انتہائی مضبوط قلعے میں محفوظ ہو جاتا ہے، اس طرح بندہ ذکر کے ساتھ قلعہ سے زیادہ شیطان کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۲)

ابن عساکر کی روایت میں ہے کہ ربیع بن انس رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ہمیں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ روایت پہنچی جو انہوں نے علماء بنی اسرائیل سے سنی تھی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام

پانچ کلمات کے ساتھ مبعوث ہوئے، پھر یہی باتیں ذکر کیں، علماء نے ذکر کیا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام لوگوں سے اکثر الگ تھلگ رہتے تھے، جنگل وبیابان میں انس رکھتے تھے، درختوں کے پتے کھا لیتے اور نہر پر جا کر پانی پی لیتے تھے، کبھی کبھار ٹڈی کی غذا استعمال فرماتے تھے، پھر اپنے آپ کو مخاطب کر کے فرماتے تھے کہ اے یحییٰ! تجھ سے زیادہ نعمتوں سے مالا مال کون ہے؟

حضرت یحییٰ علیہ السلام بہت ہی عبادت گزار تھے، والدین ان کی تلاش میں نکلے تو دیکھا کہ بحیرہ اُردن کے پاس ہیں، دونوں ان کے قریب ہوئے تو آپ نے دونوں کو عبادت کے انہماک اور خوف وخشیت سے خوب رلایا، حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ان کا کھانا سبز گھاس ہوتا تھا اور آپ اللہ کے خوف سے اتنا روتے کہ اگر آپ کی آنکھوں پر تار کول ہوتا تو وہ آپ کو جلا ڈالتا۔ (البدایہ)

وہیب بن الورد سے منقول ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو تین دن تک گم پایا تو آپ ان کی تلاش میں جنگل کو نکلے دیکھا کہ وہ ایک قبر کھودے اس میں کھڑے ہو کر اپنے آپ پر زار و قطار رو رہے ہیں تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا اے بیٹے! میں تین دن سے تیری تلاش میں ہوں اور تو قبر کھودے اس میں کھڑا رو رہا ہے؟ عرض کی اے ابا جان! کیا آپ نے ہی مجھے خبر نہیں دی کہ جنت وجہنم کے درمیان ایسا جنگل ہے جس کو آنسوؤں کے بغیر قطع نہیں کیا جا سکتا تو زکریا نے فرمایا اچھا بیٹے! روؤ تو پھر دونوں بے تحاشا روئے۔ (البدایہ ۲) علماء کہتے ہیں کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام اس قدر روتے تھے کہ آپ کے رخساروں پر آنسوؤں کی وجہ سے گڑھے پڑ گئے تھے۔ (البدایہ)

تاریخ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت کا عجیب واقعہ مذکور ہے، علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ علمائے تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں "کسی بادشاہ دمشق نے اپنی کسی محرم سے شادی کا ارادہ کیا یا کسی بھی ایسی عورت سے جس سے شادی کرنا اس کے لیے حلال نہ تھا، تو حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اس کو منع کیا تو یہ بات عورت کے دل میں کھٹکتی رہی، پھر جب بادشاہ اور عورت کے درمیان محبت کا سلسلہ بڑھتا گیا تو عورت نے بادشاہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا خون مانگا تو بادشاہ نے ہامی بھر لی اور کسی قتل کرنے والے کو بھیجا تو پھر بادشاہ نے بمع قاتل کے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر اور طشت میں بھرا ہوا ان کا خون عورت کے پاس بھیج دیا تو کہا جاتا ہے عورت فوراً اسی گھڑی ہلاک ہو گئی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

حضرت یحییٰ علیہ السلام کہاں قتل کیے گئے، اس بارے میں ایک واقعہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ انہیں مسجد اقصیٰ میں شہید کیا گیا ہے، بیت المقدس کی چٹان (صخرہ) پر ستر پیغمبروں کو شہید کیا گیا ہے، انہی میں ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام تھے۔ منقول ہے کہ بخت نصر دمشق آیا تو وہاں یحییٰ کا خون جوش مار رہا تھا تو بخت نصر نے اس خون کے بارے میں پوچھا لوگوں نے حقیقت حال کی خبر دی کہ کس طرح مظلوم پیغمبر بے گناہ شہید کیے گئے تو بخت نصر نے برائے انتقام ستر ہزار اسرائیلیوں کو قتل و خونریزی سے دوچار کیا۔ (البدایہ ولنہایہ)

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس روایت کو درست مانتے ہوئے فرمایا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام دمشق میں شہید کیے گئے اور بخت نصر کا قصہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد واقع ہوا۔ (البدایہ) زید بن واقد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب لوگوں نے دمشق کی مسجد بنانے کا ارادہ کیا تو قبلہ کے ستونوں میں سے جو مشرق کی جانب ہے اس کے نیچے سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر مبارک نکالا گیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کھال اور بال وغیرہ اپنی حالت پر بالکل صحیح سالم ہیں، کچھ بھی تبدیلی نہیں ہوئی، ایک روایت میں ہے کہ گویا ابھی ابھی شہید کیے گئے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ)

دمشق کے بادشاہ ہداوین بن ہدار نے اپنے بیٹے کی شادی اپنی بھتیجی صیدا کی ملکہ اریل سے کروا دی، ایک بار اس کے خاوند نے اس کے بارے میں تین طلاق کا حلف اٹھایا پھر ندامت ہوئی تو واپسی کی کوئی صورت کے لیے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے جواب دیا کہ جب تک دوسرے سے نکاح نہ کرے تب تک آپ سے نکاح نہیں کر سکتی، تو اس سے لڑکی کو حضرت یحییٰ علیہ السلام سے کینہ و دشمنی پیدا ہو گئی، اس نے بادشاہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر مانگا اور یہ اس نے اپنی ماں کے اشارے پر کیا تھا، لیکن بادشاہ نے اول تو انکار کیا پھر مجبور ہو کر مان بیٹھا، قاتل کو آپ کے پاس بھیجا، آپ محراب میں نماز پڑھ رہے تھے اور وہ جبرون کی مسجد تھی، تو جو شخص آپ کا سر مبارک لایا تو سر نے اس کو کہا تیرے لیے نکاح کرنا درست نہیں یہاں تک کہ تو غیر سے اس کا نکاح کروا دے تو عورت حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر طاق میں رکھ کر اپنی ماں کے پاس لے گئی اور آپ کا سر تب بھی یہی بول رہا تھا، جب آپ کا سر اقدس اس بے غیرت ماں کے سامنے رکھا گیا تو زمین نے اس کو قدموں تک نگل لیا پھر سرینوں

تک اوراس کی ماں چیخ وپکار کرتی رہی، خادمائیں بھی آہ وزاری میں مصروف اپنے چہروں کو تھپڑ مارتی رہیں، پھر زمین اس کو شانوں تک نگل گئی، تب اس کی ماں نے حکم دیا کہ اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے تاکہ سر تو باقی بچ جائے، پھر سر تن سے جدا کر دیا گیا، پھر زمین نے اس کے نگلے ہوئے کمینے جسم کو بھی باہر اچھال دیا اور پھر یہ سب لوگ ذلت وفقر تباہی وفناء میں غرق ہوتے گئے اور پیغمبروں کا خون جوش مار مار کر مسلسل انتقام کے لیے لوگوں کو اکساتا رہا یہاں تک کہ بخت نصر آیا اوراس نے اس کے انتقام میں پچہتر ہزار ظالموں کو قتل کیا، تب کہیں جا کر یہ خون ٹھنڈا ہوا۔ (البدایہ والنہایہ)

علامہ طبری رحمہ اللہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے نقل کردہ واقعہ کے ساتھ ملتا جلتا ذکر کیا ہے، ہاں اس میں اتنا فرق بیان کیا گیا کہ بادشاہ جو اپنی محرم لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا اس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اپنے پاس بلوایا اور قتل کرا دیا، اس ظالمانہ اقدام کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو اس ظالم بادشاہ پر مسلط کر دیا اور اس کے دل میں ظالم بادشاہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا بدلہ لینے کی بات ڈال دی، چنانچہ بخت نصر نے ایک سال میں اس ملک کے ستر ہزار افراد قتل کیے۔ (تاریخ طبری ج ا حصہ دوم)

بنی اسرائیل کے بادشاہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بہت احترام کرتے تھے، اپنے ہر معاملہ میں ان سے مشورہ لیتے تھے اور ان کی مجالس میں حاضری دیتے تھے، ایک ایسا ہی عقیدت مند بادشاہ اپنی سوتیلی بیٹی کے ساتھ شادی رچانا چاہتا تھا، مشورہ لینے پر حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ تمہارے لیے جائز نہیں۔

جب یہ بات اس بادشاہ کی بیوی اور سوتیلی بیٹی کو پہنچی تو انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بغض ہو گیا اور انہوں نے کسی نہ کسی طریقہ سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل سے متعلق منصوبے بنانے شروع کر دیے، آخر کار اس نے چال چلی کہ اپنی بیٹی کو بادشاہ کی محفل ناؤنوش میں زرق برق لباس پہنا کر اور سولہ سنگھار سے پرکشش بنا کر بھیج دیا اور ساتھ سمجھا دیا کہ بادشاہ کے رعب میں آکر اسے اپنے اوپر غلبہ نہ پانے دینا، البتہ جب وہ تمہاری طرف متوجہ ہو تو زیر ہونے کے لیے یہ شرط رکھنا کہ پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کرے، چنانچہ لڑکی نے یہی کیا اور بادشاہ کے ہزار ہا بار منع کرنے پر بھی اپنی شرط پر

اَڑی رہی، جب لڑکی اس شرط پر بضد رہی کہ جب تک مجھے حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر طشت میں لا کر نہ دیا جائے گا تمہیں قربت نہ دوں گی، آخر کار بادشاہ اس کے حسن کے چکروں میں پھنس گیا۔ (طبری) طبری رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ کے بیان کردہ ان واقعات میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے لیکن اتنی بات مشترکہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔

جب بادشاہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ذبح کروا کر طشتری میں اس لڑکی کے سامنے ان کا سر رکھ دیا تو ان کے منہ سے آواز آئی "تمہارے لیے سوتیلی بیٹی سے نکاح جائز نہیں" (طبری) جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ اس سر سے خون ٹھاٹھیں مار کر بہہ رہا ہے، اس خون پر مٹی ڈالی گئی لیکن اب خون مزید جوش مارنے لگا، پھر مٹی ڈالی گئی مگر خون تھا کہ تھمتا ہی نہیں یہاں تک کہ شہر کی فصیل (دیوار) تک پہنچ گیا اور اب بھی جوش مار رہا تھا۔ (طبری)

حضرت مریم علیہا السلام کی شان امتیازی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ {۴۲} يَامَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ {۴۳} ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ {۴۴} إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ {۴۵} وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ {۴۶} قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ {۴۷} آل عمران

جواب ترجمہ: اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے آپ کو چن لیا ہے اور آپ کو پاکی بخشی ہے اور تمام جہانوں کی عورتوں پر آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اے مریم! اپنے رب کی عبادت میں لگی رہیے اور سجدے کیے جائیے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیجیے۔ یہ غیب کی وہ خبریں ہیں

جن کو ہم آپ کی طرف بھیج رہے ہیں اور آپ ان کے پاس اس وقت نہ تھے جب وہ اس لیے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا اور اس وقت بھی آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔ جب فرشتوں نے مریم سے کہا تھا کہ اللہ آپ کو اپنے پاس سے کلمہ (کن) کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہو گا، دنیا و آخرت میں وہ عزت والا ہو گا اور مقربین (بارگاہ الٰہی) میں سے ہو گا۔ وہ گود میں لوگوں سے گفتگو کرے گا اور ادھیڑ عمر ہو کر بھی اور وہ نیکوکاروں میں ہو گا۔ وہ بولیں اے میرے رب! مجھے لڑکا کہاں سے ہو گا مجھے تو کسی آدمی نے چھوا تک نہیں؟ اس نے کہا کہ اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ:

گزشتہ آیات میں حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر کیا گیا، انہی کی کفالت کے سلسلہ میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا، ان کے پاس آنے والے بے موسم پھلوں کا تذکرہ کیا گیا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی آمد کا ذکر کیا گیا، یہاں بھی اسی سلسلہ کو آگے بڑھایا جا رہا ہے، یہاں حضرت مریم علیہا السلام کا ایک اور اعزاز بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے انتخاب و چناؤ کی انہیں ملائکہ کی زبانی اطلاع دی گئی، ان کی پاکیزگی اور طہارت پر آسمانی سند لائی گئی، انہیں جہان کی خواتین پر فوقیت کا اعلان کیا گیا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ " اللہ تعالیٰ کے حکم سے مریم علیہا السلام کو فرشتوں نے خبر پہنچائی کہ اللہ نے انہیں ان کی کثرت عبادت ان کی دنیا کی بے رغبتی کی شرافت اور شیطانی وساوس سے دوری کی وجہ سے اپنا قرب خاص عنایت فرما دیا ہے اور تمام جہان کی عورتوں پر انہیں خاص فضیلت دے رکھی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنتی عورتیں اونٹ پر سوار ہونے والیاں ہیں، ان میں سے بہتر عورتیں قریش کی ہیں جو اپنے چھوٹے بچوں پر بہت ہی شفقت اور پیار کرنے والی اور اپنے خاوند کی چیزوں کی پوری حفاظت کرنے والی ہیں، حضرت مریم بنت عمران اونٹ پر کبھی سوار نہیں ہوئیں۔ (مسلم)

ایک حدیث میں ہے عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت مریم بنت عمران ہیں اور عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت خدیجہ بنت خویلد ہیں۔ (بخاری، مسلم) ساری دنیا کی عورتوں میں سے تجھے کافی ہیں مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد، آسیہ فرعون کی بیوی ہیں اور حدیث میں ہے یہ چاروں عورتیں تمام عالم کی عورتوں سے افضل اور بہتر ہیں اور حدیث میں ہے مردوں میں سے کامل مرد بہت سے ہیں لیکن عورتوں میں کمال والی عورتیں صرف تین ہیں، مریم بنت عمران، آسیہ فرعون کی بیوی اور خدیجہ بنت خویلد اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید یعنی گوشت کے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی کی تمام کھانوں پر۔

حضرت مریم علیہا السلام غسل خانہ میں داخل ہوئیں، اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ انسانی شکل میں کوئی موجود ہے، اس وقت حضرت مریم علیہا السلام ڈر گئیں، فرمانے لگیں کہ میں رحمٰن کی تجھ سے پناہ چاہتی ہوں اگر تو پرہیز گار ہے، کیونکہ پرہیز گار انسان رحمٰن سے ڈرتا ہے، اس وقت حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔ دوسرے مقامات پر اُسلوب نگارش دوسرا اختیار کیا گیا مگر مفہوم ایک ہی ہے۔

اصطفاء سے مراد پہلی باران کی ماں سے لینا ہے اور انہیں عبادت کے لیے چننا ہے، انہیں جنت کے پھلوں سے سرشار و مالامال کرنا ہے، تطہیر (پاک کرنے) سے مراد اس چیز سے پاک کرنا ہے جو عورتوں کی گندگی ہوتی ہے، اصطفاء کا ایک مفہوم انہیں ہدایت دینا اور فرشتوں کو ان کی طرف بھیجنا ہے، انہیں کرامات سے نوازنا ہے، بچے کو گہوارے میں بلوا کر یہود کی تہمت سے انہیں بری کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے، انہیں اور ان کے بیٹے کو اہل جہان کے لیے نشانی بنانا بھی مراد ہو سکتا ہے، یہاں ملائکہ سے مراد جبریل ہے جسے دوسرے مقام پر اپنی روح قرار دے کر انسانی شکل میں ان کی طرف بھیجنے کا صراحتاً ذکر موجود ہے۔

یہاں آیت ۴۲ میں دو مرتبہ حضرت مریم علیہا السلام کے اصطفاء (چناؤ اور انتخاب) کی بات کی گئی ہے، ان دونوں اصطفاء سے مراد ایک ہی ہے، صرف تاکید کے لیے تکرار کیا گیا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے

کہ پہلا اِصطفاء بیت المقدس کی خدمت کے لیے ہے اور دوسرا اصطفاء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے لیے ہے۔

یٰمَرْیَمُ اقْنُتِی لِرَبِّكِ وَاسْجُدِی وَارْكَعِی مَعَ الرّٰكِعِینَ: پھر فرشتے فرماتے ہیں کہ اے مریم تو خشوع و خضوع رکوع و سجود میں رہا کر۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تجھے اپنی قدرت کا ایک عظیم الشان نشان بنانے والا ہے، اس لیے تجھے رب کی طرف پوری رغبت رکھنی چاہیے، قنوت کے معنی اطاعت کے ہیں جو عاجزی اور دل کی حاضری کے ساتھ ہو، جیسے ارشاد وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ الروم:۲۶) یعنی اس کی ماتحتی اور ملکیت میں زمین و آسمان کی ہر چیز ہے سب کے سب اس کے محکوم اور تابع فرمان ہیں۔ (ابن کثیر)

ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں قنوت کا لفظ ہے اس سے مراد اطاعت گذاری ہے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت مریم رحمہا اللہ نماز میں اتنا لمبا قیام کرتی تھیں کہ دونوں ٹخنوں پر ورم آجاتا تھا، قنوت سے مراد نماز میں لمبے لمبے رکوع کرنا ہے، حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس سے یہ مراد ہے کہ اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہ اور رکوع سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جا، حضرت اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مریم صدیقہ علیہا السلام اپنے عبادت خانے میں اس قدر بکثرت باخشوع اور لمبی نمازیں پڑھا کرتی تھیں کہ دونوں پیروں میں زرد پانی اتر آیا۔

یہاں اسلوب کلام سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ اطاعت میں ہمیشگی اختیار کیجیے، یہاں سجدے کا ذکر پہلے اور رکوع کا بعد میں کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سجدہ رکوع سے پہلے ہے، یہاں واؤ ترتیب کے لیے نہیں بلکہ اشتراک کے لیے ہے، رکوع کریں رکوع کرنے والوں کے ساتھ کا مطلب ہے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کیجیے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَیْبِ نُوحِیهِ إِلَیْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ إِذْ یُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ إِذْ یَخْتَصِمُونَ: اللہ تعالیٰ یہاں فرمارہے ہیں کہ یہ جتنا قصہ ہم آپ کے سامنے بیان کر رہے ہیں یہ غیب کی خبروں میں سے ایک ہے، جسے ہم آپ کی طرف وحی کر کے بتا رہے ہیں، ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، جب وہ لوگ مریم علیہا السلام کی کفالت

کے سلسلہ میں قرعہ اندازی کر رہے تھے، کہ کون اس کی کفالت کرے گا؟ ان کے جھگڑے کے وقت بھی آپ ﷺ وہاں موجود نہیں تھے، مگر ان واقعات کی پرتیں کھول کھول کر آپ کو سنا اور بتا رہے ہیں تاکہ آپ ان لوگوں کو آگاہ کریں۔

ذالک اسم اشارہ پہلے والے واقعات کی طرف ہے، وحی کا لفظ خفیہ اشارہ کے لیے بولا جاتا ہے، الہام دل میں بات ڈالنے کو کہا جاتا ہے، یہ ایماء (اشارہ) سے زیادہ پوشیدہ اور مخفی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجی جانے وحی سے مراد وہ ضروری علم ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ ان تک پہنچاتا ہے اور اسے دوسرے لوگوں سے مخفی رکھتا ہے، وہ سلسلہ عالم الغیب والشہادۃ کے ساتھ ایک تعلق ہوتا ہے۔

جب حضرت مریم علیہا السلام نے اپنی بیٹی کو کپڑے میں لپیٹ کر ان کے سپرد کیا تو ہر ایک نے بڑی چاہت سے ان کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے ادھر سے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنا ایک حق اور جتایا کہ میں رشتہ میں بھی ان کا خالو ہوتا ہوں تو یہ لڑکی مجھ ہی کو ملنی چاہیے اور لوگ راضی نہ ہوئے آخر قرعہ ڈالا گیا اور قرعہ میں ان سب نے اپنی وہ قلمیں ڈالیں جن سے توراۃ لکھتے تھے، تو قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکلا اور یہی اس سعادت سے مشرف ہوئے دوسری مفصل روایتوں میں یہ بھی ہے کہ نہر اُردن پر جا کر یہ قلمیں ڈالی گئیں کہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ جو قلم نکل جائے وہ نہیں اور جس کا قلم ٹھہر جائے وہ حضرت مریم علیہا السلام کا کفیل بنے، چنانچہ سب کی قلمیں تو پانی بہا کر لے گیا صرف حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم ٹھہر گیا بلکہ الٹا اوپر کو چڑھنے لگا تو ایک تو قرعے میں ان کا نام نکلا دوسرے قریب کے رشتہ دار تھے انہی کو حضرت مریم علیہا السلام سونپ دی گئیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ : اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ سے ارشاد فرما رہا ہے: اے میرے حبیب! اس وقت کو یاد کیجئے جب جبریل امین نے مریم سے کہا اللہ آپ کو عیسیٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے کلمہ یعنی حرف "کن" سے پیدا ہوئے ہیں، یہاں اگرچہ ملائکہ جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر اس سے مراد ایک ہی فرشتہ حضرت جبریل ہیں اور ان کو ملائکہ سے اس لیے تعبیر فرمایا گیا

ہے کیونکہ وہ ملائکہ کی تمام صفات کمالیہ کے جامع ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا وہ اللہ کے نزدیک دنیا اورآخرت دونوں جہان میں مرتبے ومقام والے ہوں گے اور مقربین میں سے ہوں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے پیدا کئے گئے ہیں، یوں تو اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے پیدا کی گئی ہے، لیکن ان چیزوں کے کچھ مادی اور ظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں، مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کے لیے مٹی کا پتلا بنایا گیا، عام انسانوں کی پیدائش کے لیے مرد وزن کے اختلاط اور نطفہ کو ظاہری سبب بنایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر کسی ظاہری اور مادی سبب کے محض اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کن" سے پیدا کیا گیا اس لیے آپ کو کلمۃ اللہ فرمایا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح عادل سلطان کو ظل اللہ اور نور اللہ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سایہ رحمت اور اس کے نور کے ظہور کا سبب ہوتا ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ظہور کا سبب ہیں اور کلمہ "کن" کے تصرفات کے مظہر اور دلیل ہیں اس لیے ان کو کلمۃ اللہ فرمایا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور اور حدوث کا مبدء ہے اس لیے "کلمۃ" اور "کلمۃ منہ" فرمایا اور اپنی طرف اضافت فرمائی ہے اور یہاں "من" کا لفظ تبعیض اور جزئیت کے لیے نہیں ہے جیسا کہ بعض عیسائیوں کا گمان ہے، بعض عیسائی یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں بکلمۃ منہ (آل عمران: ۴۵) مذکور ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا جز ہیں اور یہ ان کے ابن ہونے کو مستلزم ہے۔ (تبیان القرآن)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح بھی بتایا اور عیسیٰ بھی، لفظ مسیح یہ فعیل مفعول کے معنی میں ہے مسیح بمعنی ممسوح ہے اور ان کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ان کو گندگیوں اور گناہوں سے پاک کیا گیا تھا اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ان کے جسم پر اپنا بازو پھیر دیا تھا جس کی وجہ سے شیطان ان سے دور رہتا تھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مسیح بمعنی ماسح ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہے، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مریض کے جسم پر ہاتھ پھیر دیتے تھے اور اس سے وہ اچھا ہو جاتا

تھا، اس لیے ان کو یہ نام دیا گیا، دجال کو بھی مسیح کہا گیا ہے، وہ مسیح بمعنی ممسوح ہے کیونکہ وہ ایک آنکھ سے کانا ہو گا، گویا اس کی آنکھ پر کوئی چیز پھیر دی گئی۔ (انوار البیان)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عیسیٰ بن مریم فرمایا اور ماں کی طرف ان کی نسبت کی ہے کیونکہ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے ہیں، عیسیٰ بن مریم کہہ کر نصاریٰ کا رد بھی کر دیا جو حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ کہتے تھے، کہ جو اپنی ماں کی طرف منسوب ہو وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے اور اللہ کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے سوا کسی عورت کا نام قرآن کریم میں ذکر نہیں کیا، ان کا نام بھی اسی مصلحت کے تحت لیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ دنیا اور آخرت میں وجیہہ ہوں گے، شفاعت کے لیے اور علو مکانی کے اعتبار سے، وجیہہ اس شخص کو کہتے ہیں جس شخص کے لیے عزت، شرف اور قدر و منزلت ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف بنو اسرائیل نے ایک جسمانی عیب کی تہمت لگائی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت کی اور ان کی وجاہت بیان فرمائی: ترجمہ: اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچائی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی تہمت سے بری فرما دیا اور وہ اللہ کے نزدیک معزز ہیں۔

وجہہ کا معنی ہے چہرہ، وجیہہ اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی نیکیوں اور مقبولیت کی وجہ سے سرخرو ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کئی وجوہ سے اللہ کے نزدیک دنیا اور آخرت میں سرخ رو ہیں، ① ایک یہ کہ وہ اللہ کے برگزیدہ نبی ہیں۔ ② دوسری وجہ ہے کہ وہ مستجاب الدعوات ہیں ان کی دعا سے مردے زندہ ہو جاتے تھے اور مادر زاد اندھے بینا ہو جاتے تھے اور برص والے تندرست ہو جاتے تھے۔ ③ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ یہود کی لگائی ہوئی تہمتوں سے دنیا میں بری ہوئے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ثواب جزیل کا وعدہ فرمایا، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ مقربین میں سے ہیں اس میں یہ تنبیہہ ہے کہ جب انہیں پھانسی دی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان کو آسمانوں پر اٹھالے گا، یہود اور نصاریٰ دونوں اس پر متفق تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی اور صلیب پر چڑھا کر سولی دی گئی اور جس شخص کو سولی دی جائے اس کو عیسائی لعنتی کہتے تھے حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بھی کتاب

مقدس میں لکھا ہے: مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔ (گلیتوں باب: ۳ ‘آیت: ۱۳ ‘نیا عہد نامہ ص ۱۸۰ ‘مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور)

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لعنتی کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک وہ دنیا اور آخرت میں معزز، قدر و منزلت والے اور مقربین میں سے ہیں، یہود اور عیسائی دونوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ ان کو سولی دی گئی، اسلام نے سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برأت بیان کی اور یہ اعلان کیا کہ یہود نے حضرت علیہ السلام کے مشابہ کسی اور شخص کو سولی دی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا تھا۔ (تبیان القرآن)

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ: اور وہ لوگوں سے گہوارے اور ماں کی گود میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی لوگوں سے کلام کرے گا یعنی حالت رضاعت و طفولیت کے کلام میں اور بڑی عمر کے کلام میں باہم کوئی فرق نہ ہو گا اور وہ ان نیکوکار لوگوں میں سے ہو گا جو صلاح کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ صاحب معجزات ہو گا جو بچپنے میں بھی لوگوں سے بات چیت کرے گا، مہد اس مقام کو کہتے ہیں جو بچوں کے لیے بنایا جاتا ہے، خواہ ماں کی گود ہو، یا گہوارہ ہو، جھولا ہو یا پنگوڑا ہو۔ (کشف الرحمن)

کہولت میں مفسرین رحمہم اللہ کے کئی قول ہیں عام طور سے کہولت چالیس سال کے بعد کی عمر کو کہتے ہیں ان کا رفع الی السماء کہولت سے قبل ہوا ہے کیونکہ جب ان کو آسمان پر اٹھایا گیا تو ان کی عمر تینتیس سال تھی، لہٰذا کہولت میں کلام کرنا ان کا باقی ہے اور قرآن کی یہ پیشین گوئی اس وقت پوری ہو گی جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے۔ (کشف الرحمٰن) پنگوڑے میں آپ نے ایک گھڑی بات کی تھی، اس کے بعد اس وقت تک بات نہیں کی جب تک بچے باتیں کرتے ہیں۔ (المقتطف)

بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اسے ”جنین“ کہا جاتا ہے، جب پیدا ہو جاتا ہے اسے ”ولید“ کہا جاتا ہے، پھر دودھ پیتے بچے کو ”رضیع“ کہا جاتا ہے، جب چھوڑ دیتا ہے اسے ”فطیم“ کہا جاتا ہے، جب دانت نکل آتے ہیں اسے ”مثغر“ کہا جاتا ہے، جب دس سال کے قریب ہوتا ہے اسے ”ناشی“

کہا جاتا ہے، جب بلوغ کے قریب ہوتا ہے اسے ”مراہق“ کہا جاتا ہے، جب احتلام ہونے لگتا ہے اسے ”غلام“ کہا جاتا ہے، جب اس کی مونچھیں ظاہر ہونے لگتی ہیں اسے ”فتیٰ“ کہا جاتا ہے، تیس اور چالیس سال کے درمیان کی عمر والے کو ”شاب“ کہا جاتا ہے، پھر چالیس سے ساٹھ سال کی عمر والے کو ”کہل“ کہا جاتا ہے، پھر اس سے عمر بڑھ جائے تو اسے ”ھرم“ کہا جاتا ہے۔

قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ: جب حضرت جبریل علیہ السلام آدمی کی صورت میں حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آئے اور ان کو ایک لڑکے کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی تو حضرت مریم علیہا السلام نے اس بچہ کی ولادت کے طریقہ کو جاننا چاہا کہ ان کا کسی سے نکاح ہوا ہے نہ وہ فاحشہ اور بدکار ہیں یعنی بظاہر کوئی حال سبب میسر ہے نہ حرام تو پھر بچہ کیسے پیدا ہوگا؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا اسی طرح ہوتا ہے اللہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور فرمایا یہ آپ کے رب کے لیے آسان ہے۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کی آستین اور گریبان میں پھونک ماری اور وہ اسی وقت حاملہ ہو گئیں اور بعض علماء نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نفخ جبریل سے پیدا ہونا جائز نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ بچہ فرشتہ اور انسان کے اجزاء سے مرکب ہو، لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ان کی ذریت سے میثاق لیا تو اولاد کے بعض پانی کو ان کے آباء کی پشتوں میں رکھا اور بعض پانی کو ان کے امہات کے ارحام میں رکھا اور جب یہ دونوں پانی جمع ہو جاتے ہیں تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دونوں پانی حضرت مریم رحمہا اللہ میں رکھ دیئے، کچھ پانی ان کے رحم میں رکھا اور کچھ پانی ان کی پشت میں رکھا، حضرت جبریل علیہ السلام نے جب پھونک ماری تو حضرت مریم علیہا السلام کی طبیعت میں ہیجان ہوا اور جو پانی ان کی پشت میں تھا وہ ان کی پشت سے منتقل ہو کر ان کے رحم میں آگیا اور جب یہ دونوں پانی ایک دوسرے مل گئے تو مریم علیہا السلام حاملہ ہو گئیں۔ (تفسیر قرطبی، تبیان القرآن)

قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ: اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کے اس سوال کے بعد جبریل امین علیہ السلام سے کہلوایا کہ بچہ اسی طرح پیدا ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس

کے لیے لمبے چوڑے منصوبے نہیں بناتا بلکہ وہ تو ایک کلمہ کن کہتا ہے اور وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں" جس طرح مادی اسباب اور مادہ کے ذریعہ ترتیب کے ساتھ اللہ چیزوں کو پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اسی طرح بغیر اسباب کے یکدم بھی پیدا کر سکتا ہے۔(تفسیر مظہری)

نکتہ: حضرت زکریا علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے پوچھا تھا کہ بیٹا کیسے ہو گا جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے، تو اللہ نے ان کے اس سوال کے جواب میں یفعل مایشاء فرمایا تھا جب کہ یہاں یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ فرمایا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک کنواری عورت کے بچہ جننے کی بات ہے جسے کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا، یہ ایک بانجھ بوڑھی عورت کے بچہ جننے کی بہ نسبت بہت ہی عجیب وغریب بات تھی، یہاں خلق کا مادہ لا کر اس بات کی اطلاع دی گئی کہ ایک کنواری غیر شادی شدہ عورت سے بچہ کی پیدائش ایسی ہے جیسے ابتدا میں پیدا کرنا ہے، اس کے مناسب یہاں اس مقام پر یہی خلق کے الفاظ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کتاب، حکمت، تورات اور انجیل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ {۴۸} آل عمران.

جواب ترجمہ: اور اللہ سکھادے گا اس کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ: ابن جریج سے مروی ہے کہ کتاب کی تعلیم دے گا سے مراد ہاتھ سے لکھنا سکھائے گا اور قتادہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حکمت سے مراد سنت ہے، ایک مطلب یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کتابت سکھائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے زمانے میں بہت زیادہ خوبصورت کتابت کرتے تھے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آسمانی کتابوں کی تعلیم دے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد فقہ ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقے ہیں۔ اس سے اشارہ دیا گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا استاذ کوئی انسان نہیں ہوتا بلکہ

اللہ تعالیٰ انہیں تعلیم دیتا ہے، فرشتہ درمیان میں واسطہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قلم سے لکھنا سکھایا، کتابت اللہ کی طرف سے اس کے بندوں پر بڑا احسان ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قلم عطا فرمایا ہے ان پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے، سورۃ العلق میں فرمایا کہ اس عزت والے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے بندے کو قلم کے ذریعے سکھایا ہے۔

علامہ ابو حیان اندلسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد گزشتہ آسمانی کتابیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گزشتہ تمام آسمانی کتابوں کا علم عطا فرمایا اور خصوصاً توراۃ اور انجیل کا علم عطا فرمایا۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک کتاب سے مراد خط و کتابت کی تعلیم دینا ہے اور حکمت سے مراد علوم اور تہذیب الاخلاق کی تعلیم ہے کیونکہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ حقیقت کو جانے، نیک اعمال کا علم حاصل کرے اور ان دونوں کے مجموعہ کو علم و حکمت کہتے ہیں اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کتابت اور علوم عقلیہ اور شرعیہ کا علم عطا کر دیا تو ان کو توراۃ کا علم عطا فرمایا اور توراۃ کے علم کو مؤخر اس لیے کیا کہ توراۃ اللہ کی کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے اسرار و رموز ہیں اور انسان جب تک بہت زیادہ علم حاصل نہ کرے اس کے لیے اللہ کی کتاب میں غور و خوض کرنا ممکن نہیں ہے، پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انبیاء سابقین علیہم السلام پر نازل کی ہوئی کتابوں کے اسرار کو جان لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر انجیل نازل فرمائی۔ (تفسیر کبیر) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ سے مراد قلم سے لکھنا سکھانا ہے۔

حکمت سے مراد شریعت کے اسرار اور رموز ہیں، دوسرے اس سے مراد وہ طریقے ہیں جو اللہ تعالیٰ بندے کو سکھا دیتا ہے تو وہ تمام چیزوں کو ان کے مقام پر رکھتا چلا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تعلیم کتابت، علم اور حکمت کے ذریعے بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام سمجھ دار ہو گئے تو ان کی ماں ان کو لے کر کتّاب (لکھنے پڑھنے والے) کے پاس آئی اور عیسیٰ علیہ السلام کو اس کے سپرد کر دیا تو اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہہ تو "بسم اللہ" عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ (نام کے ساتھ) معلم نے کہا کہو "الرحمن" عیسیٰ علیہ السلام نے

فرمایا ”الرحیم “معلم نے کہا کہو ابو جاد، عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہ کتاب میں موجود ہے، اب عیسیٰ علیہ السلام نے معلم سے سوال کرنے شروع کیے اور پوچھا کیا تو جانتا ہے الف سے کیا مراد ہے ؟ اس نے کہا نہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے اسے بتایا کہ اس سے مراد الاء اللہ یعنی اللہ کی نعمتیں، پھر دوسرا سوال پوچھا کہ کیا تو جانتا ہے باء سے کیا مراد ہے ؟ اس نے کہا نہیں فرمایا اس سے مراد بھاء اللہ یعنی اللہ کا جمال مراد ہے۔

پھر تیسرا سوال کیا کہ کیا تو جانتا ہے جیم سے کیا مراد ہے ؟ اس نے کہا نہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے اسے بتایا کہ جیم سے مراد جلال اللہ ہے یعنی اللہ کا جلال، پھر چوتھا سوال کیا کہ جانتے ہو لام سے کیا مراد ہے ؟ اس نے کہا کہ نہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے معلم کو بتایا کہ اس سے مراد الاء اللہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام حروف کی تفسیر کرنے لگے۔

اس کے بعد معلم نے کہا كَيفَ أُعَلِّمُ مَن هُوَ أَعلَمُ مِنِّي میں اسے کیسے سکھاؤں جو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے ؟ ان کی والدہ نے کہا اس کو چھوڑ دو یہ بچوں کے ساتھ بیٹھ جائے، پھر جب وہ بچوں کے ساتھ بیٹھ گئے تو اب وہ بچوں کو بتاتے تھے جو کچھ انہوں نے کھایا ہوا ہوتا تھا اور جو چیز ان کی ماؤں نے ان کے لیے ذخیرہ کر کے رکھی ہوئی ہوتی تھی۔ (ابن منذر، در منثور)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے علوم و معارف کا مطالعہ کرنے سے انسان ورطہ حیرت میں گم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسی حکمت و بصیرت اور تعلیم دی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکیمانہ باتیں

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر در منثور میں حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی حکیمانہ باتیں نقل کی ہیں، اسی تفسیر سے ہم یہاں ایک جھلک پیش کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام پھر بات کرنے سے رک گئے تھے جب انہوں نے بچپن میں کلام کی تھی یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئے جس طرح (دوسرے) بچے بالغ ہوتے ہیں پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت اور بیان کے ساتھ گفتگو کرنے کی قوت عطا فرمائی لیکن یہودی ان کے بارے میں اور ان کی ماں کے بارے میں بہت زیادہ جھوٹی باتیں کرنے لگے اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کا دودھ پیتے تھے جب ان کا دودھ

چھڑایا تو کھانا کھانے لگے اور پینے لگے یہاں تک کہ (جب) سات سال کی عمر کو پہنچ گئے تو ان کی ماں نے ان کو ایک آدمی کے سپرد کیا تاکہ اس کو سکھائے جیسے بچوں کو سکھایا جاتا ہے وہ معلم آپ کو کچھ بھی تعلیم نہ دیتا تھا مگر یہ کہ اس تعلیم سے پہلے آپ اس پر عمل کرنے کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

(۱) عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے فرمایا جس طرح بادشاہوں نے تمہارے لیے حکمت کو چھوڑا اسی طرح تم ان کے لیے دنیا کو چھوڑ دو۔ (الزہد لابن المبارک، در منثور)

(۲) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام فرمایا کرتے تھے کوئی آدمی ایمان کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ دنیا کی چیزوں سے لاپرواہ نہ ہو جائے۔ (ابن عساکر)

(۳) عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا اگر آپ گدھا لے لیں تاکہ اپنی ضرورت کے وقت اس پر سواری کیا کریں آپ علیہ السلام نے فرمایا میں اللہ کے ہاں زیادہ بزرگی والا ہوں، اس بات سے کہ میرے لیے ایسی چیز بنا دے کہ جو مجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، الزہد)

(۴) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریوں کے گروہ! بلاشبہ اللہ کا خوف اور فردوس کی محبت مشقت پر صبر کرنے کا حکم دیتی ہے اور دور کر دیتی ہے دنیا کی زیب وزینت سے۔ (ابن عساکر)

(۵) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے آدم علیہ السلام کے ضعیف بیٹے اللہ سے ڈر، جہاں تو ہو اور اپنی حلال کمائی سے کھا اور مسجد کو گھر بنا اور دنیا میں ضعیف بن جا اور عادی بنا اپنے آپ کو رونے کا اور اپنے دل کو فکر کا اور اپنے جسم کو صبر کا اور کل کے لیے اپنے رزق کی کوشش نہ کر اس لیے کہ وہ غلطی ہے جو تیرے اوپر لکھی جائے گی۔ (ابن عساکر، روایت عتبہ بن یزید)

دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے

(۶) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہر برائی کی جڑ دنیا کی محبت ہے اور (دنیا) کی بعض خواہشات اس کے گھر والوں کو طویل غم کا وارث بناتی ہیں۔ (ابن ابی الدنیا، روایت وہیب مکی)

(۷) عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے دنیا سے گذر جاؤ اور اس میں آباد نہ ہو اور دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے اور کسی چیز کو دیکھنا دل میں شہوت اگاتا ہے۔ (ابن عساکر، روایت یحییٰ بن سعید)

(۸) عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے اور اس میں مال بڑی بیماری ہے لوگوں نے کہا اس کی بیماری کیا ہے؟ فرمایا مالدار فخر تکبر سے محفوظ نہیں ہوتا لوگوں نے کہا اگر وہ محفوظ رہے؟ تو! فرمایا مال کی حفاظت کرنا اسے غافل کر دیتا ہے اللہ کے ذکر سے۔ (احمد، شعب الایمان)

(۹) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے حواریوں کو فرمایا کہ تم جن کو تعلیم دیتے ہو ان سے اس کی اجرت نہ لو مگر جتنا تم نے مجھے دی ہے اور اے زمین کے نمک یعنی علماء تم خراب نہ ہو جاؤ کیونکہ ہر چیز جب خراب ہوتی ہے تو اس کا نمک ہی سے علاج کیا جاتا ہے اور اگر نمک خراب ہو جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں اور یقین کرو تم میں جاہلانہ دو عادتیں ہیں ایک بغیر تعجب کے ہنسنا دوسری بغیر شب بیداری کے صبح کرنا۔ (ابن مبارک، روایت عمران کوفی)

(۱۰) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نیک دلوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ زمین کو آباد فرماتے ہیں اور اگر نیک دل نہ ہو تو زمین کو برباد کر دیتے ہیں۔ (حکیم ترمذی روایت یزید بن میسرہ)

(۱۱) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ایسے گھر کے پاس سے گذرے جس کے رہنے والے مر چکے تھے تو وہیں کھڑے ہو کر فرمایا افسوس ہے وہ لوگ جو تیرے ایک دوسرے کے وارث چلے آرہے تھے (آج) تیرا کوئی مالک نہیں کیسے انہوں نے سوچ بچار نہ کی۔ شاید کہ تو زمانہ ماضی کے بھائیوں کی طرح ہے۔ (ابن ابی الدنیا، شعب الایمان، روایت مالک بن دینار)

(۱۲) لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا اے روح اللہ! ہم آپ علیہ السلام کے لیے ایک گھر بنا دیں؟ فرمایا ہاں! اس کو ساحل سمندر پر بنا دو لوگوں نے کہا تب تو پانی اس کو بہا کر لے جائے گا فرمایا تم کہاں چاہتے ہو؟ کیا تم میرے لیے پل پر گھر بنانا چاہتے ہو۔ (بیہقی، مالک بن دینار)

یقین کی بدولت پانی پر چلنا

(۱۳) (ایک مرتبہ) حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو گم پایا ان کو ڈھونڈنے کے لیے نکلے اور ان کو پانی پر چلتا ہوا پایا ان میں سے بعض نے کہا اے اللہ کے نبی! کیا ہم آپ کی طرف (پانی پر) چل سکتے ہیں فرمایا ہاں! ایک آدمی نے اپنا پاؤں (پانی میں) رکھا پھر دوسرا پانی میں رکھا تو ڈوبنے لگا فرمایا مجھے اپنا ہاتھ دے دے

اے تھوڑے ایمان والے! اگر آدم کے بیٹے کے اندر رائی کے دانہ کے برابر یقین ہو تو پانی پر چلنے لگے۔ (احمد فی الزہد، روایت بکر بن عبد اللہ)

(۱۴) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ (دنیا) تھی اور میں نہیں تھا اور یہ ہو گی اور میں اس میں نہیں ہوں گا۔ (احمد، روایت عبد اللہ بن نمیر)

(۱۵) جب عیسیٰ علیہ السلام مبعوث کئے گئے تو انہوں نے دنیا کو چہرے کے بل گرا دیا پس جب آپ اٹھا لیے گئے (آسمان کی طرف) تو لوگوں نے اس دنیا کو اٹھا لیا ان کے بعد۔ (احمد، روایت مالک بن دینار)

(۱۶) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں نے دنیا کو اس کے چہرے کے بل گرا دیا اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا میرا کوئی لڑکا نہیں کہ وہ مر جائے اور نہ کوئی گھر ہے جو برباد ہو جائے لوگوں نے ان سے عرض کیا کیا ہم آپ کے لیے کوئی گھر نہ بنا دیں فرمایا میرے لیے راستے پر ایک گھر بنا دو انہوں نے کہا یہ قائم نہیں رہے گا (پھر) لوگوں نے کہا ہم آپ کے لیے کوئی بیوی تجویز کریں فرمایا میں ایسی بیوی کا کیا کروں گا جو مر جائے۔ (زوائد، روایت حسن)

(۱۷) ایک عورت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذری اور کہنے لگی خوشخبری ہے اس چھاتی کے لیے جس نے تجھ کو دودھ پلایا اور اس گود کے لیے جس نے تجھ کو اٹھایا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خوشخبری ہے اس شخص کے لیے جو اللہ کی کتاب پڑھے پھر جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرے۔ (احمد، حیثمہ)

(۱۸) اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میں نے تجھ کو مسکینوں سے محبت اور ان پر رحمت کرنا حبہ کیا تو ان سے محبت کر اور وہ تجھ سے محبت کریں گے اور وہ راضی ہوں گے تجھے امام اور قائد بنا کر اور تو ان سے راضی ہو گا ان کو اپنا ساتھی اور تابع بنانے پر اور وہ دونوں خصلتیں ہیں تو جان لے جو شخص ان دونوں خصلتوں کے ساتھ مجھ سے (قیامت کے دن) ملاقات کرے گا تو وہ مجھ سے بہترین اور محبوب ترین اعمال کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ (احمد، روایت وہب بن منبہ)

(۱۹) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریوں کی جماعت! مسجدوں کو اپنا گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو مہمانوں کے گھروں کی طرح سمجھو اور تمہارے اس جہان میں کوئی گھر نہیں اور نہیں ہو تم مگر راستہ پر گذرنے والے یعنی مسافر ہو۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، احمد، روایت میمون بن سیاہ)

(۲۰) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ساتھ حق کے میں یہ بات تم کو کہتا ہوں کہ آسمان کے کنارے مالدار لوگوں سے خالی ہیں اور اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں داخل ہونا زیادہ آسان ہے مالدار کے جنت میں داخل ہونے سے۔ (احمد، وہب بن منبہ) (مراد وہ مالدار جو دین وایمان سے دور ہو)

(۲۱) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہر برائی کی جڑ دنیا کی محبت ہے اور شراب ہر شر کی چابی ہے اور عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ (زوائد لعبد اللہ، روایت جعفر بن فارس)

حکمت اہل لوگوں کے سپرد کریں

(۲۲) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بلاشبہ حکمت کے لیے اہلیت یعنی قابلیت (ہوتی) ہے اگر تو نے اس کو نااہل لوگوں میں رکھ دیا تو (گویا) اس کو ضائع کر دیا اگر تو نے اس کو اہل لوگوں سے روک دیا تو (گویا) اس کو ضائع کر دیا تو اس طرح رہ جس طرح طبیب ہوتا ہے وہ دوا کو وہاں رکھتا ہے جہاں اس دوا کا محل ہوتا ہے۔ (احمد، روایت سفیان)

(۲۳) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل! میں تمہارے بارے میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تم ہو جاؤ عار دلانے والے اہل کتاب کے لیے اے بنی اسرائیل تمہارا قول شفا ہے جو بیماری کو لے جاتا ہے اور تمہارے اعمال ایسی بیماری ہیں جو دوا کو قبول نہیں کرتے۔ (احمد، روایت محمد بن واسع)

(۲۴) عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء سے فرمایا کہ تم لوگوں کے لیے چوری کرنے والے لٹیرے اور مکار لومڑی کی طرح اور اچک لینے والی چیل کی طرح نہ بن جاؤ۔ (احمد۔ روایت وہب بن منبہ)

(۲۵) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا اے حواریوں کی جماعت! کون تم میں سے اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ سمندر کی موج پر ایک گھر بنا دے؟ انہوں نے کہا اے روح اللہ! اس بات کی کون طاقت رکھتا ہے؟ پھر انہوں نے فرمایا پھر تم دنیا سے اس کو ٹھہرنے کی جگہ نہ بناؤ۔ (احمد۔ روایت مکحول)

(۲۶) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تجھ کو یہ بات نفع نہ دے گی کہ تو جان لے اس چیز کو جو تو نہیں جانتا جس پر تو عمل نہ کرے اور جو تو عمل کرے اسے نہ جانتا ہو کیونکہ علم کی کثرت بھی تکبر کو زیادہ کرتی ہے جب تک اس کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ (احمد، روایت ابو عمر)

(۲۷) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا زہد چکر کاٹتا ہے تین دنوں میں کل گزشتہ جس سے تو نے نصیحت حاصل کی اور آج کے دن جس نے تیرے اندر زہد میں اضافہ کر دیا اور کل آنے والے دن میں تو نہیں جانتا کہ تیرے لیے اس میں کیا ہے (پھر) فرمایا معاملہ بھی گھومتا ہے تین صورتوں پر ایک وہ جس کا ہدایت ہونا تجھ پر ظاہر ہو چکا تو اس کی اتباع کر اور دوسرا وہ معاملہ جو تیرے لیے اس کی گمراہی ظاہر ہو چکی ہے اس سے بچ جا اور وہ تیسرا معاملہ تیرے اوپر مشتبہ ہو گیا تو اس کو اللہ عزوجل کے سپرد کر دے۔ (احمد، ابراہیم بن ولید بن عبدی)

(۲۸) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھ سے سوال کرو کیونکہ میرا دل نرم ہے اور بلاشبہ میں اپنے دل میں چھوٹا ہوں۔ (احمد۔ روایت قتادہ)

(۲۹) عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم پر گذرے اور یہ الفاظ کہے اے اللہ! ہم کو بخش دے تین مرتبہ فرمایا۔ لوگوں نے کہا اے روح اللہ! ہم آپ سے آج کوئی نصیحت سننا چاہتے ہیں اور ہم آپ سے وہ چیز سن رہے ہیں جو ہم نے پہلے نہ سنی تھی اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تو ان کو یوں کہہ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) کہ إِنِّي مَن أَغفِرُ لَهُ مَغْفِرَةً وَاحِدَةً أَصلَحُ لَهُ بِهَا دُنْيَاهُ وَآخِرَتَهُ جس شخص کی میں ایک مرتبہ مغفرت کر دوں تو میں اس کے لیے اس کے ساتھ اس کی دنیا اور اس کی آخرت کی ٹھیک کر دیتا ہوں۔ (احمد۔ روایت بشیر دمشقی)

(۳۰) عیسیٰ علیہ السلام نے جب قراء کو بلایا تو آپ ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے پھر فرمایا تم بھی اسی طرح قراء کے ساتھ کیا کرو۔ (ابن ابی شیبہ، احمد، روایت حیثمہ)

حسن سلوک کی بدولت ولی بننا: (۳۱) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تم اس بات سے محبت رکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کے اصفیاء (چنے ہوئے) بن جاؤ اور بنی آدم کا نور بن جاؤ اس کی مخلوق میں سے تو معاف کر دو اس کو جو تم پر ظلم کرے اور اس کی عیادت کرو جو تمہاری عیادت نہ کرے اور نیک سلوک کرو اس شخص کی طرف جو تمہاری طرف نیک سلوک نہ کرے اور اس کو قرضہ دو جو تم کو بدلہ نہیں دیتا۔ (احمد)

(۳۲) عیسیٰ علیہ السلام بالوں سے بنا ہوا لباس پہنتے تھے اور درخت کے پتوں سے کھاتے تھے اور رات

گذارتے تھے جہاں شام ہو جاتی نہ شام کا کھانا ساتھ رکھتے اور نہ ہی کل کے لیے کھانا ساتھ ہوتا تھا اور فرماتے تھے ہر دن اپنا رزق لے کر آتا ہے۔ (ابن ابی شیبہ، احمد روایت عبید بن عمیر)

(۳۳) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے گھر جو برباد ہونے والا ہے اور تیرے رہنے والے فنا ہونے والے ہیں اے نفس (نیک) عمل کر رزق دیا جائے گا اے جسم (اللہ کے راستے میں تکلیف اٹھا آرام پائے گا)۔ (احمد۔ روایت وھب بن منبہ)

(۳۴) عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے فرمایا حق کے ساتھ میں تم سے کہتا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام اکثر حق کے ساتھ فرماتے تھے پھر فرمایا میں تم سے کہتا ہوں اگر تم دنیا کی محبت میں سخت ہو گے تو تم مصیبت پر بے صبری کرنے میں بھی زیادہ سخت ہو گے۔ (احمد، روایت وھب بن منبہ)

(۳۵) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریوں کی جماعت! جو کی روٹی کھاؤ اور زمین سے اگنے والی چیزیں کھاؤ اور خالص صاف پانی پیو اور بچو تم گندم کی روٹی سے اس لیے کہ تم اس کا شکر ادا نہیں کر سکتے اور جان لو! کہ دنیا کی حلاوت آخرت کی کڑواہٹ ہے اور دنیا کی سخت کڑواہٹ آخرت کی مٹھاس ہے۔ (احمد، روایت عطاء ازرق)

(۳۶) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عمدہ کپڑے دل کی خود پسندی (یعنی تکبر) سے ہوتے ہیں۔ (زوائد)

(۳۷) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تم کو باتیں اس لیے نہیں بتاتا کہ تم تعجب کرو بلکہ میں اس لیے بیان کرتا ہوں تاکہ تم سیکھ لو۔ (احمد۔ روایت سفیان)

(۳۸) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا کہ تم طبیب عالم کی طرح ہو جاؤ جو دوا کو وہاں رکھتا ہے جہاں نفع دے۔ (زوائد۔ روایت ابو حسان)

(۳۹) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل! حقیر جانو دنیا کو تم پر بھی وہ حقیر ہو جائے گی حقیر جانو دنیا کو تم پر آخرت عظمت والی بنا دی جائے گی دنیا کی عزت نہ کرو ورنہ تم پر آخرت حقیر ہو جائے گی بلاشبہ دنیا کریم لوگوں کے لیے نہیں ہے اور ہر دن دنیا بلاتی ہے فتنہ اور نقصان کی طرف۔ (زوائد۔ روایت عمران بن سلیمان، بحوالہ تفسیر در منثور)

(۴۰) عیسیٰ علیہ السلام کی وصیت میں یوں ہے اے حواریوں کی جماعت اللہ کی طرف محبت کرو نافرمانوں سے بغض رکھتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤ ان سے نفرت کرتے ہوئے اور اس کی رضا کو تلاش کرو ان سے غصہ کرتے ہوئے لوگوں نے کہا اے اللہ کے نبی! ہم کون سی مجلس میں بیٹھیں؟ تو انہوں نے فرمایا اس شخص کی مجلس میں بیٹھو جو تمہارے علم میں اضافہ کرے اپنی گفتگو سے اور جس کا دیکھنا تم کو اللہ تعالیٰ یاد دلائے اور دنیا میں اس کا عمل تم کو پرہیز گار بنادے۔ (مسند احمد)

(۴۱) اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے آپ کو نصیحت کرو اگر تم خود نصیحت حاصل کرو (پھر) لوگوں کو نصیحت کرو ورنہ مجھ سے حیا کرو۔ (احمد۔ مالک بن دینار)

(۴۲) عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا جس قدر تم یہاں تکلیف اٹھاتے ہو اس قدر تم وہاں آرام پاؤ گے اور جس قدر تم یہاں آرام کرو گے اس قدر تم وہاں تکلیف پاؤ گے۔ (احمد۔ وہب)

(۴۳) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خوشخبری ہے اس شخص کے لیے جس کی زبان نے غم کا اظہار کیا اور اپنے گھر کو وسیع کر لیا اور اپنی خطاؤں کو یاد کر کے رو دیا۔ (احمد۔ سالم بن ابی جعد)

(۴۴) عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے جب تم میں سے کوئی صدقہ کرے اپنے داہنے ہاتھ سے تو اس کو چاہیے کہ اس کو بائیں ہاتھ سے مخفی رکھے اور جب روزہ رکھے تو اس کو چاہیے کہ تیل لگا لے اور اپنے ہونٹوں کو تیل مل لے تاکہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھے تو اس کو روزہ دار نہ سمجھے اور جب نماز پڑھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے اوپر دروازے کا پردہ نیچے کر دے (تاکہ نماز میں یک سوئی ہو جائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ ثناء کو اسی طرح تقسیم فرماتے ہیں جس طرح رزق کو تقسیم فرماتے تھے۔ (ابن ابی شیبہ)

مسلمان کی پردہ پوشی کی تعلیم

(۴۵) عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا تم بتاؤ اگر تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے پاس آئے اور وہ سو رہا ہو اور ہوا نے اس کے بعض کپڑے کو کھول دیا ہو (یعنی ستر ظاہر ہو چکا ہو)؟ تو قوم نے کہا ہم کپڑا اس پر ڈال دیں گے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نہیں بلکہ تم وہ کپڑا بھی کھول دو گے جو باقی ہے یہ مثال بیان کی اس قوم کی جو کسی آدمی کی برائی سنتے ہیں پھر وہ اس سے زیادہ (دوسروں) کے سامنے

بیان کرتے ہیں۔ (ابن ابی الدنیا۔ روایت خالد ربعی)

(۴۶) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا میں نے مخلوق میں غور و فکر کیا سو جو شخص (ابھی) پیدا نہیں ہوا میرے نزدیک زیادہ قابل رشک تھا اس شخص سے جو پیدا ہو چکا اور فرمایا لوگوں کے گناہوں کی طرف نہ دیکھو مگر یہ کہ تم (ان کے) مالک یا آقا ہو لیکن اپنے گناہوں میں نظر کرو گویا کہ تم غلام ہو (اللہ تعالیٰ کے) اور لوگ دو قسم کے ہیں ایک وہ آدمی جو کسی مصیبت میں مبتلا ہوا دوسرا وہ جو عافیت میں ہے پس تم مصیبت والوں پر رحم کرو اور عافیت پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرو۔ (احمد۔ ابو الجید)

(۴۷) عیسیٰ علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام سے ملے اور (ان سے) فرمایا مجھے کچھ وصیت کیجئے فرمایا غصہ نہ کر انہوں نے کہا میں اس کی طاقت نہیں رکھتا (پھر) فرمایا مال کی وجہ سے فتنہ میں نہ پڑ انہوں کہا شاید یہ کام کرلوں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ۔ مسند احمد، روایت ابو الھذیل)

(۴۸) عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواری ایک مردہ کتے پر سے گذرے انہوں نے کہا اس کی کتنی بدبو ہے آپ نے فرمایا اس کے دانت کتنے سفید ہیں یہ لوگوں کو نصیحت کر رہے ہیں اور غیبت سے ان کو منع کر رہے ہیں۔ (مسند احمد، ابن ابی الدنیا۔ روایت مالک بن دینار)

حلال ذریعہ آمدن اختیار کرنے والوں سے خوش ہونا

(۴۹) عیسیٰ علیہ السلام (ایسے) بندے کو پسند فرماتے تھے جو کسی پیشہ کو سیکھتا جس کے ذریعہ وہ لوگوں سے بے پروا ہو جائے اور اس بندے کو ناپسند کرتے تھے جو علم سیکھے اور اس کو پیشہ (کمانے کا ذریعہ) بنائے۔ (مسند احمد، روایت اوزاعی)

(۵۰) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ کے لیے عمل کرو اور اپنے پیٹوں کے لیے عمل نہ کرو اس پرندے کی طرف دیکھو جو صبح کو گھونسلہ سے نکلتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے نہ کھیتی کرتا ہے نہ کاٹتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رزق دے رہے ہیں اگر تم یہ بات کہو کہ ہم پرندے سے بڑے پیٹ والے ہیں ان وحشی گائیوں اور وحشی گدھوں کی طرف دیکھو جو صبح کو جاتے ہیں اور شام کو لوٹتے ہیں نہ کھیتی کرتے ہیں نہ کاٹتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو رزق دے رہے ہیں فضول دنیا سے بچو کیونکہ فضول دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک عذاب (کا باعث ہے)۔ (ابن ابی شیبہ احمد، ابن ابی الدنیا، روایت سالم بن ابو الجعد)

(۵۱) ابلیس نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو مردوں کو زندہ کرتا ہے اگر تو اس طرح کر سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس پہاڑ کو روٹی بنا دے عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا کیا تم روٹی کھا کر زندگی گذارتے ہو اگر ایسا ہی ہے تو یہیں بیٹھو بلاشبہ فرشتے عنقریب تجھ کو ملیں گے پھر فرمایا بلاشبہ میرے رب نے مجھ کو حکم دیا کہ میں اپنے اوپر تجربہ نہ کروں میں نہیں جانتا مجھ کو سلامت رکھے گا یا نہیں۔ (مسند احمد۔ روایت وہب بن منبہ)

(۵۲) عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے سائل کے لیے حق ہے اگرچہ وہ ایسے گھوڑے پر آئے جو چاندی کے طوق پہنے ہوئے ہو۔ (مسند احمد۔ روایت سالم بن ابو الجعد)

(۵۳) اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اگر تیرے دل کو یہ بات خوش نہ لگے کہ تیری تعریف کریں کہ میرے اندر زہد ہے میں تجھ کو اپنے پاس راہب (عبادت کرنے والا) نہیں لکھوں گا اگر لوگ تیرے ساتھ دشمنی رکھیں تو تجھ کو یہ بات نقصان نہ دے گی جب میں تجھ سے راضی ہوں اور لوگوں کی محبت تجھے نفع نہ دے گی اگر میں تجھ پر ناراض ہوں۔ (تفسیر در منثور)

(۵۴) عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کس چیز کے ذریعہ آپ پانی پر چلتے ہیں فرمایا ایمان اور یقین کے ساتھ لوگوں نے کہا بلاشبہ ہم ایمان لے آئے جیسا کہ آپ ایمان لائے اور ہم نے یقین کیا جیسا کہ تم نے یقین کیا فرمایا تب تو چلو (پانی پر) وہ لوگ آپ کے ساتھ چلے ایک موج آئی تو وہ غرق ہو گئے ان کو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم کو کیا ہوا؟ انہوں نے کہا ہم موج سے ڈر گئے تھے فرمایا کیا تم موج کے رب سے نہیں ڈرتے پھر آپ نے ان کو باہر نکالا (اور) پھر اپنے ہاتھ زمین پر مارے ان کو بند کیا پھر کھول دیا۔ اچانک ان کے ایک ہاتھ میں سونا تھا اور ایک ہاتھ میں مٹی کا ڈھیلا تھا اور فرمایا ان دونوں سے تمہارے دلوں میں کون سی چیز قدرت و منزلت والی ہے؟ لوگوں نے کہا سونا آپ نے فرمایا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ (مسند احمد۔ ابن ابی الدنیا، ابن عساکر۔ روایت فضیل بن عیاض)

(۵۵) عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جب قیامت کا ذکر کیا جاتا تو چیخ مارتے اور فرماتے کہ ابن مریم علیہما السلام کے لیے یہ لائق نہیں ہے کہ اس کے پاس قیامت کا ذکر کیا جائے پھر خاموش ہو جائے۔ (ابن ابی شیبہ)

(۵۶) عیسیٰ علیہ السلام بال کے کپڑے پہنتے تھے اور درخت سے کھاتے تھے اور کل کے لیے بچا کر نہ رکھتے

تھے جہاں رات پڑ جاتی وہیں رات گذار لیتے ان کی کوئی اولاد نہ تھی جس کا خوف ہوتا کہ وہ مر جائے گا اور نہ گھر تھا جس کے ویران ہونے کا ڈر ہوتا (مسند احمد، ابن عساکر، روایت مجاہد)

(۵۷) عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن زاہد لوگوں کے امام ہوں گے اور جو لوگ اپنے دین کو بچانے کے لیے بھاگے ہوں گے وہ قیامت کے دن عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ ہوں گے ایک مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سے ابلیس گذرا اور وہ ایک پتھر پر تکیہ لگائے ہوئے تھے اور آپ نیند سے لطف اٹھا رہے تھے ابلیس نے ان سے کہا اے عیسیٰ! کیا تو یہ خیال کرتا ہے کہ تو دنیا کی کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتا یہ پتھر دنیا کے سامان میں سے ہے؟ عیسیٰ علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور پتھر کو اٹھا کر شیطان کو مارا اور فرمایا یہ تیرے لیے ہے دنیا کے ساتھ۔ (ابن عساکر۔ روایت حسن)

(۵۸) عیسیٰ علیہ السلام جَو کھاتے تھے پیدل چلتے تھے، جانور پر سوار نہ ہوتے تھے، گھروں میں رہائش نہ رکھتے تھے چراغ نہ جلاتے تھے، کاٹن (روئی کے کپڑے) نہ پہنتے تھے، عورتوں کو نہ چھوتے تھے خوشبو نہ لگاتے تھے اور پینے کی چیز میں کبھی کوئی چیز نہ ملاتے تھے اور نہ اس کو ٹھنڈا کرتے تھے سر میں کبھی تیل نہ لگاتے تھے اپنے سر اور داڑھی کو کسی چیز سے کبھی نہ دھوتے تھے زمین اور آپ کے جسم کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہوتی مگر صرف ان کا لباس ہوتا تھا، صبح کے لیے کبھی کوئی چیز تیار نہ کرتے تھے اور نہ عشاء کے لیے کوئی چیز تیار کرتے تھے اور دنیا کی لذات میں کسی چیز کی لذت نہیں اٹھاتے تھے اور ضعیف دائمی مریضوں اور مسکین لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور کسی چیز میں کھانا رکھ کر پیش کیا جاتا تو اس کو زمین پر رکھ دیتے تھے اور کھانے کے ساتھ سالن کبھی نہیں کھاتے تھے اور دنیا سے قلیل مقدار جس سے زندہ رہا جائے لیتے تھے اور فرماتے تھے یہ (مقدار) اس شخص کے لیے ہے جو مرنے والا ہے اور اس نے اس بارے میں حساب دینا ہے۔ (ابن عساکر۔ روایت کعب)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا: (۵۹) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے کہا گیا آپ نکاح کر لیں تو فرمایا میں نکاح کر کے کیا کروں گا؟ لوگوں نے کہا آپ کے لیے اولاد پیدا ہو گی فرمایا اولاد اگر زندہ رہی تو فتنہ میں ڈال دیتی ہے اگر مر گئی غم گین کرے گی۔ (ابن عساکر۔ روایت حسن)

(۶۰) عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا اگر آپ گھر بنا لیتے (تو اچھا تھا) فرمایا ہمارے لیے بوسیدہ گھر کافی ہے جو ہم

سے پہلے لوگوں کے تھے۔ (ابن ابی الدنیا۔ شعب الایمان بیہقی۔ روایت شعب بن اسحاق)

(۶۱) عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کیا آپ اپنے لیے گھر نہیں بناتے؟ فرمایا میں دنیا میں سے اپنے لیے کوئی چیز نہیں چھوڑوں گا کہ اس کے ذریعہ یاد کیا جاؤں۔ (ابن ابی الدنیا۔ بیہقی، روایت میسرہ)

(۶۲) عیسیٰ علیہ السلام ایک گرمی کے دن چل رہے تھے اور آپ کو گرمی اور پیاس نے ستایا ہوا تھا تو ایک خیمہ کے سایہ میں بیٹھ گئے تو خیمے والا ان کی طرف نکلا اور کہا اے عبد اللہ! ہمارے سائے سے کھڑا ہو جا عیسیٰ علیہ السلام کھڑے ہو گئے اور دھوپ میں بیٹھ گئے اور فرمایا تو نہیں ہے جس نے مجھے کھڑا کیا بلاشبہ مجھ کو کھڑا کیا اس ذات نے جس نے نہیں ارادہ کیا کہ دنیا میں سے کوئی چیز مجھ کو پہنچ جائے۔ (ابن عساکر، روایت ابو سلیمان)

(۶۳) عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام دونوں ایک بستی میں آئے عیسیٰ علیہ السلام نے اس بستی کے شریر لوگوں کے بارے میں سوال کیا اور یحییٰ علیہ السلام نے اس بستی کے اچھے لوگوں کے بارے میں سوال کیا یحییٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا آپ برے لوگوں کے پاس کیوں جاتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں طبیب ہوں اور مریضوں کی دوا کرتا ہوں۔ (مسند احمد۔ روایت سفیان بن عیینہ)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات: (۶۴) عیسیٰ علیہ السلام کی حکمت میں سے یہ بھی ہے کہ تم عمل کرتے ہو دنیا کے لیے اور تم اس میں رزق دیئے جاتے ہو بغیر عمل کے اور تم آخرت کے لیے عمل نہیں کرتے جبکہ تم کو وہاں بغیر عمل کے رزق نہیں دیا جائے گا۔ افسوس ہے تم پر (اے) برے علماء اجر کو تم لے لیتے ہو اور عمل کو ضائع کر دیتے ہو عنقریب تم دنیا سے جاؤ گے قبر کے اندھیرے اور اس کی تنگی کی طرف اور اللہ تعالیٰ عزوجل تم کو گناہوں سے روکتے ہیں جیسا کہ تم کو روزہ اور نماز کا حکم کرتے وہ آدمی کیسے ہو سکتا ہے اہل علم سے کہ اس کے نزدیک دنیا سب سے زیادہ پسندیدہ ہو اس کی آخرت سے اور وہ دنیا میں زیادہ رغبت کرنے والا ہو وہ آدمی کیسے ہو سکتا ہے اہل علم میں سے جو دنیا میں اپنے مرتبہ پر ناراض ہو اور اسے حقیر جانے جبکہ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت سے ہے وہ آدمی کیسے ہو سکتا ہے اہل علم میں سے کہ جو اللہ تعالیٰ پر تہمت لگائے اس کے فیصلوں میں اور

اس پر راضی نہ ہو جو اس کو تکلیف پہنچی ہے وہ آدمی کیسے ہو سکتا ہے اہل علم میں سے جو علم اس لیے حاصل کرتا ہے کہ گفتگو کرے اور اس لیے حاصل نہیں کرتا کہ اس پر عمل کرے۔ (احمد)

(۶۵) عیسیٰ علیہ السلام وادی افیق سے گذرے ان کے ساتھ ایک آدمی ان کے حواریوں میں سے تھا ایک آدمی ان کے سامنے آیا اس نے ان کو راستہ سے روکا اور کہنے لگا میں تم دونوں کو یہاں سے نہیں گذرنے دوں گا یہاں تک کہ تم میں سے ہر ایک کو تھپڑ ماروں گا ان دونوں نے حیلہ سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا رخسار حاضر ہے اس کو تھپڑ مار دو، اس نے تھپڑ مار دیا اور ان کا راستہ چھوڑ دیا پھر اس نے حواری سے کہا میں تجھ کو اس وقت تک نہیں گذرنے دوں گا یہاں تک کہ میں تجھ کو تھپڑ ماروں گا، آپ کے ساتھی نے اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی، جب عیسیٰ علیہ السلام نے اس بات کو دیکھا تو اپنا دوسرا رخسار اس کے سامنے کر دیا پھر اس نے آپ کو ایک تھپڑ مارا اور ان دونوں کا راستہ چھوڑ دیا (پھر) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ! اگر یہ آپ کی رضا کے لیے ہے تو مجھ کو نواز دے اپنی رضا سے اور اگر یہ آپ کی ناراضگی کے لیے ہے تو بلاشبہ آپ معاف کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔ (احمد۔ روایت سعید بن عبد العزیز)

(۶۶) عیسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک عورت پاس سے گذری ایک ساتھی نے اس عورت کی طرف دیکھا تو دوسرے ساتھی نے دیکھنے والے سے کہا کہ تو نے (آنکھ کا) زنا کیا ہے عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا تم بتاؤ اگر تو روزہ دار ہوتا اور تیرے پاس سے کوئی بھنی ہوئی چیز لے کر گذرتا تو اس کو سونگھ لیتا تو کیا تیرا روزہ ٹوٹ جاتا تو اس نے کہا (روزہ نہ ٹوٹتا)۔ (زوائد)

(۶۷) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی بستی میں داخل نہیں ہوا مگر یہ کہ بستی کے رہنے والوں نے وہاں سے نکالنا چاہا تو مجھے انہوں نے نکال ہی دیا اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی جوتی درخت کی چھال سے بنا لیتے تھے اور اسی سے اس کے تسمے بھی بنا لیتے۔ (مسند احمد۔ روایت عطاء)

(۶۸) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ایسا نہیں ہے جیسے میں ارادہ کرتا ہوں لیکن ایسا ہے جیسے تو ارادہ کرتا ہے اور ایسا نہیں ہوتا جیسے میں چاہتا ہوں اور ایسا ہوتا ہے جیسے تو چاہتا ہے۔ (احمد)

(۶۹) عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب یہ تھا کہ ان کو مسکین کہا جائے۔ (احمد)

شیطان مال کے ساتھ دھوکہ دیتا ہے: (۷۰) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ شیطان دنیا کے ساتھ ہے اور اس کا دھوکہ دینا مال کے ساتھ ہے نفس کی خواہش کو زینت دیتا ہے اور اس کا پورا ہونا (یعنی زینت کا) شہوات کے وقت ہوتا ہے۔ (زوائد۔ روایت ابن حلیس)

(۷۱) عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے اے اللہ! بیشک میں نے صبح کی اس حال میں کہ نہیں طاقت رکھتا اس چیز کو روکنے کی جس کو میں ناپسند کرتا ہوں اور میں اس نفع کا مالک نہیں ہوں جس کی میں امید رکھتا ہوں اور کام میرے علاوہ غیر کے قبضہ میں ہے اور میں نے صبح کی اپنے عمل کے ساتھ رہن رکھا ہوا ہوں اور مجھ سے زیادہ کوئی فقیر نہیں میرے دشمنوں کو میرے ساتھ نہ ہنسا میری وجہ سے تکلیف نہ دے میرے دوست کو اور میرے دین کے لیے میری مصیبت نہ بنادے اور مجھ پر ایسے آدمی کو مسلط نہ کر جو مجھ پر رحم نہ کرے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، احمد، روایت جعفر بن برقان)

(۷۲) عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کے مکتوبات میں فرمایا جب تجھے کسی مصیبت کے راستہ پر چلایا جائے تو جان لے کہ تجھے انبیاء اور صالحین کے راستہ پر چلایا گیا ہے اور جب تجھے خوشحال لوگوں کے راستہ پر چلایا جائے تو جان لے کہ تجھے ان کے راستے کے علاوہ دوسرے راستے پر چلایا گیا اور تیرے ساتھ ان کے طریقے سے مخالفت کی گئی۔ (مسند احمد۔ روایت وہب بن منبہ)

(۷۳) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریوں کی جماعت! اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھ پر موت آسان ہو جائے پھر عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا یقینی طور پر میں موت سے ایسا ڈرتا ہوں جیسے موت موت سے ڈرتی ہے۔ (احمد۔ روایت حسن بن علی صنعانی)

(۷۴) عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر پر کھڑے ہوئے ان کے ساتھ حواری بھی تھے اور قبر والا دفن کیا جارہا تھا تو حواریوں نے قبر کے اندھیرے کو اور اس کی وحشت کو اور اس کی تنگی کا ذکر کیا تو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم اس سے پہلے ماؤں کے رحموں میں اس سے بھی زیادہ تنگ جگہ میں تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے کہ وہ کشادہ ہو جائے تو وہ کشادہ ہو جائے گی۔ (مسند احمد۔ روایت وہب بن منبہ)

(۷۵) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ کے ذکر کی کثرت کرو اس کی حمد بیان کرو اور اس کی پاکی بھی بیان کرو

اور اس کی اطاعت کرو تم میں سے ہر ایک کے لیے دعا کافی ہے اگر اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہے (تو یوں دعا کرے) اے اللہ! میری خطاؤں کو معاف کر دے اور میری زندگی کی اصلاح کر دے اور مجھے ناگوار چیزوں سے عافیت میں رکھ اے میرے معبود!۔ (مسند احمد، روایت وہب بن منبہ)

(۷۶) عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے فرمایا، میں تم کو سچی بات کہتا ہوں نہ تم دنیا کا ارادہ کرو اور نہ آخرت کا ارادہ کرو حواریوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس بات کو ہم سے کھول کر بیان کیجئے ہم دیکھ رہے ہیں ہم میں سے (ہر) ایک ان دونوں (دنیا و آخرت) میں سے ہر ایک کا ارادہ کرتا ہے آپ نے فرمایا اگر تم نے دنیا کا ارادہ کیا ہوتا تو تم نے دنیا کے رب کی اطاعت کی ہوتی کہ جس کے ہاتھ اس دنیا کے خزانوں کی چابیاں ہیں سو اس نے تمہیں عطا کر دیا ہوتا اور اگر تم نے آخرت کا ارادہ کیا تو تم نے آخرت کے رب کی اطاعت کی ہوتی جو آخرت کا مالک ہے وہ تم کو عطاء فرما دیتا ہے لیکن تم نے نہ تو اس دنیا کا ارادہ کیا ہے اور نہ اس کا (یعنی آخرت کا)۔ (مسند احمد، روایت ابو الجلد)

جو کی روٹی اور سبزیاں: (۷۷) حواریوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا ہم کیا کھائیں فرمایا تم جَو کی روٹی کھاؤ اور جنگل کی سبزیاں کھاؤ لوگوں نے کہا کیا چیزیں پئیں فرمایا صاف اور خالص پانی پیو لوگوں نے کہا ہم کس چیز سے تکیہ لگائیں فرمایا زمین کا تکیہ بنالو، لوگوں نے کہا ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ ہمیں زندگی گزارنے کے سخت طریقے بتا رہے ہیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا اسی کے ذریعہ تم نجات پاؤ گے اور تم آسمانوں کے بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتے جب تک تم میں سے ہر ایک اس وقت تک یہ کام نہ کرے جب تک اس کی شدید خواہش نہ ہو لوگوں نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آدمی جب بھوکا ہوتا ہے تو اس کے نزدیک ایک ٹکڑا (روٹی کا) زیادہ محبوب ہوتا ہے اگرچہ جَو کا ہو اگر اس کو پیاس لگی ہو تو اس کے نزدیک پانی سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اگرچہ وہ سادہ پانی ہو اور جب (کسی جگہ) قیام لمبا ہو جائے تو اس کو زمین سے ٹیک لگانا زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ (مسند احمد، روایت ابو عبیدہ)

(۷۸) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بات کرو فصاحت کے ساتھ اور بیدار ہو غفلت کے اوقات میں اور تم فیصلہ کرو ذہانت کے ساتھ ناکارہ پھینکی ہوئی چیز نہ بنو اور تو زندہ ہے سانس لینے والا۔ (احمد۔ عطاء)

(۷۹) عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے اے حواریوں کی جماعت! اپنے گھروں کو عارضی ٹھکانا بناؤ اور مسجدوں کو ٹھہرنے کی جگہ بناؤ اور جنگل کی سبزیوں میں سے کھاؤ اور سلامتی کے ساتھ دنیا سے نکل جاؤ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد، روایت ابو ہریرہ)

(۸۰) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اپنے خزانوں کو آسمانوں میں بناؤ کیونکہ آدمی کا دل اس کے خزانہ کے پاس ہے۔ (مسند احمد۔ روایت ابراہیم تیمی)

(۸۱) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میرا گھر مسجد ہے میری خوشبو پانی ہے، میرا سالن بھوک ہے، میرا شعار خوف ہے، میری سواری میری ٹانگیں ہیں، اور سردی میں میری انگیٹھی سورج کی کرنیں ہیں اور رات کو میرا چراغ چاند ہے اور میرے ہم نشین اپاہج اور مساکین ہیں، اور میری شام اس حال میں ہوتی ہے کہ میرے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی اور صبح اس حال میں ہوتی ہے کہ میرے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی اور میں خیر سے ہوں پس کون مجھ سے زیادہ غنی ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

(۸۲) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہارے لیے دنیا بچھا دی گئی اور تم اس کی پیٹھ پر بیٹھتے ہو پس نہ جھگڑا کریں گے تم سے مگر بادشاہ اور عورتیں لیکن بادشاہ سو ان سے تم جھگڑا نہ کرو دنیا کے بارے میں کیونکہ وہ تمہارے لیے اپنی دنیا کو پیش نہیں کریں گے لیکن عورتیں سو ان سے روزہ اور نماز کے ذریعہ بچو۔ (ابن ابی الدنیا، روایت فضیل بن عیاض)

(۸۳) مسیح علیہ السلام نے فرمایا بلاشبہ تم طلب کرتے ہو دنیا کو تاکہ تم اس کی مدد سے نیکی کرو لیکن اس کو چھوڑنا زیادہ نیکی ہے۔ (ابن عساکر۔ روایت سفیان ثوری)

(۸۴) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا اللہ کی قسم! کسی دل میں نہیں جگہ پکڑتی دنیا کی محبت مگر اس کے دل میں تین چیزیں آجاتی ہیں ایسا مشغلہ جو اس کے دل سے جدا نہ ہو اور (ایسا) فقر کہ جس سے اپنی مالداری کو نہیں پائے اور (ایسی) آرزو جس کی انتہاء نہ پائی جاسکے طالب بھی ہے اور مطلوب بھی ہے سو آخرت کا طالب اس کو دنیا طلب کرتی ہے یہاں تک کہ اس میں وہ اپنے رزق کو پورا کرتا ہے اور دنیا کا طالب اس کو آخرت طلب کرتی ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے اور اس کی گردن پکڑ لیتی ہے۔ (ابن عساکر۔ روایت شعیب بن صالح)

(۸۵) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا جتنا تم تواضع اختیار کرو گے اتنا ہی تم بلند کئے جاؤ گے (یعنی اتنا ہی بلند مقام ملے گا) اور جتنا تم رحم کرو گے اتنا تم رحم کئے جاؤ گے اور جتنا تم لوگوں کی ضروریات پوری کرو گے اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات پوری فرمائیں گے۔ (ابن عساکر)

(۸۶) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا یہ احسان نہیں ہے کہ تو اس کے ساتھ احسان کرے جو تیرے ساتھ احسان کرتا ہے یہ تو برابری ہے، احسان یہ ہے کہ تو اس کے ساتھ احسان کرے جو تیرے ساتھ برائی کرے۔ (مسند احمد، ابن عساکر، روایت شعبی)

گالی دینے والے کے ساتھ حسن سلوک: (۸۷) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ایک قوم کے پاس سے گذرے انہوں نے ان کو گالیاں دیں تو عیسیٰ علیہ السلام نے (ان سے) خیر کی بات کی، پھر دوسرے لوگوں کے پاس سے گذرے انہوں نے ان کو اور زیادہ گالیاں دیں تو عیسیٰ علیہ السلام نے ان کو اور زیادہ خیر کے کلمات کہے، تو حواریوں میں سے ایک نے کہا وہ جب آپ علیہ السلام کے ساتھ زیادہ سختی کرتے ہیں آپ علیہ السلام اتنا ہی زیادہ ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں گویا آپ ان کو ایسا طرز عمل اپنانے پر آمادہ کرتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہر انسان وہی کچھ دیتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ (ابن عساکر۔ روایت ابن مبارک)

(۸۸) ایک خنزیر عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا آپ نے فرمایا گذر جا سلامتی کے ساتھ ان سے کہا گیا اے روح اللہ! اس خنزیر کے لیے آپ نے یوں فرمایا آپ علیہ السلام نے فرمایا میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ میری زبان کو بری بات کرنے کی عادت پڑ جائے۔ (ابن ابی الدنیا، روایت مالک بن انس)

(۸۹) لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا ہم کو ایسا عمل بتا دیجئے جو ہم کو جنت میں داخل کر دے آپ علیہ السلام نے فرمایا بالکل نہ بولو انہوں نے عرض کیا ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے پھر فرمایا تم نہ بولو انہوں نے عرض کیا ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے پھر فرمایا تم نہ بولو مگر خیر کے ساتھ۔ (ابن ابی الدنیا)

(۹۰) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا حق کو لے لو باطل والوں سے اور باطل کو نہ لو (حق والوں سے اور ہو جاؤ کلام کے پرکھنے والے) تاکہ فضول کلام تم پر غالب نہ آجائے۔ (الخرائطی۔ روایت ابراہیم نخعی)

(۹۱) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا اے حواریوں کی جماعت! راضی ہو جاؤ دنیا کی ذلت پر دین کی سلامتی کے ساتھ جیسے راضی ہو جاتے ہیں دنیا والے دین کی ذلت اور رسوائی پر دنیا کی سلامتی کے

ساتھ۔(ابن ابی الدنیا۔ بیہقی۔ زہد۔ روایت زکریابن عدی)

(۹۲) عیسیٰ علیہ السلام جَو کی روٹی راکھ کے ساتھ کھانا اور کتوں کے ساتھ گوبر کے ڈھیر پر سونا البتہ کم ہے جنت الفردوس کو طلب کرنے سے۔(ابن عساکر۔ روایت مالک بن دینار)

کوئی بندہ دو مالک راضی نہیں کر سکتا:(۹۳) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کوئی بندہ نہیں طاقت رکھتا کہ اس کے لیے دو مالک ہوں، ان دونوں میں سے ایک کو راضی کرے گا تو دوسرا ناراض ہو گا اور اگر ان دونوں میں سے ایک کو ناراض کرے گا تو دوسرے کو راضی کرے گا اور اسی طرح کوئی بندہ نہیں طاقت رکھتا کہ ایک دنیا کا خادم ہو اور آخرت کے لیے عمل کرے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بڑا پیدا نہیں فرمایا اس کے رزق سے اور اس کے جسم کو بڑا نہیں بنایا اس کے لباس سے، پس عبرت حاصل کرو۔(بن عساکر۔ روایت انس بن مالک)

(۹۴) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام فرمایا کرتے تھے اے ابن آدم! جب تو نیک کام کرے تو اس سے غافل ہو جا کیونکہ وہ ایسی ذات کے پاس ہے جو اس کو ضائع نہیں کرے گا اور جب تو کوئی برا کام کرے تو اس کو اپنے سامنے رکھ۔(ابن عساکر۔ روایت المقبری)

(۹۵) عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ حرص اس کے رزق میں اضافہ کر دے گا تو وہ اپنی لمبائی یا چوڑائی میں اضافہ کرے، یا اپنی عمارتوں کی تعداد میں اور اپنے رنگ کو تبدیل کرنے میں اضافہ کرے خبر دار! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور مخلوق کو اس کے لیے پیدا فرمایا جس کے لیے اس کو پیدا فرمایا پھر رزق کو تقسیم فرمایا جس کے لیے رزق تقسیم کیا گیا اس کے لیے رزق جاری ہے، دنیا اس کو کوئی چیز دینے والی نہیں جو اس کی نہ ہو اور نہ ہی اس چیز کو روکنے والی ہے جو تمہاری ہو، تم پر لازم ہے اپنے رب کی عبادت کرنا بلاشبہ تم اس کے لیے پیدا کئے گئے ہو۔(ابن عساکر، روایت سعید بن ابی ہلال)

(۹۶) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا اگر تم میرے بھائی اور میرے ساتھی ہو تو اپنے آپ کو لوگوں کی دشمنی اور بغض پر آمادہ کرو۔(ابن عساکر۔ روایت عمران بن سلیمان)

(۹۷) مسیح علیہ السلام نے فرمایا جس شخص نے علم سیکھا اور عمل کیا اور پھر لوگوں کو سکھایا وہ عظیم پکارا جاتا

ہے آسمانوں کی بادشاہت میں۔(مسند احمد، بیہقی، روایت عبد العزیز بن ظبیان)

(۹۸) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بنی اسرائیل میں کھڑے ہوئے اور فرمایا اے حواریوں کی جماعت! بیان کرو حکمت (کی باتوں) کو ان لوگوں کے سامنے جو اس کے لائق نہ ہو (اگر تم ایسا کروگے) تو تم اپنے اوپر ظلم کروگے اور نہ روکو اس کو ان لوگوں سے جو اس کے لائق ہوں۔ (اگر تم ایسا کروگے) تو تم ان لوگوں پر ظلم کروگے اور کام تین قسم پر ہیں ایک وہ کام جس کا ہدایت ہونا واضح ہو تو اس کی تابعداری کرو دوسرا وہ کام جس کی گمراہی واضح ہو تو اس سے بچو اور تیسرا وہ کام جس میں تم پر اختلاف کیا گیا ہو تو اس کے علم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔(ابن عساکر)

(۹۹) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا اگر تم نے حکمت کو روک دیا اس کے اہل سے تو تو نے جہالت کی اور اگر تو نے اس کو دے دیا کسی غیر اہل کو تو تو نے جہالت کی، اس طبیب کی مانند ہو جا اگر وہ دوا کا موقع دیکھتا ہے تو دوائی دیتا ہے ورنہ دوائی سے رک جاتا ہے۔(ابن عساکر)

(۱۰۰) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا اے حواریوں کی جماعت! موتیوں کو خنزیر کی طرف مت پھینکو کیونکہ خنزیر موتیوں سے کوئی چیز نہیں بناتا اور حکمت کے موتی اس شخص کو نہ دو جو اس کو چاہتا نہیں ہے کیونکہ حکمت موتیوں سے بہتر ہے اور جو حکمت کے موتی نہیں لینا چاہتا وہ خنزیر سے بدتر ہے۔(الزہد۔روایت عبد اللہ بن احمد، ابن عساکر، روایت عکرمہ)

(۱۰۱) عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا يَا عُلَمَاءَ السُّوءِ جَلَسْتُمْ عَلَى أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَلَا أَنْتُمْ تَدْخُلُونَهَا وَلَا تَدَعُونَ الْمَسَاكِينَ يَدْخُلُونَهَا أَنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ عَالِمٌ يَّطْلُبُ الدُّنْيَا بِعِلْمِهِ، اے برے علماء! تم بیٹھے ہو جنت کے دروازوں پر نہ خود تم اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ تم مسکینوں کو داخل ہونے دیتے ہو کہ وہ اس میں داخل ہو جائیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے برا وہ عالم ہے جو دنیا کو اپنے علم کے ذریعہ سے طلب کرتا ہو۔(ابن عساکر۔روایت وہب بن منبہ)

(۱۰۲) عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے فرمایا نفس کا بات کرنا گناہ کے ساتھ ایسا ہے جیسا مثال دھوئیں کی گھر میں کہ اس کو نہیں جلاتا ہے لیکن اس کی ہوا کو بدبودار بنا دیتا ہے اور اس کے رنگ کو بدل دیتا ہے۔ (ابن ابی شیبہ۔روایت سالم بن ابی الجعد)

وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ: اللہ تعالیٰ نے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو کتابت وحکمت کی تعلیم دی، اسی طرح تورات وانجیل کی تعلیم بھی دی، حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ تورات اور انجیل پڑھا کرتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تورات کو زبانی یاد کرتے تھے۔ (بحر المحیط) بعض فرماتے ہیں کہ آپ تورات کے عالم تھے، بعض فرماتے ہیں کہ جب عیسیٰ علیہ السلام عمر میں بڑے ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے تورات ان کے دل میں ڈالی کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے سیکھ گئے تھے۔ (البحر المحیط) تفسیر بغوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تورات اور انجیل سکھائی تھی۔ (تفسیر بغوی) تفسیر روح البیان میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تورات اور انجیل دونوں کو زبانی یاد کرتے تھے۔ (روح البیان)

یہ وہ اطلاعات وخبریں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کو ان کے بیٹے سے متعلق دیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کس عظیم مرتبے ومقام سے سرفراز فرمانے والے ہیں۔ جس وقت یہ اطلاعات انہیں دی گئیں اس وقت سے پہلے تورات نازل ہو چکی تھی جب کہ انجیل ابھی نازل نہیں ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کی بھی اطلاع دی کہ وہ ان کے بیٹے کو دی جائے گی، اس کی ان کی طرف وحی کی جائے گی، اس کی اطلاعات ان سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی دی تھیں کہ ایک نبی آئیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ انجیل عطا کریں گے۔

حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللهِ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ {۴۹} وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ {۵۰} إِنَّ اللهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ {۵۱} آل عمران

جواب ترجمہ: اور بنا دے گا اس کو رسول بنی اسرائیل کی طرف، (بنی اسرائیل سے ان کا یہ خطاب ہو گا کہ) بلاشبہ میں تمہارے پاس لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر، کہ بلاشبہ میں بناتا ہوں تمہارے سامنے مٹی سے پرندہ کی طرح ایک چیز بھی اس میں پھونک دیتا ہوں تو وہ پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے، اور اچھا کرتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور برص والے کو اور زندہ کرتا ہوں مردوں کو اللہ کے حکم سے، اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور ذخیرہ رکھتے ہو اپنے گھروں میں، بلاشبہ اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان قبول کرنے والے ہو۔ اور سچا بتاتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب کو جو توراۃ ہے تاکہ میں حلال کروں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام کی گئیں، اور میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بیشک اللہ میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے سو اس کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے۔

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو مطلع فرمایا کہ وہ انہیں رسول بنا کر بھیجے گا، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تمام بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے جائیں گے، مگر یہودیوں کا کہنا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک خاص طبقے کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، ان کے بارے میں یہود کے دو گروہ تھے، ایک گروہ ان پر الزامات واتہامات کی بارش کرتا تھا، ان لوگوں کی اکثریت تھی، جو انہیں بدکاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والا شخص قرار دیتے تھے، یہود کا ایک فرقہ وہ تھا جو ان کے مواعظ کو سچے مواعظ قرار دیتا تھا، اس فرقے کا کہنا تھا کہ ان کی باتیں تورات کے خلاف نہیں ہیں، ان کا عقیدہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کے عبادت گزاروں میں سے ایک عبادت گزار تھے مگر وہ رسول اور نبی نہیں تھے۔ جب کہ قرآن کریم نے یہاں رَسُولًا فرما کر ان دونوں یہودی فرقوں پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ یہودی کون ہوتے ہیں ان پر موشگافیاں کرنے والے، کون ہیں جو ان پر انگشت شکایت بلند کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں عظمت، مرتبے اور مقام والا رسول بنا کر بھیجا ہے، کیونکہ عربی زبان کا یہ کمال ہے کہ باریک سے باریک نقطے میں کمال کا مضمون بیان کر دیتا ہے، یہاں رسولاً کی تنوین میں اس عظمت شان کو واضح کیا گیا ہے۔

أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ: یہاں حرف جر محذوف ہے اور رَسُولاً سے اس کا تعلق ہے یا

احوال مذکورہ پر عطف ہے اور رسالت نطق کے معنی کو متضمن ہے مطلب اس طرح ہو گا کہ ہم اس کو بنی اسرائیل کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجیں گے اور وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارے پاس معجزہ لے کر آیا ہوں جو میری رسالت کو ثابت کر رہا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات اگرچہ متعدد تھے مگر آپ علیہ السلام کی صداقت تمام معجزات سے ایک ہی طرح ثابت ہوتی تھی اس لیے بآیات کی جگہ بِآیَةٍ فرمایا۔ (مظہری) مِنْ رَّبِّكُمْ یہ آیت کی صفت ہے یعنی معجزہ ایسا ہو گا جو اللہ کا دیا ہوا ہو گا۔ یاجِئتُکُم سے اس کا تعلق ہے یعنی میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آیا ہوں (مظہری) اس آیت میں ایک نشانی سے مراد جنس نشانی ہے جو ان تمام نشانیوں کو شامل ہے جن کا ذکر اس آیت کے اگلے حصہ میں کیا ہے۔

أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللهِ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: میں تمہارے لیے صورت بناتا ہوں تا کہ تم لوگ ایمان لاؤ، هَيْئَة سے مراد تصویر بنانا ہے، پیدا کرنا مراد نہیں ہے، فیہ کی ضمیر معنیٰ کی رعایت کرتے ہوئے هَيْئَة کی طرف راجع ہے، عیسیٰ اس تصویر میں پھونک مارتے تھے تو وہ پرندہ زندہ ہو کر اس طرح اڑتا تھا جس طرح عام پرندے اڑان بھر کر اڑتے ہیں، بِإِذْنِ اللهِ کے لفظ سے ان تمام مشرکین کے عقیدہ شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے جو اولیاء اللہ میں یہ کمال تسلیم کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ بھی مردے زندہ کر سکتے یا کسی مخلوق کو پیدا کر سکتے ہیں۔ یہاں واضح طور پر بتایا جا رہا ہے کہ اس صورت کا پرندہ بننا اللہ کے امر اور ارادے سے ہوتا تھا، نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چاہت یا کاریگری سے، پرندے میں زندگی اللہ کی طرف سے ہوتی تھی، جب کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک اس کا ذریعہ بن جایا کرتی تھی، عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ایسا معجزہ تھا جس کی ایک باریک نسبت اس معجزہ کے ساتھ ہے جس کے باعث اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں لائے، جبریل امین علیہ السلام نے آپ کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونک ماری تھی، جس کے نتیجہ میں عیسیٰ دنیا میں جلوہ گر ہوئے اور بغیر والد کے پیدا ہوئے۔

بنی اسرائیل کی بری عادات میں سے کچھ کا تعلق انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ تمسخر اور مزاق اڑانے

کا تھا، وہ ان پاکباز ہستیوں کو پریشان کرنے اور لوگوں کے سامنے ان کا تماشہ لگانے کے لیے اُوٹ پٹانگ سوالات داغ دیتے تھے تاکہ جواب نہ دے سکنے کی صورت میں لوگوں کے سامنے ان کا تماشہ لگایا جاسکے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کی درخواست پر دعوائے نبوت کے بعد معجزات دکھائے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ ایک چمگادڑ پیدا کریں، آپ نے مٹی سے چمگادڑ بنائی، پھر اس میں پھونک ماری تو وہ لوگوں کے سامنے زمین وآسمان کے درمیان فضا میں اڑنے لگی، جتنی دیر لوگ اسے دیکھتے رہے وہ اڑتی رہی، جب لوگوں کی نظروں سے غائب ہوگئی تو گر کر مر گئی، اس معجزہ کی رونمائی کے بعد لوگوں نے بجائے اس کے کہ ان پر ایمان لاتے، انہیں اللہ کا سچا نبی تسلیم کرتے، وہی پرانا جملہ کس دیا جو تمام کفار اپنے نبیوں کے بارے میں بولا کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہے۔

چمگادڑ اڑنے والے جانوروں میں بہت عجیب تر ہے اور قدرت پر دلالت کرنے میں اوروں سے ابلغ کیونکہ وہ بغیر پروں کے تو اُڑتی ہے، یہ باقی جانوروں کی طرح پیدا ہوتی ہے مگر باقی پرندوں کی طرح انڈے نہیں دیتی اور دانت رکھتی ہے اور ہنستی ہے اور اس کی مادہ کے چھاتی ہوتی ہے، اس سے دودھ نکلتا ہے اور بچہ جنتی ہے باوجودیکہ اُڑنے والے جانوروں میں یہ باتیں نہیں ہیں، یہ دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں دیکھ نہیں سکتی، یہ صرف دو گھڑیوں میں دیکھ سکتی ہے، ایک گھڑی غروب آفتاب کے بعد اور ایک گھڑی طلوع فجر کے بعد جب اچھی طرح روشنی سی ہونے لگتی ہے، یہ انسانوں کی طرح ہنستی ہے، اسے عورتوں کی طرح حیض آتا ہے۔ (تفسیر روح البیان ۲/۳۷)

ابن جریر نے ابن اسحاق رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن عیسیٰ علیہ السلام کاتبوں (لکھنے پڑھنے والوں) میں سے چند لڑکوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ علیہ السلام نے مٹی اٹھائی اور ان سے پوچھا کہ کیا میں تم کو اس مٹی سے ایک پرندہ نہ بنادوں؟ انہوں نے کہا کیا آپ اس کی طاقت رکھتے ہیں؟ فرمایا ہاں اپنے رب کے حکم سے، پھر اس کو تیار کیا یہاں تک کہ اس کو پرندہ کی شکل میں بنا کر اس میں پھونک مار دی پھر فرمایا کُن طَائِراً بِاِذنِ اللہِ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاوہ پرندہ بن کر آپ کی ہتھیلیوں کے

درمیان سے اُڑ گیا اور یہ لڑکے اس بات کو لے کر ان کے حکم سے باہر نکل گئے اور انہوں نے یہ (بات) اپنے اساتذہ کو بتائی تو انہوں نے اس بات کو لوگوں میں پھیلا دیا۔ (ابن جریر، تفسیر در منثور)

ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کونسا پرندہ بنانے کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے؟ لوگوں نے کہا چمگادڑ کیونکہ وہ (صرف) گوشت ہے آپ نے چمگادڑ ہی بنا دیا۔ (در منثور)

شرعی مسئلہ بابت تصویر: یہاں شرعی مسئلہ ذہن نشین رہے کہ اس شریعت میں پرندوں کی تصویریں بنانا جائز تھا، اسی لیے تو عیسیٰ علیہ السلام نے پرندوں کی صورتیں بنائیں، اگر تصویر سازی اس شریعت میں جائز نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے منتخب پیغمبر ایسا کام نہیں کر سکتے تھے، جب کہ ہماری شریعت اسلامیہ میں کسی جاندار کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے، اگر پہلی شریعتوں میں جواز تھا تو شریعت محمدیہ میں وہ حکم ختم ہو چکا ہے، منسوخ ہو چکا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی جاندار کی تصویر بنانے پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے، یہاں تک فرمایا کہ جس گھر میں کتا اور تصویر ہو وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے، تصویریں بنانے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔

وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس مادرزاد اندھوں اور برص کی بیماری والوں کو لایا جاتا تو آپ ان پر ہاتھ پھیرتے تھے، تو یہ لوگ ٹھیک ہو جاتے تھے، برص ایسی بیماری تھی جو کسی علاج کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں ہوتی تھی، اس بیماری نے اس دور کے ڈاکٹروں، طبیبوں تک کو عاجز کر دیا تھا، ماہر ترین ڈاکٹر بھی اس کا علاج کرنے سے بے بس تھے، برص اور مادرزاد اندھا پیدا ہونے والے کے بارے میں ڈاکٹر سوال کرتے تھے، جالینوس نے کہا کہ جب کوئی مادرزاد اندھا پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج نہیں ہو سکتا، اسی طرح برص کی بیماری والا آدمی اگر اس حال میں ہوتا کہ اس میں سوئی چبھوئی جاتی تو اس میں سے خون نہ نکلتا تو کہا جاتا تھا اس کا علاج نہیں ہو سکتا، چنانچہ یہ دونوں مریض عیسیٰ علیہ السلام کے پاس لائے گئے، آپ علیہ السلام نے دعا کرتے ہی ان پر ہاتھ پھیرا تو برص والا درست ہو گیا، مادرزاد اندھا دیکھنے لگا، یہ دیکھ کر کچھ لوگ مسلمان ہو گئے اور کچھ کہنے لگے یہ تو جادوگر ہے۔ (روح البیان) اکثر اہل لغت کا قول یہ ہے کہ اکمہ وہ شخص ہے جو مادرزاد اندھا ہو اور اس امت میں قتادہ بن دعامہ السدوسی کے سوا کوئی مادرزاد اندھا نہیں ہوا، یہ صاحب تفسیر تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن بصری اور

سدی کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد مطلقاً نابینا شخص ہے۔ (بحر المحیط)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لفظ الْأَكْمَهَ سے مراد ہے ایسا اندھا جس کی آنکھیں ہی نہ ہوں (یعنی آنکھوں کی جگہ برابر ہو اور آنکھوں کا نشان بھی نہ ہو) ابن الانباری رحمہ اللہ نے کتاب میں مجاہد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ لفظ الْأَكْمَهَ سے مراد وہ شخص ہے جو دن کو دیکھتا ہے اور رات کو نہیں دیکھتا۔ ابن الانباری رحمہ اللہ نے عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لفظ الْأَكْمَهَ سے مراد ہے کمزور نگاہ والا۔ (در منثور)

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک ایک دن میں پچاس پچاس ہزار مریضوں کا اجتماع ہو جاتا تھا ان میں جو چل سکتا تھا وہ حاضر خدمت ہوتا تھا اور جسے چلنے کی طاقت نہ ہوتی اس کے پاس خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے جاتے اور دعا فرما کر اس کو تندرست کرتے اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی شرط کر لیتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپاہجوں اور مادرزاد اندھوں کے لیے یہ دعا کرتے تھے

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اِلٰهُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَ اِلٰهُ مَنْ فِي الْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ فِيْهِمَا غَيْرُكَ وَ اَنْتَ جَبَّارٌ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ جَبَّارٌ مَنْ فِي الْاَرْضِ لَا جَبَّارَ فِيْهِمَا غَيْرُكَ وَ اَنْتَ مَلِكُ مَنْ فِي السَّمَاءِ وَ مَلِكُ مَنْ فِي الْاَرْضِ لَا مَلِكَ فِيْهِمَا غَيْرُكَ قُدْرَتُكَ فِي الْاَرْضِ كَقُدْرَتِكَ فِي السَّمَاءِ سُلْطَانُكَ فِي الْاَرْضِ كَسُلْطَانِكَ فِي السَّمَاءِ اَسْأَلُكَ بِاسْمِكَ الْكَرِيْمِ وَ وَجْهِكَ الْمُنِيْرِ وَ مُلْكِكَ الْقَدِيْمِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

ترجمہ: اے اللہ تو ہی معبود ہے آسمان میں اور معبود ہے زمین میں ان دونوں میں تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں اور تو بہت طاقتور ہے آسمان میں اور بہت طاقتور ہے زمین میں اور ان دونوں میں تیرے علاوہ کوئی طاقتور نہیں تو ہی بادشاہ ہے آسمان میں اور بادشاہ ہے زمین میں اور ان دونوں میں تیرے علاوہ کوئی بادشاہ نہیں تیری قدرت ہے آسمان میں جیسے تیری قدرت ہے زمین میں اور تیری بادشاہی ہے زمین میں جیسے تیری بادشاہی ہے آسمان میں۔ ہم تجھ سے تیرے شریف نام کے ساتھ اور تیرے روشن چہرے کے ساتھ تجھ سے سوال کرتے ہیں اور تیرا ملک قدیم ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔

حضرت وھب بن منبہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ دعا گھبراہٹ اور مجنون کے لیے ہے کہ اس پر پڑھی جائے اور اس کے لیے لکھ دی جائے اور اس کا پانی بھی پلایا جائے ان شاء اللہ تعالیٰ شفا ہو گی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ کی یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان عبرانی یا سریانی تھی عربی نہ تھی اور یہ دعا عربی ہے اس لیے شاید وہب کی مراد یہ ہے کہ ان عربی الفاظ کے ہم معنی الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے، وہب رحمہ اللہ نے لکھا یہ دعا خفقان اور جنون کے لیے ہے مجنون اور خفقانی پر یہ دعاء پڑھ کر دم کی جائے اور لکھ کر پانی سے دھو کر پلائی جائے ان شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ (مظہری)

وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں، لوگوں نے جالینوس سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ مردہ علاج کے ساتھ زندہ نہیں ہو سکتا، اگر وہ مردہ کو زندہ کر لیتا ہے تو وہ نبی ہے طبیب نہیں ہے، پہلے بھی باذن اللہ ذکر کیا گیا اور یہاں باذن اللہ دوبارہ لایا گیا، تکرار کی وجہ الوہیت (الٰہ اور خدا ہونے) کے وہم کو ختم کیا گیا، کہ کہیں لوگوں کے اذہان وخیالات میں یہ بات گردش نہ کرنے لگ جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو خدا ہیں، جو زندہ کرتے ہیں اور عجیب عجیب باتوں کا صدور ان سے ہو رہا ہے، تو واضح کر دیا کہ کسی کو زندہ کرنا یہ انسانی کام نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

لوگوں کے مطالبے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار آدمیوں کو زندہ کیا۔ ① ایک عازر جس کو آپ کے ساتھ اخلاص تھا جب اس کی حالت نازک ہوئی تو اس کی بہن نے آپ کو اطلاع دی مگر وہ آپ سے تین روز کی مسافت کے فاصلہ پر تھا جب آپ تین روز میں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کے انتقال کو تین روز ہو چکے، آپ نے اس کی بہن سے فرمایا ہمیں اس کی قبر پر لے چل، وہ لے گئی آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی عازر اللہ کے امر سے زندہ ہو کر قبر سے باہر آیا اور مدت تک زندہ رہا اور اس کے اولاد ہوئی۔

② ایک بڑھیا کا لڑکا جس کا جنازہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جا رہا تھا آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی، وہ زندہ ہو کر چارپائی پر اٹھ بیٹھا، میت اٹھانے والوں کے کاندھوں سے اتر پڑا، کپڑے پہنے گھر آیا، جس

چارپائی پر میت ہو کر گیا تھا اس چارپائی کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر اپنے گھر واپس لایا، زندہ رہا، اولاد ہوئی۔

③ ایک عاشر (ٹیکس اکٹھا کرنے والا) کی لڑکی شام کو مری، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا گیا کہ اسے زندہ کر دیجیے، چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام نے اس لڑکی کو زندہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اس کو زندہ کیا، وہ ایک عرصہ تک زندہ رہی، اس کی اولاد ہوئی، لوگوں نے سمجھا کہ شاید عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کو زندہ کرتے ہیں جو قریبی زمانہ میں فوت ہوئے ہوں، چنانچہ اللہ کی قدرت دیکھیے، ہزاروں سال پہلے فوت ہونے والے سام بن نوح کو بھی عیسیٰ علیہ السلام نے زندہ کیا۔

④ سام بن نوح جن کی وفات کو ہزاروں برس گزر چکے تھے لوگوں نے خواہش کی کہ آپ ان کو زندہ کریں، عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کہا کہ مجھے ان کی قبر دکھاؤ، چنانچہ لوگ ان کے ساتھ چلے، آپ ان کی نشاندہی سے قبر پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کے ذریعے دعا کی، سام اپنی قبر سے اس حال میں نکلے کہ ان کا سر سفید تھا، عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ یہ سفیدی کیا ہے؟ آپ کے بال آپ کے زمانے میں تو سفید نہ تھے، انہوں نے کہا کہ اے روح اللہ! جب آپ نے مجھے پکارا تو میں نے سنا کوئی کہنے والا کہتا ہے اَجِبْ رُوْحَ اللّٰہ یہ آواز سن کر مجھے یوں لگا کہ قیامت قائم ہو گئی، اس ہولناکی کی وجہ سے میرا سر سفید ہو گیا، عیسیٰ علیہ السلام نے سام سے نزع کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ نزع کے وقت کی کڑواہٹ ابھی تک میرے گلے میں محسوس ہو رہی ہے، انہوں نے لوگوں سے کہا کہ ان کی بات کو مان لو، یہ اللہ کے نبی ہیں، چنانچہ ان پر کوئی ایمان لایا اور کسی نے انکار کیا، پھر عیسیٰ نے انہیں کہا کہ مر جا، انہوں نے کہا کہ ایک شرط پر، انہوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ نزع کے وقت کی سختی سے اللہ مجھے بچائے، چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی، اللہ نے ان کی دعا پر ایسا ہی کیا کہ انہیں موت کے وقت کی سختی سے بچایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہمسفر: ایک آدمی عیسیٰ علیہ السلام کا ساتھی بن گیا، دونوں چلے اور ایک نہر کے کنارے پہنچے، دونوں صبح کا کھانا کھانے بیٹھ گئے، ان کے پاس تین روٹیاں تھیں، ان دونوں نے دو روٹیاں کھائیں اور ایک روٹی بچ گئی عیسیٰ علیہ السلام نہر کی طرف پانی پینے کے لیے تشریف لے گئے، جب لوٹے تو روٹی کو نہ پایا اس آدمی سے فرمایا کس نے روٹی کھائی؟ اس نے کہا میں نہیں جانتا پھر آپ اس

کے ساتھ چلے ایک ہرنی کو دیکھا کہ اس کے ساتھ دو بچے تھے، عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ایک کو بلایا وہ آگیا تو اس کو ذبح کر کے بھون لیا اور دونوں نے کھایا، پھر اس بچہ سے فرمایا اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا، وہ کھڑا ہو گیا پھر اس آدمی سے فرمایا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس ذات کی قسم کے ساتھ کہ جس نے تجھ کو یہ نشانی دکھائی کس نے روٹی کھائی؟

اس نے کہا میں نہیں جانتا پھر یہ دونوں دریا کی طرف پہنچے عیسیٰ علیہ السلام نے اس آدمی کے ہاتھ کو پکڑا اور پانی پر چلنے لگے، پھر اس سے فرمایا میں تجھ کو اس ذات کی قسم دیتا ہوں، جس نے تجھ کو یہ نشانی دکھائی تو بتا کس نے روٹی لی؟ اس نے کہا میں نہیں جانتا، پھر یہ جنگل میں پہنچے عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی اور گارا لیا اور فرمایا اللہ کے حکم سے سونا بن جا، وہ سونا بن گئی آپ نے اس کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا اور فرمایا ایک تہائی تیرے لیے ہے، ایک تہائی میرے لیے ہے اور ایک تہائی اس کے لیے ہے جس نے روٹی لے لی، اس نے کہا میں نے اس کو لیا تھا عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا یہ سب تیرے لیے ہے اور اس سے جدائی اختیار کر لی۔

اس کے پاس دو اور آدمی آئے انہوں نے ارادہ کیا کہ اس سونے کو لے لیں اور اس آدمی کو قتل کر دیں، اس (پہلے والے) آدمی نے کہا کہ یہ ہمارے درمیان تین تہائی ہے (ہم تینوں بانٹ لیں گے) اور تم میں سے ایک اس بستی کی طرف جائے تاکہ ہمارے لیے کھانا خرید کر لے آئے چنانچہ ان میں سے ایک آدمی کو انہوں نے بھیج دیا، اب وہ آدمی جس کو بھیجا گیا تھا اس نے (دل میں) کہا کہ کس لیے میں اس مال کو تقسیم کروں لیکن میں اسی کھانے میں زہر رکھ دوں گا اور دونوں کو قتل کر دوں گا ان (پیچھے بیٹھے ہوئے) آدمیوں نے کہا ہم کس لیے اس کو تہائی مال دیں لیکن جب وہ لوٹ آئے تو اس کو ہم قتل کر دیں گے، جب وہ آدمی (کھانا لے کر) لوٹا تو انہوں نے اس کو قتل کر دیا ان دونوں نے جب کھانا کھایا تو (زہر کی وجہ سے) دونوں مر گئے اور مال جنگل میں باقی رہا اور یہ تینوں اس (مال) کے پاس قتل ہو گئے۔ (ابن عساکر، در منثور)

وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بیماروں کو اچھا کیا اور مردوں کو زندہ کیا تو بعض لوگوں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے اور کوئی معجزہ دکھایئے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ

جو تم کھاتے ہو اور جو جمع کر کے رکھتے ہو میں اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دستِ مبارک پر یہ معجزہ بھی ظاہر ہوا آپ علیہ السلام آدمی کو بتا دیتے تھے جو وہ کل کھا چکا اور آج کھائے گا اور جو اگلے وقت کے لئے تیار کر رکھا ہے، آپ کے پاس بچے بہت سے جمع ہو جاتے تھے آپ انہیں بتاتے تھے کہ تمہارے گھر فلاں چیز تیار ہوئی ہے تمہارے گھر والوں نے فلاں فلاں چیز کھائی ہے، فلاں چیز تمہارے لئے اٹھا رکھی ہے بچے گھر جاتے روتے، گھر والوں سے وہ چیز مانگتے گھر والے وہ چیز دیتے اور ان سے کہتے کہ تمہیں کس نے بتایا؟ بچے کہتے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے، تو لوگوں نے اپنے بچوں کو آپ علیہ السلام کے پاس آنے سے روکا اور کہا وہ جادوگر ہیں، ان کے پاس نہ بیٹھو اور ایک مکان میں سب بچوں کو جمع کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچوں کو تلاش کرتے تشریف لائے تو لوگوں نے کہا وہ یہاں نہیں ہیں آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر اس مکان میں کون ہے؟ انہوں نے کہا خنزیر ہیں فرمایا: ایسا ہی ہو گا اب جو دروازہ کھولتے ہیں تو سب خنزیر ہی خنزیر تھے۔ (روح البیان)

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لفظ آیت وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ یعنی میں تم کو بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو یعنی دستر خوان سے وَمَا تَدَّخِرُونَ (اور جو تم ذخیرہ کرتے ہو) یعنی اس میں سے اور وعدہ لیا تھا ان سے جب مائدۃ میں نازل ہوا کہ وہ کھائیں گے اور ذخیرہ نہ کریں گے اور وہ ڈرتے تھے کہ بندر اور سور نہ بنا دیئے جائیں۔ (مصنف عبد الرزاق، ابن جریر، در منثور)

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ: یہ چار کام پرندوں کی صورتیں بنا کر انہیں اڑا دینا، مادرزاد اندھے کو بینا کر دینا، کوڑھی کو تندرست کر دینا، مردوں کو زندہ کر دینا عظیم معجزات تھے اور ایسے زمانے میں ان معجزات کا ظہور ہوا جس زمانے میں چہار اطراف میں اطباء، حکماء اور معالجین جسمانی کی کثرت اور دھوم مچی ہوئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر کے ہاتھ پر وہ معجزات رونما ہوئے جن کی اس زمانے کے بڑے بڑے ماہرین فن سوچ بھی نہیں سکتے تھے، یہ سارے معجزات اس لیے تھے تاکہ لوگ ایمان لے آئیں، اسلوب کلام میں اس طرف اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ یہ معجزات اس لیے دکھائے گئے ہیں تاکہ تم لوگ مجھے پیغمبر سمجھو، مجھے اللہ کا فرستادہ سمجھو، مجھے صاحب کتاب نبی سمجھو اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جاؤ، یہ واضح دلائل و معجزات ہیں جو میری رسالت پر دلالت

کرتے ہیں، یہ خوارق عادت کام ہیں، ان کا ظاہری اسباب وعلل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، جیسے اطباء، حکماء اور معالجین کے پاس اسباب ووسائل ہوتے ہیں، آیت کا آخری جملہ بتاتا ہے کہ اگر تم لوگ ایمان لاتے ہو، ایقان رکھتے ہو تو یہ سب کچھ تمہیں نفع پہنچائے گا، آیت کریمہ کا یہ آخری جو حصہ ہے اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یا تو یہ عیسیٰ کا کلام تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہلوایا، یا کلام اللہ ہے۔

اس قدر وضاحت کے باوجود یہودی لب کشائی اور یاوہ گوئی سے باز نہ رہے، مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ سے خوارق کا بہ کثرت صادر ہونا تاریخ کا ایک مسلم واقعہ ہے خواہ ان کی توجیہ مفکرین کچھ بھی کرتے رہے ہوں، یہود نے انہی خوارق کو دیکھ کر آپ کو ساحر وشعبدہ باز کہنا شروع کر دیا چنانچہ جوزیفس (متوفی ۱۰۰ء) نے اپنی تاریخ آثار یہود میں آپ کا ذکر اس حیثیت سے کیا ہے اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے " یسوع نے بہ حیثیت معلم دین یا قانون ساز کے نہیں بلکہ بہ حیثیت شعبدہ باز کے اپنی زندگی میں شہرت وناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں میں حاصل کی "(ج ۷ ص ۱۶۷، ماجدی)

وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ: حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ تھا کہ وہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات کی تصدیق کریں، تصدیق کا معنیٰ اور مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس میں تھا اس پر ایمان لانا، ارباب تفسیر لکھتے ہیں کہ "ہر نبی پر واجب ہے کہ وہ اپنے سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرے کیونکہ تمام نبیوں کی تصدیق کا ذریعہ معجزہ ہے اور جب ہر نبی علیہ السلام نے اپنی نبوت کے ثبوت میں معجزہ پیش کیا ہے تو پھر ہر نبی کی تصدیق کرنا واجب ہے اور ہو سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے یہ غرض ہو کہ وہ توراۃ کو مقرر اور ثابت رکھیں، منکرین کے شبہات کا ازالہ کریں اور غالی یہودیوں نے دین میں جو تحریف کر دی ہے اس تحریف کو زائل کریں۔ (تبیان القرآن)

وہب بن منبہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر تھے، وہ ہفتہ کے دن کی تعظیم کرتے تھے اور نماز میں بیت المقدس کی طرف منہ کرتے تھے، انہوں نے بنو اسرائیل سے کہا کہ میں تم کو توراۃ کی کسی بات کی مخالفت کی دعوت نہیں دیتا، البتہ بعض چیزیں جو

توراۃ میں حرام کر دی گئیں میں ان کو حلال کرتا ہوں اور بعض مشکل احکام کو منسوخ کرتا ہوں۔ (جامع البیان، در منثور) ابن جریج نے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے اونٹ کا گوشت اور چربی کو حلال کر دیا اور کئی قسم کی مچھلیاں حلال کر دیں اور جس پرندے پر نشانات نہ ہوں ان کو حلال کر دیا۔ (البحر المحیط، تفسیر در منثور، تبیان القرآن)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے ان چیزوں کو حلال کر دیا جو ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں اور وہ توراۃ میں نہ تھیں، مثلاً تھوم کھانا اور ہر ناخن والا جانور اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے ان کے لیے ان چیزوں کو حلال کر دیا جنہیں ان پر علماء نے حرام کر دیا تھا اور وہ توراۃ میں ان پر حرام نہ کی گئی تھیں۔ (قرطبی)

احبار (یہودی علماء) نے اپنی طرف سے شرائع باطلہ گھڑ کر حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیے تھے، حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے تشریف لا کر انہیں اٹھا دیا اور باطل قرار دیا، پھر معاملہ اِدھر ہی پلٹ گیا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا، دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے لیے بطور سزا کچھ اشیاء حرام کی تھیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ [النِّسَاءِ: ۱۶۰] یہودی مظالم کے باعث ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دی تھیں جو ان کے لیے حلال تھیں، ان پر حرام کی گئی چیزیں مسلسل ان پر اس وقت تک حرام رہیں جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد نہیں ہوئی، جب آپ تشریف لائے تو آپ نے ان سے یہ سختیاں ہٹا دیں تھیں۔ (کبیر)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بہت سے احکامات اٹھا دیے تھے، ایسا کرنا اس بات کے منافی یا متناقض نہیں کہ آپ علیہ السلام تو تورات کی تصدیق کرنے والے تھے، آپ علیہ السلام نے ہفتے کو ہٹا کر اتوار کو اس کے قائم مقام کر دیا تھا۔ (تفسیر کبیر) بعض احکام کا نسخ تصدیق کے منافی نہیں جیسے قرآن کے بعض احکام بعض کے ناسخ ہیں، باوجود یکہ احکام ناسخ احکام منسوخ کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ نسخ کا معنی ہی یہ ہے کہ پچھلا حکم اگرچہ صحیح تھا لیکن وقتی اور ایک مدت خاص کے لیے تھا اب وہ وقت نہیں رہا لہٰذا وہ حکم بھی نہیں رہا۔ (تفسیر مظہری)

سوال اس جگہ یہ سوال ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام توراۃ کے مصدق تھے تو انہوں نے توراۃ کی بعض حرام کردہ چیزوں کو حلال کیسے فرمایا؟

جواب اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام توراۃ کے آسمانی کتاب ہونے کے مصدق تھے اور اس کے کہ توراۃ کے زمانہ میں توراۃ کے احکام برحق تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے زمانہ میں توراۃ کی حرام کردہ بعض چیزیں حلال کرنا اور توراۃ کے بعض احکام کو منسوخ کرنا اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ جزوی احکام میں ہر رسول کی شریعت دوسرے رسول سے مختلف ہوتی ہے۔ (تفسیر کبیر، تبیان)

وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اس سے پہلے بھی یہ آیت گزری ہے، جس سے یہ واضح کیا تھا کہ میں تمہارے پاس معجزات لے کر آیا ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے دلائل اور معجزات سے اپنی نبوت کو ثابت فرمایا، پھر یہاں جس نشانی کے لانے کا ذکر ہے اس سے مراد انجیل ہے، پھر اس کے بعد انہوں نے اللہ سے ڈرنے اور اپنی اطاعت کرنے کا حکم دیا یعنی میں تم کو جن کاموں کے کرنے کا حکم دوں ان پر عمل کرنے میں اور جن کاموں سے روکوں ان سے اجتناب کرنے میں اللہ کے خوف سے میری اطاعت کرو۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ: میرا اور تمہارا رب اللہ ہے، اسی کی بندگانی بجالاؤ، یہی صراط مستقیم ہے، یہ عیسیٰ علیہ السلام کی وہ دعوت تھی جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی اجماعی دعوت تھی، سب اپنے اپنے ادوار میں لوگوں کو یہی پیغام سناتے رہے، کہ جو پیغام ہم تمہیں سنا رہے ہیں اس پیغام کو مانو، ان احکامات کی پیروی کرو جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں، انتہائی خشوع خضوع کا اظہار کیا گیا ہے، عبودیت و بندگی کا اعتراف کیا گیا ہے، تاکہ جو لوگ انہیں ابن اللہ کہتے ہیں، جو لوگ انہیں الٰہ (معبود) کہتے ہیں، انہیں پتہ چل جائے کہ ان کی بات اور ان کا دعویٰ بالکل باطل ہے، جو جاہل نصاریٰ نے عام کر رکھا ہے، فاعبدوہ کے ساتھ اللہ کی بندگی کی دعوت دی کہ جب ساری کائنات کا خالق و مالک ایک اللہ ہی ہے تو پھر لازم ہے کہ سارے اسی کی عبادت کریں، پھر صراط مستقیم کے الفاظ کے ساتھ

اپنے اس فرمان کو مضبوط کیا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، تمہیں بتا رہا ہوں یہی صراط مستقیم ہے، آپ اپنے دور میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، ان کے بعد نصاریٰ نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی، آپ نے خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دے دیا تھا، مگر ان کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد نصاریٰ نے ان کی تعلیمات میں من پسند تبدیلیاں کر دی تھیں، خنزیر کے گوشت کو حلال قرار دے دیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللهِ آمَنَّا بِاللهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ {۵۲} رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ {۵۳} وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللهُ وَاللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ {۵۴} آل عمران

جواب ترجمہ: جب عیسیٰ نے ان کے انکار کو محسوس کیا تو انہوں نے کہا کون اللہ کی راہ میں میری مدد کرنے والے ہیں؟ حواریوں نے کہا کہ ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے (دین کے) ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے جو آپ نے نازل فرمایا اور ہم نے رسول کی پیروی کی آپ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجیے جو تصدیق کرنے والے ہیں۔ اور ان (کافروں) نے چال چلی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ ہی سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللهِ: احس احساس مصدر سے ہے، عربی میں احس الشئ کا معنیٰ ہوتا ہے جاننا، معلوم کرنا، دوسرا معنیٰ محسوس کرنا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کا کفر کیسے محسوس کیا؟ جو کفر تو یہودیوں نے اپنی زبانوں سے بولا اسے انہوں نے اپنے کانوں سے سنا تھا، دوسرا ان کی طرف سے جو کفر پر اصرار تھا اس سے انہوں نے محسوس کیا تھا، پھر ان کے مکروہ عزائم میں یہ بات تھی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کریں گے، اس بات کا انہیں علم ہو گیا تھا، جس میں کوئی شبہ نہیں تھا، اسی کو یہاں احساس کے ساتھ تعبیر فرمایا۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اپنی اتباع اور اطاعت کی دعوت دی اور انجیل پر ایمان لانے کا حکم فرمایا اور ان کو بتایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں تم میری اطاعت و فرمان برداری کرو، لیکن بنی اسرائیل نے عناد اور ہٹ دھرمی پر کمر باندھ لی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہود سے خطاب فرماتے اور حق کی دعوت دیتے تھے اور وہ لوگ ان کا مذاق بناتے تھے، ان کے انکار اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس فرمالیا کہ بنی اسرائیل ایمان لانے والے نہیں ہیں لہٰذا انہوں نے پکارا کہ کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ اس پر بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے ایمان قبول کیا اور ایک جماعت نے کفر اختیار کیا جیسا کہ سورۃ صف کی آخری آیت میں مذکور ہے وہیں پر حواری بھی موجود تھے انہوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ (انوار البیان)

قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ: حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پہلے ایمان لائے تھے، ان کی تعداد بارہ تھی، حواری کا لفظ حُوَر سے ہے جس کا معنی ہے خالص سفیدی، تو ان کے بارے میں یہ کہا گیا کہ یہ قصّار یعنی دھوبی تھے، یہاں ان حواریوں کی بات ہو رہی ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کا کفر معلوم کیا تو کہا کہ اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے دین کی مدد کرنے والے ہیں، ہم اللہ پر یقین لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہونے والے ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی رہائش اور بود و باش کے لیے کچھ نہیں بنایا تھا، وہ دن رات لوگوں میں رشد و ہدایت پھیلانے میں لگے رہے، جہاں رات پڑتی وہیں قیام کر لیتے تھے، جب دعوت الی الحق کی طرف آنے سے کچھ لوگوں نے پہلو تہی کی تو پکار اٹھے کہ کون میرا ساتھ دے گا، اس آواز پر کچھ نیک روحیں ان کے مشن کو پھیلانے میں ان کے ساتھ شریک ہو گئیں، انہی لوگوں کو حواری کہا جاتا تھا، جو عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد بھی ان کے مشن کو عام کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگاتے رہے۔

بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صدق دل سے مرید اور خاص شاگرد تعداد میں بارہ تھے اور ان کے نام یہ ہیں: ① شمعون، جسے پطرس بھی کہتے ہیں، ② شمعون یا پطرس کا بھائی اندریاس، ③ یعقوب بن زیدی ④ یوحنا، ⑤ یوحنا کا بھائی فلیپوس، ⑥ برتھولما، ⑦

تھوما۔ ⑧ متی۔ ⑨ یعقوب بن حلفائی۔ ⑩ تہدی۔ ⑪ شمعون کنعانی اور ⑫ یہودا اسکریوتی۔ یہ وہ بارہ حواری یا انصار تھے، جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہر قیمت پر آگے بڑھانے کا حضرت عیسیٰ سے عہد کیا تھا۔

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ: جب ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پکار پر لبیک کہی کہ ہم انصار اللہ (اللہ کے مددگار) ہیں، تو انصار اللہ کے لیے ایمان شرط اولین ہے، اس لیے انہوں نے اقرار کیا کہ ہم اپنے پروردگار کی نازل کردہ انجیل پر ایمان لائے، ہم نے اللہ کے فرستادہ رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی۔ مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "مسیح علیہ السلام کے صحابی ابھی مسیح علیہ السلام سے گفتگو کر رہے تھے دفعۃً براہ راست حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے، قرآن مجید اکثر ایسے موقعوں پر یہی کرتا ہے کہ بندوں کے خطاب کا رخ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پھیر دیتا ہے، کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ (تفسیر ماجدی)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ سے مراد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ ہم کو لکھ دیجئے آپ کی امت نے گواہی دی کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور انہوں نے رسولوں کے بارے میں بھی گواہی دی کہ ان سب نے بھی اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ (در منثور) وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ میں رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، الشَّاهِدِينَ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے اور معنی یہ ہے ہمارے اسماء ان کے اسماء کے ساتھ لکھ لے اور ہمیں من جملہ ان میں سے بنا دے اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے ہمیں ان کے ساتھ لکھ لے جنہوں نے تیرے انبیاء علیہم السلام کی صدق و سچائی کے ساتھ شہادت دی۔ (قرطبی) ابو صالح سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لفظ آیت فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ سے مراد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے ساتھ ہم کو بھی لکھ دیجئے۔ (در منثور)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر کے سامنے اقرار کرنے کے بعد پروردگار کے سامنے یہ اقرار کیا کہ ہم انجیل پر ایمان لا کر تیرے رسول کا اتباع کرتے ہیں، آپ اپنے فضل و توفیق سے ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں ثبت فرما دیں، گویا ایمان کی رجسٹری ہو جائے کہ

پھر لوٹنے کا احتمال نہ رہے۔ (عثمانی)

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ: جیسے جیسے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت آگے بڑھتی گئی اور آپ اپنے عہدہ رسالت کے مطابق کام کرتے رہے اور کچھ نہ کچھ افراد ان کے ساتھ ہوتے گئے بنی اسرائیل کی دشمنی تیز ہوتی گئی اور بالآخر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی ٹھان لی اور طے کر لیا کہ انہیں ختم کر کے رہیں گے، اب بنی اسرائیل نے ایسی تدبیریں شروع کر دیں جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام شہید کر دیئے جائیں اور ان سے اب بنی اسرائیل کا چھٹکارہ ہو جائے، بنی اسرائیل نے جب سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا، تو ان کو ایک مکان میں بند کر دیا اور ان پر ایک نگران مقرر کر دیا۔

جب قتل کرنے کے لیے وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اس نگران کی صورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی صورت بنادی اور ان کو اوپر اٹھالیا (معالم التنزیل للبغوی) ان لوگوں نے اندر جا کر دیکھا تو وہاں ایک ہی شخص کو پایا اور اسے قتل کر دیا کیونکہ یہ شخص صورۃً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل تھا لیکن اس سوچ بچار میں رہے کہ اگر یہ شخص وہی تھا جس کے قتل کرنے کے لیے ہم آئے تھے تو ہمارا آدمی کہاں گیا؟ قتل تو اس کو کر دیا لیکن پھر بھی شک وشبہ میں رہے، اس کو سورۃ نساء میں یوں بیان فرمایا:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ

اور انہوں نے نہ ان کو قتل کیا نہ ان کو صلیب پر چڑھایا لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا اور بلاشبہ جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ ان کی طرف سے ضرور شک میں ہیں۔ (انوار البیان)

لفظ مکر خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، یہ اچھے کام کے لیے بھی ہوتی ہے اور برے کام کے لیے بھی، سورۃ فاطر میں فرمایا وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ اس سے معلوم ہوا کہ مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی اور عربی زبان میں دونوں معنی کی گنجائش ہے اگر چالبازی اور دھوکہ سے کوئی تدبیر کی جائے گی تو وہ اُردو زبان کے محاورہ میں مکاری ہوگی اور ضروری نہیں کہ تدبیر بری ہی ہو، قرآن مجید میں جو مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے اُردو کے محاورہ والا مکر مراد نہیں ہے بلکہ عربی کے معنی مراد ہیں، یعنی خفیہ اور لطیف تدبیر جس کا دوسرے کو پتہ نہ چل سکے۔ (انوار البیان)

یہودیوں نے حضرت مریم رحمہا اللہ پر الزام لگایا کہ انہوں نے اپنے منگیتر یوسف نجار سے تعلقات استوار کر لیے ہیں، حالانکہ وہ ایک پاکدامن خاتون تھیں، اس کے ساتھ تعلقات کا دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا، انہوں نے رومی بادشاہ بیلاطس کے کان بھرے، عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف کیا، اسے کہا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو رومی حکومت کے خلاف اکساتا ہے، انہی یہودیوں کے مکر و فریب کا نتیجہ تھا کہ رومی بادشاہ بیلاطس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا۔

ابو حفص سراج الدین دمشقی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں "یہود نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو جبریل امین علیہ السلام ایک گھڑی کے لیے بھی ان سے جدا نہیں ہوتے تھے، روح القدس علیہ السلام کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کرنے کا یہی مطلب ہے، جب انہوں نے قتل کا ارادہ کر لیا تو جبریل امین علیہ السلام کو حکم ملا کہ وہ ایک کمرے میں داخل ہو جائیں جس میں روزن تھا، جب وہ لوگ اس کمرے میں داخل ہو گئے تو جبریل علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کو اس روزن سے نکال کر لے گئے، یوں ان میں عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دوسرے بندے کا شبہ ڈال دیا گیا، وہ پکڑا گیا اور صلیب پر چڑھا دیا گیا، اس منظر کے بعد لوگوں کے تین گروہ بن گئے، ایک گروہ نے کہا کہ اللہ ہمارے اندر موجود تھا جو چلا گیا ہے، دوسرے گروہ نے کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے تھے، تیسرے گروہ نے کہا کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان کی طرف اٹھا کر ان کی عزت بڑھائی، یوں ان تینوں گروہوں کی تسلی کا سامان تھا، ان میں جو دو کافر گروہ تھے وہ اہل ایمان پر اس وقت تک غالب رہے جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہیں ہوئے۔ (اللباب فی علوم الکتاب)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر بیان کیجیے۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ {۵۵} آل عمران.

جواب ترجمہ: (اس کی تدبیر اس وقت سامنے آئی) جب اللہ نے کہا تھا کہ: اے عیسیٰ میں تمہیں صحیح سالم واپس لے لوں گا، اور تمہیں اپنی طرف اٹھالوں گا، اور جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے ان (کی ایذا) سے تمہیں پاک کر دوں گا۔ اور جن لوگوں نے تمہاری اتباع کی ہے، ان کو قیامت کے دن تک ان لوگوں پر غالب رکھوں گا جنہوں نے تمہارا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، اس وقت میں تمہارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ (ترجمہ: شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب)

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ: اللہ تعالیٰ نے یہود کے مکرودجل سے اپنے پیغمبر کو بچانے کی یہ تدبیر اختیار فرمائی کہ انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھالیا، صحیح وسالم اٹھالیے گئے، یہاں حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اپنے اپنے انداز میں اس آیت کی خوب تفسیر کی ہے، بعض لوگوں نے اس آیت کے معنیٰ، مفہوم، مطلب اور تفسیر کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے، جس سے اذہان میں خلفشار اور انتشار نے جنم لینا تھا، بعض نے توفی کے لفظ سے فوت ہونے کا معنیٰ مراد لے کر طوفان اٹھالیا، کسی نے کہا کہ وہ اٹھائے جانے سے کچھ گھڑیاں پہلے فوت ہوئے، پھر اٹھائے گئے، کسی نے کہا کافی دیر تک فوت رہے پھر اٹھالیے گئے، خود نصاریٰ کا کہنا یہ ہے کہ سات گھڑیاں فوت ہونے کے بعد آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے تھے۔

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے تین گھڑیاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو موت دی تھی، (در منثور) وہب رحمہ اللہ کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے تین دن تک موت دیے رکھی، پھر انہیں اٹھایا اور آسمان پر بلند کیا، (در منثور) جب کہ درست اور صحیح بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے، بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کے الفاظ بتا رہے ہیں۔

مطر الوراق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دنیا سے اٹھالینے کی بات کی ہے موت دینے کی اس میں بات نہیں کی گئی، (در منثور) ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ توفی سے مراد آسمان پر اٹھایا جانا ہے۔ اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ توفی سے یہاں مراد نیند ہے۔ (در منثور)

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں لفظ متوفی کا مصدر توفی اور مادہ "وفی" ہے، اس کے اصل معنی عربی لغت کے اعتبار سے پورا پورا لینے کے ہیں، وفاء، ایفاء، استیفاء، اسی معنی کے لیے بولے جاتے ہیں، توفی کے بھی اصلی معنی پورا پورا لینے کے ہیں، تمام کتب لغت عربی زبان کی اس پر شاہد ہیں اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اجل مقدر پوری کر لیتا ہے اور خدا کی دی ہوئی روح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لیے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۔۳۹: ۴۲) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آتی ان کی نیند کے وقت۔ (معارف القرآن)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے الجواب الصحیح صفحہ ۸۳ جلد ۲ میں فرمایا: اَلتَّوَفِّي فِي لُغَةِ العَرَبِ مَعنٰهَا اَلقَبضُ وَالاِستِيفَاءُ وَ ذَالِكَ ثَلَاثَةُ اَنوَاعٍ، اَحَدُهَا اَلتَّوَفِّي فِي النَّومِ وَ الثَّانِي تَوَفِّي المَوتِ وَالثَّالِثُ تَوَفِّي الرُّوحِ وَالبَدَنِ جَمِيعًا، لغت عربی میں توفی کا معنیٰ قبض کرنا اور پورا پورا لے لینا ہے، یہ تین اقسام پر ہے ایک توفی نوم، دوسرا توفی موت اور تیسرا توفی روح وبدن دونوں۔ اور کلیات ابو البقاء میں ہے اَلتَّوَفِّي اَلاِمَاتَةُ وَقَبضِ الرُّوحِ وَعَلَيهِ اِستِعمَالُ العَامَّةِ اَوِ الاِستِيفَاءُ وَاَخذُ الحَقِّ وَعَلَيهِ اِستِعمَالُ البُلَغَآءِ توفی کا معنیٰ مارنا اور روح قبض کرنا عام طور پر اس کا استعمال اسی طرح ہوتا ہے یا اس کا معنیٰ پورا پورا لے لینا اور حق کو لینا بلغاء کا استعمال اسی پر ہے۔ (از معارف القرآن بتغییر یسیر فی الترجمہ) اسی لیے آیت مذکورہ میں لفظ متوفیک کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ شیخ الہند میں مذکور ہے، اس ترجمہ کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو یہودیوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے، بلکہ خود آپ کو لے لیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنی طرف آسمان پر چڑھا لیں گے۔ (معارف القرآن)

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور بعض حضرات نے اس کا ترجمہ موت دینے سے کیا ہے، جیسا کہ بیان القرآن کے خلاصہ میں اوپر مذکور ہے، اور یہی ترجمہ مفسر القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسانید صحیحہ کے ساتھ منقول ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی منقول ہے کہ معنی آیت کے ہیں

کہ حق تعالیٰ نے اس وقت جبکہ یہودی آپ کے قتل کے درپے تھے آپ کی تسلی کے لیے دو لفظ ارشاد فرمائے، ایک یہ کہ آپ کی موت ان کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت میں ہو گی۔ دوسرا یہ کہ اس وقت ان لوگوں کے نرغہ سے نجات دینے کی ہم یہ صورت کریں گے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھالیں گے، یہی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔ (معارف القرآن)

تفسیر در منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت اس طرح منقول ہے: اَخرَجَ اِسحَاقُ بنُ بِشر وَابنُ عَسَاکِر مِن طَرِیقِ جَوھَر عَن الضَّحَاكِ عَن ابن عَبَّاس فِي قَولِهِ تَعَالیٰ اِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ یَعنِی رَافِعُكَ ثُمَّ مُتَوَفِّيكَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ۔ (در منثور صفحہ: ۳۶ جلد ۲) "اسحاق بن بشر اور ابن عساکر نے بروایت جوہر عن الضحاک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت انی متوفیک ورافعک الیّ کی تفسیر میں یہ لفظ نقل کئے ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اٹھالوں گا، پھر آخر زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دوں گا۔ (در منثور بحوالہ معارف القرآن)

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ توفی کے معنی موت ہی کے ہیں، مگر الفاظ میں تقدیم و تاخیر ہے (رافعک) کا پہلے اور (متوفیک) کا وقوع بعد میں ہو گا اور اس موقع پر متوفیک کو مقدم ذکر کرنے کی حکمت و مصلحت اس پورے معاملے کی طرف اشارہ کرنا ہے جو آگے ہونے والا ہے یعنی یہ اپنی طرف بلالینا ہمیشہ کے لیے نہیں، چند روزہ ہو گا اور پھر آپ اس دنیا میں آئیں گے اور دشمنوں پر فتح پائیں گے اور بعد میں طبعی طور پر آپ کی موت واقع ہو گی، اس طرح دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ ایک معجزہ بھی تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعزاز و اکرام کی تکمیل بھی، نیز اس میں عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت کا ابطال بھی تھا، ورنہ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعہ سے ان کا یہ عقیدہ باطل اور پختہ ہو جاتا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرح حی و قیوم ہے، اس لیے پہلے متوفیک کا لفظ ارشاد فرما کر ان تمام خیالات کا ابطال کر دیا پھر اپنی طرف بلانے کا ذکر فرمایا۔ (معارف القرآن)

مفتی شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اور حقیقت یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی مخالفت و عداوت تو انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ ہی ہوتی چلی آئی ہے اور عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ جب کسی نبی کی قوم اپنے انکار اور ضد پر

جمی رہی پیغمبر کی بات نہ مانی، ان کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائی، تو دو صورتوں میں سے ایک صورت کی گئی ہے، یا تو اس قوم پر آسمانی عذاب بھیج کر سب کو فنا کر دیا گیا، جیسے عاد و ثمود اور قوم لوط علیہ السلام کے ساتھ معاملہ کیا گیا، یا پھر یہ صورت ہوتی کہ اپنے پیغمبر کو اس دار الکفر سے ہجرت کرا کے کسی دوسری طرف منتقل کیا گیا اور وہاں ان کو وہ قوت و شوکت دی گئی کہ پھر اپنی قوم پر فتح پائی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کر کے شام میں پناہ لی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے علاقہ شام میں تشریف لائے، اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے، پھر وہاں سے حملہ آور ہو کر مکہ فتح کیا، یہودیوں کے نرغہ سے بچانے کے لیے یہ آسمان پر بلا لینا بھی در حقیقت ایک قسم کی ہجرت تھی، جس کے بعد وہ پھر دنیا میں واپس آکر یہودیوں پر مکمل فتح حاصل کریں گے، رہا یہ معاملہ کہ ان کی یہ ہجرت سب سے الگ آسمان کی طرف کیوں ہے؟ تو حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں خود فرما دیا ہے کہ ان کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش عام مخلوقات کے طریق پیدائش سے مختلف بغیر ماں باپ کے ہے، اسی طرح ان کی پیدائش عام انسانوں کی پیدائش سے مختلف صورت سے ہوئی اور موت بھی عجیب و غریب طریقہ سے صدہا سال کے بعد دنیا میں آکر عجیب ہو گی، تو اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی ہجرت بھی کسی ایسے عجیب طریقہ سے ہو۔ (معارف لقرآن)

یہی عجائبات قدرت تو جاہل نصاری کے لیے اس عقیدہ میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئے، کہ ان کو خدا کہنے لگے، حالانکہ انہی عجائب کے ہر قدم اور ہر چیز پر غور کیا جائے تو ہر ایک واقعہ میں ان کی عبدیت و بندگی اور تابع فرمان الٰہی ہونے اور بشری خصائص سے متصف ہونے کے دلائل ہیں اور اسی لیے ہر ایسے موقع پر قرآن حکیم نے عقیدہ الوہیت کے ابطال کی طرف اشارہ کر دیا ہے، آسمان پر اٹھانے سے یہ شبہ بہت قوی ہو جاتا، اس لیے متوفیک کو پہلے بیان کر کے شبہ کا قلع قمع کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا اس تقدیم و تاخیر الفاظ کے ذریعہ اسی کے ساتھ نصاری کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ خدا نہیں جو موت سے بری ہوں، ایک

وقت آئے گا جب ان کو بھی موت آئے گی۔ (معارف القرآن)

امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ قرآن کریم میں اس طرح کی تقدیم و تاخیر اسی طرح کے مصالح کے ماتحت بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونے والے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا (تفسیر کبیر، صفحہ ۴۸۱، جلد ۲ بحوالہ معارف القرآن)

وَرَافِعُكَ إِلَيَّ: اس کا مفہوم ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا، اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ نام صرف روح کا نہیں بلکہ روح مع جسم کا ہے، تو رفع عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفع روحانی ہوا جسمانی نہیں اٹھایا گیا بالکل غلط ہے، رہا یہ کہ لفظ رفع کبھی بلندی مرتبہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رَفَعَ بَعضَكُم فَوقَ بَعضٍ دَرَجَاتٍ۔ (۶: ۱۶۶) اور يَرفَعِ اللهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنكُم وَالَّذِينَ أُوتُوا العِلمَ۔ (۵۸: ۱۱) وغیرہ آیات میں مذکور ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ لفظ رفع کو رفع درجہ کے معنی میں استعمال کرنا ایک مجاز ہے جو قرائن کی بنا پر مذکورہ آیات میں ہوا ہے، یہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی لینے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے علاوہ اس جگہ لفظ رفع کے ساتھ لفظ الی استعمال فرما کر اس مجازی معنی کا احتمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اس آیت میں وَرَافِعُكَ إِلَيَّ فرمایا، اور سورۃ نساء کی آیت میں بھی جہاں یہودیوں کے عقیدہ کا رد کیا گیا وہاں بھی یہی فرمایا وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللهُ إِلَيهِ۔ (۴: ۱۵۸) یعنی یہودیوں نے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا، اپنی طرف اٹھا لینا روح مع جسد کے زندہ اٹھا لینے ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

قادیانی اور دیگر ملحدین الفاظ کے ہیر پھیر سے بھی لوگوں کو گمراہ کرنے میں مصروف و مشغول رہتے ہیں، علماء امت نے اپنی بساط و ہمت کے مطابق ان کے دجل و فریب کے پردے چاک کیے ہیں، یہاں رفع کے معنیٰ رتبہ و مقام میں اٹھانا مراد لے کر ملحدین و منکرین حیات عیسیٰ دھوکہ دہی سے کام لیتے ہیں، جب کہ رفع کا حقیقی اور وضعی معنیٰ کسی چیز کو اوپر اٹھا لینا ہے۔ (صراح ج ۲ ص ۱۶) رفع برداشتن وھو خلاف الوضع یعنی رفع کا معنیٰ اوپر اٹھانے کسی شئے کا ہے، (قاموس ص ۵۱۲)

رفع ضد وضع یعنی رفع کا معنیٰ کسی چیز کو اوپر اٹھانا ہے جیسا کہ وضع کا معنیٰ کسی چیز کو زمین پر رکھنا

ہے۔(منتہی الارب ص۱۷۶)

رَفَعَ رَفعاً بالفتح برداشت ازاں خلاف وضع یعنی کسی چیز کا اٹھانا پس رفع اجسام میں حقیقی طور پر اوپر کی طرف حرکت اپنی اور انتقال مکانی مراد ہوگی اور رفع مکانی میں مناسب مقام، پھر اگر کسی دوسرے معنیٰ میں استعمال کیا گیا تو وہ معنیٰ مستعمل فیہ مجازی کہلائے گا۔(حیات عیسیٰ علیہ السلام)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے،

① سب سے پہلا وعدہ یہ تھا کہ ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ نہیں ہوگی، طبعی طور سے وقت موعود پر ہوگی، اور وہ وقت موعود قرب قیامت میں آئے گا، جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے۔

② دوسرا وعدہ: فی الحال عالم بالا کی طرف اٹھا لینے کا تھا، یہ اسی وقت پورا کر دیا گیا جس کے پورا کرنے کی خبر سورۃ نساء کی آیت میں اس طرح دے دی گئی وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَل رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ۔ (۴: ۱۵۸) یقیناً ان کو یہودیوں نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔

③ تیسرا وعدہ: ان کو دشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا میں وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور یہود کے سب غلط الزامات کو صاف کر دیا، مثلاً یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے نسب کو مطعون کرتے تھے، قرآن کریم نے اس الزام کو یہ فرما کر صاف کر دیا کہ وہ محض اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے بلا باپ کے پیدا ہوئے، اور یہ کوئی تعجب کی چیز نہیں، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اس سے زیادہ تعجب کی چیز ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے، یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خدائی کے دعوے کا الزام لگاتے تھے، قرآن کریم کی بہت سی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس کے خلاف اپنی عبدیت اور بندگی اور بشریت کا اقرار نقل فرمایا۔

④ چوتھا وعدہ: وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ میں ہے کہ آپ

کے متبعین کو آپ کے منکرین پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہاں اتباع سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد اور اقرار مراد ہے، ان کے سب احکام پر ایمان و اعتقاد کی شرط نہیں، تو اس طرح نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں اس میں داخل ہوگئے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے معتقد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ صرف اتنا اعتقاد نجات آخرت کے لیے کافی نہیں، بلکہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام احکام پر اعتقاد و ایمان رکھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں، نصاریٰ نے اس پر اعتقاد و ایمان اختیار نہ کیا، اس لیے نجات آخرت سے محروم رہے، مسلمانوں نے اس پر بھی عمل کیا، اس لیے نجات آخرت کے مستحق ہوگئے، لیکن دنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر موقوف تھا، وہ دنیا کا غلبہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو بمقابلہ یہود ہمیشہ حاصل رہا اور یقیناً قیامت تک رہے گا، جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا اس وقت سے آج تک ہمیشہ مشاہدہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ بمقابلہ یہود ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمان غالب رہے، انہیں کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں اور رہیں۔

⑤ پانچواں وعدہ: قیامت کے روز ان مذہبی اختلافات کا فیصلہ فرمانے کا تو وہ وعدہ بھی اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا، جیسا کہ آیت میں ارشاد ہے ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ۔ (معارف القرآن)۔

مسئلہ حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام

حضرت سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا ذکر خیر جس طرح قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے اس صفائی کے ساتھ سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی نہیں ہے، مسلمانوں نے جب بھی عیسیٰ علیہ السلام کے فضائل و مناقب بیان کیے تو دنیا عش عش کر اٹھی، ابتدائے اسلام میں جب مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں مکہ کی فضاؤں کو چھوڑ کر سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے اس وقت نجاشی بادشاہ کے سامنے جب قرآنی آیات تلاوت کی گئیں تو عیسائی بادشاہ کا دل پسیج گیا تھا، ازیں بعد جب ذکر عیسیٰ کیا

گیا تو ان لوگوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، وہ تعجب سے سنتے اور دیکھتے رہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت شان کس طرح مسلمان بیان کر رہے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ یہاں سورۃ آل عمران میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان کی پاکیزہ اور مقدس ماں حضرت مریم علیہا السلام کی شان قرآن کریم میں کس قدر والہانہ شگاف الفاظ میں بیان کی گئی ہے، ان کی عظمت شان کو مزید چار چاند لگانے کے لیے قرآن کریم میں سورۃ مریم انہی کی یاد قیامت تک اہل اسلام اور دنیا کو دلاتی رہے گی، ان کے تذکرے جب تک اسلام اور مسلمان باقی ہیں ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑا مقام و مرتبہ عطا فرمایا تھا، وہ بغیر والد کے دنیا میں امر خداوندی سے جنم افروز ہوئے، انہوں نے اس نوعمری میں ماں کی گود میں بات کی جب کوئی بچہ اس عمر میں نہیں بولا کرتا، انہوں نے آغوش مادر میں اپنی نبوت و رسالت اور کتاب ملنے کی اطلاع دی، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تورات اور انجیل جیسی دو آسمانی کتابوں کا علمبردار بنایا، انہوں نے آکر تورات کی تعلیمات کی تصدیق کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں بنی اسرائیل کا سب سے آخری نبی و رسول ہونے کا اعزاز عطا کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے اوصاف و خصائل عطا کیے گئے کہ وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی صفوف میں یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی خوبصورت انگوٹھی کا نگینہ جگمگاتا ہے، یہود جیسی بدفطرت قوم نے یوں تو ہزاروں نبیوں کو بلاوجہ تیہ تیغ کیا، انہیں شہادت کا جام پلایا، مگر جو کچھ ان بدطینت لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا اس کا تذکرہ قرآن کریم میں جگہ جگہ موجود ہے، ان کے قہر و شر سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ و سلامت آسمان کی طرف اٹھایا، وہ جب سے آسمان کی طرف اٹھائے گئے تب سے اب تک وہ آسمان پر زندہ ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے زمین پر نازل ہوں گے، نزول زمین کے بعد آپ امت محمدیہ کے عظیم شخص حضرت امام مہدی رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز ادا فرمائیں گے، اس میں امت محمدیہ کی فضیلت کو بھی چار چاند لگ جاتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے آخری تاجدار نبوت ان کی اقتدا میں نماز باجماعت ادا فرمائیں گے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ، وَ

إِمَامُكُمْ مِنْكُمْ ،اس وقت تم کیسے ہو گے جب تم میں ابن مریم اتریں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہو گا۔(بخاری)شارحین اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ وہ شریعت محمدیہ کے ساتھ حکمرانی کریں گے۔ إِمَامُكُمْ مِنْكُمْ کا یہ مفہوم بیان کیا گیا کہ وہ تمہاری اقتدا میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔(تعلیق مصطفےٰ بغا للبخاری)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں ہمارے پیارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آنے کی بشارت دی، جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام گرامی احمد ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک اعزاز یہ بخشا جس کا ذکر حدیث شریف میں ہے کہ پیدائش کے وقت ہر بنی آدم کو شیطان کچوکا لگاتا ہے، جس سے بچہ روتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بوقت پیدائش شیطان نے کچوکا نہیں لگایا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان سے نازل ہوں گے تو اس کے بعد آپ یمن کے جذام قبیلہ کی ایک عورت کے ساتھ شادی کریں گے، آپ علیہ السلام کے دو بیٹے پیدا ہوں گے، ان میں ایک کا نام محمد ہو گا اور دوسرے کا نام موسیٰ ہو گا، آپ چالیس یا پینتالیس سال زندہ رہیں گے، ایک روایت کے مطابق سات سال زندہ رہیں گے، بعض کہتے ہیں کہ آٹھ سال زندہ رہیں گے، بعض کہتے ہیں کہ نو سال زندہ رہیں گے، پھر طبعی موت انتقال فرمائیں گے، انتقال کے بعد آپ روضہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں آسودہ خاک ہو جائیں گے، بعض کہتے ہیں کہ آپ حجرہ مصطفےٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں مدفون ہوں گے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے پاس، بعض کہتے ہیں کہ بیت المقدس میں تدفین ہو گی، بعض یہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی تدفین ہو گی، اس پر ایک روایت بھی اشارہ کرتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام میرے ساتھ دفن ہوں گے اور ہم دونوں ایک ہی قبر سے قیامت کے دن اٹھیں گے، ابو بکر و عمر سامنے ہوں گے۔(اثمار التکمیل ج ۲ مؤلفہ شیخ موسیٰ روحانی بازیؒ)

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے قریب ابو بکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کی دو قبریں اس وقت بھی موجود ہیں اور چوتھی قبر کی جگہ خالی ہے، بعض کتابوں میں ان قبروں کے نقشے موجود ہیں، یہاں جو چوتھی قبر کی جگہ خالی ہے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تدفین ہو گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چار گروہ

یہودی، عیسائی، مسلمان اور قادیانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں، اس بارے میں حضرت مفتی محمد شفیع علیہ السلام نے معارف القرآن میں اس مقام پر مختصر مگر پر اثر اور خوبصورت مضمون تحریر فرمایا ہے، ان کے علاوہ علماء امت نے اس موضوع پر سیر حاصل کتابیں تحریر کی ہیں، حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں "دنیا میں صرف یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہو کر دفن ہو گئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے، اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۃ نساء کی آیت میں واضح کر دی ہے اور اس آیت میں بھی وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود انہی کی طرف لوٹا دیا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لیے مکان کے اندر گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص کی شکل و صورت تبدیل کر کے بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ڈھال دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ۔ ۴: ۱۵۷) نہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا (کہ اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہو لئے)۔

نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب تو ہو گئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لیے گئے، مذکورہ آیت نے ان کے اس غلط خیال کی بھی تردید کر دی، اور بتلا دیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے یہ دھوکہ عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اس لیے شُبِّهَ لَهُمْ کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہو گئے۔ (معارف)

اسلامی عقیدہ دربارہ حیات مسیح

مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یہود و نصاریٰ کے عقیدہ کی ایک جھلک پیش کرنے کے بعد اسلامی عقیدہ کی ایک جھلک بھی پیش فرمائی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا حیات عیسیٰ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟ فرماتے ہیں "ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دوسری کئی

آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لیے آسمان پر زندہ اٹھالیا نہ ان کو قتل کیا جاسکا نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر یہودیوں پر فتح پائیں گے اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے، اسی عقیدہ پر تمام امت مسلمہ کا اجماع واتفاق ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تلخیص الحبیر صفحہ ۳۱۹ میں یہ اجماع نقل کیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اور اس پر اجماع امت سے ثابت ہے۔ (معارف القرآن)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں وَأَمَّا رَفْعُ عِيسَى فَاتَّفَقَ أَصْحَابُ الْأَخْبَارِ وَالتَّفْسِيرِ عَلَى أَنَّهُ رُفِعَ بِبَدَنِهِ حَيًّا (تلخیص الحبیر کتاب الطلاق) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بدن مبارک کے ساتھ اٹھائے گئے ہیں، ان کے اٹھائے جانے پر ارباب اخبار (محدثین) اور اھل تفسیر کا اتفاق ہے، یہاں ابن حجر رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا کہ آیا آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے وہ فوت ہوئے یا سوتے سوتے میں انہیں اٹھایا گیا اس میں اختلاف ہے۔ (تلخیص الحبیر)

قادیانی عقیدہ دربارہ حیات مسیح

قادیانی جو مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کے پیروکار ہیں، اس کی اُوٹ پٹانگ تعلیمات کے علمبردار ہیں، دنیا بھر میں وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، انہیں پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا ہے، یہ مسلمانوں سے نکلا ہوا ایک فرقہ بن گیا ہے، جس کے عقائد وخیالات مسلمانوں سے الگ ہیں، لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ یہ قادیانی ٹولہ دنیا بھر میں اپنے کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اور اپنے کو مسلمان ہی کہلواتا ہے، پاکستان کی سرزمین پر انہیں مسلمانوں کے شعائر استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کا عقیدہ بھی اسلامی عقیدہ نہیں ہے، مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "توفی کے لفظ سے قادیانیوں نے بڑا غلط مفہوم لیا ہے، وہ اس کا معنی موت کرتے ہیں اور پھر اس دعویٰ کی دلیل میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں، فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ، عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے، اے مولا کریم، جب تو نے مجھے فوت کر دیا، موت دے دی، تو تو ہی ان پر نگران تھا، مرزائی پھر اس سے یہ دلیل

پکڑتے ہیں کہ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں، اس لیے ان کے دوبارہ نازل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن پاک کی بہت سی آیات کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بکثرت موجود ہیں، جن میں مسیح علیہ السلام کے دوبارہ نازل ہونے کا ذکر ہے، تو کہتے ہیں کہ ان احادیث کی رو سے دوبارہ آنے والا مسیح ابن مریم نہیں ہو گا بلکہ مثیل مسیح یعنی اس کے مشابہ ہو گا اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی ہے، جس کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ وہ دنیا میں ہدایت کا سامان پیدا کرے گا، لہٰذا مسیح موعود آ چکا ہے، اب کسی مسیح کا انتظار نہیں ہے، یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس پر قادیانی گزشتہ تقریباً سو سال سے جھگڑا کر رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ دعوی صریحاً کفر ہے۔ (معالم العرفان)

قادیانی تحقیقات نامرضیہ کہتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلاد شام میں مدفون ہیں، وہاں ہر سال لوگوں کا ان کی قبر پر ہجوم ہوتا ہے، پھر مرزا غلام احمد جسے قادیانی مسیح موعود کہتے ہیں کی کتاب ست بچن میں یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے "ہم نے کسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مسیح کی بلاد شام میں قبر ہے مگر اب صحیح تحقیق ہمیں اس بات کے لکھنے کیلئے مجبور کرتی ہے کہ واقعی قبر وہی ہے جو کشمیر میں ہے اور ملک شام کی قبر زندہ در گور کا نمونہ تھا جس سے وہ نکل آئے اور جب تک وہ کشمیر میں زندہ رہے ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر مقام کیا گویا آسمان پر چڑھ گئے۔" (ست بچن، روحانی خزائن جلد ۱۰ حاشیہ ۳۰۷)

دیکھا جائے تو قادیانیوں کا یہ خیال باطل قرآنی نصوص کے بالکل خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ہم آپ کو پورا پورا لے لیں گے اور اپنی طرف اٹھالیں گے اور قادیانی تحقیقات کبھی ان کی قبر بلاد شام میں ثابت کرتی ہیں اور کبھی کشمیر پر اور پھر وہاں سے پہاڑ کی چوٹی پر قیام کیا، گویا آسمان پر چڑھ گئے، قادیانی دجل و فریب کس قدر باریک ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کو آسمان پر چڑھنا سمجھ لیا، مگر اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف بلند کرنے کا ذکر فرمایا اسے تسلیم نہیں کیا۔

قادیانیوں کی ڈھٹائی اور بے شرمی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ دنیا بھر میں اپنا پیغام قرآن کریم کے بالکل برخلاف پھیلا رہے ہیں، ان کی ویب سائٹس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ

یغام لکھا گیا ہے ”جماعت احمدیہ کے نزدیک اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے صلیب پر لٹکا ماضرور تھا مگر وہ بے ہوشی کی حالت میں زندہ صلیب سے اتار لئے گئے تھے، اس کے بعد وہ لمسافر کر کے افغانستان کے راستے ہندوستان اور کشمیر میں پہنچے اور وہاں ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی، آج بھی ان کا مزار کشمیر کے محلہ خانیار میں یوز آصف کے نام سے مشہور ہے“ قادیانیوں نے اپنی ویب سائٹ پر اس مزار کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر بھی شائع کی ہے۔(ویب سائٹ: آسک احمدیت ڈاٹ کام او آر جی ۲۰۲۱)

قرآنی تعلیمات کے دشمن اور کذاب قادیانیوں کی یہ خانہ ساز باتیں ملاحظہ فرمائیں ① جمعہ کے روز سہ پہر انہیں صلیب پر لٹکایا گیا، تقریباً دو اڑھائی گھنٹے بعد اُنہیں اتار لیا گیا، اس دوران انسان صلیب پر جان نہیں دیتا بلکہ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے کیونکہ صلیب میں دونوں ہاتھوں اور پاؤں کی ہڈیوں کے درمیان میخیں گاڑی جاتی ہیں، اس سے اتنا خون نہیں نکلتا کہ انسان مر جائے۔

② اتارنے سے قبل جب وہ بے ہوش ہو چکے تھے ایک رومن سپاہی نے ان کی پسلی میں بھالا مارا جس سے خون اور پانی فی الفور بہہ نکلا (یوحنا ۱۹/ ۳۴)۔ یہ بات قطعیت سے ثابت کرتی ہے کہ وہ اس وقت زندہ تھے اور دل کی دھڑکن جاری تھی اور خون رگوں میں گردش کر رہا تھا، ورنہ مردہ جسم سے خون تیزی سے نہیں نکلتا کیونکہ دل کی دھڑکن رک جاتی ہے اور خون جم جاتا ہے۔

③ صلیب سے اتارنے کے بعد ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں تب صلیب کا عمل مکمل ہوتا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دو چوروں کو بھی صلیب دی گئی، ان دونوں چوروں کی تو ہڈیاں توڑی گئیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں۔

④ صلیب سے اتارنے کے فوراً بعد انہیں حواری لے گئے اور ایک خفیہ تہہ خانے میں جا کر رکھا، ان کے جسم پر مرہم لگائی گئی جو اس وقت سے آج تک طب کی کتابوں میں ”مرہم عیسیٰ“ کے نام سے مشہور ہے، جو زخموں کو بہت جلد ٹھیک کرتی ہے، جسم پر ایک چادر لپیٹ دی گئی، تین دن تک عیسیٰ علیہ السلام اسی تہہ خانے میں رہے، اس کے بعد وہ نکلے اور رات کے وقت ایک حواری کے گھر جا کر سب حواریوں سے ملے اور پھر ایک لمبے سفر کا آغاز کر دیا۔

⑤ جو چادر ان پر لپیٹی گئی جسے کفن مسیح کہا جاتا ہے وہ آج بھی اٹلی کے ایک گرجا گھر میں موجود ہے، اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بنی ہوئی ہے، کیمرے کی ایجاد کے بعد جب اس کی تصویر لی گئی تو وہ ڈارک روم میں نیگٹو کی بجائے پازیٹو بن کر ابھری اس سے معلوم ہوا کہ کپڑے پر ان کی تصویر کا نیگٹو بنا ہوا ہے جو اس بات کو قطعیت سے ثابت کرتا ہے کہ یہ تصویر جعلی نہیں اصلی ہے، اس تصویر میں بہت سے زخموں کے نشانات ہیں جن سے خون نیچے کی طرف رستا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کپڑے میں لپٹے جانے کے بعد بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ تھے اور ان کے زخموں سے خون رِس رہا تھا۔

⑥ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے افغانستان، ہندوستان اور کشمیر کی طرف سفر اس لئے اختیار کیا کیونکہ وہ بنی اسرائیل کے ۱۲ قبائل کی طرف مبعوث ہوئے تھے، ان میں سے صرف ۲ قبائل فلسطین میں آباد تھے باقی ۱۰ قبائل ۳۰۰ سال قبل ہجرت کر کے ان علاقوں میں آکر آباد ہو گئے تھے، چنانچہ مؤرخ اس بات پر قریباً متفق ہیں کہ ان علاقوں میں بنی اسرائیل کے گمشدہ قبائل آکر آباد ہوئے تھے، اسی لئے آج بھی یہاں کے قبیلوں کے نام موسیٰ خیل عیسیٰ خیل وغیرہ ملتے ہیں۔ آپ کی ہجرت اور کشمیر میں آنے کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔

⑦ سری نگر کے محلہ خانیار میں آپؑ کا مزار یوز آصف کے نام سے مشہور ہے۔ "یوز" یسوع سے بگڑا ہوا لفظ ہے اور آصف کے معنی ہیں متلاشی یعنی آپ اپنی قوم کی تلاش میں یہاں پہنچے، قبر کے پاس پتھر کی تختی ہے جس پر دو قدموں کے نشان بنے ہوئے ہیں، ان میں سوراخ یعنی زخموں کے نشان دکھائے گئے ہیں، یہ بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ اس قبر میں مدفون ہونے والے کے قدموں میں کیل لگائے گئے تھے جو صلیبی واقعہ پر دلالت کرتا ہے۔ (آسک احمد ڈاٹ کام او آر جی)

یہ سات پوائنٹ ہم نے قادیانی ویب سائٹ سے نقل کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ قادیانی کس طرح دجل، فریب، جھوٹ اور مکاری سے اپنے جھوٹے اور مکار مرزا غلام احمد قادیانی کو مسیح موعود ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سچے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کا انکار کر رہے ہیں، انہیں مصلوب مان رہے ہیں، انہیں بلاد شام میں اور کشمیر کی فلک بوس چوٹی پر مدفون مان

رہے ہیں، ان پوائنٹس کو اگر درست مان لیا جائے تو قرآنی تعلیمات کا انکار لازم آتا ہے، یہ قادیانی کذب بیانی قرآنی تعلیمات سے متصادم ہے۔

قادیانیوں کا اعلانیہ دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں، دوبارہ دنیا میں نہیں آئیں گے۔ (مجموعہ اشتہارات، بحوالہ حیات عیسیٰ علیہ السلام) مرزا قادیانی کہتا ہے کہ ”میں وہ مسیح نہیں ہوں جو کہ بنی اسرائیل کی طرف نبی ہو کر آئے تھے، کیونکہ وہ تو فوت ہو چکے ہیں، ہاں ان کا کوئی مثیل بموجب احادیث صحیحہ ضرور آئے گا اور وہ میں ہی ہوں، مجھے مسیح علیہ السلام کے ساتھ مشابہت تامہ ہے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ (ازالہ اوہام ج ۲ ص ۶۸۲، خزائن ج ۳ ص ۴۶۸)

حیات مسیح اور مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ

مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اٹھالیا ہے، انہیں ابھی تک موت نہیں آئی ہے، مفسر قرآن ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قرب قیامت میں بجسم عنصری پھر تشریف لانے والے ہیں جیسا کہ متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ (بحر محیط، ترجمان السنہ ج ۳)

قادیانیوں نے خانہ ساز تحقیقات کی بدولت کبھی عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بلاد شام میں بتائی ہے اور کبھی کشمیر میں، جب کہ یہودی اور نصاریٰ ان کی قبر کی نشاندہی کرنے سے عاجز ہیں، ان کے پاس کوئی تاریخ نہیں ہے، کوئی تحقیق نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر وفات پا چکے ہیں تو انہیں سپرد خاک کرنے والے لوگ کون تھے؟ اور کہاں انہیں سپرد خاک کیا گیا؟

علامہ بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ترجمان السنہ میں فرمایا کہ ”یہ بات کتنی عجیب ہے کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام خود نبی اولوالعزم ہیں، ان کی امت بھی تسلسل کے ساتھ کسی انقطاع کے بغیر اب تک چلی آرہی ہے، پھر ان کی موت اور ان کی قبر کا صحیح صحیح حال آج تک ان سب پر کیسے مخفی رہ گیا، بالخصوص یہود جو ان کے قتل کے مدعی تھے وہ اس اہم واقعہ سے کیسے غفلت اختیار کر سکتے تھے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول ہونے کے لیے ان کی قبر کی نشاندہی ان کے لیے سب سے کھلا ہوا ثبوت

تھی مگر یہاں نہ تو یہود ان کی قبر کا پتہ نشان بتاسکتے ہیں اور نہ اس بارے میں نصاریٰ کے پاس ہی کوئی صحیح علم ہے اور ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان جو مدت ہے وہ تقریباً چھ سو سال کی مدت ہے، یہ اتنی طویل مدت نہیں کہ اس میں کسی ایسی اولوالعزم تاریخی شخصیت کی قبر اتنی لاپتہ ہو جائے کہ نہ اس کے ماننے والے بلکہ پوجنے والوں کو معلوم ہو اور نہ اس کے دشمنوں کو، اس امت میں نہ معلوم کتنے اولیاء اللہ گزر چکے ہیں جن کی وفات پر اس سے کہیں زیادہ کی مدت گزر چکی ہے مگر ان کی قبریں آج تک تازہ یادگاریں معلوم ہوتی ہیں، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور ان کی قبر کی ایسی گمنامی یہ کیسے قرین قیاس ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر ان کے حق میں کبھی موت کا ایک حرف نہیں فرمایا اور نہ ان کی قبر کا کہیں نشان بتایا، درانحالیکہ یہ مسائل آپ کی آنکھوں کے سامنے زیر بحث چل رہے تھے اس کے برعکس فرمایا تو یہ کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے اور ابھی ان کی وفات نہیں ہوئی اور قبر بتائی تو مستقبل بعید میں اپنے پہلو کے قریب مدینہ طیبہ میں، اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے تردید الوہیت کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معمولی سے معمولی حالات کا تذکرہ فرمایا۔ (ترجمان السنہ)

مولانا بدر عالم رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں "یہاں تھوڑا سا غور اس پر بھی کر لینا چاہیے کہ اگر بالفرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت واقع ہو چکی تھی تو پھر تمام انبیاء علیہم السلام میں سے ایک ان ہی کی خصوصیت کیا تھی کہ ان ہی کے معاملہ میں نصاریٰ سے لے کر اہل اسلام تک ان کی حیات اور ان کے نزول کے تسلسل کے ساتھ قائل چلے آرہے ہیں، چلیے نصاریٰ اگر اپنی فرط عقیدت سے کسی بے اصل بات کا دعویٰ کر ڈالیں تو جائے تعجب نہیں مگر یہاں علماء اسلام کے لیے اس کا کیا محل ہو سکتا تھا جو ہمیشہ تردید الوہیت میں سرگرم رہے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں کسی کے قلم سے ایسے کلمات بھی نکل گئے ہیں کہ اگر کہیں اتنی بڑی تہمت ان کے سر نہ رکھی جاتی تو وہ کلمات ہرگز ان کے زیر قلم نہ آسکتے تھے۔ (ترجمان السنہ ج ۳ ص ۴۹۴)

مولانا بدر عالم رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں "اس مقام پر دقیقہ قابل فروگزاشت نہیں ہے کہ ایک انسان کی موت کا واقعہ کون سا پیچیدہ واقعہ ہے جس کے بیان کرنے میں ایک معمولی سے معمولی انسان کو بھی

کوئی دشواری ہو سکتی ہے، اگر قرآن کریم کسی ایک جگہ بھی صراحت کے ساتھ یہ لفظ فرمادیتا کہ اِنَّ عِیسیٰ مَاتَ یعنی عیسیٰ علیہ السلام مر چکے ہیں تو بس اسی ایک لفظ سے ساری بحثیں ختم ہو جاتیں اور بے وجہ لفظ توفی پر دفتر کے دفتر خرچ کر کے یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ رہتی کہ توفی لغت عرب میں موت کے ہم معنیٰ ہے۔

افسوس ہے کہ لفظ توفی کے موت کے معنیٰ میں ثابت کرنے کے لیے تو عمریں صرف کی گئیں مگر اس پر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہ کیا گیا کہ جب عربی زبان میں موت کے لیے دوسرا لفظ موجود تھا تو پھر یہاں موضع اختلاف میں اس صاف اور سیدھے لفظ کو چھوڑ کر ایسے مشتبہ لفظ کو کیوں اختیار کیا گیا ہے جو بڑی کاوشوں کے بعد بھی موت میں منحصر نہیں ہو سکتا بالخصوص جبکہ عیسائی یہ ڈنکا بجا رہے ہوں کہ وہ اللہ تھے والعیاذ باللہ تو کیا یہ بات سیدھی اور صاف نہ تھی کہ اللہ کا سب سے پہلا نام الحی ہے اور عیسیٰ مر چکے ہیں، سورۃ آل عمران میں جو نصاریٰ کی تردید کے لیے اتری اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو الحی القیوم کہہ کر ان کی تردید کی گئی مگر ساری سورت میں ایک بار بھی عیسیٰ کے حق میں موت کا لفظ نہ بولا گیا۔ (ترجمان السنہ ج۳ص۴۹۵)

نزول عیسیٰ علیہ السلام

عقلی اور نقلی دلائل نے ان تمام لوگوں کے خانہ ساز خیالات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ نہیں مانتے، قادیانی فرقہ تو عیسائیوں سے بھی کئی ہاتھ آگے نقل کر بڑی شدو مد کے ساتھ حیات مسیح کا انکار کرتا ہے، وہ جب انہیں حیات ہی نہیں مانتا تو پھر وہ ان کے آسمانوں سے نزول کا عقیدہ کیسے رکھ سکتا ہے، اس فرقہ ضالہ مضلہ کے نزدیک تو وہ بلاد شام کے کسی گورستان میں آسودہ خاک ہیں، کبھی ان کی تحقیق بر آمد ہوتی ہے کہ وہ صحراؤں اور کوہساروں کو عبور کرتے ہوئے کشمیر کی فلک بوس چوٹیوں پر اپنے لوگوں کی تلاش میں پہنچ گئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی اور یہیں ان کی تدفین ہوئی، جب کہ یہ ساری باتیں اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

ہم مسلمان اپنی سچی کتاب قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں، ہمیں اپنی سچی کتاب نے اطلاع دی کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر نہیں چڑھایا گیا بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیے ہیں، اسی طرح قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ان لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، قرآن کریم نے واضح فرمایا کہ انہیں اللہ نے اٹھالیا ہے، ایک مقام پر یہ واضح کر دیا کہ ان کافروں کے مکر و فریب سے ہم آپ کو پورا پورا لے لیں گے، سورۃ نساء میں اللہ تعالیٰ نے یہود بے بہبود کے اس قول کی تردید کی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ ہم نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے، سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ میں نے آپ کو بنی اسرائیل سے بچائے رکھا، یہ بھی واضح ہے کہ کسی دشمن نے آپ کو گزند نہیں پہنچایا۔

مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا ہے، وہ آسمان سے قیامت کے قریب نازل ہوں گے، پھر فوت ہوں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ میں آسودہ خاک ہوں گے اور اسی مقام سے قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھیں گے۔

نزول مسیح اور فرامین نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيكُمْ وَإِمَامُكُمْ مِنْكُمْ (بخاری) اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب مریم کے بیٹے تم میں اتریں گے اور اس وقت تمہارا امام تم ہی میں سے ہو گا۔ اس سے مراد آخری زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا ہے، یہ خطاب قریش کو کیا جا رہا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی رحمہ اللہ کی اقتدا میں نماز ادا فرمائیں گے، اس امت کی مسرت اور خوشی کا کیا عالم ہو گا جب اس عظیم الشان نبی علیہ السلام سے ملاقات کریں گے اور اس امت کا کیا اعزاز ہو گا جب اس کے ایک فرد کی اقتدا میں عیسیٰ علیہ السلام نماز پڑھیں گے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ، ظَاهِرِينَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَيَنْزِلُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ، فَيَقُولُ أَمِيرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا، فَيَقُولُ: لَا، إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ أُمَرَاءُ لِتَكْرِمَةِ اللهِ هذه الأمة (صحیح ابن حبان) میری امت میں ایک جماعت قیامت تک حق کے لیے لڑتی رہے گی، پھر عیسیٰ

بن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے تو اس جماعت کا امیر ان سے کہے گا کہ آیئے نماز پڑھایئے، آپ علیہ السلام فرمائیں گے نہیں اللہ نے اس امت کو اعزاز بخشا ہے اس لیے آپ ہی میں سے بعض بعض کے امیر ہیں۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ابن مریم علیہ السلام فج الروحا (مدینہ منورہ اور بدر کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جو مدینہ سے چھ میل کے فاصلے پر ہے، اسے صرف فج اور صرف روحا بھی کہتے ہیں) کے مقام پر حج کا یا عمرے کا یا دونوں کا تلبیہ ضرور پڑھیں گے۔

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک صبح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا اور اس کے فتنہ کے بارے میں بتایا، اس بیان سے ہمیں ڈر کی وجہ سے یوں لگا جیسے دجال کسی قریبی کھجور کے باغ میں موجود ہو، ہم اس وقت تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے گئے، جب شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ڈر کی اس کیفیت کو بھانپ لیا جو ہم پر طاری تھی اور پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ ہم نے کہا یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح دجال کا ذکر فرمایا اور اس کے فتنہ کے بارے میں بتایا یہاں تک کہ ہمیں یوں لگا کہ جیسے دجال قریبی کھجور کے باغ میں موجود ہو، یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے دجال سے زیادہ دوسری چیز کا ڈر ہے، کیونکہ اگر وہ میری زندگی میں نکلا تو تمہاری طرف سے اس کا مقابلہ کرنے والا میں موجود ہوں، اور اگر وہ اس زمانے میں نکلا جب کہ میں تمہارے بیچ میں نہ ہوں تو ہر مرد اپنا دفاع خود ہی کرے گا، میرے بعد اللہ تو ہر مسلمان کا حامی و مددگار ہے۔ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت کے آخر میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ مسلمان جنگ کی تیاری اور صفیں درست کرنے میں مشغول ہوں گے کہ نماز (فجر) کی اقامت ہو جائے گی اور فوراً ہی بعد عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نازل ہوں گے اور مسلمانوں کے امیر کو ان کی امامت کا حکم فرمائیں گے، دشمن خدا دجال عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا جیسے پانی میں نمک گھلتا ہے۔ (مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے اور ان کے یعنی حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں اور وہ نازل ہوں گے جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، ان کا قد و قامت میانہ اور رنگ سرخ و سفید ہو گا، ہلکے زرد رنگ کے کپڑوں میں ہوں گے، سر کے بال اگرچہ بھیگے نہ ہوں تب بھی چمک اور صفائی کی وجہ سے ایسے ہوں گے کہ گویا ان سے پانی ٹپک رہا ہے، اسلام کی خاطر کفار سے قتال کریں گے، پس صلیب توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ بند کر دیں گے اور اللہ ان کے زمانہ میں اسلام کے سوا تمام ادیان و مذاہب کو ختم کر دے گا اور انہی کے ہاتھوں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا، پس عیسیٰ علیہ السلام زمین پر چالیس سال رہ کر وفات پائیں گے اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک عیسیٰ بن مریم علیہما السلام عادل حکمران کی حیثیت سے نازل نہ ہوں گے قیامت نہیں آئے گی، وہ نازل ہو کر صلیب کو توڑ ڈالیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ لینا بند کر دیں گے اور مال پانی کی طرح بہائیں گے، حتیٰ کہ کوئی اسے قبول نہ کرے گا۔ (ابن ماجہ، مسند احمد)

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، قرآن کریم کی سورۃ الزخرف آیت ۶۱ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ {وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ} وہ قیامت کی نشانی ہیں، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مراد حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا قیامت سے پہلے نزول ہے۔ (ابن حبان، موارد الظمان الی زوائد ابن حبان)

تذکرہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام بزبان مصطفےٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین عالی شان کی یہ جھلک دیکھیے، کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے تو اس وقت کیا کیا انقلابات رونما ہوں گے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے ان کے نزول کے وقت کی باتیں عام فرمائی ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام علاتی بھائی ہیں (علاتی جن کا والد ایک ہو اور مائیں الگ الگ ہوں۔

① أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى ان کی مائیں ایک ہیں۔

② وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ، وَأَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ علیہ السلام فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لِأَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ ان کا دین ایک ہے، میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے بہت قریب ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اس لیے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔

③ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَيُوشِكَنَّ أَنْ يَنْزِلَ فِيكُمْ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ عنقریب تم میں نازل ہوں گے۔

④ وَإِنِّي لَأَرْجُو إِنْ طَالَتْ بِيَ حَيَاةٌ أَنْ أَلْقَاهُ، میں امید رکھتا ہوں اگر میری زندگی لمبی ہوئی تو میں ان سے ملاقات کروں گا۔

⑤ فَإِنْ عَجِلَ بِي مَوْتٌ فَمَنْ لَقِيَهُ مِنْكُمْ فَلْيُقْرِئْهُ مِنِّي السَّلَامَ اگر میری وفات جلدی ہوگئی تو تم میں جو شخص ان سے ملے وہ انہیں میرا اسلام کہے۔

⑥ فَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَاعْرِفُوهُ، رَجُلٌ مَرْبُوعٌ إِلَى الْحُمْرَةِ وَالْبَيَاضِ عَلَيْهِ ثَوْبَانِ مُمَصَّرَانِ جب تم انہیں دیکھو تو انہیں پہچان لینا، وہ میانہ قد آدمی ہوں گے، ان کی رنگت سرخ وسفید ہوگی، وہ ہلکے زرد رنگ کے دو کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔

⑦ سَبْطٌ لمبے بالوں والے ہوں گے، یا لمبے جسم والے ہوں گے۔

⑧ كَأَنَّ رَأْسَهُ يَقْطُرُ وَإِنْ لَمْ يُصِبْهُ بَلَلٌ فَيُقَاتِلُ النَّاسَ عَلَى الْإِسْلَامِ ان کے سر کے بال اگرچہ بھیگے نہ ہوں گے پھر بھی بال چمک رہے ہوں گے، وہ اسلام کی خاطر لوگوں سے لڑیں گے۔

⑨ إِمَامًا مُقْسِطًا، وَحَكَمًا عَدْلًا وہ منصف امام اور عادل حکمران ہوں گے۔

⑩ مَهْدِيًّا وہ ہدایت یافتہ ہوں گے۔

⑪ يَكْسِرَ الصَّلِيبَ، وَيَقْتُلَ الْخِنْزِيرَ، وَيَضَعَ الْجِزْيَةَ وہ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور جزیہ ختم کردیں گے۔

⑫ وَالْخَرَاجَ وہ خراج کو ختم کردیں گے۔ (ٹیکس اور خراج کافروں سے لیا جاتا ہے، اس وقت روئے زمین پر کوئی کافر نہیں ہوگا جس سے ٹیکس وخراج وصول کیا جائے۔

⑬ وَتُجْمَعُ لَهُ الصَّلَاةُ، ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی۔ (نمازوں کی امامت کروائیں گے)

⑭ وَيَدْعُو النَّاسَ إِلَى الْإِسْلَامِ، لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں گے۔

⑮ وَيُهْلِكُ اللهُ فِي زَمَانِهِ الْمِلَلَ كُلَّهَا غَيْرَ الْإِسْلَامِ، اللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ادیان کو ختم کر دیں گے۔

⑯ وَيُهْلِكُ اللهُ فِي زَمَانِهِ، مَسِيحَ الضَّلَالَةِ، الْأَعْوَرَ الْكَذَّابَ، اللہ تعالیٰ ان کے زمانے میں مسیح الضلالہ (دجال) جھوٹے کانے کو ہلاک کریں گے۔

⑰ وَتَكُونَ الدَّعْوَةُ وَاحِدَةً، ایک ہی دین کی دعوت ہو گی۔

⑱ وَيَنْزِلُ بِفَجِّ الرَّوْحَاءِ، وہ فج الروحاء میں اتریں گے۔

⑲ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَيُهِلَّنَّ مِنْهَا حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا، أَوْ لَيُثَنِّيَهُمَا جَمِيعًا، قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے وہ مقام فج الروحاء سے تلبیہ پڑھیں گے یہ تلبیہ حج کا ہو گا یا عمرہ کرنے والے کا، یا دونوں کا ہو گا۔

⑳ ثُمَّ لَئِنْ قَامَ عَلَى قَبْرِي فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، لَأُجِيبَنَّهُ، پھر وہ میری قبر پر کھڑے ہوں گے اور کہیں گے یا محمد! تو میں ان کی پکار کا جواب دوں گا۔

㉑ وَلَتُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ، فَلَا يُسْعَى عَلَيْهَا، جوان اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی کوئی ان میں رغبت نہیں رکھے گا کہ انہیں زکوٰۃ میں وصول کیا جائے، کیونکہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں رہے گا، ان پر سواری کوئی نہیں کرے گا، ان سے باربرداری کا کام نہیں لیا جائے گا۔

㉒ وَيَفِيضُ الْمَالُ حَتَّى لَا يَقْبَلُهُ أَحَدٌ، حَتَّى تَكُونَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، وہ بے دریغ مال لوٹائیں گے لیکن ان سے مال لینے والا کوئی نہیں ہو گا، یہاں تک کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہو گا۔

㉓ وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَاءُ بغض، عداوت اور کینہ ختم ہو جائے گا۔

㉔ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ، ایک دوسرے سے بغض رکھنا اور ایک دوسرے سے حسد کرنا ختم ہو جائے گا۔

㉕ وَتَضَعُ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا، جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا۔

㉖ وَتُتَّخَذُ السُّيُوفُ مَنَاجِلَ، تلواریں درانتی کی طرح بنادی جائیں گی۔

(۲۷) وَتَقَعُ الْأَمَنَةُ عَلَى الْأَرْضِ، حَتَّى تَرْتَعَ الْأُسُودُ مَعَ الْإِبِلِ، وَالنِّمَارُ مَعَ الْبَقَرِ وَالذِّئَابُ مَعَ الْغَنَمِ زمین میں عدل وانصاف ہو گا یہاں تک کہ شیر اونٹوں کے ساتھ کھائیں گے اور چیتے گائیوں کے ساتھ اور بھیڑیے بکریوں کے ساتھ کھائیں گے۔

(۲۸) وَتَذْهَبُ حُمَةُ كُلِّ ذَاتِ حُمَةٍ، فَيَلْعَبَ الصِّبْيَانُ بِالْحَيَّاتِ لَا تَضُرُّهُمْ، ہر بخار والے جاندار کا بخار اتر جائے گا، بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے جو انہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

(۲۹) وَتُنْزِلُ السَّمَاءُ رِزْقَهَا وَتُخْرِجُ الْأَرْضُ بَرَكَتَهَا، آسمان اپنا رزق اتارے گا، زمین اپنی برکتیں باہر نکالے گی۔

(۳۰) وَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ أَرْبَعِينَ سَنَةً، ثُمَّ يُتَوَفَّى وَيُصَلِّي عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ وَيَدْفِنُونَهُ، وہ زمین میں چالیس سال رہیں گے، پھر وفات پائیں گے، مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور انہیں دفن کریں گے۔ (ایک روایت میں پنتالیس سال کا ذکر بھی ہے)

(۳۱) ثُمَّ تَلَا أَبُو هُرَيْرَةَ: {وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ، وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا}، پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی اور اہل کتاب ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں گے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوں گے۔ (الجامع الصحیح للسنن المسانید) ان کے علاوہ بہت سی روایات ہیں، جن میں نزول مسیح کا علیہ السلام تذکرہ موجود ہے۔

صریح احادیث میں تاویل کا خطرناک نتیجہ

مولانا بدر عالم رحمہ اللہ فرماتے ہیں صریح الفاظ اور صریح بیانات کو پیچیدہ بنانے اور ان کی تاویلات کرنے کا نتیجہ کبھی اچھا برآمد نہیں ہوا، یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی پیشگوئی میں تاویل کی، آخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انہوں نے دجال کا مصداق سمجھا اور جب دجال ظاہر ہو گا تو اس کو مسیح ہدایت سمجھ کر اس کی اتباع کریں گے، اسی طرح نصاریٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف صاف پیشگوئیوں کی تاویلات کیں آخر اس کا بھی جو نتیجہ ظاہر ہونا تھا وہ ہوا اور انہوں نے بھی اسی

غلطی کی بدولت آنحضرت ﷺ کا انکار کیا، لہٰذا اصاف اور واضح بیانات میں تاویلات کرنا نہایت خطرناک قدم ہے اور اس کا ثمرہ بھی یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ غلط مسیح، مسیح حق مان لیے جائیں اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں تو یہودیوں کی طرح ان کا انکار کر دیا جائے، اگر نزول عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اتنے واضح اور صریح الفاظ میں بھی تاویلات یا مجازات واستعارات جاری کر دینا صحیح ہے تو پھر یہود و نصاریٰ کو بھی قصوروار ٹھہرانا غلط ہو گا، جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشگوئیوں میں تاویلیں کر کے اپنا ایمان برباد کیا۔ (ترجمان السنہ ج ۳)

عقل وانصاف کا تقاضا

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس مقام پر اپنی تفسیر معارف القرآن میں بہت ہی عمدہ طریقہ سے حیات مسیح ونزول مسیح علیہ السلام کے مسئلہ کی وضاحت کی ہے، وہ دعوت فکر دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس پر نظر کرنے سے ذرا بھی عقل و انصاف ہو تو اس مسئلہ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ سورۃ آل عمران کے چوتھے رکوع میں حق تعالیٰ نے انبیاء سابقین علیہم السلام کا ذکر فرمایا تو حضرت آدم، حضرت نوح، آل ابراہیم، آل عمران علیہم السلام سب کا ذکر ایک ہی آیت میں اجمالاً کرنے پر اکتفا فرمایا، اس کے بعد تقریباً تین رکوع اور بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خاندان کا ذکر اس بسط و تفصیل کے ساتھ کیا گیا کہ خود خاتم الانبیاء ﷺ جن پر قرآن نازل ہوا ان کا ذکر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں آیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا ذکر، ان کی نذر کا بیان، والدہ کی پیدائش، ان کا نام، ان کی تربیت کا تفصیلی ذکر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطن مادر میں آنا، پھر ولادت کا مفصل حال، ولادت کے بعد ماں نے کیا کھایا پیا اس کا ذکر، اپنے خاندان میں بچے کو لے کر آنا، ان کے طعن و تشنیع، اول ولادت میں ان کو بطور معجزہ گویائی عطا ہونا، پھر جوان ہونا اور قوم کو دعوت دینا، ان کی مخالفت، حواریین کی امداد، یہودیوں کا نرغہ، ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا جانا وغیرہ۔ پھر احادیث متواترہ میں ان کی مزید صفات، شکل و صورت، ہیئت، لباس وغیرہ کی پوری تفصیلات، یہ ایسے حالات ہیں کہ پورے قرآن وحدیث میں کسی نبی ورسول کے حالات اس تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے۔ یہ بات ہر انسان کو دعوت فکر دیتی ہے کہ

ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا۔ (معارف القرآن)

مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ذرا بھی غور کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی و رسول ہیں کوئی دوسرا نبی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنے والا نہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ قیامت تک جو جو مراحل امت کو پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ہدایات دیدیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو اس کا اہتمام فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قابل اتباع کون لوگ ہوں گے، ان کا تذکرہ اصولی طور پر عام اوصاف کے ساتھ بھی بیان فرمایا، بہت سے حضرات کے نام متعین کر کے بھی امت کو ان کے اتباع کی تاکید فرمائی، اس کے بالمقابل ان گمراہ لوگوں کا بھی پتہ دیا جن سے امت کے دین کو خطرہ تھا۔ (معارف)

مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں "بعد کے آنے والے گمراہوں میں سب سے بڑا شخص مسیح دجال تھا، جس کا فتنہ گمراہ کن تھا اس کے اتنے حالات وصفات بیان فرمادیئے کہ اس کے آنے کے وقت امت کو اس کے گمراہ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے، اسی طرح بعد کے آنے والے مصلحین اور قابل اقتداء بزرگوں میں سب سے زیادہ بڑے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، جن کو حق تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے نوازا اور فتنہ دجال میں امت مسلمہ کی امداد کے لیے ان کو آسمان میں زندہ رکھا اور قرب قیامت میں ان کو قتل دجال کے لیے مامور فرمایا، اس لیے ضرورت تھی کہ ان کے حالات وصفات بھی امت کو ایسے واشگاف بتلائے جائیں جن کے بعد نزول عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کسی انسان کو ان کے پہچاننے میں کوئی شک وشبہ نہ رہ جائے، اس میں بہت سی حکم و مصالح ہیں۔

اول یہ کہ اگر امت کو ان کے پہچاننے ہی میں اشکال پیش آیا تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، امت مسلمہ ان کے ساتھ نہ لگے گی تو وہ امت کی امداد و نصرت کس طرح فرمائیں گے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ اس وقت فرائض نبوت و رسالت پر مامور ہو کر دنیا میں نہ آئیں گے، بلکہ امت محمدیہ کی قیادت و امامت کے لیے بحیثیت خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے، مگر ذاتی طور پر جو ان کو منصب نبوت و رسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے، بلکہ اس وقت ان کی مثال اس گورنر کی سی ہو گی جو اپنے صوبہ کا گورنر ہے، مگر کسی ضرورت سے دوسرے

صوبہ میں چلا گیا ہے، تو وہ اگرچہ صوبے میں گورنر کی حیثیت پر نہیں مگر اپنے عہدہ گورنری سے معزول بھی نہیں۔ (معارف القرآن)

مفتی صاحب رحمہ اللہ اس معرکۃ الآراء بحث کو سمیٹتے ہوئے فرماتے ہیں "خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت بھی صفت نبوت و رسالت سے الگ نہیں ہوں گے اور جس طرح ان کی نبوت سے انکار پہلے کفر تھا اس وقت بھی کفر ہو گا، تو امت مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوت پر قرآنی ارشادات کی بناء پر ایمان لائے ہوئے ہے، اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہچانے تو انکار میں مبتلا ہو جائے گی، اس لیے ان کی علامات وصفات کو بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو دنیا کی آخری عمر میں پیش آئے گا، اگر ان کی علامات و حالات مبہم ہوتے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی دوسرا آدمی دعوی کر بیٹھے کہ میں مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوں، ان علامات کے ذریعہ اس کی تردید کی جاسکے گی، جیسا کہ ہندوستان میں مرزا قادیانی نے دعوی کیا کہ میں مسیح موعود ہوں اور علماء امت نے انہی علامات کی بناء پر اس کے قول کو رد کیا، خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ اور دوسرے مواقع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وصفات کا اتنی تفصیل کے ساتھ بیان ہونا خود ان کے قرب قیامت میں نازل ہونے اور دوبارہ دنیا میں تشریف لانے ہی کی خبر دے رہا ہے۔ (معارف القرآن)

اہل علم و عرفان و نزول مسیح علیہ السلام

شائقین مطالعہ اور محققین کے لیے اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے اکابرین کی تحریر کردہ کتابیں مفید ثابت ہو سکتی ہیں، ان میں مولانا بدر عالم میرٹھی کی ترجمان السنہ جلد سوم اور الجواب الفصیح لمنکر حیات المسیح، الجواب الخفی فی آیات التوفی، انجاز الوفی فی آیات التوفی، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح یہ علامہ انور شاہ کاشمیری کی تصنیف لطیف ہے، جو ان کے مایہ ناز تلمیذ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے مرتب کی، ان میں قیامت کی علامت صغریٰ اور کبریٰ پر روایات صحیحہ متواترہ پیش کی گئی ہیں، اس کتاب کا مرکزی موضوع نزول مسیح ہے، اس کی تحقیق و تعلیق عرب عالم عبد الفتاح ابو غدہ نے کی

ہے، اس کتاب کا اردو ترجمہ مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کے فرزند مفتی محمد رفیع عثمانی رحمہ اللہ نے کیا ہے، کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ کے نام سے شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے ایک بیش قیمت رسالہ تصنیف کیا ہے، حیات عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے مولانا مہر الدین رحمہ اللہ نے ایک کتاب مرتب کی ہے، اکفار الملحدین مؤلفہ علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ میں بھی مواد موجود ہے، عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام مصنفہ علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ بھی اپنے موضوع پر لاجواب و باکمال کتاب ہے، اس کا اردو ترجمہ حیات ابن مریم کے نام سے مولانا صغیر پرتاب گڑھی نے کیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب الاعلام بحکم عیسیٰ علیہ السلام، رفع ونزول وحیات مسیح علیہ السلام مؤلفہ مولانا عبد اللطیف مسعودؒ، توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام مؤلفہ امام اہلسنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ، حیات عیسیٰ علیہ السلام و مرزا قادیانی کا اقرار وانکار، حیات ونزول مسیح علیہ السلام اور مرزا قادیانی، مؤلفہ ڈاکٹر عبد اللہ خان جتوئی رحمہ اللہ، ختم نبوت ونزول عیسیٰ مؤلفہ مولانا عبد الرشید، الحق الصریح فی حیات المسیح مؤلفہ مولانا بشیر شہسوانیؒ، الالہام الصحیح فی اثبات حیات مسیح مؤلفہ مولانا غلام رسول امرتسریؒ، الکلام الفصیح فی تحقیق الحیات المسیح مؤلفہ سید محمد عرب مکی، عقیدہ رفع ونزول عیسیٰ مؤلفہ مولانا منیر علوی، رفع ونزول عیسیٰ مؤلفہ حافظ مدثر علی جیسی کتابیں اس موضوع پر کافی شافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اپنی بارگاہ سے جزائے خیر عطا کرے۔

انجام کفار، صلہ اہل ایمان

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ {۵۶} وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ {۵۷} ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ {۵۸} آل عمران

جواب ترجمہ: سو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا پس ان کو سخت عذاب دوں گا، دنیا میں اور آخرت میں اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو اللہ ان کو پورے

اجر عطا فرمادے گا، اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہ آیات اور ذکر حکیم ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے والی آیت میں فرمایا کہ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ تم میری طرف لوٹو گے تو میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو، سباق کلام سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مسیح کے پیروکاروں نے جو کفر کیا اس کی سزا طے کی جارہی ہے، ان میں یہود بھی ہیں اور نصاریٰ بھی، ان لوگوں نے نہ صرف آسمانی احکامات کو پس پشت ڈالا، بلکہ وقت کے نبی کی تعلیمات کا تمسخر اڑایا، پھر ان کا انکار کیا، دین میں اختلافات کے بیج بوئے، پھر تفصیل سے بیان کر دیا کہ وہ اختلاف کیا تھا، وہ اختلاف یہ تھا کہ ایک قوم نے کفر کیا اور دوسرے ایمان لائے، جن لوگوں نے کفر کیا، احکامات خداوندی، کتاب خداوندی، تعلیمات خداوندی، تعلیمات پیغمبرانہ کا انکار کیا، ان کے لیے فیصلہ یہ کیا جائے گا کہ انہیں دنیا اور آخرت دونوں جہان میں سخت سزا اور عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، ایمان لانے والوں اور نیک اعمال بجالانے والوں کے درمیان فیصلہ یہ ہو گا کہ انہیں ان کے اعمال صالحہ کا پورا پورا اجر دیا جائے گا۔

مولانا مفتی عاشق الٰہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کفار کو دنیوی عذاب قتل، قید اور ذلت کی شکل میں دیا جائے گا، اسی طرح کفار کو دنیا میں امراض، مصائب، مشکلات اور آلام کا سامنا کرنا پڑے گا، بعض اہل علم اس میں اپنی مختلف رائے رکھتے ہیں، کہ دنیا میں انہیں پہنچنے والی تکالیف و مشکلات آیا ان کے لیے دنیوی عذاب ہے یا کہ نہیں؟ بعض فرماتے ہیں کہ کافر کے حق میں تو یہ عذاب دنیوی ہے، اگر یہی دکھ، تکلیف، پریشانی، مشکل مسلمان کو پہنچتی ہے تو یہ اس کے حق میں ابتلا اور امتحان ہوتا ہے۔

دنیا میں مومن اور کافر سبھی زندہ رہتے ہیں اور کھاتے کماتے ہیں، یہ سب دنیاوی امور ہیں آخرت میں تو ایمان مدار نجات ہو گا ایمان اور اعمال صالحہ کی بنیاد پر جنت ملے گی اور اس وقت اعمال کا پورا پورا بدلہ اللہ پاک کی طرف سے دے دیا جائے گا اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے دنیا میں بھی سزا ہے اور آخرت میں بھی، یہ سزا مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ جب مسلمان

جہاد کرتے تھے (جواب بھی واجب ہے) اس وقت کافر ان کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے قید ہوتے تھے غلام باندی بنائے جاتے تھے جزیہ دینے پر مجبور ہوتے تھے اور اب بھی ان کے ملکوں میں تباہی آتی رہتی ہے، نئی بیماریاں زلزلے وغیرہ مصائب و آلام کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور اگر کہیں دنیاوی حال اچھا ہے تو وہ استدراج (اللہ کی طرف سے مہلت اور ڈھیل) ہے اور مسلمانوں کے ملکوں میں جو کبھی اس طرح کی کوئی چیز آجاتی ہے وہ کفارہ سیئات کا ذریعہ بنتی ہے، نصاریٰ کا دنیا میں یہودیوں پر فائق اور غالب رہنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آخرت میں نجات کے مستحق ہوں گے، کیونکہ وہاں کی نجات کا تعلق اس ایمان سے ہے جو اللہ کے ہاں معتبر ہے۔

نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح نہیں مانتے جیسا انہوں نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان نہیں لاتے (ان کی تشریف آوری کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی) اس لیے کافروں میں شمار ہیں اور کفر کی وجہ سے آخرت میں ان کو سخت اور دائمی عذاب ہوگا اور یہودی بھی کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان نہیں لائے اور سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بھی نہیں مانتے لہٰذا وہ بھی آخرت میں عذاب دائمی کے مستحق ہیں۔ (انوار البیان) دنیا میں سزا، آخرت میں عذاب ان کافروں کا مقدر ہے، ایسا عذاب دیا جائے گا کہ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوگا۔

اشکال: یہاں فرمایا گیا کہ میں کافروں کو عذاب شدید دوں گا دنیا اور آخرت میں، فیصلہ قیامت کا بیان ہو رہا ہے، دنیا اور آخرت میں سزا دینے کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ اس وقت تو سزائے دنیوی نہیں ہوگی۔

جواب اشکال: مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ "اس کہنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم کو یہ کہے کہ اس وقت تو ایک سال کی قید کرتا ہوں، اگر جیل خانہ میں کوئی شرارت کی تو دو سال کی سزا کروں گا، فقط اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ دو سال آج کی تاریخ سے ہوں گے، پس اس بنا پر یقینی ہے کہ شرارت کے بعد دو سال کا حکم ہو جاوے گا، حاصل یہ ہوتا ہے کہ شرارت پر اس مجموعہ کی تکمیل بطور انضمام ایک سال زائد کے مرتب ہو جاوے گی، اسی طرح یہاں سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں تو سزا ہو چکی اس کے ساتھ سزائے

آخرت منضم ہو کر مجموعہ قیامت کے روز تکمیل کر دیا جائے گا، یعنی سزائے دنیا کفارہ نہ ہو گا سزائے آخرت کے لیے بخلاف اہل ایمان کے کہ اگر ان پر دنیا میں کوئی مصیبت وغیرہ آتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں اور عاقبت کی عقوبت خفیف یا دفع ہو جاتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کی طرف لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ میں اشارہ فرمایا گیا، یعنی اہل ایمان بسبب ایمان کے محبوب ہیں، محبوب کے ساتھ ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں اور اہل کفر بسبب کفر کے مبغوض ہیں، مبغوض کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔ (بیان القرآن)

وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ: جو لوگ ایمان لائے، نیک اعمال بجالائے انہیں ان کے اعمال صالحہ کا پورا پورا اجر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ جو لوگ آپ پر اور اس حق پر ایمان لائے جو آپ ان کے پاس لائے اور انہوں نے نماز، زکوٰۃ، روزے اور صلہ رحمی وغیرہ جیسے نیک اعمال کیے تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کا ثواب کمی کیے بغیر پورا پورا دے گا، یہ گفتگو عیسیٰ کے ان پیروکاروں کے بارے میں ہے جو محمد رسول اللہ کی بعثت سے پہلے تھے، جنہیں عیسیٰ نے بذات خود بشارت دی ہے۔ (المختصر فی تفسیر القرآن الکریم)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں " أَيْ: فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، فِي الدُّنْيَا بِالنَّصْرِ وَالظَّفَرِ، وَفِي الْآخِرَةِ بِالْجَنَّاتِ الْعَالِيَاتِ، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دنیا اور آخرت میں اجر دیں گے، دنیا میں مدد و نصرت اور کامیابی کی صورت میں اور آخرت میں بلند ترین جنتوں کی صورت میں۔ (ابن کثیر)

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعمال صالحہ پر اہل ایمان و نیکوکاروں کو پورا پورا اجر دیا جائے گا، لیکن یہ مہربانی کافروں پر نہیں ہو گی، کیونکہ کافر اپنے اعمال بد کی وجہ سے ظالم ہیں، وہ اس مہربانی کے مستحق نہیں ہیں، واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ان ظالموں سے بغض رکھتا ہے، ان پر کسی قسم کا رحم و کرم نہیں فرمائے گا، یہاں ظالمین ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ اپنے کفریہ عقائد، نظریات، خیالات اور اعمال میں حدود کو پھلانگ چکے ہیں، اس لیے یہ ناپسندیدہ ہیں۔

ذٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ: ذالک یہ اسم اشارہ ہے جو مشیر ہے ان خبروں کی

طرف جو عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق تھیں، اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرما رہے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کی یہ خبریں جو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھ کر سناتے ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے کلام کے صحیح ہونے کے واضح دلائل ہیں اور یہ متقین کے لیے ذکر اور نصیحت ہے اور ایسا محکم کلام ہے کہ باطل اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ (المختصر فی تفسیر القرآن الکریم) یہاں اللہ تعالیٰ نے تلاوت کی اضافت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے کیونکہ یہ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے، ذکر الحکیم سے مراد قرآن کریم ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

تخلیق آدم علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام میں مماثلت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ {۵۹} الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ {۶۰} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے اسے مٹی سے بنایا پھر اسے کہا کہ ہو جا پھر ہو گیا۔ یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے سو آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اہل نجران میں سے ایک جماعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی ان میں السید اور العاقب بھی تھے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر عرض کیا آپ کو کیا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے صاحب کے بارے میں ایسا ایسا کہتے ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا صاحب کون ہے؟ انہوں نے کہا عیسیٰ علیہ السلام تمہارا خیال ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں! وہ اللہ کا بندہ ہے انہوں نے کہا کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسیٰ علیہ السلام کے مثل کوئی دیکھا ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے متعلق کوئی خبر دی گئی ہے؟ پھر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چلے گئے تو آپ کے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو ان کو فرما دیجئے إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے۔ (ابن جریر، در منثور

② حسن رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ نجران کے دو راہب (سید اور عاقب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

آئے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان پر اسلام پیش کیا، ان میں سے ایک نے کہا ہم اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے ہیں، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا تم جھوٹ بولتے ہو، اسلام قبول کرنے سے تمہیں تین چیزیں مانع ہیں، تم صلیب کی عبادت کرتے ہو، تم خنزیر کھاتے ہو اور تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کا بیٹا ہے، ان دونوں نے کہا پھر عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کا باپ کون ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی (الوسیط)

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ: اللہ تعالیٰ کے ہاں عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی مثال تو آدم عَلَیْہِ السَّلَام کی طرح ہے، انہیں مٹی سے بنا کر فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کو ماں اور باپ کے بغیر پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، قرآنِ حکیم کی بیان کردہ یہ مثال تشبیہ غریب الاغرب کے قبیل سے ہے، تاکہ مخالفین کی تمام دلیلیں کٹ جائیں اور ذہنوں میں بات مضبوطی سے بیٹھ جائے۔

دونوں جگہ مثل کا معنی ہے عجیب حالت یعنی اللہ کے نزدیک عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی عجیب حالت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کی عجیب حالت کی طرح ہے، وجہ مشابہت یہ ہے کہ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ اللہ نے آدم عَلَیْہِ السَّلَام کو مٹی سے بنایا، ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ پھر اس کالبد سے کہا زندہ آدمی ہو جا، فَيَكُونُ فوراً وہ ہو گیا، یہ گزشتہ حال کی حکایت ہے یا یہ مطلب ہے کہ آدمی کو مٹی سے بنانے کا اندازہ کیا اور اندازہ علمی کو موجود ہو جانے کا حکم دیا تو وہ موجود ہو گیا لیکن یہاں واقعہ کی تاخیر مدت مراد نہیں ہے بلکہ ایک بیان کی دوسرے بیان سے تاخیر مراد ہے یعنی اوّل آدم عَلَیْہِ السَّلَام کا مٹی سے پیدا کرنا بیان کیا پھر پیدا کرنے کا طریقہ بتا دیا کہ حکم دے دیا بس وہ پیدا ہو گیا، مطلب یہ کہ آدم عَلَیْہِ السَّلَام کے باپ نہیں تھے، نہ پیٹ میں رہنے اور دودھ پینے اور دودھ چھوڑنے کی نوبت آئی، عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کی پیدائش کی حالت بھی گو عجیب ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، مگر آدم عَلَیْہِ السَّلَام کی پیدائش کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب ہوئی کہ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تعجب آگیں ہونے میں دونوں کی پیدائش کی حالت مشترک ہے مگر ایک میں تعجب آگینی کم ہے اور دوسری میں زیادہ کم، عجیب کو زیادہ عجیب سے تشبیہ دی گئی ہے، عمومی ضابطہ تولید کی خلاف ورزی دونوں جگہ ہے لیکن ایک میں کم اور دوسری میں زیادہ، اس بیان سے مادہ خصومت ہی کی بیخ کنی ہو جاتی ہے اور نزاع پیدا کرنے والے کے شبہ کا ہی استیصال ہو جاتا ہے۔ (مظہری)

علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں "پھر جب ان کے لیے فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا یعنی انسان ہو گیا، یہاں (ثم) تراخی زمانی کے لیے ہے، کیونکہ اس نے ان کی پیدائش کو واضح کیا ہے، جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، وہ ایک لمبے زمانے تک گوشت پوست کی صورت میں رہے، ان کے قالب کی پیدائش کے بعد وہ جنت کے دروازے پر چالیس سال یونہی رہے ان میں روح نہیں پھونکی گئی۔ (روح المعانی)

عیسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے درمیان وجوہ مماثلت

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم کی طرح ہے، یہ مماثلت کئی وجوہ سے ہے۔ ① یہ دونوں بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ ② دونوں کلمہ "کن" سے پیدا ہوئے۔ ③ دونوں نبی ہیں۔ ④ دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ ⑤ دونوں کی مخالفت کی گئی حضرت آدم علیہ السلام کی ابلیس نے مخالفت کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہود نے مخالفت کی۔ ⑥ اس مخالفت کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام آسمانوں سے زمین کی طرف آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین سے آسمانوں کی طرف گئے۔ ⑦ حضرت آدم علیہ السلام پھر کامیاب ہو کر جنت میں جائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر کامیاب ہو کر زمین پر آئیں گے۔ ⑧ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے علم کا اظہار فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کے علم کے متعلق فرمایا وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرہ: ۳۱) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علم کے متعلق فرمایا وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران: ۴۸) ⑨ دونوں میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ۔ (الحجر: ۲۹ ص: ۷۲) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: نَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء: ۹۱، التحریم: ۱۲) ⑩ دونوں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں دونوں کھاتے پیتے تھے اور دونوں کے لیے موت مقدر ہے۔ (تبیان القرآن)

علمائے روم کا عیسائیوں سے مباحثہ

بعض علماء کا روم کے عیسائیوں سے مباحثہ ہوا ان سے پوچھا تم عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کیونکہ ان کا باپ نہیں تھا، علماء نے کہا تو پھر حضرت آدم علیہ السلام عبادت کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ ان کے باپ اور ماں دونوں نہیں ہیں، انہوں نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں

کو زندہ کرتے تھے، علماء نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار مردے زندہ کئے ہیں اور حضرت حزقیل علیہ السلام نے آٹھ ہزار مردے زندہ کئے تھے، انہوں نے کہا وہ مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفا دیتے تھے، علماء نے کہا پھر جرجیس علیہ السلام عبادت کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ وہ آگ میں جل جانے کے باوجود صحیح وسالم نکل آئے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی نکلی ہوئی آنکھ دوبارہ لگادی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ایک نابینا، بینا ہو گیا۔ (البحر المحیط، کشاف، تبیان القرآن)

فائدہ * اس آیت سے قیاس کا شرعی حجت ہونا ثابت ہو رہا ہے کیونکہ تخلیق آدم علیہ السلام پر قیاس کرتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کے پیدائش کے جواز پر اللہ نے استدلال کیا ہے (پس مسلمانوں کا وہ گروہ جو صرف قرآن، سنت اور اجماع کو احکام کی علت قرار دیتا ہے اور قیاس کو دلیل حکم نہیں مانتا اس آیت سے اس کے قول کی تردید مستفاد ہوتی ہے) (مظہری)

کن فیکون کی وضاحت

سوال اس آیت میں ہے آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا پھر اس سے فرمایا "کن" (ہو جا) "فیکون" (سو وہ ہو گیا) اس سے معلوم ہوا کہ پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے "کن" فرمایا۔ حالانکہ تخلیق "کن" سے ہی ہوتی ہے۔

جواب ① خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے تخلیق کا ارادہ کیا، پھر فرمایا "کن" تو وہ ہو گئے۔

جواب ② اللہ تعالیٰ نے مٹی سے ایک پتلا بنایا پھر "کن" فرما کر اس میں جان ڈال دی۔

جواب ③ اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر اور وضاحت کی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے کیسے بنایا تو فرمایا ہم نے اس سے "کن" کہا تو وہ ہو گئے خلاصہ یہ ہے کہ لفظ "ثم" تاخیر واقع کے لیے نہیں ہے بلکہ تاخیر بیان کے لیے ہے۔

سوال ② فیکون مضارع کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے "ہوتا ہے یا ہو گا"۔ بظاہر فکان فرمانا چاہیے تھا جس کا معنی ہے ہو گیا؟

جواب اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہے: اے محمد! ﷺ آپ کا رب جس چیز کے لیے "کن" فرماتا ہے وہ لا محالہ ہو جاتی ہے۔

سوال ③ اس آیت میں مذکور ہے پھر آدم علیہ السلام سے فرمایا "کن" تو وہ ہو گئے۔ "کن" فرمانے سے پہلے تو آدم علیہ السلام وجود میں آئے ہی نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا کہ اس سے کہا "کن"؟

جواب "اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں جو آدم علیہ السلام کا وجود علمی تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا تم اب علم تفصیلی اور وجود خارجی میں بھی آجاؤ۔ (کبیر، تبیان القرآن)

آدم علیہ السلام کو کس چیز سے پیدا کیا گیا؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بہت سے پہلوؤں کا ذکر فرمایا ہے، ان کا ذکر امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے، ان کے ساتھ قرآنی آیات کے حوالہ جات بھی پیش کیے ہیں۔

① اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا ہے، جیسا کہ آیت خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ میں ہے۔

② آدم علیہ السلام کو پانی سے پیدا کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا (الْفُرْقَانِ: ۵۴) اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا فرمایا، پھر اس کو نسبی اور سسرالی رشتے عطا کیے۔

③ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو طین (گارے) سے پیدا کیا، ارشاد فرمایا الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ (السَّجْدَةِ: ۷، ۸) اس نے جو چیز بھی پیدا کی، اسے خوب بنایا، اور انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک نچوڑے ہوئے حقیر پانی سے چلائی۔

④ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سلالہ طین (مٹی کا سَت، مٹی کا جوہر، مٹی کا خلاصہ) سے پیدا کیا، ارشاد فرمایا وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ (الْمُؤْمِنُونَ ۱۲، ۱۳) اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے ٹپکی ہوئی بوند کی شکل میں ایک محفوظ جگہ پر رکھا۔

⑤ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو طین لازب سے پیدا فرمایا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ (الصّٰفّٰت: ۱۱) ان کو تو ہم نے چپکتی ہوئی مٹی سے بنایا ہے۔

⑥ آدم علیہ السلام کو صلصال سے پیدا کیا گیا، ارشاد ہے إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ (الحِجر: ۲۸) میں گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔

⑦ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عجل سے پیدا فرمایا، ارشاد ہے خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الأَنبِيَاء: ۳۷) انسان جلد بازی کی خصلت لے کر پیدا ہوا ہے۔

⑧ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کبد سے پیدا فرمایا، ارشاد ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (الْبَلَد: ۴) ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔

مٹی کے مختلف نام

عربی زبان کی وسعت کا انکار تو آج تک نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی ممکن ہے، روئے زمین پر شاید بلکہ یقیناً عربی وہ زبان ہے جس کا دامن بہت ہی وسیع ہے، دنیا کی کسی زبان میں یہ وسعت نہیں ہے، جس طرح کا ذخیرہ الفاظ عربی کے دامن میں موجود ہے دوسری کسی زبان کا دامن اس سے خالی ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم میں مٹی کے چند نام ذکر فرمائے ہیں، جب کہ نام تو اور بھی کافی تھے۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

① اَلصَّعِيدُ: سطح زمین والی مٹی ② اَلثَّرٰی: گیلی مٹی ③ اَلرَّغَامُ: ریتلی مٹی ④ اَلعَفَاءُ، اَلعَفَرُ: وہ مٹی جو نشانات کو مٹا دیتی ہے ⑤ اَلمُورُ: وہ مٹی جسے ہوا اڑا کر لے جاتی ہے ⑥ اَلهَبَاءُ: وہ مٹی جسے ہوا اڑاتی ہے اور انسانی چہروں، جسموں اور کپڑوں پر دیکھی جاتی ہے، باریک گرد، مٹی کے باریک ذرّات جو ہوا سے اڑ کر چیزوں کو لگ جاتے ہیں، ہوا میں پھیلے ہوئے باریک ذرّات۔ ⑦ اَلدُّمَّاءُ، اَلرَّاهِطَاءُ: وہ مٹی جسے چوہا اندر سے نکال کر اپنے بل کا راستہ اس سے بند کرتا ہے۔ ⑧ اَلجُرثُومَةُ: وہ مٹی جسے چیونٹی اپنی بستی کے قریب جمع کرتی ہے ⑨ اَلنَّبِيثَةُ: وہ مٹی جو کنویں کی کھدائی کے وقت نکلتی ہے ⑩ اَلدَّمَالُ، السَّمَادُ: وہ مٹی جس کے ساتھ کھاد ملا کر پودوں کو ڈالی جاتی ہے۔ ⑪ البَوْغَاءُ والدَّقْعَاءُ: مٹی، وہ زمین جس میں گھاس نہ ہو، بنجر زمین، وہ باریک غبار جو ریت کے ذرّات

کی طرح ہوتی ہے۔ ⑫ السَّافِيَاءُ: وہ باریک دھول جو ہوا کے ساتھ زمین کے اندر جاتی ہے۔ (فقہ اللغۃ سر العربیۃ، القاموس الوحید) ⑬ اَلْهَابِي: باریک اڑنے والی مٹی، موضع هابي التراب وہ جگہ جہاں سے مٹی اڑتی ہو یا جس کی مٹی بہت باریک ہو، قبر کی مٹی، غبار میں چھپا ہوا ستارہ۔ ⑭ اَلْحَفْرُ: کھدائی کی ہوئی جگہ سے نکلی ہوئی مٹی۔ ⑮ اَلْقَعْسُ: سڑی ہوئی مٹی، بدبودار مٹی۔ ⑯ اَلْحَاثِيَاءُ: چوہے کے بل کی مٹی۔ ⑰ اَلْحَثْوَةُ: مٹی کی بھری ہوئی مٹھی۔ ⑱ اَلدَّرْمَكُ: ملائم مٹی۔ ⑲ اَلْغَوْلُ: بہت زیادہ مٹی۔ ⑳ اَلْمَسْنُونُ: بدبودار مٹی، سڑا ہوا کیچڑ۔

ان میں سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کے لیے استعمال ہونے والی مٹی اَلْمَسْنُونُ ہے، آدم علیہ السلام کی تخلیق میں استعمال ہونے والی مٹی کے نام قرآنی آیات میں موجود ہیں۔

غبار کے مختلف نام

علاوہ ازیں مٹی کی ایک وہ قسم ہے جسے غبار کہا جاتا ہے، اس کے لیے بھی عربی زبان میں کئی نام استعمال کیے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے ① اَلنَّقْعُ وَالعَكُوبُ: وہ غبار جو گھوڑوں کے ٹاپوں اور اونٹوں کے کھروں سے اڑتی ہے۔ ② اَلعَجَاجَةُ: وہ غبار جسے ہوا اڑاتی ہے۔ ③ اَلرَّحَتِّيُ وَالقَسْطَلُ: میدان کارزار میں اُڑنے والی غبار۔ ④ اَلخَيْضَعَةُ: معرکہ آرائی کے دوران اڑنے والی غبار۔ ⑤ اَلعِثْيَرُ: قدموں کے باعث اٹھنے والی غبار۔ ⑥ اَلمَنِينُ: بکھرے ہوئے گرد و غبار۔ (فقہ اللغہ، القاموس الوحید) ⑦ اَلهَيُولُ: وہ باریک اُڑتے ہوئے ذرّات جو روشن دان سے سورج کی روشنی اندر داخل ہونے کے دوران دکھائی دیتے ہیں۔ ⑧ اَلهَبَابُ: گرد و غبار، اَلهَبَّابُ: بہت گرد و غبار اُڑانے والی ہوا، آندھی۔ ⑨ اَلهَبَوَةُ: گرد و غبار، ذرّہ خاک۔

مٹی کے اوصاف

مٹی کے مختلف اوصاف ہیں، اس کی مختلف خاصیات ہیں، ملاحظہ فرمائیے

① اَلصَّلْصَالُ: خشک مٹی، کھنکھناتی مٹی، بجنے والی مٹی۔ ② اَلفَخَّارُ: آگ میں پکائی گئی مٹی، آگ میں پکا کر بنائے جانے والے مٹی کے برتن، ٹھیکری، ٹھیکرا، پکائی ہوئی مٹی۔ ③ اَللَّازِبُ: لیس دار مٹی، چپکنے والی مٹی، تر مٹی یا گارے کا لیس دار ہونا۔ ④ اَلحَمَأُ: جو پانی کی رنگت بدل ڈالے اور اسے خراب

کردے۔ کیچڑ، بدبودار مٹی، الحمأۃ سڑی ہوئی کالی مٹی۔ (مٹی کے یہ چار نام وہ ہیں جو تخلیق آدم کے بیان میں ذکر کیے گئے ہیں)

⑤ الشَّأْطَةُ الثُّرْمُطَةُ الطَّثْرَةُ: بدبودار کیچڑ، کیچڑ کو جب پانی ڈال کر بڑھا دیا گیا ہو تو اس وقت یہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، ایسے موقع پر بولتے ہیں جب ایک خرابی کے ساتھ دوسری خرابی پیدا ہو جائے۔ (القاموس الوحید) کیچڑ۔ الثُّرْمُطَةُ دلدل، گیلی مٹی۔ الطَّثْرَةُ کیچڑ، کائی، گندہ پانی۔

⑥ الرِّدَاغُ: بہت زیادہ کیچڑ والی جگہ۔ ⑦ الوَحَلُ: وہ دلدل اور کیچڑ جس میں جانور داخل ہوں تو پھنستے ہی چلے جائیں، نکلنا مشکل ہو جائے۔ ⑧ الرَّدْغَةُ والرَّزَغَةُ: بہت زیادہ کیچڑ۔ جب کیچڑ میں جانور وغیرہ بہت زیادہ پھنستے جائیں۔ ⑨ الوَرْطَةُ: مویشی کا کیچڑ میں اس طرح داخل ہونا کہ اس سے نکلنا مشکل ہو۔ انسان کسی ایسی پریشانی میں پھنسے جہاں سے اس کے لیے نکلنا مشکل ہو جائے تو اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ⑩ الغَضْرَاءُ: اس زمین کو کہا جاتا ہے جس میں ہرے رنگ کی خالص چکنی مٹی ہو۔ ⑪ السَّیَاعُ: جب مٹی کے ساتھ تنکے وغیرہ خلط ملط ہو گئے ہوں تو اسے السیاع کہتے ہیں۔

⑫ اَلْمِلَاطُ: دیوار لیپنے کا گارا، پلاسٹر، مسالہ، چنائی میں دو اینٹوں یا دو پتھروں کے درمیان کا گارا۔

مٹی گارے کے لیے عربی زبان میں استعمال ہونے والے ان الفاظ کو یہاں لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی تاکہ قرآن کریم میں تخلیق آدم علیہ السلام کے لیے استعمال کیے گئے مٹی گارے اور دوسرے مٹی گارے کے بارے میں اچھی طرح فرق معلوم ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے اس قدر اقسام مٹی و گارے سے اگر چند اقسام کا چناؤ کیا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت کار فرما ہے۔

آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنانے میں حکمت

حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کرنے میں کئی وجوہات اور حکمتیں ہیں، ① تاکہ وہ علیہ السلام متواضع اور عاجز رہیں، چونکہ مٹی کی خاصیت میں عجز وانکسار ہے۔ ② تاکہ آپ علیہ السلام پر دہ داری کرنے والے ہوں، کیونکہ مٹی دوسری چیزوں کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ ③ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کا خلیفہ بنانا تھا، ارشاد ہے إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (الْبَقَرَة: ۳۰) اس لیے ان کو مٹی کا بنایا گیا

تاکہ ان کی مٹی کے ساتھ قوی مناسبت ہو۔

④ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے کیونکہ عناصر اربعہ میں سب سے روشن آگ ہے اللہ تعالیٰ نے آگ سے شیاطین کو پیدا کیا اور انہیں گمراہی کے اندھیروں میں مبتلا کر دیا اور سب سے لطیف ہوا ہے، (ایک قول کے مطابق) فرشتوں کو ہوا سے پیدا کیا اور ان کو انتہائی شدت اور قوت عطا فرمائی اور پانی جو بہت رقیق ہے اس سے آسمانوں کو پیدا کیا اور ان کو فضاء میں معلق کر دیا اور آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا جو عناصر اربعہ میں سب سے کثیف ہے، تاریک اور نچلے درجہ میں تھی اور اس کو اپنی معرفت، ہدایت، نورانیت اور محبت عطا فرمائی اور آسمانوں کو سمندر کی موجوں سے پیدا فرمایا اور اسے ہوا میں معلق باقی رکھا تاکہ ان عناصر کی پیدائش ایک واضح اور کھلی دلیل بن جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی بلا احتیاج مدبر اور خالق بلا شرکت غیرے ہے۔

⑤ انسان کو مٹی سے بنایا تاکہ وہ اس مٹی سے شہوت، حرص اور غضب کی آگ کو بجھا سکے، کیونکہ یہ ایسی آگیں ہیں جو مٹی کے بغیر بجھائی نہیں جا سکتیں، اسے پانی سے پیدا کیا تاکہ چیزوں کی صورتیں اس میں مجلّی اور مصفّی دکھائی دیں، پھر اللہ تعالیٰ نے پانی اور مٹی کو ملایا تاکہ وہ کثیف ہو کر طین (مٹی) بن جائے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت یہود کی افترا بازیوں، بہتان تراشیوں اور نصاریٰ کی مبالغہ آرائیوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی، قرآن نے یہ سارے پردے ہٹا دیئے، ان کی اور ان کی والدہ کی طہارت و پاکیزگی، ان کی عجیب و غریب پیدائش، ان کے حیران کن معجزات بھی بیان کر دیئے اور ان کا بندہ ہونا بھی ثابت کر دیا، اب اس پر یہ کہہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ وہ سچی حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے، اس لیے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ میں خطاب یا تو قرآن کے ہر پڑھنے سننے والے کو ہے یا خطاب حضور کریم ﷺ کو ہے اور مراد حضور ﷺ کی امت ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کی اپنی ذات شک وشبہ سے بالاتر تھی، اَلْخِطَابُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ وَالْمُرَادُ اُمَّتُهٗ لِاَنَّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ شَاكًّا فِيْ اَمْرِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ (قرطبی، ضیاء القرآن)

آیتِ مباہلہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ {۶۱} آل عمران

جواب ترجمہ: پھر جو کوئی آپ سے اس واقعہ میں جھگڑے بعد اس کے کہ آپ کے پاس صحیح علم آ چکا ہے تو آپ کہہ دیں کہ آؤ ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں بلائیں پھر سب التجا کریں اور اللہ کی لعنت ڈالیں ان پر جو جھوٹے ہوں۔

شانِ نزول: نبی کریم ﷺ نے جب عیسائیوں کے نجرانی وفد پر واضح کیا کہ تم لوگ اسلام اس لیے قبول نہیں کر رہے ہو کہ تمہیں تین چیزیں روکتی ہیں، ① صلیب کی پرستش ② خنزیر کا کھانا ③ تمہارا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنا، یہ باتیں اسلام میں منع ہیں مگر تم انہیں چھوڑ نہیں سکتے، اس پر آیت اِنَّ مَثَلَ عِيسىٰ عِندَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ اُتری، اس پر نصرانی وفد نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ ﷺ کیا کہتے ہیں، گویا انہوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا، اس پر یہ آیت (۶۱) نازل ہوئی۔ (درمنثور)

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ: یعنی نصاریٰ میں سے جو شخص آپ ﷺ کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت جھگڑا کرے، باوجودیکہ اسے پتہ چل چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی شان کیا ہے، ان کا مرتبہ اور مقام کیا ہے، اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ کیا ہے؟ وہ اللہ کا کلمہ ہیں، وہ کن کے لفظ سے پیدا کیے گئے، وہ اللہ کی قدرت کا شاہکار عظیم ہیں، وہ مقدس عورت کے بیٹے ہیں، انہیں آغوش مادر میں کلام کرنے کی سعادت ملی، انہیں بنی اسرائیل کا آخری تاجدارِ نبوت بنایا گیا، ان پر آسمانی کتاب انجیل نازل کی گئی، انہیں تورات کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا، انہیں یہود بے بہبود کے قہر و ظلم سے محفوظ رکھا گیا، یہودی سازش کے تحت انہیں لقمہ اجل بننے سے بچایا گیا، انہیں جبریل علیہ السلام کی معیت میں آسمان پر اٹھایا گیا، انہیں بے شمار خوبیوں سے نوازا گیا، مگر وہ ابن اللہ (اللہ کے بیٹے) ہرگز نہیں

ہیں، یہ سب کچھ یہ لوگ جانتے تھے، ان باتوں کا انہیں اچھی طرح علم ہو چکا ہے، انہیں نبی کریم ﷺ نے بھی واضح طور پر بتادیا، انہیں قرآن کریم کی مختلف آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناقب سنائے گئے، سورۃ مریم کی آیات میں مریم اور ابن مریم علیہما السلام کا تذکرہ کیا گیا، سورۃ آل عمران کی ابتدائی تراسی آیات میں حق وصداقت کا بیان کیا گیا، جن سے کسی دانا اور بینا کو کسی درجہ میں شک وشبہ نہیں ہو سکتا، اس کے باوجود اگر یہ لوگ پس وپیش کریں، بال کی کھال اتاریں اور حق کا انکار کریں تو ایسی صورت میں پھر یا تو میدان کارزار سجایا جائے، جس میں تلواریں ٹکرائیں، ان کی دھاروں سے خون کے فوّارے پھوٹیں، ان کے خون کی رنگینی سے دھرتی لالہ زار بنائی جائے، یا پھر بغیر تیغ وتفنگ کھلے میدان میں نکل کر ایک دوسرے کے خلاف بد دعائیہ کلمات ادا کیے جائیں، جس کے نتیجہ میں وہ مجیب الدعوات اپنا فیصلہ صادر کر دے۔

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ: میرے حبیب! جب عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ ﷺ کے پاس درست معلومات آچکی ہیں، تو آپ ﷺ نجرانی عیسائیوں کے اس وفد سے جنہوں نے آپ ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث چھیڑی ہے کہ وہ اللہ کے بندے نہیں تھے بلکہ وہ ابن اللہ تھے، تو ان سے فرمایئے کہ پھر تم لوگ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم بھی آئیں اور تم بھی آؤ سب اکٹھے ہو کر بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑائیں۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ: پھر ہم یکجا ہو کر مباہلہ کریں اور اللہ کی بارگاہ میں زاری کریں، گڑگڑائیں کہ وہ جھوٹوں کو ہلاک وبرباد کرے، جب آپ ﷺ نے یہ آیت نجرانی وفد کے سامنے تلاوت کی تو انہوں نے مہلت طلب کی کہ ہم واپس ہوتے ہیں اور اور اس معاملے کو دیکھتے ہیں، پھر ہم لوگ کل آپ ﷺ کی خدمت میں آئیں گے، وہ صبح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس وقت آئے جب رحمت دوعالم ﷺ نے حضرت حسین کو اپنے گلے سے لگایا ہوا تھا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ہاتھ سے تھاما ہوا تھا، فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ چل رہی تھیں اور علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ در منثور میں نقل کی گئی ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے حسن وحسین کو اپنی

چادر میں لپیٹا ہوا تھا، جب کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے چل رہی تھیں، یہ آیت مبارکہ اتری تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ، حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور یوں اللہ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اے میرے اللہ! یہ میرے گھر کے لوگ ہیں۔ (ترمذی) یہ آیت آیتِ مباہلہ کہلاتی ہے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر نجرانی وفد کے لوگ خوف زدہ ہوئے تھے۔

مباہلہ کی تعریف

لفظ مباہلہ بُہلَۃٌ اور بَہلَۃٌ سے ہے، جس کا معنیٰ ہے لعنت کرنا، بَہلَۃُ اللہِ کا معنیٰ اللہ کی لعنت اِبتِہَالٌ باب افتعال سے ہے، اس کا معنیٰ تضرع کرنا، گڑگڑانا، لفظ مباہلہ یہ باب مفاعلہ سے ہے، جس کا معنیٰ دو فریقوں کا ایک دوسرے پر لعنت یعنی بددعا کرنا مطلب یہ ہے کہ جب دو فریقوں میں کسی معاملے کے حق یا باطل ہونے میں اختلاف ہو اور دلائل سے وہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو تو دونوں بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا کریں کہ یا اللہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے اس پر لعنت فرما، اس کے بعد مباہلہ کا لفظ مطلق دعا کے لیے مشہور ہو گیا، ابتہال و تضرع کا لفظ عربی میں دعاوزاری کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں اسی معنیٰ میں ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ (معارف القرآن۔ مباہلہ مؤلفہ علی اکبر)

آیت مباہلہ کا پس منظر

اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ ۹ ہجری میں نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو وہ غلو آمیز عقائد رکھتے تھے اس پر مناظرہ کرنے لگا، بالآخر یہ آیت نازل ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ (تفسیر مکہ)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر در منثور میں ایک روایت میں اس کا پس منظر یہ بیان کرتے ہیں "بیہقی نے دلائل میں سلمہ بن عبد یشوع رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے اور وہ اپنے باپ دادا سے روایت کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سورۃ طس" نازل ہونے سے پہلے اہل نجران کی طرف خط لکھا: بِسْمِ اللّٰہِ اِلٰہِ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْب مِن مُّحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰہِ اِلٰی اُسْقُفِ نَجْرَانَ وَاَھْلِ نَجْرَانَ اِنْ اَسْلَمْتُمْ فَاِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَیْکُم اللّٰہَ اِلٰہَ اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْب اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ اَدْعُوْ کُم اِلٰی عِبَادَۃِ اللّٰہِ مِنْ عِبَادَۃِ العِبَادِ وَاَدْعُوْ کُم اِلٰی وِلَایَۃِ العِبَادِ فَاِنْ اَبَیْتُمْ فَالْجِزْیَۃ

وَاِنْ اَبَیْتُمْ فَقَدْ اٰذَنْتُکُمْ بِالْحَرْبِ وَالسَّلَامُ ۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو معبود ہے ابراہیم کا اسحاق کا اور یعقوب کا محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اسقف نجران اور اہل نجران کی طرف اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو بہتر ہے بلاشبہ میں تمہاری طرف اس اللہ کی تعریف کرتا ہوں جو معبود ہے ابراہیم اسحاق اور یعقوب کا امابعد میں تم کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں بندوں کی عبادت سے اور میں تم کو اللہ کی بادشاہت کی طرف بلاتا ہوں بندوں کی حکمرانی سے اگر تم انکار کرو (میری دعوت کا) تو جزیہ ادا کرو اور تم اس کا بھی انکار کرو تو پھر میں تمہارے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہوں۔ "والسلام"۔

جب اُسقف نے اس خط کو پڑھا تو وہ اس کی وجہ سے مشکل میں پڑ گیا اور سخت خوف زدہ ہو گیا اس نے اہل نجران میں سے ایک آدمی کو بلایا جس کو شرجیل بن وراعہ کہا جاتا تھا اس نے نبی اکرم ﷺ کا خط اس کو دیا اس نے اس کو پڑھا اور اسقف نے اس کو کہا تیری کیا رائے ہے؟ شرجیل نے کہا تو جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے نبوت عطا فرمائے گا سو لوگ ایمان لائیں گے اگر یہ وہی آدمی ہے نبوت کے بارے میں میری کوئی رائے نہیں اگر دنیا کے کام میں رائے ہوتی تو میں اس بارے میں تجھ کو مشورہ دیتا اور تیرے لیے کوشش کرتا، اُسقف نے اہل نجران کی طرف باری باری پیغام بھیجا تو ہر ایک نے شرجیل کی طرح جواب دیا آخر سب کی رائے یہ ہوئی کہ شرجیل بن وراعۃ عبداللہ بن شرجیل اور جبار بن فیض کو بھیجو تاکہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خبر لے آئیں یہ وفد روانہ ہوا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گیا آپ نے ان سے سوال کیا اور انہوں نے آپ ﷺ سے کہا آپ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج ان کے بارے میں میرے پاس کوئی چیز نہیں تم (میرے پاس) ٹھہرے رہو، یہاں تک کہ میں تم کو کل صبح تک بتادوں گا جو کچھ مجھے ان کے بارے میں بتایا جائے گا تو (اس پر) اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ سے لے کر فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکٰذِبِیْنَ تک تو انہوں نے اس آیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جب رسول اللہ ﷺ نے کل (پھر) صبح فرمائی ان کو یہ خبر دینے کے بعد آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے (در منثور)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نصاریٰ نجران اس قدر سمجھانے پر بھی اگر قائل نہ ہوں تو ان کے ساتھ "مباہلہ" کرو جس کی زیادہ مؤثر اور مکمل صورت یہ تجویز کی گئی کہ دونوں فریق اپنی جان سے اور اولاد سے حاضر ہوں اور خوب گڑگڑا کر دعا کریں کہ جو کوئی ہم میں جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت اور عذاب پڑے۔ یہ "مباہلہ" کی صورت پہلے ہی قدم پر اس بات کا اظہار کر دے گی کہ کون فریق کس حد تک خود اپنے دل میں اپنی صداقت و حقانیت پر وثوق و یقین رکھتا ہے۔ چنانچہ دعوت "مباہلہ" سُن کر وفد نجران نے مہلت لی کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے جواب دیں گے، آخر مجلس مشاورت میں ان کے ہوشمند تجربہ کار ذمہ داروں نے کہا کہ اے گروہِ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور حضرت مسیح کے متعلق انہوں نے صاف صاف فیصلہ کن باتیں کہی ہیں تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں، پس ایک نبی سے مباہلہ وملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب الٰہی سے نہ بچے اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے، بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں، کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں۔

یہی تجویز پاس کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن، حسین، فاطمہ، علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لئے باہر تشریف لا رہے تھے، یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے، ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا، آخر انہوں نے مباہلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا، ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔ (تفسیر عثمانی)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "قرآن نے یہ نہیں بتلایا کہ مباہلہ کی صورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اختیار کی جاسکتی ہے اور یہ کہ مباہلہ کا اثر

کیا ہمیشہ وہی ظاہر ہونا چاہیے جو آپ ﷺ کے مباہلہ میں ظاہر ہونے والا تھا۔(عثمانی) ہمارے بزرگوں میں سے محقق فرماتے ہیں کہ مباہلہ اب بھی جائز ہے، مگر بعض فرماتے ہیں کہ مباہلہ حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا، اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی دوسرا شخص مباہلہ کرے گا، تو اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہوسکتے، جو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں ہوتے، تاہم اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے۔(معالم العرفان)

روافض کے استدلال کا جواب

اس آیت میں ابناءنا سے مراد صرف اولاد صلبی نہیں ہے بلکہ عام مراد ہے خواہ اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو، کیونکہ عرفاً ان سب پر اولاد کا اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا ابناءنا میں آپ ﷺ کے نواسے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور آپ ﷺ کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں، خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابناءنا میں داخل کرنا اس لیے بھی صحیح ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے تو پرورش بھی حضور ﷺ کی آغوش میں پائی تھی، آپ ﷺ نے ان کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا اور آپ رضی اللہ عنہ کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا، ایسے بچے پر عرفاً بیٹے کا اطلاق کیا جاتا ہے، اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولاد میں داخل ہیں، لہٰذا روافض کا آپ کو اَبنَاءَنَا سے خارج کرکے اور اَنفُسَنَا میں داخل کرکے آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔(معارف القرآن)

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں، روافض (اہل تشیع) اس آیت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں اَبنَاءَنَا سے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں اور نِسَاءَنَا سے حضرت فاطمہ اور اَنفُسَنَا سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں تو ثابت ہوا کہ حضرت علی عین رسول اللہ اور رسول اللہ کی طرح مسلمانوں کے جان ومال میں تصرف کے حق دار ہیں کما قال تعالیٰ، اَلنَّبِیُّ اَولٰی بِالمُومِنِینَ مِن اَنفُسِھِم اور جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ تصرف کا حق دار ہو وہی ان کا امام اور خلیفہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ اَنفُسَنَا سے خاص حضرت امیر رضی اللہ عنہ مراد نہیں بلکہ جماعت مومنین مراد ہے جو دین اور ملت میں آپ ﷺ کے رفیق ہیں جیسا کہ وَاَنفُسَکُم سے کافروں کی جماعت مراد ہے اور یہ

مطلب نہیں کہ یہ سب نصاری آپس میں ایک دوسرے کے عین ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک دین اور ایک ملت میں سب شریک ہیں اور قریب اور شریک دین اور رفیق ملت کے لیے لفظ نفس کا استعمال قرآن میں شائع اور ذائع ہے اور کَمَا قَالَ تَعَالیٰ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ، وَلَا تَلْمِزُوا اَنْفُسَكُمْ لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالَ تَعَالیٰ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ وَقَالَ تَعَالیٰ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ، چونکہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو نسب اور قرابت اور مصاہرت اور اتحاد فی الدین والملت کی وجہ سے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص اِتصال تھا اس لیے لفظ نفس سے تعبیر کر دیا گیا اس تعبیر سے اتحاد اور عینیت اور مساوات کا گمان کرنا خیال باطل ہے ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صفات میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہو جائیں اور یہ امر فریقین کے نزدیک باطل ہے اس لیے کہ اگر اَنفُسَنَا کا یہ مطلب ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سراسر عین رسول ہیں اور تمام صفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہیں تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اور رسول بھی ہوں اور خاتم النبیین اور تمام جن وانس کی طرف مبعوث بھی ہوں اور تمام انبیاء ومرسلین کے سردار بھی ہوں نیز لازم آئے گا کہ معاذ اللہ جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح بھی درست نہ ہو غرض یہ کہ انفسنا کے لفظ سے تمام صفات میں مساوی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

البتہ بعض صفات میں شرکت اور موافقت مفہوم ہوتی ہے اور بعض صفات میں شرکت مفید مدعا نہیں اس لیے محققین شیعہ بھی اس کے قائل ہوئے ہیں یہ آیت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی محض ایک گونہ فضیلت پر دلالت کرتی ہے افضیلت اور امامت اور خلافت بلافصل سے آیت کا ذرّہ برابر تعلق نہیں اور یہی اہل سنت والجماعت کہتے ہیں اور نساء کے معنی عورتوں کے ہیں اس کا اطلاق عام طور پر زوجہ بیوی پر ہوتا ہے جیسا کہ یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ میں بالاتفاق زوجہ کے معنی مراد ہیں لہٰذا نساء کے لفظ سے بیٹی کے معنی مراد لینا اور یہ کہنا کہ نِسَاءَ نَا سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں لغت اور عرف کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں اور علی ہذا اَبنَاءُ نَا سے نواسوں کا مراد ہونا معنی حقیقی نہیں بلکہ معنی مجازی ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی بیٹا نہ تھا مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ اور معنی مجازی کے لحاظ سے لفظ اَبنَاءَ

نَا حسنین رضی اللہ عنہما کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بھتیجوں اور بھانجوں کو بھی شامل ہے۔(معارف القرآن لکاندھلوی)

مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ میں سے بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا، حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کو لے کر نکلے۔ شیعہ حضرات اس ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت یہی افراد ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی اہل بیت میں شامل نہیں ہے، حالانکہ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی شامل ہیں، مگر سب کو اس موقع پر لانا ضروری نہیں تھا، یہ تو دعا کا مقام تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چند افراد کو لے کر فوراً نکل آئے، تاہم مذکورہ روایت میں واقعہ کی پوری تفصیل موجود نہیں ہے۔

ابن عساکر رحمہ اللہ بہت بڑے مؤرّخ گزرے ہیں، جنہوں نے بڑی مستند تاریخ لکھی ہے، وہ امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے اور وہ اپنے والد امام محمد باقر رحمہ اللہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے تشریف لائے تو ان کے ساتھ حضرات ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ، عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ علی المرتضی رضی اللہ عنہ اور ان سب کی اولاد بھی تھی، یہ روایت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے در منثور میں اسی طرح بیان کی ہے اور یہی روایت تفسیر روح المعانی میں بھی موجود ہے، تاہم پہلی مذکورہ روایت میں باقی تین حضرات اور ان کی اولاد کا ذکر نہیں ہے دونوں روایات کو جمع کرنے سے پوری صورت حال سامنے آجاتی ہے۔

شیعہ حضرات تو حقائق کو اس حد تک مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی دوسری بیٹی کو تسلیم ہی نہیں کرتے حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین صاحبزادیاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ تھیں جو واقعہ مباہلہ سے قبل فوت ہو چکی تھیں، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ۲ھ میں فوت ہوئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے لیے تشریف لے گئے تو رقیہ رضی اللہ عنہا مدینہ میں فوت ہو گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکے، بدر سے واپس آکر ان کی قبر پر جا کر دعا کی، اس کے بعد ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا، مگر کچھ عرصہ بعد وہ بھی وفات پا گئیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ۸ھ میں فوت ہوئیں، اس کا

ذکر احادیث میں موجود ہے، واقعہ مباہلہ ۹ ھ یا ۱۰ ھ میں پیش آیا، جب کہ آپ ﷺ کی تین صاحبزادیاں ۸ ھ تک فوت ہو چکی تھیں، مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ شیعہ سوائے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آپ ﷺ کی کسی اور صاحبزادی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

ان حضرات کا معتبر مصنف ملا باقر مجلسی اپنی کتاب حیات القلوب میں لکھتا ہے کہ جب حضور ﷺ مباہلے کے لیے نکلے تو مہاجرین اور انصار سب آپ ﷺ کے ساتھ تھے، قرآن پاک نے ازواج مطہرات کو صریحاً اہل بیت فرمایا ہے خود حضور ﷺ نے ایک موقع پر ازواج کو اہل بیت میں شریک کیا تھا، لہٰذا شیعوں کا عقیدہ باطل ہے۔ (معالم العرفان)

مباہلہ نہیں صلح

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ {٦٢} فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ {٦٣} آل عمران

جواب ترجمہ: یہی واقعات کا سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور بلاشبہ اللہ ہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ پھر بھی اگر وہ نہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ بگاڑ کرنے والوں سے خوب واقف ہے۔

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: قرآن کریم میں یہاں جس قدر دلائل وبراہین بیان کیے گئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی پاکیزہ ماں کا تذکرہ کیا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا بیان کیا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول بتایا گیا، اللہ تعالیٰ کی قدرتیں بیان کی گئیں، یہ سب واقعات اور قصص حق اور سچ ہیں، ان قصص وواقعات کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ عبادت کے لائق اور مستحق ایک ہی ذات حق ہے، یہاں نصاریٰ کے خود ساختہ عقائد ونظریات کے پیش نظر ایسا اسلوب کلام پیش کیا گیا کہ انسانی عقل محو حیرت رہ جاتی ہے، دو جملوں میں نصاریٰ کے نظریات وافکار ضالہ کا بطلان کر دیا، جب فرمایا کہ غلبہ والا اللہ ہی ہے، حکمت والا اللہ ہی ہے۔

آیت کریمہ کے آخری جملوں میں نصاریٰ کا رد ہے، انہیں بتلایا جارہا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنے، بیماروں کو شفا دینے کے باعث وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو کہیں ابن اللہ کہتے ہیں، کہیں اللہ کہتے ہیں، سارے اختیارات کا مالک انہیں جانتے ہیں، ان پر واضح کیا گیا کہ ان چند معجزات کے ظہور کی وجہ سے کسی کو خدائی اختیارات کا مالک نہیں سمجھا جاسکتا، نہ ہی وہ ان معجزات کے ظہور کی وجہ سے خدا کہلا سکتے ہیں، جب کہ نصاریٰ کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام یہودیوں کے خوف وڈر کی بناء پر بھاگتے پھرتے تھے، یہودیوں نے انہیں قتل کر دیا تھا، جب کہ اللہ تعالیٰ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا، اللہ اسے کہتے ہیں جس کا ساری کائنات پر غلبہ ہے، اسی کی قدرت کاملہ سے نظام کائنات جاری وساری ہے۔

پھر نصاریٰ کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو یہ بتاتے تھے کہ تم کیا کھا کر آئے ہو اور کیا چیز تم گھروں میں چھوڑ آئے ہو، یعنی حضرت مسیح علیہ السلام غیب دان تھے، اس وجہ سے وہ انہیں الٰہ اور خدا کہتے تھے، انہیں بتایا گیا کہ اس قدر علم سے کوئی خدا نہیں ہو سکتا، بلکہ اللہ وہ ہے جو تمام معلومات اور تمام کاموں کے انجام سے باخبر ہو، ماضی، حال اور مستقبل اس کے علم سے باہر نہ ہو، واضح فرمادیا کہ اللہ کے برابر کوئی نہیں ہے، اس کی قدرتیں کامل اور تام ہیں، اس کی حکمت بالغہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا، جب اس کے کمالات کی ابجد تک کوئی نہیں پہنچ سکتا تو خدا کیسے ہو سکتا ہے؟

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے پیاروں کو لے کر مباہلہ کے لیے ظاہر ہوئے تو ان انفاس قدسیہ کو دیکھ کر سمجھدار پادری سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ مباہلہ کرنا ہماری تباہی وبربادی کا پیام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیاروں سے فرمایا کہ جب میں دعا کروں تو تم لوگ آمین کہنا یہ منظر دیکھ کر نصاریٰ نجران کا پوپ کہنے لگا کہ اے نصرانیو! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر اللہ سے یہ سوال کریں کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹادے تو ضرور ہٹادے گا لہٰذا تم مباہلہ نہ کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک رُوئے زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا یہ سن کر کہنے لگے کہ اے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری رائے یہ ہے کہ ہم مباہلہ نہ کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے دین پر چھوڑ دیں اور ہم اپنے دین پر رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہیں مباہلہ سے انکار ہے تو اسلام قبول

کرو اسلام قبول کرنے پر تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور تمہاری وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مسلمانوں کی ہیں انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہو گی وہ کہنے لگے کہ ہمیں جنگ کی طاقت نہیں ہم آپ ﷺ سے صلح کر لیتے ہیں۔

اور وہ یہ کہ ہر سال دو ہزار جوڑے کپڑوں کے پیش کیا کریں گے، ایک ہزار ماہ صفر میں اور ایک ہزار ماہ رجب میں، آپ ﷺ نے ان سے اس بات پر صلح کر لی اور فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اہل نجران پر عذاب منڈلا رہا تھا اگر وہ مباہلہ کر لیتے تو مسخ کر دیئے جاتے اور بندر اور خنزیر بنا دیئے جاتے اور ان کے سارے علاقے کو آگ جلا کر ختم کر دیتی اور نجران کے لوگ بالکل ختم ہو جاتے یہاں تک کہ پرندے بھی درختوں پر نہ رہتے اور ایک سال بھی پورا نہ ہوتا کہ تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ سے مباہلہ کرنے کو تیار ہو رہے تھے اگر مباہلہ کے لیے نکل آتے تو (میدان مباہلہ سے) اس حال میں واپس ہوتے کہ مال پاتے اور نہ ہی اہل و عیال میں سے کسی کو پاتے (اور خود بھی مر جاتے) نصاریٰ مباہلہ کے لیے راضی نہ ہوئے اور اپنے باطل دین پر قائم رہے اور یہ جانتے ہوئے کہ محمد عربی ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں ایمان نہ لائے اور ایمان سے روگردانی کر بیٹھے اور آج تک ان کا یہی طریقہ ہے حضرات علماء کرام نے بارہا مناظروں میں شکست دی ہے، ان کی موجودہ انجیل میں تحریف ثابت کی ہے ان کے دین کو مصنوعی خود ساختہ دین بارہا ثابت کر چکے ہیں لیکن وہ اپنے دنیاوی اغراض سیاسیہ اور غیر سیاسیہ کی وجہ سے دین اسلام کو قبول نہیں کرتے اور دنیا بھر میں فساد کر رہے ہیں جس وقت رسول اللہ ﷺ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی تھی اس وقت سے لے کر آج تک ان کا یہی طریقہ رہا ہے اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ کہ اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جاننے والا ہے، یہ وعید اس وقت سے لے کر آج تک کے نصاریٰ کو اور آج کے بعد جو نصاریٰ حق سے اعراض کریں گے قیامت تک ان سب کو شامل ہے۔ (انوار البیان، ابن کثیر، احمد)

شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " اگر نہ دلائل سے مانیں نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ اِحقاقِ حق مقصود نہیں نہ دل میں اپنے عقائد کی صداقت پر وثوق ہے، محض فتنہ و فساد پھیلانا ہی پیش نظر ہے تو خوب سمجھ لیں کہ سب مفسدین اللہ کی نظر میں ہیں۔ (عثمانی)

اہل کتاب کو دعوتِ توحید

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ {۶۴} آل عمران

جواب ترجمہ: آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے (وہ یہ) کہ ہم صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنالے پھر اگر وہ نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ: نجرانی نصاریٰ کا جو وفد رحمت دوعالم ﷺ کے ساتھ بحث مباحثہ کرنے کے لیے آیا تھا یہ اسے خطاب کیا جارہا ہے۔

تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ: تم ایک ایسے کلمہ کی طرف آجاؤ، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، جس میں انبیاء اور رسل بھی متحد تھے اور اللہ کی مخلوق بھی متحد ہے۔

صاحب "بصیرتِ قرآن" اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں "یہود اور نصاریٰ دونوں توحید خالص پر چلنے کے مدعی تھے، وہ یہی کہتے تھے کہ ہم تو اللہ کو ایک ہی مانتے ہیں لیکن زبانی دعوے کے باوجود وہ طرح طرح کے شرک میں مبتلا تھے، یہود و نصاریٰ جن کو تمام دلیلوں سے دین کی سچائی بتادی گئی تھی اور ان کے باطل عقائد کو کھول کر بیان کر دیا گیا تھا اب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا جارہا ہے کہ اے نبی! آپ یہود و نصاریٰ سے فرمائیے کہ آؤ ہم ایک ایسی حقیقت پر آجائیں جس کا تم

بھی بظاہر انکار نہیں کرتے۔(بصیرت قرآن)

أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ : پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم، توریت، زبور اور انجیل میں یہ بالکل واضح ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت و بندگی جائز نہیں ہے، لہٰذا ہم اس بات کو اپنے باہمی اتحاد کی بنیاد بنا لیتے ہیں۔(بصیرت قرآن)یعنی ہم اسی کی عبادت کریں اور اس میں مخلص ہوں۔(المقتطف)

وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا : دوسری بات یہ کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی اور کو اس کی ذات وصفات میں شریک نہ ٹھہرائیں گے، اس کی تعلیم بھی تمام آسمانی کتابوں میں ایک جیسی ہے، لہٰذا اللہ کی ذات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شامل کرکے ان کو اُلوہیت کا ایک حصہ قرار دینا کسی طرح جائز اور مناسب نہیں ہے۔ (بصیرت قرآن)یعنی غیر اللہ کو مستحق عبادت ہونے میں اس کا شریک نہ بنائیں(المقتطف)

وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ : تیسری بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنائے یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم دے اس کو نہ مانا جائے یا اللہ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت کا حکم دیا جائے تو اسے تسلیم نہ کیا جائے، لہٰذا تمہارے پادریوں اور راہبوں نے جو حکم بھی اطاعت الٰہی کے خلاف دیئے ہیں ان کو ہرگز قبول نہ کیا جائے، کیونکہ اگر کوئی شخص ان پادریوں اور راہبوں کے کہنے پر بلا چون وچرا تسلیم کرتا ہے تو یہ ان کو رب بنانے ہی کے مترادف ہے، لہٰذا ان کو رب نہ بنایا جائے۔(بصیرت قرآن)یعنی ہم عزیر کو اللہ کا بیٹا نہ بنائیں، حضرت مسیح کو اللہ کا بیٹا نہ قرار دیں، احبار(یہودی علماء) نے تحلیل و تحریم میں جو بدعات و خرافات پیدا کی ہیں، ہم ان کی اطاعت نہ کریں کیونکہ وہ ہمارے جیسے ہی لوگ ہیں، جب وہ ہمارے جیسے ہیں تو وہ خدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ابن جریج کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں میں ایک دوسرے کی بات نہ مانیں۔(المقتطف من عیون التفاسیر)نصاریٰ نے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا رب بنالیا تھا(سورۃ توبہ ۳۱)یعنی گناہ کے کاموں میں ان کی پیروی کرتے تھے، نصاریٰ نے اللہ کو تین میں سے تیسرا خدا مان لیا تھا، توحید کا انکار کر دیا تھا۔(بحر المحیط)

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ یہ آیت وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ نازل ہوئی تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام سے پہلے ہم ان کی عبادت تو نہیں

کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کیوں نہیں؟ انہوں نے لوگوں کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور لوگوں نے ان کی پیروی کی یہی تو ان کو رب اور معبود بنانے کے برابر ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ اور مخلوق کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے کہنے سے اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال اور حلال کی ہوئی چیز کو حرام مان لینا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایسی تقلید اختیار کرنا حرام اور کفر و شرک ہے، البتہ ایسی تقلید جائز ہے جس میں کسی عالم، مجتہد، فقیہ نے کوئی ایسی شرح اور تفسیر کی ہو جس سے اُصول دین کے مطابق حرام اور حلال واضح ہو جائیں، جیسے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے برسوں کی محنت اور تجربات کی روشنی میں قرآن و حدیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کے مطابق کچھ اُصولوں کو متعین کیا ہے، جس کو فقہ اسلامی کہتے ہیں اگر دین کے اہم مسائل خصوصاً حرام و حلال کے مسائل کو عام مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا جائے گا تو اس سے نہ صرف ہزاروں فتنے پیدا ہوں گے بلکہ حرام اور حلال میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ (بصیرت قرآن)

اب جو فتنہ ہمارے سامنے ہے وہ ہمارے بزرگوں نے صدیوں کی کاوشوں اور جدوجہد کے بعد تیار کیا ہے، درحقیقت ان کے مرتب کئے ہوئے فقہ کی اتباع اور پیروی وہ قرآن و سنت ہی کے ابدی اصولوں کی پیروی ہے، لہٰذا ایسی تقلید میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر آج بھی کوئی ایمان فروش حلال کو حرام اور حرام کو حلال اپنی مرضی سے قرار دیتا ہے، ایسے شخص کی بات سننا بھی گناہ عظیم ہے اور یہودیوں اور نصاریٰ کی وہ روش ہے جس پر چل کر وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی راہ راست سے بھٹکا دیا۔ (بصیرت قرآن)

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ کہلوا دیا ہے کہ اگر یہ واقعتاً اپنی نجات چاہتے ہیں تو ساری رسموں کو چھوڑ کر صرف ان اصولوں کی طرف آجائیں جو آسمانی کتابوں سے ثابت ہیں لیکن اگر ان کے نزدیک اپنی گھڑی ہوئی رسمیں اور باتیں ہی اصل ہیں تو پھر آپ صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہم تو اللہ ہی کے فرمان بردار ہیں اور ان ہی کے حکم کو مانتے ہیں۔ (بصیرت قرآن) جو کچھ آپ ﷺ نے ان پر پیش کیا ہے آپ ﷺ نے اتمام حجت کر دیا ہے، اگر یہ ان باتوں کا انکار کرتے ہیں تو کسی دلیل اور حجت کی بناء پر نہیں کرتے بلکہ عناد کی

وجہ سے کر رہے ہیں، تو آپ ﷺ انہیں واضح کر دیں کہ انصاف سے کام لیں اور اعتراف حقیقت کر لیں کہ اس قصہ میں دعوت وارشاد میں بہت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، بہت ہی عمدہ اور احسن انداز میں دلائل وبراہین کے انبار لگائے گئے ہیں، بہت حسین پیرائے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا، اس کے ساتھ متعلقہ مباحث کو کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے، پھر بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ انہیں عبد اللہ، رسول اللہ، کلمۃ اللہ جیسے القابات سے نوازا گیا، نصاریٰ کے لیے کوئی ایسی شق پیچھے نہیں چھوڑی گئی جس کی موجودگی میں وہ کوئی نقطہ اعتراض اٹھا سکیں، ان کے تمام تر عناد کے باوجود انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی مگر انہوں نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی، جب یہاں بھی ان کے قدم نہ جم سکے تو انہیں بہت سہل طریق پر اُتارا گیا کہ آؤ ہم وہاں اتحاد کر لیتے ہیں جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کھڑے تھے اور وہ نقطہ توحید تھا، جب وہ یہاں بھی نہ آئے تو علی الاعلان ان سے کہا گیا کہ گواہ رہنا کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے یہود و نصاریٰ کا نزاع

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ {٦٥} هَاأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ {٦٦} آل عمران

جواب ترجمہ: اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ توراۃ وانجیل ان کے بعد ہی نازل ہوئیں کیا تم کو سمجھ نہیں ہے۔ تم وہی تو ہو جو ان چیزوں میں جھگڑ چکے ہو جن کی تمہیں کچھ خبر تھی تو اب ایسی چیز میں کیوں جھگڑتے ہو جس کی تمہیں کچھ خبر نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

شان نزول: ① نصاریٰ نجران اور یہود کے احبار رسول کریم ﷺ کے پاس اکٹھے ہوئے، پھر آپ ﷺ کے پاس آپس میں جھگڑنے لگے، احبار نے کہا کہ ابراہیم تو یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا

کہ ابراہیم تو نصرانی تھے، اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

② نبی کریم ﷺ نے یہود مدینہ کو ایک مشترکہ کلمہ کی طرف دعوت دی، ان لوگوں نے آپ ﷺ سے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا شروع کر دیا، یہ کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کو جھٹلایا اور نفی فرمائی۔ (عبد بن حمد، طبری، العجاب)

③ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں (ابو یاسر، ابو الحقیق، زید بن تابوت) نے کہا ابراہیم علیہ السلام ہم میں سے تھے، موسیٰ علیہ السلام ہم میں سے تھے، دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی ہم میں سے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی تھے۔ (العجاب)

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ: یہاں کلام میں مضاف محذوف ہے جو کہ دین ہے، یعنی اے اہل کتاب تم دین ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ دین کا لفظ اس لیے محذوف مانا ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ دونوں گروہوں کا ابراہیم علیہ السلام کی ذات کے بارے میں کوئی تنازعہ یا جھگڑا نہیں تھا، وہ دین ابراہیم علیہ السلام کے لحاظ سے جھگڑا کرتے تھے، ایک مدعی تھا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے دوسرا دعویدار تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، اللہ تعالیٰ نے دونوں کے بے دلیل دعوے کی تردید فرمائی ہے۔

أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ: واضح کیا گیا کہ یہودیت اور نصرانیت دونوں اَدیان ابراہیم علیہ السلام کے بعد کی پیداوار ہیں، یہ دونوں ادیان تورات اور انجیل کے نزول کے بعد وجود میں آئے ہیں، ابراہیم علیہ السلام کے دنیا سے رحلت کے ایک طویل عرصہ بعد تورات و انجیل کا نزول ہوا ہے۔

زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے، یہ آیت یہود و نصاریٰ کے خلاف واضح حجت ہے، کیونکہ توراۃ و انجیل دونوں ان کے بعد نازل کی گئیں اور ان دونوں کتابوں میں ان ادیان میں سے کسی ایک کا نام نہیں ہے اور اسلام کا نام ہر کتاب میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا عرصہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی ایک ہزار نو سو پچیس برس کا فاصلہ تھا، یہ بھی کہا گیا کہ دو ہزار سال کا فاصلہ تھا۔ (قرطبی، المقتطف)

أَفَلَا تَعْقِلُونَ: تم لوگ اپنی زبانوں سے نکلنے والی باتوں پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے ہو، تم اپنے باطل

قول کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے ہو۔ مولانا عبد الماجد دریابادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”یعنی جن کتابوں پر تم اپنی نام نہاد یہودیت اور نصرانیت کی بنیاد قرار دیتے ہو وہ تو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد کی چیزیں ہیں، تو کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو کہ یہ مذہب ان کے سر تھوپنا چاہتے ہو، (تفسیر ماجدی) یہ بدیہی امر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام متقدم تھے، تورات وانجیل متأخر تھیں، تو متقدم کے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ متأخر کی پیروی واتباع کرے، تو یہاں استفہام زجر وڈانٹ ڈپٹ کے لیے لایا گیا ہے، ان کی جہالت کو عالم آشکار کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

هَاأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ: هَا یہاں تنبیہ کے لیے ہے اور أَنْتُمْ مبتدا ہے، هَؤُلَاءِ اس کی خبر ہے، اس کے ساتھ ان کی اس حالت پر خبردار کیا گیا ہے جس سے وہ غافل ہیں، یعنی تم وہ حمقاء اور ہونقین (ہونق کی جمع بے وقوف) ہو جو جھگڑا کرتے ہو اس چیز کے بارے میں جسے تم جانتے ہو یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان ومقام سے متعلق اور تورات اور انجیل کے بارے میں، لیکن جس بارے میں تمہیں علم ہی نہیں ہے اس بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو یعنی ابراہیم علیہ السلام اور دین ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں، جس کا تذکرہ تمہاری کتابوں میں قطعی طور پر موجود ہے۔ تُحَاجُّونَ یہ محاجہ سے ہے، اس کا مطلب ہے دو باہمی نزاع کرنے والے فریقوں کا دلیلوں کا تبادلہ کرنا، بایں طور کہ ان میں سے ہر ایک دلیل پیش کرے اور دوسرے سے اس بات کا مطالبہ کرے کہ وہ اس کی دلیل کا رد کرے۔ (تفسیر الوسیط للطنطاوی)

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ” یعنی تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھگڑتے ہو کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات کو جانتے تھے جو وہ اپنی کتاب میں پاتے تھے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں انہوں نے باطل اور غلط جھگڑا کیا۔ (قرطبی) جن چیزوں کی تمہیں کچھ تھوڑی بہت خبر تھی گو محض ناتمام اور سرسری تھی مثلاً مسیح علیہ السلام کے واقعات یا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات وغیرہ ان میں تم جھگڑ چکے، لیکن جس چیز سے تمہیں بالکل مس نہیں نہ اس کی کبھی ہوا لگی، اسے تو خدا کے سپرد کر دو۔ (عثمانی)

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کو جانتا ہے اور تم لوگ جاہل

ہو۔(المقتطف) اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ابراہیم دین اسلام پر تھے جب کہ تم اس بات کو نہیں جانتے ہو۔(بحر المحیط) وہی جانتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کیا تھے اور آج دنیا میں کونسی جماعت کا مسلک اس سے قریب تر ہے۔(عثمانی)

مسئلہ: آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اس کے بارے جھگڑنا منع ہے، جس کے بارے علم نہ ہو اور اس سے روکنے اور منع کرنے کے ممنوع ہونے پر دلیل موجود ہے، جو اس کے نزدیک متحقق اور ثابت نہ ہو، پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَاأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ (تم وہی تو ہو جو ان چیزوں میں جھگڑ چکے ہو جن کی تمہیں کچھ خبر تھی تو اب ایسی چیز میں کیوں جھگڑتے ہو جس کی تمہیں کچھ خبر نہیں) اور اس کے بارے جھگڑنے کا حکم موجود ہے جس کے بارے علم اور یقین ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل:۱۲۵) اور ان سے بحث و مناظرہ اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ اور شائستہ ہو۔

ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے آکر اپنے بچے کا انکار کیا اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے عرض کی ہاں آپ نے پوچھا: ان کی رنگت کیسی ہے؟ اس نے عرض کی، وہ سرخ رنگ کے ہیں، آپ ﷺ نے پوچھا: کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے؟ اس نے عرض کی ہاں، آپ ﷺ نے پوچھا: وہ کہاں سے آیا؟ اس نے عرض کی: شاید اصل اس کی مشابہ ہو، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور یہ بچہ شاید اصل اس کے مشابہ ہو۔ (صحیح بخاری، باب اذا عرض بنفی الولد، حدیث نمبر ۴۸۹۳،) یہی جھگڑے کی حقیقت اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے استدلال کو واضح اور ظاہر کرنے کی انتہا ہے۔(قرطبی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیفی مسلمان تھے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيّاً وَلاَ نَصْرَانِيّاً وَلَكِن كَانَ حَنِيفاً مُّسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ {۶۷} آل عمران

جواب ترجمہ: ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی لیکن سیدھے راستے والے مسلمان تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

شانِ نزول: اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے، نجران کے نصاریٰ اور یہود کے احبار میں مباحثہ ہوا یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے اور نصرانیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ آپ نصرانی تھے یہ نزاع بہت بڑھا تو فریقین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم (فیصلہ کرنے والے) مانا اور آپ سے فیصلہ چاہا اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا: قرآن کریم میں واضح بتلایا گیا کہ تورات، انجیل دونوں آسمانی کتابیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد نازل ہوئی ہیں، تو یہاں مزید وضاحت کی گئی کہ پھر وہ ان کتابوں اور ان ادیان کی آمد سے پہلے ہی ان کے پیروکار بن کر یہودی و نصرانی کیسے بن گئے تھے۔

یہ آیت کریمہ پچھلی آیات کا تتمہ اور تکملہ ہے، یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، نصرانی دعویٰ کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی تھے، یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو دعویٰ بلا دلیل قرار دیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوؤں کی تکذیب کی اور فرمایا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین اور ان کی شریعت پر ہیں اور ان کے علاوہ کوئی دین اور کوئی ملت ان کے طریقہ پر نہیں ہے، خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی یا مشرکین ہوں جو بت پرستی کرتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام ادیان باطلہ سے اعراض کرنے والے اور خالص مسلم تھے اور یہی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اور آپ کی شریعت ہے۔

وَلٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا: ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی لیکن وہ ہر باطل نظریہ سے الگ رہنے والے خالص مسلمان تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ (جامع البیان) وہ گمراہ کن عقائد اور نظریات سے بالکل ایک طرف تھے۔ (المقتطف) وہ مخلص انسان تھے۔ (بحر المحیط) حنیف کا معنیٰ سیدھے دین حق کی طرف میلان رکھنے والا اور سیدھا دین حق اسلام ہی ہے۔ (اوضح التفاسیر) عربوں کے نزدیک حنیف کا معنیٰ فی الحقیقت اسلام کی طرف میلان رکھنے والا، رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کا اطلاع دینا کہ ابراہیم مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ مسلمان

تھے، تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور صالحین رحمہم اللہ اس بات کو جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ اسلام اور ایمان یہ اصول دین میں سے ہیں، ان سے جہالت یا ان کی معرفت لغت سے متعلق نہیں ہے۔

ابو جعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لغت میں مسلمان کا معنیٰ اللہ کے حکم کے سامنے اپنے کو جھکا دینا اور اس کی اطاعت کرنا ہے، مؤمن کا معنیٰ اس چیز کی تصدیق کرنا جو رسول اللہ کی طرف سے لے کر آئے ہیں، تمام اوقات میں اسے قبول کرنے والے ہوں اور اس پر عمل پیرا ہوں، یہ وہ چیز ہے جسے کسی نبی کا دین دور نہیں کر سکتا۔ (اعراب القرآن للنحاس)

حنیف حنفٌ سے ہے، جس کا معنیٰ گمراہی سے استقامت کی طرف میلان رکھنا، حنف کے برعکس جنف ہے جس کا معنیٰ استقامت سے گمراہی کی طرف میلان رکھنا، عربی میں تحنف الرجل اس وقت بولتے ہیں جب ایک شخص راہِ استقامت کی تلاش میں سرگرداں ہو، مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی دن بھی یہودی نہیں رہے جیسے یہود کہتے ہیں اور نہ ہی وہ نصرانی رہے جیسے نصاریٰ کہتے ہیں، لیکن وہ حنیفی مسلمان تھے، یعنی گمراہ گن عقائد کی بجائے راہ استقامت (سیدھی راہ) کے متلاشی تھے، وہ مسلمان تھے یعنی انہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر رکھا تھا، اس کے لیے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے تھے، عبادت میں خالص اسی کی بندگی بجالاتے تھے۔ (الوسیط للطنطاوی) حنیف وہ ہوتا ہے جو توحید کا اقرار کرتا ہے، حج ادا کرتا ہے، قربانی دیتا ہے، مختون ہوتا ہے اور قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ (قرطبی)

ابن جریر نے سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ میرا خیال ہے کہ وہ اس کو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ زید بن عمرو بن نفیل رحمہ اللہ شام کی طرف نکلے کہ وہ دین کے بارے میں سوال کر رہے تھے، یہودیوں کے ایک عالم سے ملے اور اس سے اس کے دین کے بارے میں پوچھا اور اس سے کہا شاید کہ میں تمہارے دین کو قبول کر لوں مجھے اپنے دین کے بارے میں بتاؤ، یہودی نے اس سے کہا بلاشبہ تو ہرگز ہمارے دین پر نہیں آسکتا، یہاں تک کہ تو اپنے حصہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے غضب میں سے لے گا، زید نے کہا میں اللہ کے غضب سے دور بھاگتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے

غضب میں سے کچھ بھی کبھی نہیں لوں گا، اس نے کہا کیا تم مجھ کو ایسا دین بتا سکتے ہو، جس میں یہ نہ ہو انہوں نے کہا میں اس کو نہیں جانتا، مگر یہ کہ تو حنیف ہو جائے یعنی دین حنیف اختیار کر لے، اس نے کہا حنیف کیا ہے؟ انہوں نے کہا وہ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے جو نہ یہودی تھے نہ نصرانی تھے اور وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے، وہ اس کے پاس سے نکل کر نصاریٰ کے ایک عالم سے ملے اور اس کے دین کے بارے میں پوچھا اور اس سے کہا شاید کہ میں تمہارے دین کو قبول کر لوں مجھے اپنے دین کے بارے میں بتاؤ؟ اس نے کہا تو ہرگز ہمارے دین پر نہیں ہو گا مگر یہ کہ تو اپنے حصہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی لعنت کو لے گا، انہوں نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی لعنت میں سے کسی کو برداشت نہیں کر سکتا اور اللہ تعالیٰ کے غصہ میں سے کسی کو برداشت نہیں کر سکتا، اس نے کہا کیا تم مجھے ایسا دین بتا سکتے ہو جس میں یہ نہ ہو تو اس نے اس کو ایسا ہی کہا جیسے یہودی نے کہا تھا کہ میں نہیں جانتا مگر یہ کہ وہ حنیف تھے، یہ آدمی دونوں کے پاس سے باہر آ گیا اور وہ دونوں اس بات پر متفق ہوئے تھے ابراہیم علیہ السلام کی شان میں سے وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھاتا رہا اور کہتا اے اللہ! میں تجھ کو گواہ بناتا ہوں کہ بلاشبہ میں ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہوں۔ (در منثور)

یہاں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ حنیف مسلم تھے، یعنی اپنے کو سپرد کرنے والے، تو اس کا تقاضا ہے کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہو جس کی طرف آدمی اپنے کو سپرد کرے، یعنی انہوں نے اپنی زمام کار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دی اور مسلَم فیہ کا بھی تقاضا ہے جو کہ ایمان ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی زمام کار اللہ تعالیٰ کے سپرد کی تو لازمی بات ہے کہ انہوں نے اپنے کو ہر اس چیز کے سپرد کیا ہو جو اِفعل (یہ کرو) اور لا تفعل (یہ نہ کرو) کے سپرد کیا ہو، جب ہم قافلہ انبیاء کرام علیہم السلام پر اس اشتقاق کا جوڑ بٹھاتے ہیں تو ہمیں وہاں یہ بات ملتی ہے کہ آدم مسلمان تھے، نوح مسلمان تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے بھی نبی تشریف لائے وہ سارے کے سارے مسلمان تھے۔

کیونکہ تمام انبیاء اور رسل علیہم السلام نے اپنی زمام ہر چیز میں مسلم الیہ یعنی اللہ کے سپرد کر رکھی تھی، انہوں نے اس چیز کے ساتھ جوڑ بٹھار کھا تھا جو ان کی طرف نازل کی گئی تھی، اسی لیے وصف اسلام کے ساتھ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام موصوف تھے، کتب سابقہ پر ایمان لانے والے تمام اہل ایمان اس

وصف کے ساتھ موصوف تھے۔

یہاں تک کہ عرش بریں کا سب سے آخری پیام رحمت دوعالم ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوا، ختم نبوت کے اعزاز کے ساتھ آپ ﷺ کی عظمت و رفعت کو چار چاند لگائے گئے، انہیں بھی اِفعل (یہ کیجیے) لاتفعل (یہ نہ کیجیے) کے ساتھ جوڑا گیا، آپ ﷺ کی طرف کوئی نیا پیغام نہیں آیا، اس کے علاوہ کسی نے اپنے کو اللہ کے سپرد نہیں کیا، اپنی سپرداری سب کے لیے اسی پیغام میں تھی جو اللہ کی طرف سے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کیا گیا، پھر خاتم الانبیاء ﷺ پر نازل کیا گیا۔

مقصود کا حصول تو اسلام کی تکمیل کے ساتھ ہوتا ہے، راہیں مکمل طور پر اللہ کی طرف سے طے کی جاتی ہیں، اسلام کا اِستقلال واِستقرار عقیدہ کی صفائی وستھرائی کے ساتھ ہوتا ہے، یوں اسلام کا جھنڈا اُمت مسلمہ کے سر پر سجایا گیا، جو حضرت محمد ﷺ کی اُمت ہے یہی وہ امت ہے جس نے اپنے کو ان تمام باتوں میں اللہ کے سپرد کیا ہوا ہے جو حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہیں۔

اور علماء توریت وانجیل پر ان کا کمال جہل ظاہر کر دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک کا دعوٰی ان کے کمال جہل کی دلیل ہے۔ یہودیت ونصرانیت توریت وانجیل کے نزول کے بعد پیدا ہوئیں اور حضرت موسٰی علیہ السلام کا زمانہ جن پر توریت نازل ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے صدہا برس بعد ہے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام جن پر انجیل نازل ہوئی ان کا زمانہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے بعد دو ہزار برس کے قریب ہوا ہے اور توریت وانجیل کسی میں آپ کو یہودی یا نصرانی نہیں فرمایا گیا باوجود اس کے آپ کی نسبت یہ دعوٰی جہل وحماقت کی انتہا ہے، قرآن نے واضح کر دیا کہ ابراہیم تو حنیفی مسلمان تھے۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ: وہ مشرکین میں سے نہیں تھے، مشرک وہ ہوتے ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے تیسرا ہے، یا وہ کہتے ہیں کہ عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، یا وہ کہتے ہیں کہ عیسٰی اللہ کے بیٹے ہیں، اسی طرح کے دوسرے اقوال باطلہ اور فاسدہ زبانوں سے ادا کرتے ہیں۔ (الوسیط للطنطاوی) یہاں یہود ونصاریٰ کی طرف ایک باریک اِشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ ابراہیم علیہ السلام ان کی طرح مشرک نہیں تھے، جنہوں نے عزیر علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور مشرکین کا بھی رد کر دیا گیا جو کہتے تھے کہ ہم لوگ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے دین کی پیروی کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریبی تعلق والے لوگ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ {۶۸} آل عمران

جواب ترجمہ: بلاشبہ انسانوں میں ابراہیم کے ساتھ سب سے زیادہ قریب تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کا اتباع کیا اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ ایمان والوں کا دوست ہے۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ روسائے یہود نے کہا اللہ کی قسم اے محمد! آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں کہ ہم دین ابراہیم علیہ السلام کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قریب اور حق دار ہیں نیز یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے آپ کو تو صرف حسد ہے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول۔ در منثور)

② جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے اور وہاں سکونت پذیر ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے اور بدر کی جنگ کا واقعہ پیش آگیا تو مکہ کے قریش دارالندوہ میں اکٹھے ہو گئے، انہوں نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے جو لوگ حبشہ میں بادشاہ نجاشی کے پاس ہیں ان کے ذمے ہمارا اثار ہے یعنی ان سے خون کا انتقام لینا ہے اور یہ انتقام بدر میں قتل ہونے والے تمہارے آدمیوں کا ہے، لہٰذا تم مال جمع کرو اور اس سے نجاشی کے لیے تحفے بھیجو، ہو سکتا ہے وہ تمہارے ان لوگوں کو جو اس کے پاس ہیں واپس بھیج دے، نیز یہ کہ تم اپنے میں سے دو صاحب الرائے آدمیوں کا اس کام کے لیے انتخاب کر لو چنانچہ انہوں نے عمرو بن العاص اور عمارہ بن ابی معیط کو تحفے اور عمدہ قسم کا چمڑا دے کر نجاشی کی طرف بھیجا۔

یہ لوگ سمندر کے راستے حبشہ پہنچے جب یہ لوگ نجاشی کے دربار میں آئے تو انہوں نے نجاشی کو سجدہ کیا اور اسے سلام کیا اور اس سے کہا کہ ہماری قوم آپ کی شکر گزار ہے اور خیر خواہ ہے اور تمہاری

بہتری خوشحالی کے لیے نیک خواہشات رکھتی ہے، انہوں نے ہمیں اس لیے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ ہم آپ کو ان لوگوں سے خبردار کریں جو آپ کے پاس آئے ہیں کیونکہ یہ لوگ جھوٹے شخص کے ساتھی ہیں، جس نے ہمارے اندر سے نکل کر یہ خیال کیا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، اس کی پیروی ہمارے بے عقل لوگوں کے سوا اور کسی نے نہیں کی، ہم نے ان پر سختی کی اور ہم نے انہیں اپنے وطن کی ایک گھاٹی میں محصور کیے رکھا، نہ ان تک کوئی شخص جاتا ہے اور نہ ان میں سے کوئی شخص باہر نکل سکتا ہے، انہیں بھوک اور پیاس نے مار ڈالا، جب یہ جان بلب ہو گئے تو اس شخص نے اپنے چچازاد کو آپ کے پاس بھیجا تاکہ تمہارے دین ملک اور عایا میں بگاڑ پیدا کر سکیں، ان سے خبردار اور محتاط رہیے اور ان کو ہمارے حوالے کیجیے تاکہ آپ کی طرف ہم ان سے نمٹ لیں، ہماری اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ جب یہ لوگ آئیں گے آپ کے دربار میں تو آپ کو سجدہ نہیں کریں گے اور نہ ہی اور لوگوں کی طرح آپ کے سامنے ادب بجالائیں گے جو بات تمہارے دین اور ادب دربار کے خلاف ہے اور اس سے انحراف ہے۔

نجاشی نے ان لوگوں کو بلا بھیجا، جب یہ لوگ آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے دروازے پر بلند آواز سے کہا کہ حزب اللہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے، نجاشی نے کہا کہ اس پکارنے والے سے کہو کہ اپنی بات دھرائے چنانچہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اپنے کلمات دہرائے تو نجاشی نے کہا کہ ہاں یہ لوگ اللہ کی امان اور حفاظت میں داخل ہوں، اس پر عمرو بن عاص نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا کہ دیکھتے نہیں یہ کس طرح اپنے آپ کو حزب اللہ کہہ کر پکارتے ہیں؟ نجاشی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا ان دونوں کو یہ بات بڑی ناگوار گزری، پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے تو انہوں نے نجاشی کو سجدہ نہیں کیا، عمرو بن عاص نے نجاشی سے کہا کیا آپ دیکھتے نہیں یہ لوگ کس طرح تمہیں سجدہ کرنے سے تکبر کرتے ہیں، اس پر نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے پوچھا کہ تمہیں مجھ کو سجدہ کرنے اور دنیا بھر سے میرے پاس آنے والوں کی طرح کیا بات روکتی ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ ہم صرف اس خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں جس نے آپ کو پیدا کیا اور آپ کو حکومت بخشی، پہلے ہمارا اسلام کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا جب ہم بتوں کی پرستش کرتے تھے پھر اللہ نے ہمارے درمیان ایک سچا نبی مبعوث کیا، اس نے ہمیں ایسا سلام سکھایا جو ہمارے لیے اللہ کو پسند

ہے، یہ اہل جنت کا سلام ہے، نجاشی کو معلوم تھا کہ یہ سچ ہے، توراۃ اور انجیل میں یہی ہے، نجاشی نے پوچھا کہ تم میں سے کس نے حزب اللہ کہہ کر اندر آنے کی اجازت طلب کی تھی؟ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں ہوں، اس پر نجاشی نے کہا کہ تم بات کرو، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بات شروع کی اور کہا کہ آپ اہل زمین کے بادشاہ ہیں اور اہل کتاب میں سے ہیں، آپ کے دربار میں زیادہ بات کرنا زیب نہیں دیتا اور نہ ہی ظلم زیب دیتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے بات کروں آپ ان دو آدمیوں کو حکم دیں کہ ایک بات کرے اور دوسرا خاموش رہے اور آپ ہماری باہم گفتگو سن لیں اس پر عمرو نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بات کرو۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی سے کہا کہ اس شخص سے پوچھئے کہ کیا ہم لوگ غلام ہیں یا آزاد؟ اگر ہم غلام ہیں تو واقعی اپنے مالکوں سے بھگوڑے ہیں، آپ ہمیں ان کے پاس واپس بھیج دیجئے، نجاشی نے عمرو سے پوچھا کہ یہ لوگ غلام ہیں یا آزاد؟ عمرو نے جواب دیا کہ یہ لوگ آزاد اور معزز لوگ ہیں، اس پر نجاشی نے کہا یہ غلامی سے نجات پا گئے، پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب ان سے پوچھئے کہ کیا ہم نے ناحق کسی کا خون بہایا ہے تو ہم سے قصاص لیں؟ عمرو نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے، انہوں نے کسی کا قطرہ بھر خون نہیں بہایا ہے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ اب ان سے پوچھئے کہ کیا ہم نے ناحق کسی کا مال لیا ہے جو ہم نے ادا کرنا ہے؟ اس پر نجاشی نے کہا کہ اگر ان کے ذمے خزانہ بھر کسی کا مال ہو تو وہ میں ادا کر دوں گا۔

اس پر عمرو نے جواب دیا کہ نہیں، ان کے ذمے کسی کا ایک قیراط بھر بھی قرض نہیں ہے، اس پر نجاشی نے پوچھا کہ پھر ان سے کیا چاہتے ہو اور ان سے کس چیز کا مطالبہ کرتے ہو؟ اس پر عمرو نے کہا کہ ہم اور یہ لوگ ایک ہی دین کے پیروکار تھے اور ہمارا معاملہ ایک ہی تھا، ہم اپنے آبائی دین کے پیرو تھے، انہوں نے وہ دین ترک کر دیا اور دوسرے دین کے پیرو بن گئے، ہم اپنے دین پر ہی قائم رہے، ہماری قوم نے آپ کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ آپ انہیں ہمیں لوٹا دیں، نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ پہلے تم کس دین پر تھے اور اب تم نے کس دین کی پیروی کی ہے؟ مجھے سچ سچ بتا دو، تو

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم جس دین کی طرف اب پھر گئے ہیں یہ اللہ کا دین اسلام ہے، یہ دین اللہ کا ایک رسول ہمارے پاس لے کر آیا ہے، وہ ابن مریم علیہ السلام کی کتاب کی طرح اس کے موافق ایک کتاب بھی ساتھ لایا ہے، نجاشی نے کہا کہ اے جعفر! تم نے ایک عظیم معاملے کی بات کی ہے، لہٰذا تم ذرا ٹھہرو، اس کے بعد نجاشی نے ناقوس بجانے کا حکم دیا، جس پر تمام قسیس اور راہب یعنی مذہبی پیشوا جمع ہو گئے، جب یہ لوگ اس کے پاس جمع ہوئے تو نجاشی نے کہا کہ میں تمہیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل کی کیا تم عیسیٰ علیہ السلام اور قیامت کے درمیان کسی نبی کا ذکر (اپنی کتابوں میں) پاتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی ہے اور کہا ہے کہ جو اس نبی پر ایمان لایا گویا وہ مجھ پر ایمان لایا اور جس نے اس کا کفر کیا گویا اس نے میرا کفر کیا، اس پر نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ تم سے کیا کہتا ہے، کس بات کا حکم دیتا ہے اور کس بات سے منع کرتا ہے؟

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ ہمارے سامنے اللہ کی کتاب پڑھتا ہے، معروف اور نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے، اچھی ہمسائیگی کا حکم دیتا ہے، صلہ رحمی اور یتیموں سے نیک سلوک کی تعلیم دیتا ہے، وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کریں، نجاشی نے کہا کہ وہ جو کچھ تمہارے سامنے پڑھتا ہے اس کا کچھ حصہ ہمیں پڑھ کر سناؤ، اس پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۃ العنکبوت اور سورۃ الروم کی تلاوت کی، تلاوت سن کر نجاشی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، انہوں نے کہا کہ اے جعفر! یہ پاک کلام کچھ اور سناؤ، اس پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۃ الکہف کی تلاوت کی، عمرو بن العاص نے چاہا کہ نجاشی کو ان سے ناراض کر دے، لہٰذا اس نے یہ کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو گالی دیتے ہیں، نجاشی نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

اس پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۃ مریم کی تلاوت کی، جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تلاوت کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کے ذکر پر پہنچے تو نجاشی نے مسواک کا ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ

اللہ کی قسم! حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس ذکر سے زیادہ کچھ نہ تھے، یعنی وہ یہی کچھ تھے جو انہوں نے بیان کیا ہے، اس کے بعد نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر ان سے کہا کہ آپ لوگ چلے جائیں اور یہ میرے ملک میں آزادی سے رہیں، یعنی امن میں رہیں، جو تمہیں گالی یا تکلیف دے اسے سزا دی جائے گی، اس نے نیز کہا کہ تمہیں خوشخبری ہو، تم بے خوف ہو جاؤ، حزب ابراہیم پر آج کوئی آفت اور مصیبت نہیں ہے، عمرو نے پوچھا کہ اے نجاشی! حزب ابراہیم کون ہے؟ نجاشی نے کہا حزب ابراہیم یہ خاندان ہے اور ان کا وہ آقا ہے جس کی طرف سے یہ آئے ہیں اور ان کے پیروکار ہیں۔

یہ بات مشرکوں کو ناگوار گزری، انہوں نے دین ابراہیم علیہ السلام پر ہونے کا دعوی کیا، اس کے بعد نجاشی نے عمرو اور ان کے ساتھی کو وہ تحفے تحائف وغیرہ واپس کر دیئے جو وہ اٹھا لائے تھے، اس نے کہا کہ میرے لیے تمہارے یہ تحفے رشوت ہیں، انہیں لے جاؤ، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکومت عنایت کی اور مجھ سے کوئی رشوت طلب نہیں کی، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم دربار سے چلے گئے اور ہم وہاں عزت و احترام سے بخیر و عافیت رہے، اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بحث و مباحثے سے متعلق یہ وحی نازل کی: اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ

اِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ: اولیٰ اسم تفضیل ہے، اس کا معنیٰ ہے قریب ترین، یعنی لوگوں میں ابراہیم کے قریب ترین وہ لوگ ہیں جو اس کے پیروکار ہیں، ابراہیم کی زندگی میں جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ان میں لوط علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام ہیں، ان کی امت کے لوگ ہیں جو اس زمانے میں ان کی شریعت پر عمل پیرا تھے اور ان کے بعد جنہوں نے ان کی پیروی کی۔

وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا: اور یہ نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے بہت زیادہ قریب ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر مانا، کیونکہ یہ لوگ اکثر احکام میں ملت ابراہیمی کے موافق ہیں، موحّد ہیں، قربانی کرتے ہیں، ختنہ کراتے ہیں، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، حج اور عمرہ کرتے ہیں اور ان احکام کو پورا کرتے ہیں، جن سے اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کی جانچ کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پورا کیا تھا۔ (مظہری) اور جو لوگ ان پر ایمان لائے یہ بھی ابراہیم علیہ السلام سے قریب تر ہیں کیونکہ یہ امت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے۔ جیسا کہ سورۃ حج کے آخر میں فرمایا مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ توحید اور عقیدہ معاد میں تمام انبیاء علیہم السلام مشترک ہیں لیکن شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کثیر تعداد میں ایسے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے موافق ہیں، توحید کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو محنت کی، جان جوکھوں میں ڈالی، اس کے لیے آگ میں ڈالے گئے، وطن چھوڑا، امت محمدیہ نے پوری طرح محنت اور کوشش کرکے جانوں اور مالوں کی قربانی دے کر اس دعوت کو صحیح طریقہ پر باقی رکھا اور کروڑوں مؤحد ان کوششوں کی وجہ سے وجود میں آئے، دعوت توحید کے لیے اور توحید پر خود باقی رہنے اور دوسروں کو باقی رکھنے میں امت محمدیہ نے جو قربانیاں دی ہیں اس کی نظیر دوسری امتوں میں نہیں ہے، یہود و نصاریٰ تو مشرک ہوگئے، انہوں نے توحید کی دعوت ختم ہی کر دی ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ (انوار البیان)

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ: جو لوگ ابراہیم علیہ السلام جیسے عظیم الشان نبی کے قریبی ہیں یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں، اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے دوست ہیں، جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دوست ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر اہل ایمان کے ساتھ اللہ کی دوستی ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مدد و نصرت کرے گا، ان کے نیک اعمال کی انہیں جزائے خیر عطا کرے گا، یہاں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے ساتھ دوستی کا اعلان فرمایا ہے، گویا ایمان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

گمراہ کن اہل کتاب کا کارنامہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ {۶۹} آل عمران

جواب ترجمہ: بعض اہل کتاب دل سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم کو گمراہ کر دیں اور گمراہ نہیں

کرتے مگر اپنے نفسوں کو اور نہیں سمجھتے۔

شان نزول: جب یہود نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو اپنے دین کی طرف دعوت دی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول، زادالمسیر)

وَدَّت طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ: بعض اہل کتاب دل سے چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم کو گمراہ کر دیں اور گمراہ نہیں کرتے مگر اپنے نفسوں کو۔ مطلب یہ کہ ان کو گمراہ کرنے کا گناہ انہی پر ہے، اھلِ ایمان تو اُن کی پیروی نہیں کریں گے۔ طَآئِفَةٌ لوگوں کی ایک ٹولی یا گروہ کو کہا جاتا ہے جس کی تعداد کم از کم تین افراد پر مشتمل ہوتی ہے، من اھل الکتاب سے مراد بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع ہیں۔

لَوْ يُضِلُّونَكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلاَّ أَنفُسَهُمْ: لَوْ تمنی کے لیے ہے، ان کی تمنا اور آرزو یہ ہے کہ وہ تمہیں راہ راست سے ہٹا کر چاہِ ضلال میں پھینک دیں، لیکن اس گمراہ کرنے کا وبال انہی پر آئے گا، کیونکہ اہل ایمان ان کی گمراہ کن چالوں کو سمجھتے ہوئے دین حنیف سے نہیں پھریں گے، الٹا انہی تمنا کرنے والوں کو نقصان ہو گا، اس میں خبر دی جارہی ہے کہ یہودیوں کی چاہت اور تمنا کے باوجود مسلمان یہودیت اختیار نہیں کریں گے، البتہ ان کو دگنا عذاب دیا جائے گا، ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کے حربے استعمال کرنے کا اور دوسرا خود ان کا گمراہ رہنے کا۔

وَمَا يَشْعُرُونَ: اور اس بات کو وہ سمجھتے نہیں ہیں کہ وہ اپنا کتنا بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ کلبی کہتے ہیں کہ انہیں اس بات کا پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرمادے گا۔

ان آیات میں یہود کے مسلمانوں سے حسد و عناد اور اسی سلسلہ میں ان کے چند کرتوتوں کا ذکر کیا جارہا ہے، پہلی کوشش ان کی یہ تھی کہ جیسے بھی ممکن ہو اگر کچھ مسلمانوں کو یہودی بنالیا جائے تو وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوسکتے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے چند مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش بھی کی، مگر الٹا بدنام ہوئے اور رسوائی بھی ہوئی، بھلا آپ کے پیروکار اور جانثاران یہودیوں کے دام میں کیسے پھنس سکتے تھے؟ دوسری کوشش ان کی یہ تھی کہ تورات کی جن آیات میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات دی گئی ہیں، انہیں عوام میں شائع و ذائع ہونے سے روکا جائے اور اس

سلسلہ میں مکر و فریب اور کتمانِ حق کسی بات سے بھی دریغ نہ کیا جائے، ان کوششوں سے وہ کامیاب نہ ہوئے بلکہ الٹا ان جرائم سے اپنے آپ کو مزید گمراہی میں مبتلا کر لیا۔ (تیسیر القرآن)

اہل کتاب کی اسلام دشمنی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ {۷۰} يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ {۷۱} وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ {۷۲} وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَى هُدَى اللهِ أَنْ يُؤْتَى أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ {۷۳} يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ {۷۴} آل عمران

جواب ترجمہ: اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کر رہے ہو جب کہ تم دیکھ رہے ہو۔ اے کتاب والو! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں گڈمڈ کر دیتے ہو اور جانتے بوجھتے حق کو چھپا جاتے ہو۔ اور کہا اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہ ایمان لاؤ اس پر جو نازل کیا گیا مسلمانوں پر دن کے شروع حصہ میں اور منکر ہو جاؤ دن کے آخر حصہ میں امید ہے کہ یہ لوگ واپس لوٹ آئیں۔ اور ماننا اسی کی جو تمہارے دین پر چلے، آپ کہہ دیجیے کہ اصل راستہ تو اللہ ہی کا راستہ ہے (اور یہ سب تم اس ضد میں کر رہے ہو) کہ تم کو جو کچھ ملا تھا وہ کہیں کسی اور کو نہ مل جائے یا وہ تم پر تمہارے رب کے پاس غالب نہ ہو جائیں آپ فرما دیجیے کہ تمام تر فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اسے عنایت فرما دیتا ہے اور اللہ تو بڑی وسعت والا خوب جاننے والا ہے۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ: اے اہل کتاب! تم لوگ تورات اور انجیل کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ تورات اور انجیل کی جن آیات کا تم لوگ انکار کرتے ہو یہ آیات ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کی گواہی دیتی ہیں، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب! تم

قرآن کریم کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ جب کہ تمہیں ان کے صحیح اور درست ہونے کا پتہ ہے، یہاں استفہام انکاری ہے، آیات سے مراد معجزات ہیں، اسی لیے آگے شہادت کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ: تم لوگ معجزات کو جانتے ہو، تمہیں معلوم ہے کہ قرآن کریم سچی کتاب ہے، اس کی آیات درست اور صحیح ہیں، نبی کریم ﷺ کے بارے میں تم جانتے ہو کہ وہ سچے نبی ہیں، ان کی بعثت سے پہلے تم لوگ ان کے بارے میں خبریں دیتے پھرتے تھے۔

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ: اے اہل کتاب! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں مخلوط کرتے ہو، اس کے بارے میں حضرت حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ توراۃ اور انجیل میں جو انہوں نے تحریف کرلی تھی مخلوط کرنے سے وہ مراد ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ زبان سے اسلام ظاہر کرتے تھے اور دلوں میں انہوں نے کفر اختیار کر رکھا تھا، منافق بنے ہوئے تھے۔ (انوار البیان) یہ لوگ حق کے لبادے میں باطل پیش کرتے تھے۔ (المقتطف)

وَ تَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ: کہ تم حق کو یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں، یہودی آپس میں اور بعض مرتبہ انصار اور مہاجرین کے سامنے یہ بات کہہ دیتے تھے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن دنیاوی اغراض کی وجہ سے حق قبول نہیں کرتے تھے، جانتے بوجھتے گمراہ ہونا بہت بڑی شقاوت ہے۔ (انوار البیان)

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ: اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ تم لوگ جو چیز ایمان والوں پر نازل کی گئی ہے اس پر دن کے ابتدائی حصہ میں ایمان لاؤ اور آخری حصہ میں انکار کر دو، اس سے مراد یہود کے رؤساء تھے، جنہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دی تھی۔

شان نزول: ① حسن رحمہ اللہ اور سدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ خیبر (بقول بعض عرینہ) کے یہود کے بارہ مذہبی پیشواؤں نے باہم طے کیا اور ایک دوسرے سے کہا کہ محمد ﷺ کے دین میں دن کے آغاز میں یوں داخل ہو جاؤ کہ صرف زبانی اقرار کرو، دل سے اعتقاد نہ رکھو اور دن کے آخری حصے میں انکار

کر دو اور کہو کہ ہم نے اپنی کتابوں میں دیکھا ہے اور علماء سے مشورہ کیا ہے ہمیں معلوم ہوا کہ محمد ﷺ وہ نبی نہیں ہیں ہم پر اس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو گیا اور اس کے دین کا باطل ہونا ثابت ہو گیا، جب تم لوگ یہ کر لو گے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ان کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ کہیں گے کہ یہ لوگ اہل کتاب ہیں اور وہ اس کے بارے میں ہم سے بہتر جانتے ہیں اس طرح وہ اپنے دین کو چھوڑ کر تمہارے دین کی طرف لوٹیں گے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی اور اپنے نبی ﷺ کو اور مومنوں کو باخبر کیا۔

② مجاہد رحمہ اللہ مقاتل رحمہ اللہ اور کلبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت قبلہ کے معاملے سے متعلق ہے اور شان نزول یہ ہے کہ جب قبلہ کو خانہ کعبہ کی طرف پھیرا گیا تو یہ بات یہود پر ان کی مخالفت کے باعث سخت شاق اور ناگوار گزری، کعب بن اشرف (یہودی) اور اس کے ساتھیوں نے کہا کہ کعبے کے معاملے پر محمد ﷺ پر نازل ہونے والے احکام پر ایمان لاؤ اور دن کے شروع میں کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو پھر دن کے آخری حصے میں کعبے کا انکار کر دو اور اپنے قبلہ صخرہ کی طرف پھر جاؤ، شاید وہ پھر یہ کہیں گے یہ اہل کتاب ہیں اور ہم سے زیادہ جاننے والے ہیں اس طرح شاید وہ ہمارے قبلہ کی طرف دوبارہ پھر جائیں، اس پر اللہ نے اپنے نبی کو ان کے مکر اور چال سے خبر دار کیا اور محتاط کیا اور ان کے راز سے باخبر کیا اور یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا: یعنی اہل ایمان پر جو قرآن کریم نازل کیا گیا ہے تم لوگ اس پر اپنا ایمان لانا ظاہر کرو۔

وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ: ان آیتوں میں اور اس سے بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مکر و فریب، بد دیانتی اور شرارتوں سے مومنوں کو ہوشیار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ان میں بعضوں نے یہ شرارت کرنے کا ارادہ کیا ہے کہ کچھ لوگ صبح کو قرآن کریم پر ایمان لے آئیں، دن میں مسلمانوں کے ساتھ رہیں شام ہوتے ہی اسلام کو چھوڑ کر پھر اپنے لوگوں میں آملیں، اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ جب شام کو ایک کثیر جماعت یہ کہتے ہوئے واپس آئے گی کہ ہم نے تو

اسلام کی بڑی تعریف سنی تھی، ہم نے اس سے متأثر ہو کر قبول کر لیا تھا مگر جب قریب گئے تو معلوم ہوا کہ اسلام کا تو دُور دُور تک پتہ نہیں ہے، اس سے دو فائدے ہوں گے کہ اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی ہو گی اور جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں وہ بھی اس سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے، وہ سوچیں گے کہ آخر لوگوں کی اتنی بڑی تعداد ایک بات کو برا کہہ رہی ہے یقیناً کوئی نہ کوئی تو خرابی ہو گی جس سے اتنی بڑی جماعت اسلام کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔

ان یہود و نصاریٰ کے رھبان اور پادری اپنے لوگوں کو یہ سمجھا کر بھیجتے تھے کہ دیکھو تم کسی کی باتوں میں مت آجانا کیونکہ جو دین و مذہب تمہیں دیا گیا ہے اس جیسا تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے، اگر تم ان کی باتوں میں آگئے تو کل قیامت کے دن وہ تم سے جھگڑیں گے اور دلیل کے طور پر ان باتوں کو پیش کریں گے، اس طرح کی باتیں سکھا کر لوگوں کو بھیجتے تھے مگر یہ تدبیر بھی ان کے لیے الٹی ہی پڑ گئی جو لوگ شرارت کے خیال سے گئے تھے جب وہ نبی اکرم ﷺ کے قریب پہنچے تو آپ کے اخلاق حسنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری اور اللہ کی عبادت و بندگی کا اچھوتا انداز دیکھتے ہی دل سے اسلام کے قائل ہو جاتے اور پھر واپس نہ جاتے، اس طرح ان کی تدبیریں خود ان ہی کے خلاف پلٹ گئیں، لیکن پھر بھی مومنوں کو یہودیوں اور نصرانیوں کی شرارتوں سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ وہ ان سازشوں اور شرارتوں سے باخبر رہیں۔ (بصیرت قرآن)

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَى هُدَى اللهِ أَنْ يُؤْتَى أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَآءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ: حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کلام یہود کا بقیہ حصہ ہے، یعنی انہوں نے کہا کہ تم لوگ انہی لوگوں کی بات کو ماننا اور تصدیق کرنا جو تمہارے دین کے تابع ہیں۔

وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ: اس کے بعد یہودیوں کی ایک اور بات کا تذکرہ فرمایا اور وہ یہ کہ انہوں نے آپس میں یوں کہا وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ کہ تمہارا جو دین یہودیت ہے اس دین پر مضبوطی کے ساتھ جمنے کا اقرار ان ہی لوگوں کے سامنے کرنا جو تمہارے دین کے تابع ہیں، یعنی اپنا اندرونی عقیدہ اپنے ہی لوگوں کے سامنے بیان کرنا اور مسلمانوں کو دین اسلام سے پھیرنے کے لیے اوپر

اوپر سے یہ کہہ دینا کہ ہم نے تمہارا دین قبول کر لیا (اندر سے اپنے عقیدہ پر رہنا) پھر ظاہری طور پر بھی یوں کہہ دینا کہ ہم اپنے دین پر واپس آ گئے حالانکہ دل سے انہوں نے اپنا دین چھوڑا ہی نہیں تھا، یہ ان کا مکر تھا۔ (انوار البیان)

اور بعض مفسرین نے وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تم صرف اسی شخص پر ایمان لاؤ جو تمہارے دین کی موافقت کرتا ہو کما فی معالم التنزیل اَی وَلَا تُصَدِّقُوا اِلَّا لِمَن تَبِعَ دِینَكُم اَی وَافَقَ مِلَّتَكُم جس کا معنی یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ نئی شریعت لے کر آئے ہیں اور وہ تمہاری شریعت کے موافق نہیں ہے اس لیے تم ان پر ایمان نہ لاؤ۔ (انوار البیان)

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ: اے محمد ﷺ آپ فرما دیں کہ بلاشبہ ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے وہ جسے ہدایت دینا چاہے اور ہدایت پر رکھنا چاہے اسے کسی کی تدبیر ہدایت سے نہیں روک سکتی، یہ معنی پہلی تفسیر کے مطابق ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق اس کا یہ معنیٰ ہو گا کہ اللہ کو اختیار ہے کہ اپنی بھیجی ہوئی ایک شریعت کو منسوخ کر دے اور اس کی جگہ دوسری شریعت بھیج دے اور اس پر عمل کرنے کا حکم فرما دے جب اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوسری شریعت بھیج دی تو اسے قبول کر لو اگر اس کے خلاف چلو گے تو برابر کفر کی گمراہی میں رہو گے۔ (انوار البیان) آیت میں یہ جملہ معترضہ لایا گیا ہے۔ (المقتطف)

اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ: اس میں بھی یہودیوں کی ایک بات کا تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے آپس میں کہا کہ تم کبھی یہ تصدیق نہ کرنا کہ تم کو جو علم اور کتاب اور حکمت دی گئی ہے اس جیسی کسی اور کو بھی عطا کی گئی ہو، علم اور کتاب اور حکمت یہ صرف ہمارا ہی حصہ ہے، نیز انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم اس بات کی تصدیق نہ کرنا کہ تمہارے رب کے پاس دوسرے لوگ حجت میں تم پر غالب آ جائیں گے، کیونکہ تمہارا ہی دین صحیح ہے اس صورت میں اَنْ یُّؤْتٰٓى سے پہلے ایک وَ لَا تُؤْمِنُوْا مقدر ماننا ہو گا صاحب بیان القرآن نے اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اے یہودیو! تم ایسی باتیں اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں مسلمانوں پر حسد ہے کہ انہیں آسمانی کتاب کیوں مل گئی یا یہ لوگ تم پر مذہبی مناظرہ میں کیوں غالب آ جاتے ہیں اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہل

اسلام کے تنزل کی کوششیں کرتے ہو اس صورت میں اَنْ یُّؤْتٰٓی سے پہلے تَدَبَّرْتُم یا قُلْتُم مقدر ماننے کی ضرورت ہو گی۔ (انوار البیان)

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ : آپ ﷺ فرما دیجیے کہ بلاشبہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے عطا فرما دے، وہ بڑی وسعت والا ہے، بڑے علم والا ہے۔

یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ: وہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو مخصوص فرما دے۔

وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ: اور وہ بڑے فضل والا بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاتم النّبیین سیدنا محمد عربی ﷺ کو نبوت و رسالت سے نواز دیا اور ان پر کتاب نازل فرما دی اور ان کے ذریعہ ہدایت پھیلا دی اس پر تمہارا حسد کرنا جہالت اور کفر ہے یہ تو اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی دوسرے کو نبی کیوں بنایا، یہ عصبیت جاہلیہ اہل علم کو برباد کر دیتی ہے۔ (انوار البیان)

اہل کتاب کے امانت دار اور خائن لوگ

سوال یہ آیت مبارکہ کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؟

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لاَّ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلاَّ مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِماً ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَّيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ {۷۵} آل عمران.

جواب ترجمہ: اور اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں کہ اگر تو ان کے پاس ایک ڈھیر مال کا امانت رکھے وہ تجھ کو ادا کریں اور بعضے ان میں سے وہ ہیں اگر تو ان کے پاس ایک اشرفی امانت رکھے تو بھی تجھے واپس نہیں کریں گے ہاں جب تک کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے یا اس واسطے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم پر ان پڑھ لوگوں کا حق لینے میں کوئی گناہ نہیں اور اللہ پر وہ جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

تفسیر: اس سے پہلے کتنی ہی آیات ایسی گزر چکی ہیں جن میں یہودیوں کی ان خیانتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق دین کے ساتھ تھا، اب ان کی ان خیانتوں کا بیان کیا جا رہا ہے جن کا تعلق

مال کے ساتھ ہے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ: یہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب ایک آدمی نے ان کے پاس بارہ سو اوقیہ سونا امانتاً رکھا تھا تو انہوں نے اسے واپس کر دیا تھا، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں يُرْوَى أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ سَلَامٍ اِستَودَعَهُ قُرَشِيٌّ أَلْفًا وَمِائَتَيْ أُوقِيَّةً ذَهَباً فَأَدَّاهُ إِلَيْهِ، روایت کی جاتی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے پاس ایک قریشی نے بارہ سو اوقیہ سونا امانت کے طور پر رکھا تو انہوں نے اسے یہ واپس لوٹا دیا تھا۔ (روح المعانی) قنطار سے مراد بہت زیادہ مال ہے۔

وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لاَّ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ: دوسرا کعب بن اشرف تھا جس کو ایک قریشی نے صرف ایک دینار امانتاً دیا مگر اس نے اسے واپس کرنے سے انکار کر دیا اور واپس نہیں دیا۔ (بغوی) اسی تفسیر بغوی میں ہے کہ فنحاص بن عازوراء کو ایک شخص نے ایک دینار امانتاً دیا تو اس نے اسے واپس نہیں کیا تھا، اس شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں میں یہ بہت بڑا خائن تھا، باقی یہودی بھی خیانت کار تھے مگر اس کا مذہب یہ تھا کہ جو اس کے دین کا مخالف ہوتا تھا اس کے مال کو ہڑپ کرنا یہ حلال سمجھتا تھا، چاہے اسے ہتھیانے کا جو بھی طریقہ ہوتا۔ (المقتطف)

آیت مبارکہ میں قنطار سے مراد بہت زیادہ مال ہے اور دینار سے مراد تھوڑا سا مال ہے، اللہ تعالیٰ یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ یہودیوں میں امانت دار لوگ بھی ہیں اور خیانت کار بھی ہیں، ان میں بعض ایسے ہیں جو بہت سا مال بھی بطور امانت رکھنے کے بعد واپس کر دیتے ہیں، بعض حرماں نصیب ایسے ہیں جو تھوڑا سا مال بھی واپس نہیں کرتے۔

إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا: یہ ایک استثنائی صورت بیان کی گئی ہے، کہ جب آپ ان خیانت کار یہودیوں کے سر پر کھڑے رہیں گے، ان سے لگاتار اپنی امانت کی واپسی کا مطالبہ کرتے رہیں گے، دلیل کے ساتھ آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں گے تو یہ آپ کی امانت واپس کر دیں گے۔

ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ: یہودیوں پر ایک اور جہالت سوار تھی اور وہ یوں کہتے تھے کہ عرب کے اُمّی لوگوں کا ہمارے لیے سب کچھ حلال ہے، ان کا عقیدہ تھا کہ جو بھی

کوئی ہمارے دین پر نہ ہو اس پر ظلم کرنا مال مارنا حلال ہے، حضرت حسن رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب لوگوں نے یہودیوں سے خرید و فروخت کے معاملات کیے، یہودیوں پر ان کے قرضے تھے، جب وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور یہودیوں سے تقاضا کیا تو انہوں نے کہا کہ تمہارا ہم پر کوئی حق نہیں اور نہ ہمارے ذمہ کچھ ادائیگی ہے، تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور ہمارے تمہارے درمیان جو عہد تھا وہ ختم ہو گیا اور ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ہم نے یہ بات اپنی کتابوں میں پائی ہے، عربوں کو اُمِّیُّوْن (ان پڑھ) کہا کیونکہ یہ لوگ یہودیوں کے مقابلہ میں پڑھے لکھے نہیں تھے یہودیوں نے کہا کہ اَن پڑھوں کے ہم نے مال مار لیے تو کیا ہے، ان کے مالوں کے بارے میں ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں کو ہمارے لیے حلال کر دیا ہے۔ (انوار البیان)

وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ: اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور فرمایا وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ کہ یہ لوگ اللہ کے ذمہ جھوٹ لگاتے ہیں اور جانتے بھی ہیں کہ ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں (معالم التنزیل صفحہ ۳۱۷۔۳۱۸: ج ۱) تفسیر ابن کثیر میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب اہل کتاب نے لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا كَذَبَ اَعْدَاءُ اللّٰهِ کہ اللہ کے دشمنوں نے جھوٹ کہا۔ (انوار البیان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک آدمی نے کہا کہ ہم جہاد میں جاتے ہیں اور ذمی (یعنی وہ کافر جو دار الاسلام میں رہتے ہیں) ہم کو ان کے جو مال مل جاتے ہیں مرغی اور بکری ہم انہیں کھا جاتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تم کیا سمجھ کر کھا جاتے ہو اس نے جواب دیا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے اہل کتاب نے کہا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ جب ذمیوں نے جزیہ ادا کر دیا تو تمہارے لیے ان کے مال حلال نہیں ہیں ہاں اگر وہ اپنے نفسوں کی خوشی کے ساتھ دیں تو اور بات ہے۔ (ابن کثیر۔ انوار البیان)

فائدہ: آیت میں اہل کتاب کا تذکرہ تو ہے ہی اس اُمت کے نادہندہ لوگوں کو بھی تنبیہ ہے قرض لینے اور امانت رکھنے کے لیے تو جلد سے جلد تیار ہو جاتے ہیں اور جب دینے کا وقت آتا ہے تو ٹال مٹول

کرتے ہیں، صاحب حق کو چکر لگواتے ہیں، پریشان کرتے ہیں امانت کھا جاتے ہیں قرض مار لیتے ہیں، پھر بدنیت لوگوں کی اللہ پاک کی طرف سے مدد بھی نہیں ہوتی، صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے لوگوں کے مال لے لیے جن کی ادائیگی کا وہ ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا فرما دیتا ہے یعنی اس کی حسن نیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قرضوں کی ادائیگی کے لیے سہولت پیدا فرما دیتے ہیں اور جس نے لوگوں کے مال لیے جنہیں وہ تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ تلف فرما دیتا ہے (مال اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور اس پر قرضہ باقی رہ جائے گا، قیامت کے دن حقوق العباد مارنے کی وجہ سے عذاب میں جائے گا۔ (کمافی حاشیۃ البخاری عن العینی۔ انوار البیان)

فائدہ: اس امت میں بھی بہت سے جھوٹے پیر فقیر ایسے ہیں کہ جن بستیوں میں ان کے کسی باپ دادا سے لوگ مرید ہو گئے تھے، ان بستیوں کو اپنا مرید آباد بنا رکھا ہے، سالانہ ان علاقوں میں گشت کرتے ہیں اور جو کچھ چاہتے ہیں ان کے مالوں میں سے بلا اجازت لیتے ہوئے چلے جاتے ہیں اور وہ لوگ لحاظ اور مروت کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے، شرعاً اس طرح کا لیا ہوا مال حلال نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اَلا لَا یَحِلُّ مَالُ امرءٍ مُّسلِمٍ اِلَّا بِطِیب نَفسٍ مِّنہُ، خبردار کسی مسلمان آدمی کا مال حلال نہیں ہے مگر یہ کہ وہ نفس کی خوشی سے دے دے، کمافی المشکوٰۃ، بے آبروئی کے ڈر سے یا کسی بھی طرح کے دباؤ سے کوئی شخص اگر اجازت دے دے تب بھی اس کا مال لینا حلال نہیں ہوتا اگرچہ وہ ظاہری طور پر زبان سے اجازت بھی دے دے یا خاموش رہے، اسی لیے طیب نفس کی قید لگائی جو مال طیب نفس سے نہ ملے گا اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص فاسق ہو اندر سے اس کا باطن پاک نہ ہو اور اسے بزرگ سمجھ کر ہدیہ دیا جائے اگرچہ خوشدلی سے ہو وہ ہدیہ اس کے لیے حلال نہیں ہے۔ (کمافی احیاء العلوم صفحہ ۱۰۴: ج ۲، انوار البیان)

فائدہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا، جس نے کسی اور شخص سے ایک ہزار دینار قرض مانگے، اس نے کہا گواہ لاؤ کہا اللہ کی گواہی کافی ہے، اس نے کہا ضامن لاؤ، اس نے کہا

ضمانت بھی اللہ ہی دیتا ہوں، وہ اس پر راضی ہو گیا اور وقت ادائیگی مقرر کر کے رقم دے دی، وہ اپنے دریائی سفر میں نکل گیا۔

جب کام کاج سے نپٹ گیا، تو دریا کنارے کسی جہاز کا انتظار کرنے لگا تاکہ جا کر اس کا قرض ادا کر دے، لیکن سواری نہ ملی تو اس نے ایک لکڑی لی اور اسے بیچ میں سے کھوکھلا کر کے اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیئے اور ایک خط بھی اس کے نام رکھ دیا، پھر منہ بند کر کے اسے دریا میں ڈال دیا اور کہا اے اللہ! تو بخوبی جانتا ہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار قرض لیے تیری شہادت پر اور تیری ضمانت پر اور اس نے بھی اس پر خوش ہو کر مجھے دے دیئے، اب میں نے ہر چند کشتی ڈھونڈی کہ جا کر اس کا حق مدت کے اندر ہی اندر دے دوں لیکن نہ ملی، پس اب عاجز آ کر تجھ پر بھروسہ کر کے میں اسے دریا میں ڈال دیتا ہوں، تو اسے اس تک پہنچا دے، یہ دعا کر کے لکڑی کو سمندر میں ڈال کر چلا آیا، لکڑی پانی میں ڈوب گئی، یہ پھر بھی تلاش میں رہا کہ کوئی سواری ملے تو جائے اور اس کا حق ادا کر آئے۔

ادھر قرض خواہ شخص دریا کے کنارے آیا کہ شاید مقروض کسی کشتی میں اس کی رقم لے کر آ رہا ہو، جب دیکھا کہ کوئی کشتی نہیں آئی تو یہ سوچ کر واپس جانے لگا، تو ایک لکڑی کو جو کنارے پر پڑی ہوئی تھی یہ سمجھ کر اٹھا لیا کہ جلانے کے کام آئے گی، گھر جا کر اسے چیرا تو اس کے اندر سے مال اور خط نکلا، کچھ دنوں بعد قرض دینے والا شخص آیا اور کہا اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی سواری ملے تو آپ کے پاس آؤں اور مدت گذرنے سے پہلے ہی آپ کا قرض ادا کر دوں، لیکن کوئی سواری نہ ملی، اس لیے دیر لگ گئی، اس نے کہا تو نے جو رقم بھیج دی تھی وہ اللہ نے مجھے پہنچا دی ہے، تو اب اپنی یہ رقم واپس لے جا اور راضی خوشی لوٹ جا۔ (ابن کثیر)

فائدہ: حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کا قول ہے کہ دینار کو اس لیے دینار کہتے ہیں کہ وہ دِین یعنی ایمان بھی ہے اور نار یعنی آگ بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ حق کے ساتھ لو تو دِین ہے اور ناحق لو تو نار یعنی آتش دوزخ۔ (ابن ابی حاتم، ابن کثیر)

جاہلوں کا مال کھانے کا گناہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

بَلٰی مَنْ أَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ {۷۶} آل عمران

جواب ترجمہ: پکڑ کیوں نہیں ہو گی البتہ جو اپنا اقرار پورا کرے گا اور پرہیز گاری اختیار کرے گا تو بلاشبہ اللہ پرہیز گاروں کو چاہتا ہے۔

بَلٰی: یہاں اس بات کا اثبات ہے جس کی انہوں نے نفی کی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ جاہلوں کا مال کھانے پر پکڑ نہیں آئے گی، تو یہاں بتایا جارہا ہے کہ پکڑ کیوں نہیں ہو گی، پکڑ تو ہو گی، وہ جاہلوں کا مال ناجائز طریقے سے کھائیں گے تو اس کا گناہ انہیں ہو گا۔

قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں بَلٰی یعنی جس طرح یہودی کہتے ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ مومنین کے معاملہ میں بھی ان کی گرفت ہو گی یہ مطلب ہے کہ (کافروں کے) مال کے بچاؤ کی صرف دو صورتیں ہیں مسلمان ہو جانا یا مسلمانوں کا ذمی بن جانا (یعنی یہودی الٹا سمجھے ہیں کہ مسلمان کے مال کو اپنے لیے مباح جانتے ہیں، حقیقت اس کے برعکس ہے، ان کا مال مسلمانوں کے لیے مباح ہے ہر طرح سے لینا جائز ہے، بچاؤ کی صرف دو صورتیں ہیں مسلمان ہو جانا یا جزیہ دینا، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے لوگوں سے لڑنے کا اس وقت تک حکم دیا گیا ہے کہ وہ لا الٰہ الّا اللہ اور محمّد رسول اللہ کا اقرار کرلیں اور ٹھیک نماز پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں اگر وہ ایسا کر لیں تو ان کی جانیں اور ان کے مال سوائے اسلامی حقوق کے ہر طرح مجھ سے محفوظ ہو جائیں گے اور (اندرونی) حساب فہمی اللہ کے ذمہ ہے (کہ انہوں نے یہ اقرار توحید و رسالت دل کے یقین کے ساتھ کیا ہے یا نفاق کے ساتھ۔ (مظہری)

مَنْ أَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ: معاملہ ایسا نہیں جیسے ان کا گمان ہے بلکہ یہ گناہ کا کام ہے، البتہ جس نے اللہ سے کیا ہوا عہد و پیمان پورا کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور لوگوں سے کیے ہوئے وعدے بھی پورے کیے اور امانت ادا کی، اللہ کے حکموں کو بجالا کر اور اس

کے منع کیے ہوئے کاموں سے رک کر تقویٰ اختیار کیا تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور انہیں ضرور اس پر نہایت باعزت بدلہ دے گا۔ (المختصر فی تفسیر القرآن)

عہد اور وعدہ: عہد اور وعدہ دونوں الفاظ کا مفہوم ایک جیسا ہے، لیکن ان میں واضح فرق ہے، عہد اس قول و قرار کو کہا جاتا ہے جو دو فریقوں کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے، جب کہ وعدہ اس قول و قرار کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی شخص کی طرف سے ہوتا ہے، منطق کی زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ عہد عام ہے اور وعدہ خاص ہے، عہد ہو یا وعدہ اسلام دونوں کی پابندی کرنے کا حکم دیتا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے، یہ بھی فرمایا کہ اس کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا، ایک حدیث شریف میں ہے کہ اس شخص کا کوئی دین نہیں ہے جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا، حدیث میں مسلمان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ وعدہ کرتا ہے تو پورا کرتا ہے۔

تقویٰ نام ہے کفر سے اجتناب، خیانت کاری سے بچاؤ اور نقص عہد سے بچنے کا، اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کی عزت و اکرام میں اضافہ فرمائے گا، ان سے محبت فرمائے گا، یہ آیت جوامع میں سے ہے، کیونکہ اطاعت دو کاموں میں منحصر ہے، ایک اللہ کے حکم کی تعظیم بجالانا، دوسرا مخلوق پر شفقت کا ہاتھ رکھنا، عہد و پیمان کی پاسداری ان دونوں کو شامل ہے، تقویٰ ان امور سے بچنے کا نام ہے جن سے روکا گیا ہے، جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے انہیں طاعات کا نام دیا گیا ہے۔

یہود کو نذرانے اور رشوتیں ختم ہونے کا خوف

سوال یہ آیت کن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور مناسبت کیا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلٰئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ وَلاَ يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلاَ يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ {۷۷} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے حقیر معاوضہ لیتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور ان سے اللہ کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان کی طرف نہ

دیکھے گا اور انہیں پاک بھی نہ کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شان نزول: ① رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اس لیے جھوٹی قسم کھائی تاکہ کسی مسلمان کا مال کھائے تو وہ اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس سے ناراض ہو گا۔ اشعث بن قیس نے کہا کہ اللہ کی قسم! یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی، اس کا شان نزول یہ ہے کہ میرا ایک یہودی کے ساتھ زمین پر تنازعہ تھا، اس نے مجھے میرا حق دینے سے انکار کر دیا، میں نے مقدمہ نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا، آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس ثبوت ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں، آپ ﷺ نے یہودی سے پوچھا کہ کیا تم حلف اٹھاتے ہو؟ تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ تو حلف اٹھالے گا اور میرا مال لے جائے گا، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلَئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ (اسباب)

② عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے بازار میں (فروخت کرنے کے لئے) سودا لگایا تو اس نے حلف اٹھا کر کہا کہ اس نے اس سودا کی اتنی قیمت دی ہے، جو اس نے نہیں دی تھی تاکہ کسی مسلمان کو جھانسہ دے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَ أَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلَئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ (اسباب النزول)

③ کلبی کا قول ہے کہ علماء یہود کی ایک جماعت فاقہ زدہ تھی، انہیں قحط کا سامنا ہوا تھا، وہ کعب بن اشرف (یہودی) کے پاس مدینہ میں آگئے، تو کعب نے ان سے پوچھا کہ کیا تم اپنی کتابوں میں اس شخص کو اللہ کا رسول جانتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں، انہوں نے پوچھا کہ تم کیا جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، یعنی وہ اس کا رسول نہیں ہے، انہوں نے کہا کہ ہم تو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے، اس پر کعب نے کہا کہ خدا نے تمہیں بہت سی بھلائی سے محروم کر دیا، تم میرے پاس آئے ہو تاکہ میں تمہارے ساتھ حسن سلوک کروں اور تمہارے اہل و عیال کے لیے کپڑے دوں، اب خدا نے تمہیں بھی محروم کر دیا اور تمہارے اہل و عیال کو بھی، اس پر انہوں نے کہا کہ ہمیں شبہ ہوا ہے، ذرا ٹھہرو کہ ہم اس سے ملیں، پھر وہ چلے گئے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کی صفت کے برعکس آپ ﷺ کی صفت لکھی اور نبی کریم ﷺ کے پاس گئے، آپ ﷺ کے ساتھ

گفتگو کی اور آپ ﷺ سے سوالات کئے، اس کے بعد کعب کے پاس واپس آئے اور کعب سے کہا کہ ہماری رائے تھی کہ یہ شخص اللہ کا رسول ہے، لیکن جب ہم اس سے ملے تو یہ وہ شخص نہیں ہے، جس کی تعریف ہمارے ہاں کی گئی ہے، ہم نے اس شخص کی صفات ان صفات سے مختلف دیکھی ہیں جو تمہارے ہاں موجود ہیں، یہ کہہ کر انہوں نے وہ تحریر نکالی جو انہوں نے خود لکھی تھی، کعب نے اس پر نظر ڈالی تو خوش ہو گیا اور انہیں غلہ دے دیا اور انہیں خرچ وغیرہ دیا، اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلَئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ نازل کی۔ (اسباب النزول للواحدی نیشاپوری)

④ عکرمہ کا قول ہے کہ یہ آیت رؤسائے یہود ابو رافع، کنانہ بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب وغیرہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے، انہوں نے محمد کی شان میں جو کچھ اللہ نے توراۃ میں لکھا تھا، لکھا، پھر انہوں نے اس کو بدل کر اپنے ہاتھوں سے اس کے خلاف لکھا اور حلف اٹھا کر کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ ان کے پیروکاروں کی طرف سے انہیں جو کچھ کھانے پینے کو ملتا تھا وہ بند نہ ہو، یہ آیت إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلَئِكَ لاَ خَلاَقَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی ان صفات کا انکار کیا جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں ان کے بارے میں نازل فرمائی تھیں۔ (اسباب النزول)

⑤ مسند احمد میں ہے کندہ قبیلے کے ایک شخص امرو القیس بن عامر کا جھگڑا ایک حضرمی (حضر موت یمن کا رہنے والا) شخص سے زمین کے بارے میں تھا، جو حضور ﷺ کے سامنے پیش ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرمی اپنا ثبوت پیش کرے، اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا اب کندی قسم کھالے، تو حضرمی کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ جب اس کی قسم پر ہی فیصلہ ٹھہرا تو رب کعبہ کی قسم! یہ میری زمین لے جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص جھوٹی قسم سے کسی کا مال اپنا کرلے گا تو جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا اللہ اس سے ناخوش ہو گا، پھر آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو امرؤالقیس نے کہا یا رسول اللہ! اگر کوئی چھوڑ دے تو اسے اجر کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جنت، تو کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ گواہ رہیے کہ میں نے وہ ساری زمین اس

کے نام چھوڑ دی۔ (ابن کثیر، مسند احمد، معارف النزول)

⑥ ایک شان نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت یہود کے احبار سے متعلق نازل ہوئی ہے جنہوں نے تورات میں تحریف کی تھی، جنہوں نے امانتوں کا حکم تبدیل کر دیا تھا۔ (المقتطف)

⑦ ابن جریر نے شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے دن کے اول حصہ میں اپنا سامان فروخت کے لیے پیش کیا جب دن کا آخری حصہ (یعنی شام) ہوئی تو ایک آدمی آیا تاکہ اس سے سامان خریدے، تو مالک نے قسم کھا کر کہا کہ دن کے اول حصہ میں اتنی قیمت پر اس نے سامان نہیں بیچا اگر شام نہ ہوتی تو میں اس کو اس بھاؤ کے ساتھ فروخت نہ کرتا (اس پر) اللہ تعالیٰ نے آیت إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا اتاری۔ (ابن جریر، در منثور)

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا: يَشْتَرُونَ سے یہاں یستبدلون مراد ہے یعنی وہ تبدیل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس عہد و پیمان کو جو ان پر تھا، ایمان، وفاداری اور امانتوں سے متعلق کہ وہ ان میں دیانت داری سے کام لیں گے، انہوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ وہ ضرور بہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور ضرور بہ ضرور ان کی مدد و نصرت کریں گے، مگر انہوں نے اس عہد کا کوئی پاس اور لحاظ نہیں رکھا، وہ مدد و نصرت کیا کرتے الٹا انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، مخالفت بھی دشمنی کی حد تک، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے ساتھ مل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان پہنچاتے رہے۔ ثَمَنًا قَلِيلًا: سے مراد ہے متاع دنیا خواہ قلیل ہو یا کثیر کیونکہ جنت کی نعمتوں کے مقابل تو دنیا کا کثیر سامان بھی قلیل ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اداء امانت کے عہد اور جھوٹی قسموں کے عوض متاع دنیا حاصل کرتے ہیں۔ (مظہری)

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے کوئی بات نہیں کریں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا بوڑھا زنا کرنے والا، محتاج تکبر کرنے والا اور وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے سامان دیا ہو، پھر اس کو قسم کے ساتھ بیچتا ہے اور قسم کے ساتھ خریدتا ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی، در منثور)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اجازت دی ہے کہ میں ایسے مرغے کے بارے میں بیان کروں کہ اس کی گردن عرش کے نیچے جھکی ہوئی ہے اور وہ کہتا ہے سُبْحَانَكَ مَا اَعْظَمَ رَبُّنَا اے ہمارے رب! تو پاک ہے تیری شان کتنی بلند ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ وہ شخص میرے نام کی جھوٹی قسم کھاتا ہے وہ میری قدرت کو کچھ نہیں جانتا۔ (در منثور)

أُولَئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ: یہاں فرمایا گیا کہ جو اہل کتاب اللہ کے عہد کا پاس نہیں کرتے نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں کا ذکر لوگوں سے کرتے ہیں نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کرتے ہیں اور اسی طرح جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اور ان بدکاریوں سے وہ اس ذلیل اور فانی دنیا کا فائدہ حاصل کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قسم کھا کر کسی مسلمان شخص کا حق مارا اللہ نے اس کے لیے دوزخ لازم کر دی اور جنت اس پر حرام کر دی، ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ اگرچہ تھوڑی سی چیز ہو؟ فرمایا: اگرچہ درخت پیلو کی ایک ٹہنی ہو۔ (رواہ مسلم)

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ: ان بری اور قبیح صفات کے ساتھ جو لوگ متصف ہیں، یہ آخرت میں ملنے والی بیش بہا نعمتوں سے محروم ہوں گے، وہاں جو سب سے بڑا اعزاز ملنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف ہے وہ اس سے محروم ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان سے بات تک نہیں کرے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی ناراضگی، غضب اور جلال سے کنایہ ہے کیونکہ جب کسی سے شدید ناراضگی ہوتی ہے تو اس سے بات نہیں کی جاتی۔ بعض علماء نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ ان سے ایسا کلام نہیں کرے گا جس سے ان کو خوشی ہو اور نہ ان کی طرف نظر رحمت سے دیکھے گا۔ (مظہری)

وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: یہ بھی اللہ تعالیٰ کے انتہائی غصے اور غضب کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھا گا نہیں، کیونکہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں جب کوئی کسی سے ناراض ہوتا ہے تو نہ اس کی طرف دیکھتا ہے، نہ توجہ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اس سے ہم کلام ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی ان بدقسمت و بدنصیب انسانوں پر اپنی نظر رحمت نہیں کریں گے۔

وَلَا يُزَكِّيهِمْ: مطلب یہ ہے کہ اللہ ان کا گناہ معاف نہیں کرے گا کیونکہ یہ بندوں کا حق ہے اس کا

بدلہ تو ضرور ملنا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمالناموں کی تین مدیں ہیں ایک مدوہ ہے جس کی پروا (سختی کے ساتھ) اللہ نہیں کرے گا۔ دوسری مدوہ ہے جس میں سے کوئی چیز (بغیر عوض کے) نہیں چھوڑے گا تیسری مدوہ ہے جس کو معاف نہیں فرمائے گا۔ جس مد کو معاف نہیں فرمائے گا وہ تو شرک ہے اور جس مد کی کوئی خاص پروا نہیں کرے گا وہ خود انسان کا اپنی ذات پر ظلم ہے یعنی وہ حقوق جو براہ راست خدا کے انسان پر ہیں ان کو ادا نہ کرنا جیسے کوئی روزہ ترک کر دیا یا کوئی نماز چھوڑ دی اور وہ مد جس (کے اندراجات) میں سے کوئی چیز (بغیر بدلہ کے) نہیں چھوڑے گا وہ بندوں کی باہم حق تلفیاں ہیں اس میں لا محالہ بدلہ دینا ہو گا۔ (رواہ الحاکم واحمد،)

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: یہ بد قسمت وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نعمتوں سے محروم رہیں گے، اللہ کی نظر رحمت سے محروم رہیں گے، اللہ کی ہم کلامی سے محروم رہیں گے، انہیں اللہ تعالیٰ جنت میں داخل نہیں کرے، دوزخ ان کا ٹھکانہ ہو گا، دوزخ میں انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا، یہ سب کچھ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہو گا، ان کے جرائم کی طویل فہرست کا صلہ انہیں دوزخ کی دھکتی اور شعلہ زن آگ کی شکل میں ملے گا۔

اہل کتاب کی کتاب میں تحریف

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَّلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ {۷۸} آل عمران

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبانوں کو موڑ کر کتاب بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کو کتاب سے سمجھو حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَّلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ: يَلْوُونَ یہ أَمَالَه سے ہے، اس کا معنیٰ ہے جب وہ اسے جھکا لے، مروڑ لے اور اسی سے یہ معنی ہے وہ کلام میں تحریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ اسے مقصد سے پھیر دیتے ہیں، اللَّیُّ کا اصل معنی اَلمَیلُ (ایک طرف جھکنا) ہے، لَوَی بِیَدِہٖ کا معنیٰ ہے اس نے اپنا ہاتھ پھیر دیا، اور لَوَی بِرَأسِہٖ کا معنیٰ ہے اس نے اپنا سر پھیر دیا، قرآن کریم میں دوسرے مقام پر سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَیًّا بِأَلسِنَتِهِمْ (النساء: ۴۶) یعنی حق سے عناد رکھتے ہوئے اور اس سے غیر کی طرف پھیرتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں اور وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ (آل عمران ۱۵۳) کا معنی ہے لَا تُعَرِّجُونَ عَلَيهِ تم کسی کو مڑ کر دیکھتے بھی نہیں تھے، عربی میں کہا جاتا ہے لَوَی عَلَيهِ جب وہ اس سے منہ موڑے اور سیدھا تن کر کھڑا ہو جائے، اور اللَّیُّ کا معنی ہے اَلمَطلُ مروڑنا، لوہے کو بڑھانے کیلئے کاٹنا، ٹال مٹول کرنا۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی) بحر العلوم علامہ سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لَفَرِيقًا میں لام زیادت تاکید علی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ یہ یہود ہیں، جو اللہ کی کتاب میں زیادتی کرتے تھے، جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمایا تھا۔ (جامع البیان)

اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات کی جارہی ہے جو آسمانی کتاب میں تحریف کرتا تھا، ایسا انداز اختیار کرتا تھا جس سے دوسروں کو دھوکہ ہو جاتا تھا کہ یہ جو کچھ پڑھا اور سنایا جارہا ہے یہ بھی کتاب الٰہی کا حصہ ہے، حالانکہ وہ کتاب الٰہی کا حصہ بالکل نہیں ہوتا تھا، یہ حرکت کرنے والے لوگوں میں کعب بن اشرف یہودی، مالک بن صیف، حیّ بن اخطب جیسے لوگ تھے، یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تورات میں بیان کی گئی صفات میں تحریف کرتے تھے، یہ لوگ تورات میں زانی کی سزار جم (سنگساری) میں تحریف کرتے تھے۔ (فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یہاں بھی انہی ملعون یہودیوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان کا ایک گروہ یہ بھی کرتا ہے کہ عبارت کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا دیتا ہے، یعنی اللہ کی کتاب بدل دیتا ہے، اصل مطلب اور صحیح معنی خبط کر دیتا ہے اور جاہلوں کو اس چکر میں ڈال دیتا ہے کہ کتاب اللہ یہی ہے، پھر یہ خود اپنی زبان سے بھی اسے کتاب اللہ کہہ کر جاہلوں کے اس خیال کو اور مضبوط کر دیتا ہے اور

جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ پر افترا کرتا ہے اور جھوٹ بکتا ہے، زبان موڑنے سے مطلب یہاں تحریف کرنا ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ لوگ تحریف اور ازالہ کر دیتے تھے، مخلوق میں ایسا تو کوئی نہیں جو کسی اللہ کی کتاب کا لفظ بدل دے، مگر یہ لوگ تحریف اور بے جا تاویل کرتے تھے، وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توراۃ و انجیل اسی طرح ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُتاریں ایک حرف بھی ان میں سے اللہ نے نہیں بدلا لیکن یہ لوگ تحریف اور تاویل سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور جو کتابیں انہوں نے اپنی طرف سے لکھ لی ہیں اور جسے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشہور کر رہے ہیں اور لوگوں کو بہکاتے ہیں حالانکہ دراصل وہ اللہ کی طرف سے نہیں اللہ کی اصلی کتابیں تو محفوظ ہیں جو بدلتی نہیں۔ (ابن ابی حاتم، ابن کثیر)

حضرت وہب رحمہ اللہ کے اس فرمان کا اگر یہ مطلب ہو کہ ان کے پاس اب جو کتاب ہے تو ہم بالیقین کہتے ہیں کہ وہ بدلی ہوئی ہے اور محرف ہے اور زیادتی اور نقصان سے ہرگز پاک نہیں اور پھر جو عربی زبان میں ہمارے ہاتھوں میں ہے اس میں تو بڑی غلطیاں ہیں، کہیں مضمون کو کم کر دیا گیا ہے، کہیں بڑھا دیا گیا ہے اور صاف صاف غلطیاں موجود ہیں بلکہ دراصل اسے ترجمہ کہنا زیبا ہی نہیں، وہ تو تفسیر اور وہ بھی بے اعتبار تفسیر ہے اور پھر ان سمجھداروں کی لکھی ہوئی تفسیر ہے، جن میں اکثر بلکہ کل کے کل دراصل محض الٹی سمجھ والے ہیں اور اگر حضرت وہب رحمہ اللہ کے فرمان کا یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب جو درحقیقت اللہ کی کتاب ہے پس وہ بیشک محفوظ و سالم ہے، اس میں کمی زیادتی ناممکن ہے۔ (ابن کثیر)

لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ: تاکہ اے مسلمانو! تم اس کی پڑھی ہوئی تحریف شدہ عبارت کو اللہ کی اصل کتاب کا حصہ سمجھ لو، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات کا حصہ نہیں ہے بلکہ کتاب اللہ میں تحریف کرنے والے یا خود پڑھنے والے کا یا اس کے محرفین ساتھیوں کے بنائے اور گھڑے ہوئے خانہ ساز جملے ہیں، جن کا کتاب اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ: بدبخت یہودیوں نے کس قدر جسارت کی کہ اللہ کی

کتاب کو اپنے مذموم مقاصد کی خاطر توڑ مروڑ ڈالا، پھر اپنی زبانوں کو بھی مروڑ ڈالا، الفاظ کی ادائیگی کو بھی دھوکہ دہی کے لیے اپنے اپنے مقامات سے بدل ڈالا، پھر طُرفہ تماشہ یہ کہ وہ اپنی ان دسیسہ کاریوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، وہ اپنی غلط سلط، بے ہودہ اور فرسودہ باتوں کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، حالانکہ حقائق یہ ہیں کہ یہ کلام اللہ نہیں ہے، یہ ان کا خانہ ساز کلام ہے، یہ جھوٹی باتیں ہیں، ایسا تاکیدی کلام کیا گیا ہے جس نے ان کے مزعومہ خیالات کا پردہ بھی فاش کر دیا ہے، وہ اپنے طور پر بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کلام اللہ نہیں ہے مگر جرأت اور ڈھٹائی سے اسے کلام اللہ بتاتے ہوئے ذرا شرم وحیا محسوس نہیں کرتے۔

وَيَقُولُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ: یہ بدنصیب یہودی اپنی طرف سے الفاظ وجملے بنا کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، من مانی تحریفات کرتے ہیں اور وہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم اپنا بنایا، گھڑا گھڑایا جھوٹ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حضرت سیدنا ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت تمام یہود ونصاریٰ کے بارے میں اُتری ہے، اس لیے کہ ان لوگوں نے تورات اور انجیل میں تحریف کی ہے اور اللہ کی کتاب میں وہ مضامین شامل کر دیے ہیں جو کتاب اللہ میں موجود ہی نہیں تھے۔ (فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن)

یہود ونصاریٰ کیسے تحریف کرتے تھے؟

یہود تورات میں لفظی تحریف کرتے تھے، بعض اوقات وہ الفاظ بدل دیتے، بعض اوقات وہ اپنی طرف سے عبارت بنا کر یہ کہتے کہ یہ اللہ نے فرمایا ہے اور بعض اوقات وہ بعض الفاظ بدل دیتے، بعض اوقات وہ اپنی طرف سے عبارت بنا کر یہ کہتے کہ یہ اللہ نے فرمایا ہے اور بعض اوقات وہ بعض آیات کو چھپا لیتے یا تورات سے حذف کر دیتے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ تورات میں انبیاء علیہم السلام کی طرف شراب پینے اور زنا کرنے کی نسبت بیان کی گئی ہے، حتیٰ کہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ بھی اور اس میں کوئی عاقل شک نہیں کر سکتا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے، بلکہ ان کا خود ساختہ کلام ہے۔ (تبیان)

یہودیوں کی تلبیس وتحریف بہت خطرناک حد تک دکھائی دے رہی ہے، وہ کسی خاص عنوان

وموضوع میں تحریف نہیں کرتے تھے، قرآنی نصوص سے یوں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشن ہی یہی تھا کہ آسمانی پیغام کو اصل شکل وصورت سے بگاڑ کر لوگوں کے سامنے رکھا جائے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر یہودیوں کی تحریف بارے انکشافات کیے ہیں، انہیں بعض ارباب تفسیر نے یکجا کیا ہے، یہاں ذیل میں وہ آیات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، جو یہودیوں کی کھلی تحریف کا پتہ دیتی ہیں۔

① حضرت نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثار فداکار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تذکرہ خیر آسمانی کتاب میں موجود تھا، جسے انہوں تورات سے ختم کر دیا، ارشاد ربانی ہے الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۱۵۷الاعراف) جو اس رسول کی پیروی کریں گے جو نبی امی ہے جس کا (تذکرہ) وہ اپنے پاس توراۃ وانجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو بھلائی کی تلقین کرے گا اور ان کو برائی سے روکے گا اور ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا اور ان پر سے ان کے بوجھ کو اور ان پر لدی ہوئی بیڑیوں کو اُتارے گا۔

حضرت نبی کریم ﷺ کو یہاں اُمّی کہا گیا ہے، اُمّی سے مراد اُمّ القریٰ مکہ مکرمہ کے رہنے والے، زجاج کہتے ہیں کہ اُمّی اسے کہتے ہیں جو خلقتہً اپنی ماں کی طرح ہو اور اس نے لکھائی پڑھائی نہ سیکھی ہو۔ (بحر المحیط) نبی کریم ﷺ کی صفت ومدح تورات وانجیل میں موجود تھی، مگر ان حسد کے بیمار یہودیوں نے ان باتوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔

② قرآن کریم نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، ان کے ساتھی کفار پر سخت، آپس میں شیر وشکر ہیں، انہیں آپ رکوع وسجدہ میں دیکھیں گے، وہ رضائے مولیٰ کے متلاشی ہیں، ان کی پیشانیاں داغ سجود سے دمک رہی ہیں، نشان سجدہ ان کی پیشانی پر موجود ہے، پھر قرآن کریم ہمیں بتلاتا ہے کہ ذَالِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ان کی یہ مثالیں تورات وانجیل میں موجود ہیں۔ (سورۃ الفتح آیت ۲۹)

یہود نے توراۃ میں سے سیدنا محمد ﷺ کا ذکر اور آپ ﷺ کی ان صفات کا ذکر حذف کر دیا اور اسی طرح آپ ﷺ کے اَصحاب رضی اللہ عنہم کا ذکر اور اُن کی صفات کا ذکر حذف کر دیا اور اسی طرح اور بہت سے احکام کو چھپالیا۔ (تبیان القرآن)

③ قرآن کریم اہل کتاب کی ایک اور بری عادت کا یوں ذکر کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جو واضح چیزیں لے کر تشریف لائے ہیں وہ انہیں چھپاتے پھرتے ہیں، قرآن کریم بتاتا ہے

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (المائدہ:۱۵) اے اہل کتاب! بیشک تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا جو تم سے بہت سی ایسی چیزوں کو بیان کرتا ہے جن کو تم چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگذر فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو مطلع فرمایا کہ ہمارے نبی ﷺ تمہاری بہت سی ان باتوں کو عالم آشکار کر دیتے ہیں جنہیں تم لوگ چھپاتے ہو، جو تمہاری کتاب تورات میں موجود ہیں، جنہیں اہل کتاب چھپاتے تھے ان میں ایک آیت رجم (سنگساری کے حکم والی) ہے، شراب کی حرمت کی بات ہے، سود کھانے سے متعلق حکم ہے، نبی کریم ﷺ کی مدح سرائی سے متعلق آیات ہیں، ان چیزوں پر یہودی پردہ ڈالتے تھے۔

④ قرآن کریم نے یہودیوں کی تحریف و دجل و فریب کا پردہ یوں چاک کیا ہے، ارشاد ہے مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَكِنْ لَعَنَهُمُ اللهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۴۶) النساء

جو یہودی ہیں وہ باتوں کو اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نہ مانا اور آپ سنیں سن نہ سکیں اور زبان کو موڑ کر اور دین میں طعنہ زنی کرتے ہوئے "راعنا" کہتے ہیں اور اگر وہی لوگ یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا آپ سن لیں اور ہمارا خیال فرمائیں تو ان کے لیے بہتر اور درست ہوتا لیکن اللہ نے ان کو ان کے انکار کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا تو وہ اکا دکا ہی ایمان لاتے ہیں نبی کریم ﷺ کی نعت و مدح جو ان کی کتابوں میں بیان کی گئی اس میں تحریف کرتے ہیں، اپنی نافرمانی

کا برملا اظہار کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے ساتھ سرگرم سخن ہوتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں، دین اسلام میں طعن سے کام لیتے ہیں، یہ باتیں کفریات میں سے ہیں، اسی لیے تو اللہ نے انہیں مستحق لعنت ٹھہراتے ہوئے ملعون قرار دیا ہے۔

⑤ سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی شیطانی حرکت کا یوں ذکر فرمایا ہے

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ (المائدہ:۱۳) وہ باتوں کو اپنی جگہ سے بدلنے لگے اور جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا (بڑا) حصہ انہوں نے فراموش کر دیا اور ان میں تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر آپ کو برابر ان کی خیانت کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی جو صفت ان کی کتاب میں بیان کی گئی تھی اسے انہوں نے بدل ڈالا، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ان کے لیے حلال کی تھیں انہوں نے انہیں حرام قرار دیا۔ (بحر المحیط)

⑥ وہ لوگ آسمانی پیغام سننے کے بعد اس میں تبدیلی کرتے تھے، قرآن کریم بتاتا ہے

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (البقرہ : ۷۵) ان میں کچھ لوگ اللہ کا کلام سنتے ہیں اور پھر سمجھنے بوجھنے کے بعد بھی اس میں تحریف کر دیا کرتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ یہاں عقل وخرد سے عاری ان لوگوں نے اللہ کے کلام کو سنا، سمجھا، پرکھا پھر اسے تبدیل کیا انہیں اس کا اچھی طرح علم بھی تھا کہ وہ تحریف جیسی غلط کاری کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

⑦ یہود کی ایک اور تحریف قرآن کریم کی زبانی سنیے اور ملاحظہ فرمایئے، قرآن کریم بتاتا ہے

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ (البقرہ:۵۹) تو ظالموں سے جو قول کہا گیا تھا اس کو انہوں نے دوسرے قول سے تبدیل کر دیا۔ انہیں کہا گیا تھا کہ تم لوگ یہاں دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو گے مگر وہ سرینوں کے بل چل کر آگے بڑھے، انہیں گناہوں سے معافی مانگنے کا حکم دیا گیا تھا مگر انہوں نے معافی کے الفاظ بدل کر سرخ گندم مانگنا شروع کر دیا تھا، یہ ان کی تحریف تھی جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اس قول کو بدل دیا تھا جو انہیں کہنے کے لیے اور کرنے کے

لیے کہا گیا تھا۔

⑧ یہود کی ایک اور خرابی جو تحریف سے متعلق تھی اس کا یوں ذکر کیا گیا ہے

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (البقرہ:۷۹) بس ان لوگوں کے لیے تباہی ہے جو اپنے ہاتھوں کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ معمولی دام حاصل کر لیں۔

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ایک گروہ کا جو حال بیان کیا ہے، یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس میں ہر وہ قوم مبتلا ہو جاتی ہے جو دین کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جو نام نہاد دیندار ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک دین اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت ان کی اغراض دنیاوی میں سے ادنیٰ غرض کے برابر بھی نہیں ہوتی اور ان کی ذمہ داری کی حس اس قدر ماند پڑ جاتی ہے کہ ان کا دل اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بھی نہیں چوکتا، وہ لوگوں اور بندوں کی چاپلوسی کی خاطر آیات الٰہی میں تبدیلی کرتے ہیں اور اپنی غیر صحت مند خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اللہ کے دین میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اس خطرناک مقام سے آگاہ کرتے ہیں جہاں قدم پھسل جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اپنے مقام قیادت کو کھو دیا۔ (فی ظلال القرآن)

ان آیات کے مجموعی تأثر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ گروہ کتاب اللہ میں سے مجازی تعبیرات پر مشتمل بعض جملے تلاش کر لیتا تھا اور پھر ان آیات کو توڑ مروڑ کر ان سے ایسے معانی نکال لیتا تھا، جن کی متحمل وہ آیات نہ تھیں، یوں وہ اپنی تاویلات کے ذریعہ عجیب معانی نکالتے اور ان پڑھ لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ یہ مفاہیم کتاب اللہ کے مدلولات ہیں، حالانکہ وہ خود ان کے ایجاد کردہ تھے، وہ لوگوں سے کہتے تھے یہ ہے وہ بات جو اللہ نے کہی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہوتی تھی، ان تاویلات کا مقصد اور ہدف یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُلوہیت (خدا ہونا) ثابت کر دیں یعنی تین اُقنوم باپ، بیٹا اور روح القدس، تین بھی اور ایک بھی اور وہ ایک اللہ ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے تصور سے پاک ہے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایسے کلمات روایت کرتے تھے

جو ان کے مزعومات کی تائید کرتے تھے۔(فی ظلال القرآن)

کتاب، حکمت، نبوت اور ربّانی

سوال یہ آیت مبارکہ کس مناسبت سے نازل ہوئی؟ اس کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ {۷۹} وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ {۸۰} آل عمران

جواب ترجمہ: کسی انسان سے یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ نے اس کو کتاب اور حکمت و نبوت دی ہو پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ، چونکہ تم کتاب کی تعلیم کرتے ہو اور جیسے تم خود اس کو پڑھتے رہے ہو۔

شانِ نزول: ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب اہل نجران کے وفد کے یہود و نصاریٰ کے اہم علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی تو ابو رافع قرظی نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں جیسا کہ نصاریٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی عبادت کرتے ہیں تو اہل نجران میں سے ایک نصرانی نے کہا جس کو رئیس (ربّیس، ریس) کہا جاتا تھا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ ہم سے یہی چاہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی پناہ! کہ ہم غیر اللہ کی عبادت کریں، یا ہم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کا حکم کریں اور نہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں اور نہ اس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے تو ان دونوں کی باتوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ نازل فرمائی۔(الدلائل بیہقی، در منثور، العجاب فی بیان الاسباب)

② حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ! ہم آپ کو ایسے ہی سلام کرتے ہیں جیسا کہ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں، کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

سجدہ نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں لیکن تم اپنے نبی کا اکرام کرو اس کے اہل کے حق کو پہچانو کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کو سجدہ کرے تو (اس پر) اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (عبد بن حمید، در منثور)

③ مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ سے متعلق نازل کی گئی ہے، جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کی۔ (اسباب النزول) لبشر سے عیسیٰ مراد ہیں، کتاب سے یہاں انجیل مراد ہے۔ (اسباب النزول)

④ ابن جریج رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ یہود میں سے کچھ لوگ کتاب اللہ میں تحریف کرنے کے بعد لوگوں کی پوجا کرنے لگ گئے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (العجاب فی بیان الاسباب للحافظ)

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّي مِن دُونِ اللّٰهِ: اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی تحریف کو بیان فرمایا تھا اور فرمایا تھا کہ اہل کتاب کی عادت اور ان کا طریقہ کتاب میں تحریف اور تبدیل کرنا ہے اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان کی من جملہ تحریفات میں سے یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے خدا ہونے کے دعوی دار تھے اور وہ اپنی امت کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دیتے تھے حالانکہ کسی بشر کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت عطا کرے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ (تبیان القرآن)

امام بغوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ** سے مراد حضرت عیسی علیہ السلام ہیں، اللہ نے یہاں اس لیے یہ بات ذکر فرمائی ہے کیونکہ نجران کے عیسائی کہا کرتے تھے کہ عیسی علیہ السلام نے انہیں کہا ہے کہ تم مجھے رب بنالو، اس پر اللہ نے فرمایا کہ عیسی علیہ السلام کو کتاب انجیل دی گئی ہے، تو کسی ایسے انسان کے لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ اسے کتاب دیں پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ مجھے اللہ کے سوا رب بنالو۔ (تفسیر بغوی)

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ماکان لبشر سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں، مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ انہیں قرآن کریم جیسی کتاب

عطا فرمائیں اور وہ لوگوں سے کہیں کہ اللہ کے علاوہ میری عبادت کرو۔

بشر، انسان اور آدمی: بشر انسان کو کہتے ہیں، واحد ہو یا اس کی جمع ہو اس کی جمع ابشار ہے، بشر کا معنی انسان کی ظاہری کھال ہے اور کھال کو کھال سے ملانا مباشرت ہے اور بشارت اور بشری کا معنی خوشخبری دینا ہے۔ (القاموس المحیط) بشر انسان اور آدمی میں فرق ہے، ظاہری کھال اور چہرے، مہرے کے اعتبار سے بشر کہتے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے انسان کہتے ہیں اور نسب کے اعتبار سے آدمی کہتے ہیں۔ (تبیان) کھال کے ظاہر کو بشرہ کہتے ہیں اور کھال کے باطن کو اُدمہ کہتے ہیں، انسان کو اس کی ظاہری کھال کے اعتبار سے بشر کہتے ہیں کیونکہ جانوروں کی کھالوں پر بڑے بڑے بال ہوتے ہیں یا اُون ہوتی ہے، قرآن مجید میں جب انسان کے جسم اور اس کے ظاہر کا اعتبار کیا جاتا ہے تو پھر اس پر بشر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ (مفردات امام راغب اصفہانی، تبیان القرآن)

تمام انسان بشریت میں انبیاء علیہم السلام کے مساوی ہیں اور علوم و معارف اور اعمال حسنہ کی خصوصیت کی وجہ سے ان کو عام انسانوں پر فضیلت حاصل ہے۔ (تبیان) انبیاء علیہم السلام بشریت میں عام انسانوں کے مساوی ہیں لیکن وحی کی خصوصیت کی وجہ سے عام انسانوں سے متمیز ہیں، عام انسانوں اور انبیاء علیہم السلام میں بشریت بہ منزلہ جنس ہے اور استعداد نزول وحی اور ادراک غیب، انبیاء علیہم السلام کے لیے بہ منزلہ فصل ممیز ہے، حواس اور عقل سے ادراک کرنا عام انسانوں اور انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے جس سے وہ عالم شہادت میں ادراک کرتے ہیں اور عالم غیب کا ادراک کرنا، جنات اور فرشتوں کو دیکھنا اور ان سے کلام کرنا اور حامل وحی ہونا، یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے۔ (تبیان القرآن)

حکم اور نبوت: کتاب کے بعد یہاں اللہ نے حکم کا لفظ ذکر فرمایا ہے، حکم سے مراد علم و فہم ہے، حکم کا معنی ہے شریعت کی فقہ (سمجھ) اور قرآن کی فہم اور اس کا تقاضا شریعت پر عمل کرنا ہے، سدی نے کہا اس سے مراد نبوت ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد حقائق قرآن کی فہم ہے، ابن زید نے کہا اس سے مراد اللہ کی آیات اور اس کی حکمتوں کو جاننا ہے، بعض علماء نے کہا اس سے مراد وہ علوم اور معارف ہیں جن سے اُولوالعزم رسل مختص ہیں اور باقی انبیاء ان کے تابع ہیں۔ (المفردات، تبیان) بعض علماء نے کہا حکم سے مراد یہاں سنت ہے، کیونکہ اس آیت میں کتاب کے بعد حکم کا ذکر

فرمایا ہے اور ظاہر یہ ہے کہ حکم سے مراد یہاں قضاء ہے یعنی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں تدریجاً مراتب کا ذکر فرمایا ہے پہلے کتاب کا ذکر فرمایا جس سے علم حاصل ہوتا ہے پھر اس سے ترقی کر کے قضا کا ذکر فرمایا کیونکہ جب انسان کو علم میں مہارت تامہ حاصل ہو جائے تو پھر وہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، پھر اس کے بعد سب سے بلند مرتبہ کا ذکر فرمایا جو نبوت ہے اور تمام خیرات کا مجمع ہے۔ (البحر المحیط)

اس تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان پہلے عالم بنتا ہے پھر قاضی بن جاتا ہے پھر نبی بن جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے نبی بنانا ہوتا ہے اس کو ایسی صفات مخصوصہ کے ساتھ پیدا کرتا ہے جو نبی کے لیے ضروری ہیں، پھر پہلے مرتبہ میں اس کے علم کو ظاہر فرماتا ہے، پھر اس کی قضاء کے مرتبہ کو ظاہر فرماتا ہے پھر اس کو مقام بعثت پر فائز کرتا ہے اور اس کو اعلان نبوت کا حکم دیتا ہے۔ (تبیان القرآن)

ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ: نبوت اللہ کی طرف سے خبر دینے والے عظیم اور بلند مرتبے کو کہا جاتا ہے، کار نبوت یہ نہیں ہے کہ نبی لوگوں سے یہ کہیں کہ تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر ہماری عبادت کرو، یہاں فرمایا کہ انبیاء کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ وہ ربانی بن جائیں، ربانیین کا واحد ربانی ہے، یہ رب کی طرف منسوب ہے، اسی طرح مولوی وہ شخص ہے جو مولا کی طرف منسوب ہے، اس کا معنی ہے مولا والا، اسی طرح ربانی کا معنی ہے رب والا، ربانی اس عالم کو کہتے ہیں جو علم کے تقاضوں پر ہمیشہ عمل کرے، فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات پر عامل ہو اور ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے مجتنب ہو، جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فوت ہوئے تو محمد بن حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا اس امت کے ربانی فوت ہو گئے۔ رَبَّانِیٌّ کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں، یہ لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے رِبِّی کا لفظ توراۃ اور انجیل میں بہت آیا ہے، صورت ذرا دونوں کی مختلف ہے لیکن معناً کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ (تدبر قرآن)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم فقہاء اور علماء بن جاؤ، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم حکماء اور علماء بن جاؤ،

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عالم اسے کہا جاتا ہے جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سکھانے والے فقیہ بن جاؤ، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ربانی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو لوگوں کو بڑے علم سے پہلے چھوٹا علم سکھائے۔

حضرت عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حکماء، علماء اللہ کی مخلوق کے لیے ناصح ہوتے ہیں، ابو عبیدہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی سے سنا وہ کہہ رہا تھا کہ الرَّبَّانِيُّ الْعَالِمُ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَالْأَمْرِ وَالنَّهْيِ، الْعَارِفُ بِأَنْبَاءِ الْأُمَّةِ وَمَا كَانَ وَمَا يَكُونُ ربانی اس عالم کو کہا جاتا ہے جو حلال و حرام کو جانتا ہو، امر و نہی کو جانتا ہو، امت کے احوال سے آگاہ ہو، بعض فرماتے ہیں کہ ربانی کا مقام احبار کے مقام سے بلند ہوتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ احبار کا مقام علماء کے مقام سے بلند ہوتا ہے، ربانی انہیں کہا جاتا ہے جو لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ علم بھی رکھتے ہوں۔ الرَّبَّانِيِّ الْعَالِمُ بِدِينِ الرَّبِّ الَّذِي يَعْمَلُ بِعِلْمِهِ، لِأَنَّهُ إِذَا لَمْ يَعْمَلْ بِعِلْمِهِ فَلَيْسَ بِعَالِمٍ، ربانی رب کا دین جاننے والا جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے، کیونکہ جو شخص اپنے علم پر عمل نہیں کرتا وہ عالم نہیں ہے۔ (قرطبی) ربانی منسوب الی الرب ہے، اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کامل العلم اور کامل العمل ہو، اس میں الف اور نون مبالغے کے لیے ہے، جس دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوا تو اس دن حضرت محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ نے کہا تھا الْيَوْمَ مَاتَ رَبَّانِيُّ هَذِهِ الْأُمَّةِ آج اس امت کا عالم ربانی فوت ہو گیا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَا مِنْ مُؤْمِنٍ ذَكَرٍ وَلَا أُنْثَى حُرٍّ وَلَا مَمْلُوكٍ إِلَّا وَلِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِ حَقٌّ أَنْ يَتَعَلَّمَ مِنَ الْقُرْآنِ وَيَتَفَقَّهَ فِي دِينِهِ. کوئی مومن و مرد و عورت اور آزاد و غلام نہیں مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرے اور اس کے دین میں تفقہ حاصل کرے۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ: ابو عمرو اور اہل مدینہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ علم سے ماخوذ ہے اور ابو حاتم نے اسی قرأت کو پسند کیا ہے، ابو عمرو نے کہا ہے، اور اس کی تصدیق تَدْرُسُونَ کرتا ہے (کیونکہ) التدریس سے تشدید کے ساتھ تُدَرِّسُونَ نہیں کہا گیا، ابن عامر اور اہل کوفہ نے تُعَلِّمُونَ التَّعْلِيم سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عبید نے اسے

اختیار کیا ہے اور کہا ہے: کیونکہ یہ دونوں معنوں (یعنی) تُعَلِّمُونَ اور تُدَرِّسُونَ کو جامع ہے۔

مکی نے کہا ہے: تشدید زیادہ بلیغ ہے، لِأَنَّ كُلَّ مُعَلِّمٍ عَالِمٌ بِمَعْنَى يَعْلَمُ وَلَيْسَ كُلُّ مَنْ عَلِمَ شَيْئًا مُعَلِّمًا، کیونکہ ہر معلم عالم ہوتا ہے یعنی وہ جانتا ہے، لیکن ہر وہ شخص جو کسی شے کا علم رکھتا ہو وہ معلم نہیں ہوتا، پس تشدید علم (سیکھنا) اور تعلیم (سکھانا) دونوں پر دلالت کرتی ہے اور تخفیف صرف علم (سیکھنے) پر دلالت کرتی ہے، پس تعلیم (سکھانا) ابلغ اور زیادہ قابل تعریف ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ ذم میں ابلغ ہے، جنہوں نے تخفیف کی قرأت کو ترجیح دی ہے، انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ رسالت پر فائز کیے جانے والے، تاج نبوت اپنے سروں پر سجانے والے کبھی بھی اپنے پیروکاروں کو وہ تعلیم نہیں دے سکتے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، ان کی تعلیمات میں یہ بات سر فہرست ہوتی ہے کہ لوگو! تم اللہ والے بن جاؤ، تم ربانی بن جاؤ، تم علماء اور فقہاء بن جاؤ۔

قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں" یعنی تم ربانی ہو جاؤ اس وجہ سے کہ تم کتاب کے عالم اور معلم ہو اور ہمیشہ پڑھتے اور یاد رکھتے ہو، تدرسون کا معنی یہ ہے کہ ہمیشہ کتاب کو پڑھنے اور یاد رکھتے ہوئے ممکن ہے کہ لوگوں کے سامنے پڑھنا یعنی لوگوں کو پڑھانا مراد ہو۔ صحاح میں ہے دَرَسَ الدَّارُ یعنی گھر مٹ گیا (اس کے) نشانات باقی رہ گئے۔ درس الکِتَابَ وَالْعِلْمَ کتاب کو اور علم کو پڑھا یعنی کتاب اور علم کا اثر اپنی یاد داشت میں لے لیا اور چونکہ یاد داشت ہمیشہ پڑھتے رہنے سے ہوتی ہے، اس لیے ہمیشہ پڑھتے رہنے کی تعبیر لفظ درس سے کی اللہ نے فرمایا: وَ دَرَسُوا مَا فِيهِ، وَ بِمَا كُنتُم تَدرُسُون حاصل مراد یہ ہے کہ چونکہ تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے اور جانتے سکھاتے ہو اس لیے ربانی ہو جاؤ، کیونکہ جاننے کا فائدہ عمل کرنا اور اپنی اصلاح کرنا ہے اور تعلیم کی غرض دوسروں کی اصلاح ہے مگر دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح لازم ہے تاکہ آیت: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْن اور اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے مصداق نہ ہو جاؤ۔ (مظہری)

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا: کہ نبی تم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو اپنا رب بنالو، تمام انبیاء علیہم السلام توحید کی دعوت دینے کے لیے تشریف لائے تھے وہ غیر اللہ کو رب ماننے کی دعوت کیسے دے سکتے تھے؟

اَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: کیا نبی تم کو کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم اللہ کے فرمان بردار ہو۔ اگر تم مؤحد ہو تو نبی تم کو توحید سے کیوں ہٹائے گا؟ وہ شرک کی دعوت نہیں دے سکتا، ہاں اپنی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دے گا، جس کا وہ مامور ہے اور جس پر ایمان لائے بغیر تم مومن نہیں ہوسکتے اور تمہارا عقیدہ توحید اس پر ایمان لائے بغیر تمہیں نجات نہیں دلا سکتا۔ (انوار البیان)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت یہ تھی کہ صرف اللہ کے بندے بنو اسی کی عبادت کرو نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی کی دعوت دی اور اسی دعوت پر محنت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی دعوت کے لیے مشقت اٹھائی اور جہاد کیے، ایک مرتبہ فارس کے جہاد کے موقع پر حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ بطور سفیر رستم کے پاس تشریف لے گئے، رستم اہل فارس کا صاحب اقتدار تھا، رستم نے کہا کہ تم لوگ کیوں آئے ہو انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف لے جائیں اور موجودہ دین میں ان کے ظلم سے بچا کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ (البدایہ والنہایہ، انوار البیان)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا گیا عہد و پیمان

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ {۸۱} فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ {۸۲} آل عمران

جواب ترجمہ: اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں جو کچھ بھی تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں

پھر آجائے تمہارے پاس رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اور ضرور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے اس پر میرا مضبوط عہد قبول کر لیا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم نے اقرار کر لیا، فرمایا سو تم گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ پھر جو شخص اس کے بعد روگردانی کرے گا سو یہی لوگ نافرمان ہیں۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ: یہاں بیان ہو رہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ لیا کہ جب کبھی ان میں سے کسی کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کتاب و حکمت دے اور وہ بڑے مرتبے تک پہنچ جائے پھر اس کے بعد اسی کے زمانے میں رسول آجائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت و مدد کرنا اس کا فرض ہو گا یہ نہ ہو کہ اپنے علم و نبوت کی وجہ سے اپنے بعد والے نبی کی اتباع اور مدد سے رک جائے۔ (ابن کثیر)

میثاق النبیین سے مراد یہ ہے کہ تمام نبیوں پر یہ بات لازم کر دی کہ اپنے بعد آنے والے نبی پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت و مدد کریں، اگر اس کا زمانہ نہ پائیں تو اپنی قوم کو ترغیب دیں کہ وہ آنے والے نبی پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں، بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء کرام علیہم السلام سے خصوصی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا گیا ہے، اس کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی کرتی ہے کہ جو نبی بھی آتا رہا اس سے یہی عہد و پیمان لیا جاتا رہا کہ اگر تمہارے زمانے میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں اور تم زندہ ہو تو ان پر آپ نے ایمان لانا ہے اور ان کی مدد کرنا ہے، اس پر وہ اپنی قوم سے عہد لیا کرتا تھا۔ (ابن جریر، المقتطف)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد لیا کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں اور عیسیٰ علیہ السلام سے عہد لیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ رسول کی تنوین تنکیر کے لیے ہو اور بعض مفسرین رحمہم اللہ نے یوں بیان فرمایا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سب نبیوں سے عہد لیا کہ تمہاری موجودگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے تو ان پر ایمان

لانا اور ان کی مدد کرنا اور اپنی امتوں کو بھی اس کا حکم دینا کہ ان میں سے جو بھی ان کا زمانہ پالے ان پر ایمان لائے اور ان کی مدد کرے۔ (معالم التنزیل ج ۱، انوار البیان)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک طویل سلسلہ رہا، ان میں کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر نہ کیا ہو، ان سے عہد و پیمان لیا گیا کہ وہ اپنی قوم کو ان کے بارے میں بتائیں گے ان سے یہ بھی عہد لیا گیا کہ وہ اپنے بعد والے لوگوں کے سامنے بھی اس بات کو بیان کریں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات و نعت سے متعلق کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھیں گے، پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان اہل کتاب میں مبعوث ہوئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، ان کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم توحید اور پہلی شریعتوں کی بعض چیزوں کی تصدیق فرماتے تھے، یہ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام سے عہد و پیمان لیا اور انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں سے میثاق لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ خیر کریں گے، پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا دیا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ بات یاد دلائی جو انہیں ان کے انبیاء کرام علیہم السلام نے بتلائی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے عہد لیا انبیاء علیہم السلام سے جب تمہارے پاس کتاب و حکمت آجائے، پھر تمہارے پاس عظیم الشان رسول آجائے یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تمہارے پاس موجود تورات کی تصدیق کرنے والے ہوں گے تو تم ان پر ضرور بہ ضرور ایمان لانا اور ان کی مدد بھی کرنا، یہاں ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ تم نے ان کی تصدیق بھی کرنا ہے۔ (بحر العلوم)

قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ: پھر ان سے پوچھا کہ کیا تم اقرار کرتے ہو؟ اور اسی عہد و میثاق پر مجھے ضامن ٹھہراتے ہو، سب نے کہا ہاں ہمارا اقرار ہے، تو فرمایا گواہ رہو اور میں خود بھی گواہ ہوں۔ (ابن کثیر) کیا تم نے اس عہد و پیمان کو قبول کر لیا جو میں نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تم سے لیا تھا کہ تم نے ان پر ایمان لانا ہے۔

زجاج کہتے ہیں کہ فاشھدوا کا معنیٰ ہے ثابت قدم رہو، کیونکہ گواہ وہ ہوتا ہے جو مدعی کے دعویٰ کو درست قرار دیتا ہے، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی گواہی کا مطلب یہ ہے کہ وہ

انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت ورسالت کو معجزات ودلائل کے ساتھ ثابت کرتا ہے۔علامہ قتبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ إِصْرٌ کا اصل معنیٰ بوجھ ہے، نبیوں سے لیے گئے عہد وپیمان کو إِصْرٌ اس لیے کہا گیا ہے، کیونکہ عہد وپیمان عہد کرنے والے کو اس بات سے روکتا ہے جو اس امر ثقیل کی مخالفت کرتا ہے۔

فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ: اللہ تعالیٰ نے یہاں ان اہل کتاب کی مذمت کی ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو جھٹلایا، جنہوں نے ان پر بہتان تراشے، انہیں اللہ تعالیٰ نے فاسق قرار دیا ہے، فاسق فسق سے ہے، فسق لغت میں ایک حالت سے دوسری حالت، ایک طریقے سے دوسرے طریقے کی طرف جانے کو کہا جاتا ہے، پھر اس کا بہت زیادہ استعمال نیکی سے نکل کر شر کی طرف جانے والے پر کیا جانے لگا۔(تفسیر القرآن للقرآن)

اب اس عہد ومیثاق سے جو پھر جائے وہ قطعی فاسق اور بدکار ہے، جس نے اس عہد کے بعد رو گردانی کی، عہد کو پورا نہ کیا، کسی بھی ایک نبی کو جھٹلایا تو ایسے لوگ خدا تعالیٰ کے نافرمان ہیں اور نافرمانی کے بدترین مرتبہ میں ہیں کیونکہ وہ کافر ہیں، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے تو اللہ کی نافرمانی کا صدور ہو ہی نہیں سکتا، ان کی اُمتوں نے اس عہد سے منہ موڑا اور کفر اختیار کیا، یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے اور یہود ونصاریٰ دونوں قومیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی منکر ہو کر کفر پر مصر رہیں۔(انوار البیان)

حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے عہد لیا کہ اس کی زندگی میں اگر اللہ تعالیٰ اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے تو اس پر فرض ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کرے اور اپنی امت کو بھی وہ یہی تلقین کرے کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں لگ جائے۔(ابن کثیر)

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ! میں نے ایک دوست قریظی یہودی سے کہا تھا کہ وہ توراۃ کی جامع باتیں مجھے لکھ دے اگر آپ فرمائیں تو میں انہیں پیش کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا، حضرت عبد اللہ ثابت نے کہا کہ تم نہیں دیکھتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ کا کیا حال ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے میں اللہ کے رب ہونے

پر اسلام کے دین ہونے پر محمد ﷺ کے رسول ہونے پر خوش ہوں۔

اس وقت حضور ﷺ کا غصہ دور ہوا اور فرمایا قسم ہے اس اللہ تعالیٰ کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تم میں آجائیں اور تم ان کی تابعداری میں لگ جاؤ اور مجھے چھوڑ دو تو تم سب گمراہ ہو جاؤ گے، تمام امتوں میں سے میرے حصے کی امت تم ہو اور تمام نبیوں میں سے تمہارے حصے کا نبی میں ہوں۔ (مسند احمد، ابن کثیر)

مسند ابو یعلی میں لکھا ہے اہل کتاب سے کچھ نہ پوچھو وہ خود گمراہ ہیں تو تمہیں راہ راست کیسے دکھائیں گے؟ بلکہ ممکن ہے تم کسی باطل کی تصدیق کر لو یا حق کی تکذیب کر بیٹھو اللہ کی قسم اگر موسیٰ علیہ السلام بھی تم میں زندہ موجود ہوتے تو انہیں بھی بجز میری تابعداری کے اور کچھ حلال نہ تھا، بعض احادیث میں ہے اگر موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا، پس ثابت ہوا کہ ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، جس زمانے میں بھی آپ کی نبوت ہوتی آپ ﷺ واجب الاطاعت تھے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی تابعداری پر جو اس وقت ہوں آپ ﷺ کی فرمان برداری مقدم رہتی، یہی وجہ تھی کہ معراج والی رات بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام کے امام آپ ﷺ ہی بنائے گئے، اسی طرح میدان محشر میں بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو انجام تک پہنچانے میں آپ ہی شفیع ہوں گے، یہی وہ مقام محمود ہے، جو آپ ﷺ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں، تمام انبیاء علیہم السلام اور کل رسول علیہم السلام اس دن اس کام سے منہ پھیر لیں گے بالآخر آپ ﷺ ہی خصوصیت کے ساتھ اس مقام میں کھڑے ہوں گے۔ (ابن کثیر)

اسلام کل کائنات کا دین ہے

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ {۸۳} قُلْ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ

مُسْلِمُونَ {۸۴}آل عمران

جواب ترجمہ: تو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہیں جبکہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی خوشی یا طاقت سے اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرمادیجیے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور اس پر جو ابراہیم واسمعیل اور اسحق ویعقوب اور ان کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دیا گیا، ہم ان میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ) کے فرمان بردار ہیں۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اہل کتابین یعنی یہود اور نصاری جو توراۃ اور انجیل کے حامل ہیں، دین ابراہیمی کے بارے میں اپنے باہمی اختلاف کا معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے، ہر فرقے کا خیال تھا کہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا زیادہ دعویدار اور حق دار ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ كِلَا الفَرِيْقَيْنِ بَرِيءٌ مِّنْ دِيْنِ إِبرَاهِيْمَ دونوں فریق دین ابراہیمی (کی قربت) سے بری ہیں، اس پر وہ ناراض ہوگئے، انہوں نے کہا کہ لَا نَرْضَى بِقَضَائِكَ وَلَا نَأْخُذُ بِدِيْنِكَ خدا کی قسم! ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر رضامند نہیں ہیں اور نہ ہی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کریں گے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ نازل کی۔ (اسباب النزول، خازن، روح)

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ: سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے عہد وپیمان لینے کا ذکر فرمایا کہ ان پر اور ان کی امتوں پر یہ بات لازم ہے کہ وہ نبی آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے، ان کی تصدیق کریں گے اور ان کی مدد ونصرت کریں گے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی تصدیق کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جو دین اسلام لے کر آئیں گے اسے تسلیم کیا جائے، دین اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے، جسے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے لیے پسند کرلیا ہے، یہاں اسی دین کو دین اللہ (اللہ کا دین) قرار دے کر واضح کردیا گیا کہ کیا یہ لوگ اس دین کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جس کے سامنے ساری کائنات سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے، یہاں یہود ونصاریٰ سے فرمایا جارہا ہے کہ کیا وہ دین اللہ (اللہ کے دین) کے علاوہ کسی اور

دین کی تلاش میں ہیں، باوجود یکہ ان سے عہد وپیمان لیا جاچکا ہے، اس کے باوجود کہ یہ لوگ اس عہد وپیمان پر عمل پیرا ہونے کا اقرار کرچکے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ انہیں گواہ بھی بناچکے ہیں۔

شیخ اسعد حامد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں کہ کوئی شخص اس کے دین کے علاوہ کسی چیز کو تلاش کرے، اللہ کا دین وہ ہے جو اس نے اپنی کتابوں میں نازل کیا ہے، جو اس نے اپنے رسولوں کو دے کر بھیجا ہے، وہ دین اسلام ہے، جو ایک اکیلے کی طرف بلاتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ (ایسر التفاسیر)

علامہ وہبہ بن مصطفےٰ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "خلاصہ یہ ہے کہ دین حق اللہ کے لیے جھکنے اور اس کے لیے اخلاص کا نام ہے، اللہ کا دین ایک ہی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے اَدیان کے عام اُصول ایک ہی ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں، ایک دوسرے کی مدد ونصرت کرتے ہیں، ایک دوسرے کی دعوت وتبلیغ کی تائید کرتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام سارے کے سارے اللہ کے بندے ہوتے ہیں جو اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی ذات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہوتے ہیں، یکسو ہو کر اس کے دین کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں، انہوں نے اکمل وکامل طریقے سے حق رسالت ادا کیا، انسانوں پر لازم اور ضروری ہے کہ ان کے راستے پر چلیں اور ان کے کھینچے ہوئے خطوط کی پیروی کریں، بلا کسی اختلاف، نزاع اور دشمنی کے ان کی سنتوں پر چلیں، ان کی سنتوں اور طریقوں کے مقابلے میں موروثی چیزوں کی پیروی نہ کریں، انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس جو کتاب وحکمت موجود ہے اس کی پیروی ان پر لازم ہے، اس آخری صورت میں تمام ادیان کا دھارا اسلام ہی کی طرف بہتا ہے اور تمام کے تمام احکام رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں ڈھلتے ہیں، قرآن کریم اپنے سے پہلے والی کتابوں اور پیغامات سماویہ کی تصدیق کرتا ہے اور ان پر نگہبان بھی ہے، تو اللہ کا دین یک ہی ہے، دین نام ہے ایک ہی رب کی عبادت کا۔ (التفسیر المنیر فی العقیدۃ والشریعۃ والمنہج)

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا: یہاں واؤ حالیہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ دین اسلام کے علاوہ کسی دین کو کیونکر تلاش کرسکتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمینوں کی سب مخلوقات خوشی اور ناخوشی سے اس کے لیے اسلام لائیں، اس کا مطلب واضح ہے کہ جو کچھ نبی کریم

ﷺ اللہ تعالیٰ کے پاس سے لے کر آئے اس کو ماننا، قبول کرنا اور اس کی تصدیق کرنا ہے اور اسلام کا معنی ہے اطاعت سے سر تسلیم خم کرنا اور یہاں جس طرح کی سرافگندگی آسمان وزمین کی طرف سے بتلائی جارہی ہے اس کا یہی مطلب ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، اس سے مراد فرشتے، جنات اور انسان ہیں۔ (المقتطف) مراد ملائک، انس وجن اور وہ مخلوقات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (اوضح التفسیر) اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی چاہت ومنشاء سے مخلوق کو پیدا کیا، ان میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، لمبے تڑنگے بھی ہیں اور چھوٹے وبونے بھی، تندرست بھی ہیں اور بیمار بھی یہ سبھی اطاعت وسرافگندگی پر مجبور ہیں، ان میں جو تندرست ہے وہ تو خوشی سے اطاعت کرتا ہے کیونکہ وہ اس سے محبت رکھتا ہے، بیمار اطاعت وسرافگندگی کرتا ہے، جھکتا ہے مگر جھکنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ (اعراب القرآن للنحاس) اس سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ اس کے سامنے جھکا ہوا ہے یہ جھکاؤ اور اطاعت یا تو خوشی اور اختیار سے ہے جیسے اہل ایمان کی اطاعت وانقیاد کیونکہ وہ ہر اچھی اور بری تقدیر میں، ہر حال میں اس سے راضی اور خوش ہیں، وہ خوشحالی وبدحالی، تنگی اور آسانی ہر حال میں اس کی صدا پر لبیک کہنے والے ہیں، یا یہ انقیاد وجھکاؤ مسخر کرنے اور زبردستی سے کروایا جارہا ہے، جیسے کافر لوگ ہیں، کیونکہ یہ لوگ بھی تو اس کی سلطنت عظیم اور اس کی قدرت نافذہ کے ماتحت ہیں، وہ اپنے کفر کے باوجود اس کی تقدیر وقضا کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس لیے یہ لوگ اس کی سلطنت کے سامنے مطیع ومنقاد ہیں، سرافگندہ ہیں، کیونکہ ان کے لیے اور ان کے علاوہ کسی اور کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں بچتا کہ وہ کسی ایسی چیز کو روک سکیں یا دور کر سکیں جس کا وہ ذات عالی ان سے ارادہ رکھتی ہے۔ (تفسیر الوسیط للطنطاوی)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: وَاللّٰهِ لَا يَجْعَلُ اللّٰهُ مَنْ دَخَلَ فِي الْإِسْلَامِ طَوْعًا كَمَنْ دَخَلَهُ كَرْهًا اللہ کی قسم! جو شخص اسلام میں خوشی سے داخل ہوا اس جیسا اس شخص کو نہیں بنایا جو زبردستی اسلام میں داخل ہوا۔ حضرت یحییٰ رحمہ اللہ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ اس سے مراد منافق ہے یا وہ شخص جو اس پر قتل کیا گیا۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان

والا شخص تو خوشی سے اس کی اطاعت کرتا ہے، اس کا اسے نفع بھی ہوتا ہے اور اس سے قبول بھی کیا جاتا ہے، جب کہ کافر ناخوشی اطاعت کرتا ہے جو اس کی طرف سے قبول نہیں کی جاتی اور نہ ہی اسے نفع دیتی ہے۔

حضرت یحییٰ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ منافق وہ شخص ہے جو دل سے اسلام قبول نہیں کرتا۔ (تفسیر القرآن العزیز لابن ابی زمنین مالکی) الطَّوْعُ: سہولت کے ساتھ انقیاد و اتباع کرنا۔ الْكَرْهُ: مشقت کے ساتھ اتباع کرنا، نفس کے انکار کے ساتھ بات ماننا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں سے کسی کے لیے کوئی سبیل نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد اور منشاء کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرے۔ (غریب القرآن) آسمان والے سہولت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کرتے ہیں، جب کہ زمین والوں میں سے بعض سہولت کے ساتھ سجدہ کرتے ہیں اور بعض مشقت کے ساتھ جیسے منافقین۔ (فتح الرحمٰن فی تفسیر القرآن)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کارہ اس وقت اسلام قبول کرتا ہے جس وقت اس کا اسلام قابل قبول نہیں ہوتا، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب موت سامنے دکھائی دیتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الغافر میں فرمایا فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا انہیں ان کا ایمان اس وقت نفع نہیں دے گا جب وہ ہماری پکڑ کو دیکھیں گے۔ (سورۃ الغافر آیت ۸۵) علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ملائکہ علیہم السلام، انبیاء علیہم السلام اور مرسلین علیہم السلام کا ایمان طائع (خوشی سے اسلام قبول کرنے والے) کی طرح ہوتا ہے۔ (تفسیر طبری)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے فرمان أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً پر ارشاد فرمایا کہ الْمَلَائِكَةُ أَطَاعُوهُ فِي السَّمَاءِ وَالْأَنْصَارُ وَعَبْدُ الْقَيْسِ فِي الْأَرْضِ آسمانوں میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں، جب کہ زمین میں انصار اور عبدالقیس اللہ کی بندگی کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَإِنَّ أَصْحَابِي أَسْلَمُوا مِنْ خَوْفِ اللهِ وَأَسْلَمَ النَّاسُ مِنْ خَوْفِ السَّيْفِ، تم لوگ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں نہ دو کیونکہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر سے اسلام قبول کیا ہے جب کہ باقی

لوگوں نے تلوار کے خوف وڈر سے اسلام قبول کیا ہے۔ (قرطبی) حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں خوشی کے ساتھ اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے آسمان والے ہیں، مہاجرین وانصار ہیں اور اہل بحرین ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم)

کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہل آسمان خوشی سے فرمانبرداری کرتے ہیں، رہے اہل زمین تو ان میں جو اسلام کے زمانے میں پیدا ہوا وہ تو خوشی سے فرمانبرداری کرتا ہے، جس نے انکار کیا اس کے ساتھ لڑائی کی گئی یہاں تک کہ وہ ناخوشی سے اسلام میں داخل ہو گیا، انہیں سختی کے ساتھ پابہ زنجیر کر کے اسلام میں لایا گیا، جب کہ وہ اسلام قبول کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ مسلمان کا سایہ سجدہ کرتا ہے جب کہ اس کا چہرہ خوش ہو رہا ہوتا ہے، جب کہ کافر کا سایہ سجدہ کر رہا ہوتا ہے تو وہ اسے ناپسند کر رہا ہوتا ہے، مقاتل فرماتے ہیں کہ جو آسمان میں ہیں اس کی تابعداری کر رہے ہیں سے مراد فرشتے ہیں، زمین میں جو فرمانبرداری کر رہے ہیں اس سے مراد اہل ایمان ہیں۔ (بحر العلوم)

آسمان والوں میں بخوشی اطاعت وانقیاد بجالانے والے فرشتے ہیں، جب کہ زمین میں بخوشی اطاعت وانقیاد بجالانے والے جنات اور انسان ہیں، طوعاً نظر واستدلال سے اطاعت قبول کر لیتے ہیں، کرھاً کا مطلب ہے قوت وزبردستی مطیع ہو جاتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ اٹھا کر رکھ دیا گیا تھا کہ وہ ایمان لائیں تو وہ لوگ ایمان لے آئے تھے، اسی طرح عذاب دیکھ کر ڈوبتے فرعون نے ایمان کا اظہار کر لیا تھا، اسی طرح جب اللہ کی قوت وطاقت کو دیکھتے ہیں تو ایمان لے آتے ہیں جب کہ یہ ایمان اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ طَوْعاً کا مطلب ہے جو شخص بغیر کسی دلیل وحجت کے اسلام لایا، جب کہ کَرْھاً کا مطلب ہے کہ جو شخص دلیل توحید کی طرف مجبور کیا گیا، اس پر سورۃ الزخرف کی آیت ۸۷ دلالت کرتی ہے، ارشاد ہے کہ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ اگر آپ ان سے سوال کریں کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو کہیں گے کہ انہیں اللہ نے پیدا کیا ہے، سورۃ العنکبوت کی آیت ۶۲ میں ہے وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا، سورج وچاند

کو کس نے تابع کیا تو ضرور بہ ضرور کہیں گے کہ انہیں اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور اللہ ہی نے تابع کیا ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں احکام کی دو قسمیں ہیں ایک تشریعی جیسے نماز و روزہ جن میں بندے کے اختیار کو دخل ہے اور دوسرے تکوینی جیسے جلانا اور مارنا اور بیمار کرنا، احکام تکوینیہ کے تو سب مسخر ہیں کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، کرھاً سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے اور طوعاً سے احکام تشریعیہ کی اختیاری اطاعت مراد ہے اور خوشی سے اطاعت کرنے والے فرشتے ہیں۔ (معارف القرآن للکاندھلویؒ)

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز ممکن لذاتہ ہے اور ہر ممکن اپنے وجود اور عدم (وجود کا نہ ہونا) میں اس کا محتاج ہے اور اپنے وجود اور عدم میں اللہ کا محتاج ہونا یہی اس کے اطاعت گزار ہونے کا مفہوم ہے کہ اس کے ایجاد کرنے سے ممکن موجود ہو جائے اور اس کے فنا کرنے سے ممکن معدوم (ختم) ہو جائے، تو آسمانوں اور زمینوں کی ہر مخلوق اپنے وجود اور عدم میں اللہ کی اطاعت گزار ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے حصر کر دیا ہے کہ سب اسی کے اطاعت گزار ہیں، اس کا معنیٰ ہے کہ اللہ ہی اکیلا خالق ہے اس کے سوا اور کوئی نہ کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے اور نہ کسی چیز کو فنا کر سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر للرازی)

انسانی اَذہان میں تو بس ایک ہی بات آتی ہے کہ انسان اللہ کے سامنے قیام کرتا ہے، رکوع کرتا ہے، سجدہ کرتا ہے، اس کے احکامات بجالاتا ہے، اس کے نواہی سے رکتا ہے، اس کے اِفعل (یہ کام کرو) پر لبیک کہتا ہے، اس کے لاتفعل (یہ کام نہ کر) پر وہ رک جاتا ہے، جب کہ کلام اللہ شریف کی تلاوت کے دوران انسانی نگاہوں کے سامنے جب سورۃ الرعد کی آیت ۱۵ گزرتی ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ بھی ہے وہ طوعاً و کرھاً اللہ کے سامنے سربسجود ہے، سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ بتاتی ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح خواں ہے، لیکن انسان ان کی تسبیح خوانی کو سمجھ نہیں سکتا، اسی طرح سورۃ آل عمران کی آیت ۸۳ بھی واضح پیغام دیتی ہے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اسی ذات عالی شان کا مطیع و منقاد ہے، اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

جو انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیقات پر غور و فکر کرتا ہے تو اسے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب

نظام کائنات اس کے فرمان کے تابع ہے، ساری کائنات خوشی وناخوشی سے اللہ کے حکموں کے تابع ہے، ستاروں اور سیاروں کی گردشیں، آفتاب وماہتاب کا طلوع وغروب، زمینوں کی حرکات وسکنات، دریاؤں کی روانی وسمندروں کی سیلانی، نباتات کی روئیدگی، طوفان بادوباران، آندھیاں اور جھکڑ، زمینوں پر آنے والا اِرتعاش اور سمندروں کا جوار بھاٹا، ذی ارواح کی آمدورفت، وجود اور فنائیت یہ سب اسی ایک احکم الحاکمین کے امر کے تابع ہیں۔

ارباب تفسیر نے اس مقام پر اپنے اپنے حسن ذوق کے مطابق بہترین مواد پیش کیا ہے، ان کی باریک بین نگاہیں دیکھتی اوران کے جواہر بار قلم لکھتے ہیں کہ انسان کے جسم کی رگوں میں خون گردش کر رہا ہے، انسان غذا کو کھا کر حلق سے نیچے اُتار لیتا ہے پھر اس کھائی ہوئی غذا کو خون، گوشت اور ہڈیوں میں متشکل کرنے کے لیے اس کے جسمانی اَعضاء اس تکوینی نظام کے تحت کام کر رہے ہیں، دل پھیپھڑے، جگر اور معدہ ایک مقررہ وقت تک یہ کام انجام دیتے رہتے ہیں، غرض انسان کے باہر جو پھیلی ہوئی کائنات اور عالم کبیر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں لگا ہوا ہے اور انسان کے اندر جو عالم صغیر ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں لگا ہوا ہے، کوئی چیز اس کی اطاعت سے باہر نہیں ہے، ایک درمیان میں یہ خاک کا پتلا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دے کر انسان بنادیا پھر اس کو یہ موقع دیا کہ وہ عالم کبیر کو اللہ کا اطاعت گزار دیکھ کر اس سے عبرت حاصل کرے یا خود اپنے نفس اور عالم صغیر میں جھانک کر دیکھ لے اور اس سے نصیحت حاصل کرے، جب اس کا اپنا نفس اور کائنات کی کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریزی سے باہر نہیں ہے تو وہ خود اس کے حضور اطاعت سے سر تسلیم خم کیوں نہیں کرتا۔ (تفسیر کبیر، تبیان)

وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ: بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے، انہیں قیامت کے دن ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، اس میں ان لوگوں کے لیے وعید شدید ہے جنہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی، اللہ کے نبیوں کی مخالفت کی، ان کے احکامات سے روگردانی کی، کتابوں کی تکذیب کی، سچے دین سے بغاوت کی، اللہ کے دین کے ساتھ دشمنی رکھی، ان کا مرجع اور مآب اللہ کی ذات ہے، میدان محشر میں قیامت کا میدان لگے گا جدھر انہیں جانا پڑے گا، وہاں خیر وشر جو کچھ انہوں

نے کیا ہو گا اس کا حساب دینا پڑے گا۔

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم میں سے کسی کا کوئی جانور تھک جائے یا بدک جائے تو اس کے کانوں میں یہ آیت أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا پڑھ دیا کرو۔ (قرطبی)

تمام انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق واستثناء ایمان: قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ، آپ فرما دیجیے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور اس پر جو ابراہیم و اسمعیل اور اسحق و یعقوب اور ان کی اولاد پر اُتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دیا گیا، ہم ان میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ) کے فرمان بردار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اپنے انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد و پیمان لیا تھا کہ جب ان کے پاس وہ رسول آجائیں جو ان پر اُتاری ہوئی کتابوں اور ان کے دین کی تصدیق کریں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس رسول پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں اور یہاں یہ فرمایا کہ آپ فرما دیجیے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اُتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اُتارا گیا اور جو موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ رسول ہیں جن پر ضروری تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے۔

قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ: یہ خطاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار کے لیے شاہانہ طریقہ کلام کا حکم دیا یا یہ حکم دیا کہ اپنے ساتھ اپنے متبعین کو بھی شامل قرار دے کر اظہار ایمان کرو، یا خطاب ہر مومن کو ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ساتھ ہر مومن بھائی کو شامل سمجھ کر اظہارِ ایمان کریں۔ (مظہری) یہاں فرمایا گیا کہ اگر اہل کتاب ایمان نہیں لاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیروکاروں اور

ایمان والوں سے فرمادیں کہ وہ ایمان لے آئیں۔(بحر العلوم) اے محمد ﷺ! آپ اور آپ کی امت کہے کہ ہم ایمان لائے اکیلے اللہ پر۔(التفسیر الواضح) نبی کریم ﷺ کو فرمایا گیا کہ وہ اپنی طرف سے اور اپنے پیروکاروں کی طرف سے ایمان باللہ کی خبر دیں، اسی لیے یہاں قل میں واحد کا صیغہ لایا گیا اور آمنا میں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔(المقتطف من عیون التفاسیر)

وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا: اور اس قرآن کو جو ہم پر اُتارا گیا ہے اگر خطاب ہر مومن کے لیے مانا جائے تو ہم پر نازل ہونے سے مراد ہو گا رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے ہم تک پہنچنا، یا یوں تاویل کی جائے گی کہ اگر جماعت کے کسی ایک فرد کی طرف کسی فعل کی نسبت کی جائے (اور وہ فرد اہم ہو) تو پوری جماعت کی طرف اس فعل کی نسبت ہو جاتی ہے (اہل ایمان میں رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ سب سے اہم ہے اور آپ ﷺ پر قرآن نازل ہوا تو گویا سب پر نازل ہوا) مادہ نزول کے بعد کبھی الیٰ آتا ہے کیونکہ اللہ کا پیام پیغمبروں تک پہنچتا ہے کبھی علیٰ آتا ہے کیونکہ اللہ کا پیام اوپر سے اُترتا ہے۔(مظہری) اور جو ہمارے اُوپر قرآن کریم میں نازل کیا گیا ہے، قرآن کریم مصدر معرفت ہے جو تمام شریعتوں اور احکام کو شامل ہے۔(التفسیر الوسیط للزحیلی) سورۃ بقرہ میں "الی" کا لفظ ہے اور یہاں "علی" کا لفظ ہے "الی" کا معنی اللہ کی طرف سے اور "علی" کا معنی رسول پر ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ اللہ کا کلام اور اس کی کتابیں اللہ کی طرف سے رسول پر نازل ہوتی ہیں سورۃ بقرہ میں اللہ کی جانب کا اعتبار کیا اور فرمایا جو ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے کیا گیا اور یہاں رسول کا اعتبار کیا اور فرمایا اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا، خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں منزل اور دوسری آیت میں منزل علیہ کا اعتبار کیا ہے۔(تفسیر کبیر، تبیان القرآن)

وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ: اس میں اختلاف ہے کہ جن انبیاء علیہم السلام کی شریعت منسوخ ہو چکی ہے ان پر کس طرح ایمان لایا جائے، بعض علماء نے یہ کہا کہ جب ان کی شریعت منسوخ ہو گئی تو ان کی نبوت بھی منسوخ ہو گئی اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ انبیاء اور رسل تھے اور اس پر ایمان نہیں لاتے کہ وہ اب انبیاء اور رسل ہیں اور بعض علماء نے یہ کہا کہ ان کی شریعت کا منسوخ ہونا ان کی نبوت کے منسوخ ہونے کو مستلزم نہیں ہے اور ہم اس پر ایمان لاتے

ہیں کہ وہ اب بھی انبیاء علیہم السلام اور رسل علیہم السلام ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۲، تبیان) ابراہیم علیہ السلام پر اُتارے گئے صحیفوں کا ذکر سورۃ الاعلیٰ میں ہے۔ اسباط سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد مراد ہے، ان کے بارہ بیٹے تھے جو نبی تھے۔ (خازن)

وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی گئی، صحیفے بھی اُتارے گئے، جن کا ذکر سورۃ الاعلیٰ میں موجود ہے، عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اُتاری گئی، ان سب پر ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا ایمان ہے کہ وہ اپنے دور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتاری گئی آسمانی کتابیں تھیں، تورات، زبور، انجیل اور قرآن کریم چار بڑی اور مشہور کتابوں کے علاوہ ایک سو کتابوں کا ذکر ملتا ہے، نبیون جمع ذکر کر کے اِشارہ کیا گیا کہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ہم ایمان لاتے ہیں، ان پر جو آسمانی پیغامات بھیجے گئے ہم ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ: ہم رسولوں کی جماعت میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے، ہم یوں نہیں کہہ سکتے کہ کسی نبی ورسول کو مانیں گے اور کسی کو نہیں مانیں گے، جیسا کہ اہل کتاب کہتے تھے کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں، اہل کتاب اللہ کے نبیوں کے درمیان فرق کرتے تھے، ان میں اِمتیازی خطوط قائم کرتے تھے، جیسا کہ ہمیں قرآن کریم نے بتایا کہ وہ کہتے تھے نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا کفر کرتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کا انکار کرنے والے تھے، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے ایک نبی کا انکار کرنا ایسا ہے جیسا کہ تمام نبیوں کا انکار، یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر بلا تفریق اور بلا استثناء ایمان رکھتے ہیں، ہم نفس نبوت میں کسی نبی کا دوسرے نبی کے ساتھ تقابل نہیں کرتے، کسی میں فرق نہیں کرتے، کسی کی اس طرح تعریف نہیں کرتے جس سے دوسرے کی توہین و تنقیص لازم آئے۔

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ: ہم اسی کے لیے جھکتے ہیں، اسی کے تابعدار ہیں، اسی کی اِطاعت کرتے ہیں، اسی کی بندگی بجالاتے ہیں، ہمیں اس کی طرف سے جو حکم دیا جاتا ہے ہم اس پر لبیک کہتے ہیں، جس چیز سے ہمیں روکا جاتا ہے ہم اس سے رک جاتے ہیں، ہم اسی ذات عالی کی اُلوہیت (الٰہ اور معبود) اور ربوبیت (رب ہونے) کا اقرار کرتے ہیں۔

اسلام ہی اسلام کوئی اور نہیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ {۸۵} آل عمران)

جواب ترجمہ: اور جو کوئی اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

شان نزول: ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ سے لے کر وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورۃ البقرۃ: ۶۲) تک نازل ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ نازل ہوئی۔ (طبری، العجاب فی بیان الاسباب)

② مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قبیلہ اوس کے طعمہ بن ابیرق کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو مرتد ہو کر مکہ والوں سے مل گیا تھا۔ (تفسیر مقاتل، العجاب فی بیان الاسباب)

③ یہ آیت مرثد بن ابی مرثد، طعمہ بن ابیرق، مقیس بن صبابہ، حارث بن سوید، سمیت دس لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مقاتل کہتے ہیں کہ یہ بارہ لوگ تھے۔ (بحر العلوم) یہ بارہ لوگ تھے، جو مدینہ سے نکلے اور اہل مکہ کے ساتھ آکر مل گئے، ان میں حارث بن سوید انصاری بھی تھے۔ (روح)

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً: حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں میں لکھتے ہیں "اسلام" کے لفظی معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں، اور اصطلاح میں خاص اس دین کی اطاعت کا نام "اسلام" ہے جو اللہ تعالی نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، کیونکہ اصول دین تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔ پھر لفظ "اسلام" کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، قرآن کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں، انبیاء سابقین علیہم السلام کا اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اپنی امت کو امت مسلمہ کہنا بھی نصوص قرآن سے ثابت ہے اور نام کا خاتم الانبیاء

ﷺ کی اُمت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔

(هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ۲۲:۷۸) خلاصہ یہ کہ ہر دین الٰہی جو کسی نبی ورسول کے ذریعے دنیا میں آیا اس کو بھی "اسلام" کہا جاتا ہے اور امت محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس جگہ "اسلام" کے لفظ سے کونسا مفہوم مراد ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ دونوں میں سے جو بھی مراد لیا جائے، نتیجہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ انبیاء سابقین کے دین کو جو اسلام کا نام دیا گیا ہے وہ ایک محدود طبقہ اور مخصوص زمانے کے لئے تھا، اس وقت کا اسلام وہی تھا، اس طبقہ اور امت کے علاوہ دوسروں کے لئے اس وقت بھی وہ اسلام معتبر نہ تھا اور جب اس نبی کے بعد اور کوئی نبی بھیج دیا گیا تو اب وہ اسلام نہیں رہا، اس وقت کا اسلام وہ ہوگا جو جدید نبی پیش کرے، جس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی اصولی اختلاف نہیں ہوگا مگر فروعی احکام مختلف ہوسکتے ہیں اور خاتم الانبیاء ﷺ کو جو اسلام دیا گیا وہ ناقابل نسخ دائمی تا قیامت رہے گا اور حسب قاعدہ مذکورہ آپ ﷺ کی بعثت کے بعد پچھلے تمام اَدیان منسوخ ہوگئے، اب وہ اسلام نہیں بلکہ اسلام صرف وہ دین ہے جو آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے پہنچا، اسی لئے احادیث صحیحہ معتبرہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اس وقت ان پر بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، تو باوجود اپنے وصفِ نبوت اور عہدہ نبوت پر قائم رہنے کے اس وقت وہ بھی آپ ﷺ ہی کی شریعت کا اتباع کریں گے۔

اس لئے اس جگہ خواہ اسلام کا مفہوم عام مراد لیں یا مخصوص اُمت محمدیہ کا دین مراد لیں، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت کے بعد صرف وہی دین اسلام کہلائے گا جو آپ ﷺ کے ذریعہ دنیا کو پہنچا ہے، وہی تمام انسانوں کے لئے مدار نجات ہے، آیت مذکورہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین جو شخص اختیار کرے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں۔ (معارف القرآن)

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "جب خدا کا دین (اسلام) اپنی مکمل صورت میں آپہنچا تو کوئی جھوٹا یا نامکمل دین قبول نہیں کیا جاسکتا، طلوع آفتاب کے بعد مٹی کے چراغ جلانا یا گیس بجلی اور ستاروں کی روشنی تلاش کرنا محض لغو اور کھلی حماقت ہے، مقامی نبوتوں اور ہدایتوں کا عہد گزر چکا، اب سب سے بڑی آخری اور عالمگیر نبوت وہدایت سے ہی روشنی حاصل کرنی چاہیے کہ یہ ہی تمام روشنیوں کا خزانہ ہے جس میں پہلی تمام روشنیاں مدغم ہو چکی ہیں۔

فَإِنَّكَ شَمْسٌ وَالْمُلُوكُ كَوَاكِبٌ إِذَا طَلَعَتْ لَمْ يَبْدُ مِنْهُنَّ كَوْكَبٌ

پس بے شک آپ آفتاب ہیں، دنیا کے بادشاہ ستارے، جب آپ طلوع ہو گئے تو ستاروں میں سے کوئی بھی ظاہر نہیں ہو سکتا۔

طبرانی کی معجم اوسط میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تَجِيءُ الْأَعْمَالُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَتَجِيءُ الصَّلَاةُ فَتَقُولُ: يَا رَبِّ أَنَا الصَّلَاةُ فَيَقُولُ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ وَتَجِيءُ الصَّدَقَةُ فَتَقُولُ: يَا رَبِّ أَنَا الصَّدَقَةُ فَيَقُولُ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيءُ الصِّيَامُ فَيَقُولُ: أَنَا الصِّيَامُ فَيَقُولُ إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ ثُمَّ تَجِيءُ الْأَعْمَالُ كُلُّ ذَالِكَ يَقُولُ اللهُ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ ثُمَّ يَجِيءُ الْإِسْلَامُ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ أَنْتَ السَّلَامُ وَأَنَا الْإِسْلَامُ فَيَقُولُ اللهُ: إِنَّكَ عَلَى خَيْرٍ بِكَ الْيَوْمَ آخِذٌ وَبِكَ أُعْطِي (در منثور ۲/۲۵۶)

قیامت کے دن اعمال پیش ہوں گے، نماز پیش ہو گی اور کہے گی، اے میرے رب! میں نماز ہوں، اللہ فرمائیں گے بے شک تو خیر پر ہے، صدقہ پیش ہو گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! میں صدقہ ہوں، اللہ فرمائیں گے بے شک تو خیر پر ہے، پھر روزہ پیش ہو گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! میں روزہ ہوں، اللہ فرمائیں گے کہ بے شک تو خیر پر ہے، پھر اس کے بعد تمام اعمال پیش ہوں گے، اللہ سب کو کہیں گے کہ تو خیر پر ہے، پھر اسلام پیش ہو گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں، اللہ فرمائیں گے کہ بے شک تو خیر پر ہے اور میں تیرے سبب ہی آج کے دن دوں گا اور آج کے دن پکڑوں گا۔

فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ: یعنی تمام اَدیان والے لوگوں سے کوئی دین اسلام کے علاوہ قبول نہیں کیا جائے گا،

جو لوگ اسلام کے علاوہ دین اختیار کریں گے ان سے وہ ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا۔

دنیا کے کچھ بے بصیرت لوگ اسلام میں کیڑے نکالنے اور اس میں خامیاں ڈھونڈنے میں مصروف ہیں، اپنے دن رات اسی میں صرف کر رہے ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کے سامنے اسلام کے نقائص اور خامیاں بیان کریں تاکہ دنیا اسلام سے دُور ہو جائے، وہ نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، مگر ان کور بختوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام آفتاب عالمتاب ہے، اس کی روشنی بجھائے نہیں بجھ سکتی، یہ نور خدا ہے جو کفر کی حرکات پر خندہ زن ہے، اس چراغ کو پھونکوں سے بجھانا بہت مشکل ہے، کلید کامیابی اور کلید نجات یہی پیام آخریں ہے، اس کے بغیر جو کچھ ہو گا وہ منہ پر مار دیا جائے گا۔

وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ: جو لوگ دین اسلام کے علاوہ کوئی دین اختیار کریں گے، اسلام میں سے نکل کر دوسرا دین قبول کریں گے تو ان سے کسی صورت میں وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور یہ لوگ آخرت میں نقصان اٹھائیں گے، کیونکہ جنت میں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو گھر بنایا تھا انہوں نے اسے چھوڑ کر وہ گھر اختیار کیا جو ان کے لیے دوزخ میں بنایا گیا تھا، جنت کی بیش بہا نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے، جنت کی آرام دہ زندگی سے محروم ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی رضا سے محروم ہو جائیں گے، راحت و سکون والی زندگی کی بجائے اذیت ناک، ذلت آمیز، عذاب الیم، عذاب مہین، عذاب عظیم والی زندگی ملے گی، خاسر عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے اپنا راس المال ضائع کر دیا ہو، یہاں مراد نیک اعمال کا زیاں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کافر کے عمل کو قبول نہیں فرمائیں گے، نیک اعمال کا اجر و ثواب ضائع کر دیا، عذاب کے مستحق بن گئے۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو یہودیوں نے کہا کہ ہم تو مسلمان ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا** جس میں حکم دیا گیا کہ لوگوں پر بیت اللہ کا حج ہے، آپ ﷺ نے یہودیوں کو بتلایا تو انہوں نے بیت اللہ کا حج نہیں کیا۔ (روح المعانی) مسلمانوں نے حج کیا اور مشرکین نے نہیں کیا۔ (تفسیر مجاہد)

مرتدین کے لیے احکامات

سوال ان آیات کا ترجمہ، تفسیر اور شان نزول بیان کیجیے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ {۸۶} أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ {۸۷} خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ {۸۸} إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ {۸۹} (آل عمران)

جواب ترجمہ: اللہ کیسے ہدایت دے اس قوم کو جس نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا۔ حالانکہ وہ گواہی دے چکے تھے کہ بے شک رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں بھی آگئیں اور اللہ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور اصلاح کر لی تو بیشک اللہ غفور ہے رحیم ہے۔

شان نزول: ① مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حارث بن سوید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، پھر کفر اختیار کر لیا، اس کے بعد وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ سے لے کر فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ تک نازل فرمائی، پھر اس کی قوم کے ایک شخص نے یہ آیت اس تک پہنچائی، پھر اس کے سامنے اس آیت کو پڑھا، اس کے بعد حارث نے کہا، اللہ کی قسم! جہاں تک میں جانتا ہوں تو سچا (صادق) ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت ہی سچے (صدوق) ہیں اور اللہ تعالیٰ تینوں سے زیادہ سچا (اصدق) ہے، اس پر حارث واپس پلٹا، پھر اسلام قبول کیا اور اس کے بعد بہت ہی اچھا اسلام رہا۔ (طبری)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انصار میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا، پھر وہ مرتد (اسلام کے بعد پھر جانا) ہو گیا اور مشرکین کے ساتھ مل گیا، پھر اس پر وہ شرمندہ ہوا، اس نے اپنی

قوم کو پیغام بھیجا کہ میرے بارے میں نبی کریم ﷺ سے پوچھو کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس کی قوم نبی کریم ﷺ کی طرف آئی، ان لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس پر یہ آیات كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْماً كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ سے لے کر غَفُورٌ رَّحِيمٌ تک نازل ہوئیں، اس کی قوم نے اس کی طرف پیغام بھیجا، پھر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ (نسائی، قرطبی)

③ ایک روایت میں ہے کہ انصار کا ایک شخص مرتد ہو کر مشرکوں سے جاملا، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْماً كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ سے لے کر إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا تک نازل فرمائیں، اس کی قوم نے یہ آیات اس تک پہنچائیں، جب یہ آیات اس پر پڑھی گئیں تو اس نے کہا، اللہ کی قسم! میری قوم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس مجھے جھٹلایا نہیں اور نہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے بارے میں جھوٹا سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تینوں میں سب سے زیادہ سچا ہے، چنانچہ وہ تائب ہو کر واپس لوٹ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے توبہ کو قبول فرمالیا اور اسے چھوڑ دیا۔ (قرطبی)

④ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کی آمد کی خوشخبری سناتے تھے، ان کے وسیلے سے کافروں کے خلاف اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعا مانگتے تھے، جب آپ ﷺ نبی بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے دشمنی کی اور کفر کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت أُولٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ نازل فرمائی، ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی، فرشتوں کی اور سب انسانوں کی، ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔ (قرطبی)

⑤ مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْماً كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ بنو عمرو بن عوف قبیلہ کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی اس نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور (پھر) شام چلا گیا۔ (عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، تفسیر در منثور)

ایک روایت میں مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ شخص روم چلا گیا اور نصرانی (عیسائی) بن گیا، پھر اس نے اپنی قوم کو لکھا مجھے بتاؤ کیا میرے لیے توبہ ہو سکتی ہے؟ تو یہ آیت إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا نازل ہوئی، تو اس پر وہ شخص دوبارہ ایمان لے آیا اور واپس لوٹ آیا۔ (در منثور)

⑥ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ابو عامر راہب، حارث بن سوید بن صامت و حوح بن اسلمت وغیرہ بارہ آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جو اسلام سے پھر کر قریش سے مل گئے تھے، پھر انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو خط لکھے کیا ہمارے لیے توبہ ہو سکتی ہے؟ تو اس پر توبہ والی آیت إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا نازل ہوئی۔ (در منثور)

⑦ حسن بصری رحمہ اللہ سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ یہود و نصاریٰ اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی، جب انہوں نے دیکھا اور اس کو پڑھا اور اس بات کی گواہی دی کہ وہ سچے ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ان کے خاندان سے نہ ہوئی تو اس پر انہوں نے عرب کے لوگوں پر حسد کیا، پس انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا انکار کر دیا بعد ان کے اقرار کے محض حسد کرتے ہوئے عرب کے لوگوں سے جب کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں میں مبعوث فرمایا۔ (عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، در منثور)

میرے خیال کے مطابق یہاں جن روایات میں یہودیوں کا ذکر ہے وہ شان نزول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، اگرچہ دوسرے مواقع پر دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے، یہودیوں کے بارے میں شان نزول کے باعث یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دوسروں کے بارے میں یہ نہیں ہو سکتا، ہو سکتا ہے کہ جب دوسروں کی توبہ کا وقت آیا ہو تو اس وقت ان کا دوبارہ نزول ہوا ہو، لیکن یہاں چونکہ آغاز سورت سے یہود و نصاریٰ کا تذکرہ چل رہا ہے، قریب کی آیات میں بھی انہی کا ذکر ہے، بعید کی آیات میں بھی انہی کا ذکر ہے تو یہاں جب یہودیوں کے بارے میں بحث کو اختتام کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو انہی کا ذکر مناسب لگتا ہے، اگر یہاں یہودیوں کی بجائے حارث بن سوید وغیرہ کا ذکر سمجھا جائے تو مضمون سیاق و سباق سے ہٹ جائے گا، جو اسلوب قرآنی کے خلاف لگتا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ: اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیوں ہدایت دے جنہوں نے ایمان جیسی عظیم دولت پانے کے بعد کفر کو اختیار کیا اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت کی گواہی بھی دے دی ہے، ان کے پاس واضح دلائل و معجزات بھی آ گئے ہیں، قرآن کریم جیسا عظیم معجزہ بھی ان کے پاس آ گیا ہے، پھر راہ

حق کو چھوڑ کر چاہ ضلال میں جا گرے ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”جن لوگوں نے وضوحِ حق کے بعد جان بوجھ کر کفر اختیار کیا، یعنی دل میں یقین رکھتے ہیں اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں اقرار کرتے ہیں کہ یہ رسول سچّا ہے، اس کی حقانیت و صداقت کے روشن دلائل، کھلے نشانات اور صاف بشارات ان کو پہنچ چکی ہیں، اس پر بھی کبر و حسد اور حب جاہ و مال، اسلام قبول کرنے اور کفر و عدوان کے چھوڑنے سے مانع ہے جیسا کہ عموماً یہود و نصاریٰ کا حال تھا، ایسے ہٹ دھرم، ضدی معاندین کی نسبت کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ باوجود اس طرح کا رویہ قائم رکھنے کے خدا تعالیٰ ان کو نجات و فلاح اور اپنی خوشنودی کے راستہ پر لے جائے گا یا جنت تک پہنچنے کی راہ دے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اس کی عادت نہیں کہ ایسے بے انصاف متعصب ظالموں کو حقیقی کامیابی کی راہ دے، اسی پر ان بدبختوں کو قیاس کرلو جو قلبی معرفت و یقین کے درجہ سے بڑھکر ایک مرتبہ مسلمان بھی ہو چکے تھے، پھر دنیاوی اغراض اور شیطانی اغواء سے مرتد ہوگئے، یہ ان پہلوں سے زیادہ کج رو اور بے حیا واقع ہوئے، اس لیے ان سے بڑھ کر لعنت و عقوبت کے مستحق ہوں گے۔ (عثمانی) جب تک یہ لوگ کفر کو اختیار کیے رکھیں گے اللہ تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق نہیں دے گا، ظالم وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کیا۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

مفتی عبدالواحد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”اول ان مرتدین کا بیان ہے جو کفر پر قائم رہ کر اس کو ہدایت سمجھتے رہے، چونکہ ان کا اعتقاد یا دعویٰ یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اب ہدایت فرمائی، لہٰذا ان کی مذمت میں اس کی نفی بھی فرماتے ہیں کہ بھلا (اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہوگئے) دل سے (ایمان لانے کے بعد اور) زبان سے (اپنے اس اقرار کے بعد کہ رسول) صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ رسالت میں (سچے ہیں اور اس کے بعد کہ ان کو) حقانیت اسلام کے (واضح دلائل پہنچ چکے تھے اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتے) یہ مطلب نہیں کہ ایسوں کو کبھی اسلام کی توفیق نہیں دیتے، بلکہ مقصود ان کے مذکورہ بالا دعویٰ کی نفی کرنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے جو اسلام چھوڑ کر یہ طریق اختیار کیا ہے تو اب ہم کو خدا نے ہدایت دی ہے، نفی کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص کفر کا

بے ڈھنگا راستہ اختیار کرے وہ ہدایت خداوندی پر نہیں، اس لیے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو خدا نے ہدایت دی ہے، کیونکہ ہدایت کا یہ راستہ نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ یقیناً گمراہ ہیں۔ (فہم القرآن)

سوال آیت مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر کیا، اسے اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیں گے، جس شخص نے ظلم کیا اسے اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیں گے، جب کہ ہم بہت سے مرتدین کے بارے میں سنتے ہیں کہ وہ اسلام لائے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی، بہت سے ظالموں نے ظلم سے توبہ کی، انہیں ہدایت ملی، جب کہ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ انہیں اللہ ہدایت نہیں دیں گے؟

جواب اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ لوگ اپنے کفر پر ڈٹے رہیں گے، اپنے مظالم پر قائم رہیں گے، اسلام قبول نہیں کریں گے تو اسے ہدایت نہیں ملے گی، رہے وہ لوگ جنہوں نے کوشش کی، اپنے جرائم ونافرمانیوں سے رجوع کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے دے گا، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت: ۶۹) وہ لوگ جو ہمارے دین میں کوشاں ہوں گے ہم انہیں اپنی راہوں کی راہنمائی کریں گے۔ ② كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ کا مطلب یہ ہے کہ كَيْفَ يُرْشِدُهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ اللہ تعالیٰ انہیں کیونکر جنت کی طرف راہنمائی کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ (النساء: ۱۶۸، ۱۶۹) بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا اور انہیں جہنم کی راہ پر ڈال دے گا۔

③ اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کیونکر رحم کرے گا اور انہیں کیونکر سزا سے نجات دے گا؟

④ اس کا ایک معنیٰ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کیونکر معاف کرے گا۔ (بحر العلوم)

⑤ یہ مطلب نہیں کہ ایسوں کو کبھی توفیق اسلام کی نہیں دیتے بلکہ مقصود ان کے اسی دعویٰ مذکور کی نفی کرنا ہے، وہ کہتے تھے کہ ہم نے جو اسلام چھوڑ کر یہ طریق اختیار کیا ہے تو ہم کو خدا نے ہدایت دی ہے خلاصہ نفی کا یہ ہوا کہ جو شخص کفر کا بے ڈھنگا راستہ اختیار کرے وہ ہدایت خداوندی پر نہیں اس لیے وہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو خدا نے ہدایت دی ہے کیونکہ کفر ہدایت کا راستہ نہیں بلکہ ایسے لوگ

یقیناً گمراہ ہیں۔ ⑥ اِستفہام تعجب کے لیے ہے اور ان کے کفر کو بڑا سمجھنے کے لیے ہے یعنی وہ قوم کیسے ہدایت کی مستحق ہو سکتی ہے جس نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا۔

مرتدین کی توبہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے نیز آیت کریمہ کا شان نزول بیان کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ {۹۰} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لانے کے بعد منکر ہو گئے پھر انکار میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہر گز قبول نہیں کی جائے گی اور وہی گمراہ ہیں۔

شان نزول: ابو صالح رحمہ اللہ جو اُم ھانی رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے سے روایت ہے کہ حارث بن سوید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی پھر اہل مکہ سے مل گیا اور اُحد کی جنگ میں کفار کی طرف سے حاضر ہوا اور مسلمانوں کو قتل کیا، پھر وہ شرمندہ ہو کر مکہ کی طرف لوٹ آیا، اس نے اپنے بھائی جلاس بن سوید کو لکھا اے میرے بھائی! إِنِّي قَدْ نَدِمْتُ عَلَى مَا كَانَ مِنِّي فَأَتُوبُ إِلَى اللهِ، وَأَرْجِعُ إِلَى الْإِسْلَامِ میں اپنے کام پر شرمندہ ہوں، اللہ کی طرف توبہ کرتا ہوں اور اسلام کی طرف لوٹتا ہوں؟ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادو، اگر تم میری توبہ کی امید پاؤ تو مجھ کو لکھ دو انہوں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت كَيْفَ يَهْدِي اللهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ اُتاری، اس کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے جن پر اس کی ذمہ داری تھی نے کہا کہ بھرپور لطف اندوزی کے بعد اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ نازل فرمائی۔ بلاشبہ وہ لوگ جو کافر بن گئے اپنے ایمان کے بعد کفر میں بڑھتے چلے گئے ہر گز ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، در منثور)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ أَنَّ قَوْمًا أَسْلَمُوا ثُمَّ ارْتَدُّوا، ثُمَّ أَسْلَمُوا ثُمَّ ارْتَدُّوا،

فَأَرْسَلُوا إِلَى قَوْمِهِمْ يَسْأَلُونَ لَهُمْ، فَذَكَرُوا ذَلِكَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ، کچھ لوگ مسلمان ہوئے پھر مرتد ہوگئے پھر اسلام لائے پھر مرتد ہوگئے پھر اپنی قوم کے پاس آدمی بھیج کر پچھوایا کہ کیا اب ہماری توبہ ہے؟ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا اس پر یہ آیت اتری (تفسیر در منثور بحوالہ مسند البزار)۔

③ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ، حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت عطاء خراسانی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا، پھر ان کا کفر بڑھا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ اور قرآن کریم کا بھی انکار کر دیا۔ (اسباب النزول)

④ حضرت ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کی نعت وصفات پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا، پھر جب وہ اپنے کفر پر ڈٹے رہے تو ان کا کفر بڑھ گیا۔ (اسباب النزول للواحدی نیشاپوری)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ: ایمان قبول کر لینے کے بعد کفر اختیار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ خبر دار کر رہے ہیں کہ تم نے ایسا برا کام کیا ہے جس کا ازالہ تمہارے لیے ناممکن ہے، تمہیں اس جرم کی ایک تو سزا یہ ملے گی کہ تمہاری توبہ قبول نہیں ہوگی، تمہارا یہ کام گمراہ کن ہے اور تم خود بھی چاہ ضلالت کی گہرائیوں میں جا گرے ہو۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے مزید وضاحت فرمائی ہے وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (النسآء:۱۸) اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) برے کام کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آموجود ہو تو اس وقت کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کی (توبہ قبول ہوتی ہے) جو کفر کی حالت میں مریں، ایسے لوگوں کے لیے ہم نے عذاب الیم (دردناک عذاب) تیار کر رکھا ہے۔

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ: جو گمراہی پر ڈٹے رہیں گے یہ گمراہ ہوں گے، گمراہوں میں ان کا شمار ہوگا۔

سوال توبہ کب تک قبول ہوتی ہے؟

جواب موت کے وقت جب روح جسم سے نکلنے لگتی ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے اور حلق کی نالی میں ایک قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے، اس کو "حالت نزع" کہتے ہیں، اس کے بعد زندگی کی کوئی امید نہیں رہتی، اور اس وقت دوسرا عالم منکشف ہو جاتا ہے، اس لیے اس وقت کا ایمان اور توبہ قابل قبول نہیں، کیونکہ ایمان بالغیب (بن دیکھے ایمان لانا) مطلوب ہے، اس لیے جب تک موت آنکھوں کے سامنے نہ آجائے، توبہ کا موقع ہے، سورۃ النساء (آیت ۱۸) میں ہے: "اور ایسے لوگوں کی توبہ قابل قبول نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہوتی ہے یعنی دوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں تو وہ کہتا ہے: میں اب توبہ کرتا ہوں! اور نہ ان لوگوں کا ایمان قابل قبول ہے جن کو حالت کفر میں موت آجاتی ہے۔ (ہدایت القرآن)

سوال اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرمادیا کہ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ایمان لانے کے بعد جن لوگوں نے کفر کیا، پھر کفر میں بڑھتے رہے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی، حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مرتد کا ارتداد خواہ کفر میں کتنا ہی بڑھ جائے اور وہ پھر توبہ کرلے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی؟

جواب ① مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مرتد ہوگئے تھے اور اپنا حال پوشیدہ رکھنے کے لیے اور اپنے دلوں میں کفر چھپاتے ہوئے زبان سے توبہ کا اظہار کیا تھا۔ ② بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت ایسی قوم کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے شرک کے سوا باقی تمام گناہوں سے توبہ کی تھی۔ ③ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو فرمایا گیا کہ ان کی توبہ مقبول نہیں ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت موت ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ (انموذج جلیل فی اسئلۃ واجوبۃ عن آی التنزیل)

حالت کفر پر مرنے والوں کی سزا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَى

بِهٖ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ {۹۱} آل عمران

جواب ترجمہ: بلاشبہ جنہوں نے کفر کیا اور کافر ہو کر مرے تو ہر گز ان میں کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا خواہ وہ اس کو فدیہ میں دے ڈالے یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ: اللہ تعالیٰ کو نہ ماننا، اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا انکار کرنا، اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو جھٹلانا، اللہ تعالیٰ کے ارشادات و فرامین کا تمسخر اڑانا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کرام علیہم السلام کے توسط سے انسانوں تک پہنچایا جانے والا پیغام تسلیم نہ کرنے والے لوگ وہ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ واضح فرما رہے ہیں کہ جنہوں نے کفر کیا اور انہیں توبہ کرنے کی توفیق نہ ملی، انہوں نے توبہ نہ کی، اپنے کفریہ عقائد سے درست عقائد کی طرف پلٹنے اور رجوع کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، وہ اسی کفریہ حالت میں مر گئے تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ: کفر پر مرنے والوں کی کوئی نیکی قبول نہیں، گو اس نے زمین بھر کر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہو، مِلْءُ کسی چیز کی اس مقدار کو کہا جاتا ہے جو اس چیز کو بھر دے، وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ یعنی ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، اگر وہ زمین بھر کر سونا بطور فدیہ پیش کریں تو بھی قبول نہیں کیا جائے گا، یہ کلام علی سبیل الفرض والتقدیر ہے، کیونکہ ان لوگوں کے پاس آخرت میں کسی چیز کا اختیار نہیں ہو گا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر زمین بھر کر دنیا میں انہوں نے خرچ کیا ہو پھر وہ کفر کی حالت میں ہی مر گیا ہو تو ان کا یہ خرچ ان کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ عبد اللہ بن جُدعان جو بڑا مہمان نواز، غلام آزاد کرنے والا اور کھانا پینا دینے والا شخص تھا کیا اسے اس کی یہ نیکی کام آئے گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں اس لیے کہ اس نے ساری عمر میں ایک دفعہ بھی أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ (الشعراء: ۸۲) نہیں کہا یعنی اے میرے رب! میری خطاؤں کو قیامت والے دن بخش۔

جس طرح اس کی خیرات نامقبول ہے اسی طرح فدیہ اور معاوضہ بھی، جیسے اور جگہ ہے وَلَا

يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (البقرۃ:۱۲۳) ان سے نہ بدلہ مقبول نہ انہیں سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی مزید فرمایا قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خِلَالٌ ابراھیم:۳۱) فرمادیجیے !میرے ان بندوں کے لیے جو ایمان لائے کہ وہ نماز قائم کریں، جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کریں، پوشیدہ طور پر اور علی الاعلان، اس سے پہلے کہ وہ دن آن پہنچے کہ جس میں خرید فروخت کام آسکے اور نہ دوستی و محبت اور جگہ ارشاد ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (المائدہ:۳۶) بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اگر ان کے پاس زمین بھر کے اور اس اتنا اور بھی ہو تا کہ وہ قیامت کے دن کے ہولناک عذاب کے بدلے میں فدیہ دیں تو ان سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔

مسند احمد میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے يُقَالُ لِلرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ : أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ لَكَ مَا عَلَى الأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ ، أَكُنْتَ مُفْتَدِيًا بِهِ ؟ قَالَ: فَيَقُولُ: نَعَمْ . قَالَ: فَيَقُولُ : قَدْ أَرَدْتُ مِنْكَ أَهْوَنَ مِنْ ذَلِكَ ، قَدْ أَخَذْتُ عَلَيْكَ فِي ظَهْرِ أبيك آدَمَ أَلَّا تُشْرِكَ بِي شَيْئًا، فَأَبَيْتَ إِلَّا أَنْ تُشْرِكَ، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جہنمی سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ زمین پر جو کچھ ہے اگر تیرا ہو جائے تو کیا تو اس کو ان سزاؤں کے بدلے اپنے فدیے میں دے ڈالے گا، وہ کہے گا ہاں تو جناب باری کا ارشاد ہو گا کہ میں نے تجھ سے بہ نسبت اس کے بہت ہی کم چاہا تھا، میں نے تجھ سے اس وقت وعدہ لیا تھا جب تو اپنے باپ آدم کی پیٹھ میں تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا لیکن تو شرک کئے بغیر نہ رہا۔ (مسند احمد، بخاري، مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

يُؤْتَى بِالرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَقُولُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ ، كَيْفَ وَجَدْتَ مَنْزِلَكَ ؟ فَيَقُولُ : أَيْ رَبِّ، خَيْرُ مَنْزِلٍ. فَيَقُولُ : سَلْ وَتَمَنَّ. فَيَقُولُ : مَا أَسْأَلُ وَلا أَتَمَنَّى إِلا أَنْ تَرُدَّنِي إِلَى الدُّنْيَا فَأُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ عَشْرَ مِرَارٍ ، لِمَا يَرَى مِنْ فَضْلِ الشَّهَادَةِ. وَيُؤْتَى بِالرَّجُلِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَيَقُولُ لَهُ : يَا

ابْنَ آدَمَ، كَيْفَ وَجَدْتَ مَنزِلَكَ؟ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ شَرُّ مَنزِلٍ. فَيَقُولُ لَهُ: تَفْتَدِي مِنِّي بِطِلاعِ الأَرْضِ ذَهَبًا؟ فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ، نَعَمْ. فَيَقُولُ: كَذَبْتَ، قَدْ سَأَلْتُكَ أَقَلَّ مِنْ ذَلِكَ وَأَيْسَرَ فَلَمْ تَفْعَلْ، فَيُرَدُّ إِلَى النَّارِ (مسند احمد (۳/۲۰۸)

ایک ایسے جنتی کو لایا جائے گا جس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہو تم نے کیسی جگہ پائی؟ وہ جواب دے گا اللہ بہت ہی بہتر، اللہ تعالیٰ فرمائے گا اچھا اور کچھ مانگنا ہو تو مانگو، دل میں جو تمنا ہو کہو تو یہ کہے گا باری تعالیٰ میری صرف یہی تمنا ہے اور میرا یہی ایک سوال ہے کہ مجھے دنیا میں پھر بھیج دیا جائے میں تیری راہ میں جہاد کروں اور پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ ہو جاؤں پھر شہید کیا جاؤں، دس مرتبہ ایسا ہی ہو کیونکہ وہ شہادت کی فضیلت اور شہید کے مرتبے دیکھ چکا ہو گا اسی طرح ایک جہنمی کو بلایا جائے گا اور اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے ابن آدم! تو نے اپنی جگہ کیسی پائی؟ وہ کہے گا اے میرے اللہ! بہت ہی بری، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا ساری زمین بھر کر سونا دے کر ان عذابوں سے چھوٹنا تجھے پسند ہے؟ وہ کہے گا ہاں! اے اللہ! اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، میں نے تو اس سے بہت ہی کم اور بالکل آسان چیز تجھ سے طلب کی تھی لیکن تو نے اسے بھی نہ کیا چنانچہ وہ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ: أُولَئِكَ اسم اشارہ کا مشارالیہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا، کفر کی حالت میں مر گئے، ان سے کسی قسم کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہو گا کہ ان سے عذاب کو ٹال سکے یا اس عذاب کو ہلکا کر سکے۔

محبوب مال راہ خدا میں خرچ کرنا

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ {۹۲} آل عمران

جواب ترجمہ: تم ہرگز پوری نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک تم اس چیز کو نہ خرچ کر دو جو تمہیں پسند ہے اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ: بر کا معنٰی احسان کرنا، کمال خیر، رضا، جنت، یعنی اے اہل ایمان! تم لوگ ہر گز خیر کی حقیقت کو نہیں پاسکتے، تم ہر گز خیر کے کمال کو نہیں پاسکتے، تم لوگ ہر گز رضاء الٰہی کو نہیں پاسکتے، تم لوگ ہر گز جنت کو نہیں پاسکتے۔ بِرّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے انسان نیکوکار بنتا ہے، وہ چیز احسان اور خیر ہے، بِرّ یہاں رضاء اللہ (اللہ کی رضا) کے معنٰی میں ہے۔ اَلْبِرّ ایسا جامع کلمہ ہے جو خیر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، ابو صالح کہتے ہیں کہ تم ہر گز اس ثواب کو نہیں پاسکتے جو اللہ کے پاس جنت میں ہے، تم لوگ ابرار الاخیار کے وصف کو ہر گز نہیں پاسکتے، اَلْبِرّ یہ اخیار کا خاصہ ہے (خاصہ کسی چیز کا اسی میں پایا جاتا ہے کسی اور میں نہیں)، اللہ تعالیٰ نے یہاں اہل ایمان کو راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ نیل کا معنٰی کسی چیز کا ادراک اور ملنا، عربی زبان میں کہا جاتا ہے نَالَنِی مِن فُلَان مجھے یہ چیز فلاں شخص سے ملی ہے، مَعرُوفٌ یَّنَالَنِی یعنی یہ چیز مجھ تک پہنچی ہے، اسی سے نوال عطیہ کے معنٰی میں ہے۔ ہاتھ سے کسی چیز کے لینے کو تناول کہا جاتا ہے، اَلْبِرّ نیکیاں کرنے اور نیک اعمال بجالانے کو کہا جاتا ہے، حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اَلْبِرّ اور اَلاِثم کے بارے میں پوچھا کہ یارسول اللہ! نیکی اور گناہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلْبِرّ (نیکی) تو عمدہ اخلاق کا نام ہے، جب کہ الاثم (گناہ) وہ چیز ہے جو تیرے سینے میں کھٹکے اور تو اس بات کو ناپسند کرے کہ لوگ اس پر مطلع ہو جائیں۔

حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں زیادہ کھجوروں والے تھے (یعنی ان کے کھجوروں کے باغ تھے) اور ان کے مالوں میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ مال ان کے نزدیک بیر حاء تھا اور یہ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں داخل ہو کر میٹھا پانی پیتے تھے، جب یہ آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ نازل ہوئی تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ اور میرے مالوں میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ مال بیر حاء ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے لیے صدقہ ہے، میں امید کرتا ہو اس کی نیکی کا اور اس کے ذخیرے کا اللہ کے نزدیک، یا رسول اللہ! جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرمائیں اس کو خرچ کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بَخٍ بَخٍ، ذَاكَ

مَالٌ رَابِحٌ، ذَاكَ مَالٌ رَابِحٌ، واہ واہ یہ تو بہت نفع دینے والا مال ہے یہ تو بہت نفع دینے والا مال ہے تحقیق میں نے سن لیا جو کچھ تو نے کہا میرا خیال ہے کہ تو اس کو اپنے (غریب) رشتہ داروں میں بانٹ دے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یا رسول اللہ! میں ایسے ہی کرتا ہوں، پھر ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے رشتہ داروں اور اپنے چچا کے بیٹوں میں تقسیم فرما دیا۔ (تفسیر ابن کثیر، تفسیر در منثور)

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے اس آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ نے حاضر کیا، میں نے ان چیزوں کا ذکر کیا جو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھیں، میں نے اپنی لونڈی مرجانہ رومی کے سوا اپنے نزدیک کسی چیز کو زیادہ محبوب نہیں پایا، پھر میں نے کہا کہ یہ لونڈی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آزاد ہے، اگر میں کسی ایسی چیز کی طرف دوبارہ پلٹتا جس میں اللہ کی راہ میں دے دیا ہوتا تو پھر میں لونڈی سے نکاح کر تا بعد میں آپ نے حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے اس کا نکاح کر دیا۔ (در منثور)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان کے لیے ایک باندی جلولاء کے قیدیوں میں سے خرید کر ان کی طرف بھیج دیں، انہوں نے باندی خرید کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دی اور فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے (باندی) کو آزاد کر دیا۔ (عبد بن حمید، ابن جریر، در منثور)

محمد بن المنکدر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ نازل ہوئی تو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایک گھوڑا لے کر آئے، جس کو شبلہ کہا جاتا تھا اور ان کے نزدیک یہ مال سب سے زیادہ محبوب تھا، عرض کیا یا رسول اللہ! یہ گھوڑا صدقہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہ کو دے دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے اس کو قبول فرما لیا ہے۔ (سعید بن منصور، ابن المنذر، در منثور)

ہر شخص کی محبوبات الگ الگ ہیں اور جس شخص کے پاس پیسہ کم ہو وہ اس میں سے اللہ کے لیے خرچ کر دے تو وہ بھی اس آیت کے مفہوم میں شامل ہے، کیونکہ کم مال ہونے کی وجہ سے پیسہ زیادہ محبوب ہوتا ہے، آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ زکوۃ ہو یا صدقات واجبہ یا نافلہ ان میں سب سے

اچھا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اور اپنی محبوب چیزیں مستحقین میں خرچ کی جائیں، اگر کوئی شخص ایسی چیز کو اللہ کی راہ میں دیدے جو اس کی ملکیت تو ہے لیکن ضرورت سے زائد ہے جیسے پرانے اُتارے ہوئے کپڑے تو اس کا بھی اجر ہے، البتہ جس چیز سے محبت ہو اس کے خرچ کرنے میں زیادہ ثواب ہے اسی لیے بعض مفسرین نے اَلْبِرّ کی تفسیر الخیر الکامل سے کی ہے، یعنی کامل ثواب اسی میں ہے جبکہ محبوب چیز خرچ کی جائے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں کہ جو چیز محبوب نہیں اسے خرچ نہ کرو مطلب یہ ہے کہ محبوب چیز خرچ کرنے کی طرف رغبت کرو۔ (انوار البیان)

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ: یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کیسی چیز خرچ کی؟ کہاں خرچ کی؟ اور کس کے لیے خرچ کی؟ جتنی محبوب اور پیاری چیز جس طرح کے مصرف میں جس قدر اخلاص و حسن نیت سے خرچ کرو گے اسی کے موافق اللہ تعالیٰ کے یہاں سے بدلہ ملنے کی امید رکھو۔ (عثمانی)

جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے اور وہ اسی کے مطابق تمہیں بدلہ دے گا۔

فائدہ: غیر محبوب کے خرچ کرنے پر اجر و ثواب ملتا ہے بشرطیکہ وہ قابل نفرت نہ ہو جیسا کہ ارشاد ہے، وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ، یعنی قصد کر کے خراب اور ردی چیز خیرات مت کرو، ہاں اگر کسی نے سارا مال خیرات کر دیا اور اس میں کچھ ردی بھی تھا یا سارا ہی ردی تھا تو کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ قصد کر کے ردی نہیں دے رہا ہے بلکہ جو اس کے پاس موجود ہے وہی دے رہا ہے ممانعت اس کی ہے کہ ایک شخص کے پاس عمدہ مال بھی ہے اور خراب بھی مگر وہ شخص صدقہ کے لیے خراب اور ردی مال کا انتخاب کرتا ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی) اس میں ردی اور بے کار چیز صدقہ کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے، جب کہ جید، عمدہ، اعلیٰ، ارفع اور بہترین چیز اللہ کی راہ میں دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔

نکتہ۔ شاید یہود و نصاریٰ کے ذکر میں یہ آیت اس لیے نازل کی کہ ان کو اپنی ریاست بہت محبوب تھی اس وجہ سے وہ نبی کے تابع نہ ہوتے تھے تو جب تک وہ اللہ کی راہ میں اپنی محبوب ریاست کو نہ چھوڑیں گے ایمان کی دولت حاصل نہ کر سکیں گے۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

یہودی کس قدر جھوٹ بولتے تھے؟

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے نیز بتائیے کہ ان آیات کا شانِ نزول کیا ہے؟

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلاًّ لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلاَّ مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ قُلْ فَأْتُواْ بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ {۹۳} فَمَنِ افْتَرَى عَلَى اللهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ {۹۴} قُلْ صَدَقَ اللهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ {۹۵} آل عمران

جواب ترجمہ: بنی اسرائیل کے لیے سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں مگر وہ چیز جو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کی تھی آپ فرمادیجیے کہ تورات لاؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔ پھر اس کے بعد بھی جو اللہ پر جھوٹ باندھے تو وہی لوگ ناانصاف ہیں۔ میرے حبیب! آپ فرمادیجیے کہ اللہ نے تو بات سچ سچ کہہ دی بس اب تم ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو (اللہ کے لیے) یکسو تھے اور وہ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔

شانِ نزول: ابوروق اور کلبی کہتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں، یہودیوں نے کہا: یہ کیسے؟ آپ ﷺ تو اونٹوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کا دودھ پیتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: كَانَ ذٰلِكَ حَلَالًا لِإِبْرَاهِيمَ، فَنَحْنُ نُحِلُّهُ، یہ چیزیں ابراہیم علیہ السلام کے لیے حلال تھیں، اس لیے ہم بھی انہیں حلال ہی جانتے ہیں، اس پر یہودیوں نے کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک، ابراہیم سے لے ہم تک پہنچی وہ حرام تھی تو ہم اسے آج بھی حرام ہی جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جھوٹ بولتے ہیں، {كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ} بنی سرائیل کے لیے ہر چیز حلال تھی، سوائے اس کے جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کردی تھی، اس پر یہ آیت اتری۔ (اسباب النزول، ابوالحسن نیشاپوری ص ۱۱۵)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلاًّ لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ: طعام سے مراد مطعومات ہیں، یعنی کھائی جانے والی تمام اشیاء ان پر حلال کی گئی تھیں، بنی اسرائیل ان سب نعمتوں سے استفادہ کرتے اور لطف اندوز ہوتے تھے،

حِلاً یہ مصدر ہے جس میں واحد، جمع، مذکر اور مؤنث سب یکساں ہیں۔ مرد ار، خنزیر کا گوشت اور لہو جاری ان پر بھی حرام تھا۔ (بحر العلوم)

شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہود کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور انہوں نے کہا اے ابو القاسم! آپ ہمیں چند ایسی باتیں بتایئے جن کو نبی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے متعلق سوال کرتے ہیں، انہوں نے جو سوالات کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ توراۃ کے نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے کون سے طعام کو اپنے اوپر حرام کیا تھا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، جس نے توراۃ کو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا ہے، کیا تم کو علم ہے یعقوب علیہ السلام بہت سخت بیمار ہوگئے اور ان کی بیماری بہت طول پکڑ گئی، تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بیماری سے شفا دے دی تو وہ اللہ کی رضا کے لیے اپنے محبوب مشروب اور محبوب طعام کو اپنے اوپر حرام کر دیں گے اور ان کے نزدیک محبوب طعام اونٹ کا گوشت تھا اور محبوب مشروب اونٹنیوں کا دودھ تو یہودیوں نے کہا ہاں۔ (مسند امام احمد)

اس سے پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا تھا کہ جب تک انسان اللہ کی راہ میں اپنی محبوب چیز کو خرچ نہ کرے وہ نیکی نہیں پا سکتا اور اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ کی رضا کے لیے اپنے محبوب طعام اور مشروب کو چھوڑ دیا۔ اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دین کے اصول اور بنیادی عقائد پر یہود کے شبہات کا جواب دیا تھا اور اس آیت میں دین کی فروع اور فقہی مسائل میں یہود کے اعتراض اور شبہات کا جواب دیا ہے۔ نیز اس سے پہلی آیات میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو مقرر فرمایا تھا اور اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے اول تو اس لیے کہ یہود نسخ کے منکر تھے اور اپنی شریعت کو قیامت تک کے لیے نافذ مانتے تھے، اس آیت میں ان پر یہ ثابت کیا گیا کہ پہلے اونٹ کا گوشت حرام نہیں تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کو حرام کیا ہے، اس سے نسخ ثابت ہو گیا اور جب نسخ جائز ہو گیا تو یہودی شریعت کا منسوخ ہونا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا نافذ ہونا جائز ہو گیا، ثانیاً اس لیے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مکتب میں پڑھا نہیں تھا،

نہ کسی عالم کی صحبت میں بیٹھے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے بتادیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اُوپر اُونٹ کا گوشت اور اُونٹنیوں کا دودھ حرام کیا تھا۔ (تبیان القرآن)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اونٹ کے گوشت کو شرعاً حرام کیا تھا یا عرفاً؟ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر اونٹ کا گوشت حرام کرلیا تھا، حالانکہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا یہ اللہ کے اختیار میں ہے، بندوں کے اختیار میں نہیں ہے، امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی رحمہ اللہ نے اس کے حسب ذیل جواب دیئے ہیں: ① یہ ہوسکتا ہے کہ انسان کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرلے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ بھی اس کو حرام کر دیتے ہیں مثلاً انسان اپنی بیوی کو طلاق مغلظہ دے کر اپنے اوپر حرام کرلے، پھر اللہ تعالیٰ بھی اس عورت کو اس پر حرام کر دیتے ہیں۔

(ب) انبیاء علیہم السلام بھی اجتہاد کے ذریعہ کسی چیز کا حلال یا حرام ہونا معلوم کرتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے یہ معلوم کیا تھا کہ اُونٹ کا گوشت حرام ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نبیذ کو حلال قرار دیتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس کو حرام کہتے ہیں اور یہ حلت اور حرمت اجتہادی ہے، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے اونٹ کے گوشت کو اپنے اجتہاد سے حرام قرار دیا تھا۔

(ج) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دینا ایسا ہو جیسے ہماری شریعت میں نذر ماننا اور جس طرح ہماری شریعت میں نذر کو پورا کرنا واجب ہے اسی طرح ان کی شریعت میں کسی چیز کی تحریم کو پورا کرنا واجب ہو۔ (تفسیر کبیر، تبیان القرآن)

إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آیت **كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ** حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو اپنے اوپر کھانا حرام کیا تھا، وہ ہڈی والا گوشت تھا آپ علیہ السلام کو عرق النساء کی بیماری لگ گئی تھی، آپ علیہ السلام اس حال میں رات گذارتے تھے کہ ان کی چیخ و پکار ہوتی تھی، تو انہوں نے اللہ کے لیے یہ نذر مانی کہ اگر ان کو شفا ہوگئی تو ایسا گوشت نہیں کھائیں گے جس میں ہڈی ہوگی، تو اس وجہ سے یہودیوں نے بھی اس کو اپنے اوپر حرام کرلیا۔ (در منثور) جو کھانا

حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کیا تھا وہ انہیں تمام کھانوں میں سب سے زیادہ محبوب و مرغوب تھا۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت ہے کہ آیت إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ سے مراد ہے کہ انہوں نے دودھ اور اونٹ کے گوشت کو حرام کر لیا تھا، آپ علیہ السلام کو عرق النساء کی بیماری تھی، انہوں نے اونٹ کا گوشت کھایا تو رات سخت تکلیف میں گذاری (اس پر) انہوں نے قسم کھائی کہ اب وہ اس (گوشت) کو کبھی نہیں کھائیں گے۔ (در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تیسری روایت ہے کہ جن زائد چیزوں کو یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا وہ جگر اور گردوں کی چیزیں اور چربی تھی، سوائے اس چربی کے جو پیٹھ پر ہوتی ہے کیونکہ یہ قربانی کے لیے پیش کی جاتی تو اس کو آگ کھا جاتی تھی۔ (در منثور)

مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو مرغوب و محبوب کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یہ تورات کے نزول سے پہلے کی بات ہے، تورات میں یہ چیزیں جو انہوں نے اپنے اوپر حرام کی تھیں حرام نہیں قرار دی گئیں۔

قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ: میرے حبیب! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجیے کہ تم توراۃ لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ توراۃ میں یہ چیزیں حرام ہیں، ابراہیم علیہ السلام پر تو یہ چیزیں کیا حرام ہوتیں خود توراۃ میں ان کی حرمت نہیں ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سینکڑوں سال کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ توراۃ ان چیزوں کی تحریم کے ساتھ نازل ہوئی، جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حرام کر لیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ انہوں نے جھوٹ بولا یہ بات تورات میں نہیں تھی، بلاشبہ یہ چیزیں ان کے لیے حرام نہیں کی گئی تھیں، مگر اس لیے کہ بنی اسرائیل نے توراۃ کے نازل ہونے کے بعد نافرمانی کی پھر فرمایا فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ اور یہودیوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا موسیٰ علیہ السلام یہودی تھے گویا ہمارے دین پر تھے اور

ہماری توراۃ میں آگیا ہے حرام ہونا چربی کا، ناخن والے جانوروں کا اور ہفتہ کے دن شکار کرنے کا، محمد ﷺ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا حضرت موسیٰ علیہ السلام یہودی نہیں تھے اور توراۃ میں اسلام کے سوا کچھ نہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ کیا اس میں یہ بات ہے وہ اس حکم کو لائے جو انبیاء علیہم السلام موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تو رات تو اکٹھی تختیوں میں نازل ہوئی۔ (در منثور)

مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "آیت مذکورہ میں مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ یعنی توراۃ کے نزول سے قبل کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ نزول توراۃ سے پہلے یہ سب چیزیں حلال تھیں البتہ توراۃ نازل ہونے کے بعد بہت سی حلال چیزیں یہود پر ان کے ظلم اور شرارت کی وجہ سے توراۃ میں حرام کر دی گئیں جن کی کچھ تفصیل سورۃ انعام میں ہے، آپ ﷺ ان یہود سے کہہ دیجیے اگر تم کو اس کا دعوی ہے کہ یہ چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے برابر حرام چلی آرہی ہیں تو توراۃ کو لے کر آؤ اور یہ مضمون توراۃ میں دکھاؤ اور سب کے سامنے اس کو پڑھ کر سناؤ اگر تم اس دعوی میں سچے ہو کہ یہ چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حرام تھیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ ان کی کتاب کے ساتھ مباحثہ کریں یہود یہ دلیل قاطع اور برہان ساطع سن کر حیران رہ گئے اور توراۃ نہ لاسکے اس طرح نبی کریم ﷺ کی صداقت پر ایک حجت قائم ہو گئی اور یہود کا کاذب اور مفتری ہونا ثابت ہو گیا۔ (معارف القرآن للکاندھلوی)

فَمَنِ افْتَرَى عَلَى اللهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ: اب اگر اس مطالبے کے بعد اور اس کھلے الزام کے بعد جو توراۃ نہ لانے کی وجہ سے ان پر آگیا پھر بھی بدبخت یہی کہے جائے کہ یہ چیزیں ملت ابراہیمی میں حرام تھیں اور یہ بدبخت اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی تہمت لگائے جائیں تو بس ایسے ہی بدبخت تو ظالم اور ناانصاف ہیں۔ (کشف الرحمٰن) ان لوگوں نے اپنے زعم اور خیال کے مطابق یہ بات گھڑلی تھی کہ تورات کے نزول سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں پر یہ چیزیں حرام تھیں۔ (المقتطف) افتراء اور اختلاق یہ دونوں باب افتعال سے ہیں، افتراء کا معنیٰ ایسا جھوٹ جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہ ہو، جھوٹ دو قسم پر ہوتا ہے، ایک ایسا جھوٹ جو گھڑا گیا ہے جس

کی کوئی اصل نہ ہو یا اصل تو ہو لیکن اس میں تبدیلی کی گئی ہو، ایسا جھوٹ جس کی جڑ اور بنیاد ہی کوئی نہ ہو یہ دونوں قسموں میں زیادہ بڑی بات ہے، اسی طرح جھوٹ گھڑنے والا بھی دو قسم پر ہے، ایک اونچے درجے کا اور دوسرا نچلے درجے کا، اونچے درجے کے جھوٹے کو زیادہ گناہ ملتا ہے، پھر جھوٹ بنانے والے کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جھوٹا جو جھوٹ اور فریب کو جانتا ہے، دوسرا وہ جو جھوٹا جو جھوٹ فریب کو جانتا ہی نہیں ہے، جو جھوٹا جھوٹ فریب کو جانتا ہے زیادہ خراب مرتبے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے آیت میں فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا، وہ ذات جو پوشیدہ اور پوشیدہ تر کو جانتی ہے، ان لوگوں نے یہ حرکت اس وقت کی جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر ان کے جھوٹ اور کذب کو آشکار کر دیا ہے اور یہ بات بھی کھول کر بتادی کہ ایسا جھوٹ وافتراء گھڑنے والے ظلم کی انتہاؤں پر ہیں، واضح فرمادیا کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے۔

ان لوگوں نے دلائل وبراہین دیکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات پر افتراء باندھا ہے، تو یہ افتراء باندھنے والے، جھوٹ گھڑنے والے ظالم ہیں، اپنی ذات پر بھی انہوں نے ظلم کیا، اپنے مصاحبین ومعاصرین پر بھی انہوں نے اس لحاظ سے ظلم کیا کہ انہیں گمراہ کیا، انہوں نے جو کچھ بھی کیا انتہائی برا کیا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ جن چیزوں کو حرام کیا گیا وہ تورات میں نہیں، بنی اسرائیل کے لیے ساری چیزیں حلال تھیں سوائے ان کے جو یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام قرار دی تھیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی اور نصرانی نہیں تھے بلکہ وہ یکسو ہونے والے مسلمان تھے، تم ملت ابراہیمی کی پیروی کرو جو مخلص اور یکسو تھے ملت اسلام اور ملت ابراہیمی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، تم ملت اسلام کی پیروی کرو، تم لوگ اونٹ کا گوشت کھاؤ اور دودھ استعمال کرو، کیونکہ ابراہیم اونٹ کا گوشت کھاتے تھے اور اونٹنیوں کا دودھ بھی پیتے تھے، تم لوگ اپنی مرضی اور نفسانی خواہشات کے مطابق حلال اور حرام کی بات نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے یہاں آخر میں یہود ونصاریٰ پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا کہ ابراہیم مشرک نہیں تھے ان کی اتباع کرو کیونکہ توحید اور دین پر ڈٹے رہنے کی وجہ سے ان کی اتباع

ضروری وواجب ہے۔

عبادت کے لیے زمین پر پہلا گھر

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتایئے کہ عبادت کے لئے زمین پر پہلا گھر کون سا بنایا گیا ہے؟ اس گھر کے فضائل کیا ہیں؟

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ {۹۶} فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ {۹۷} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک لوگوں کے واسطے جو سب سے پہلا گھر مقرر ہوا یہی ہے جو مکہ میں برکت والا ہے اور جہان کے لوگوں کے لیے راہ نما ہے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں مقام ابراہیم ہے اور جو بھی اس میں داخل ہوا وہ امن سے ہوا اور اللہ کے لیے اس گھر کا حج کرنا ان لوگوں پر لازم ہے جو بھی وہاں تک راستہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو کوئی منکر ہو تو اللہ کو دنیا جہان کی پروا نہیں۔

شان نزول: مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تَفَاخَرَ الْمُسْلِمُونَ وَالْيَهُودُ، فَقَالَتِ الْيَهُودُ: بَيْتُ الْمَقْدِسِ أَفْضَلُ وَأَعْظَمُ مِنَ الْكَعْبَةِ لِأَنَّهُ مُهَاجَرُ الْأَنْبِيَاءِ وَفِي الْأَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ، وَقَالَ الْمُسْلِمُونَ: بَلِ الْكَعْبَةُ أَفْضَلُ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى هَذِهِ الْآيَةَ (اسباب النزول) مسلمان اور یہود نے آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا یہود نے کہا کہ بیت المقدس کعبہ سے زیادہ فضیلت والا اور عظمت والا ہے کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ ہے اور ارض مقدس میں واقع ہے اور مسلمانوں نے کہا بلکہ کعبہ افضل ہے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ: سب سے پہلا گھر جو اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے، وہ ہے جو مکہ میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے، اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا کے سب گھروں میں پہلا گھر عبادت ہی کے لئے بنایا گیا ہو، اس سے پہلے نہ کوئی عبادت خانہ ہو نہ دولت خانہ، حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالی کے نبی ہیں، ان کی

شان سے کچھ بعید نہیں کہ انہوں نے زمین پر آنے کے بعد اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر یعنی عبادت کی جگہ بنائی ہو، اسی لئے حضرت عبد اللہ بن عمر، مجاہد قتادہ، سدی وغیرہ صحابہ و تابعین اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کے رہنے سہنے کے مکانات پہلے بھی بن چکے ہوں، مگر عبادت کے لئے یہ پہلا گھر بنا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالی نے جبریل علیہ السلام کے ذریعہ ان کو یہ حکم بھیجا کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں، ان حضرات نے حکم کی تعمیل کرلی تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں اور ان سے کہا گیا کہ آپ اول الناس یعنی سب سے پہلے انسان ہیں اور یہ گھر اول بیت وضع للناس ہے، یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں "مسلمانوں کے اس دعوے پر کہ ہم سب سے زیادہ ابراہیم علیہ السلام سے اشبہ و اقرب ہیں، یہود کو یہ بھی اعتراض تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وطن اصلی (عراق) چھوڑ کر شام کو ہجرت کی، وہیں رہے وہیں وفات پائی، بعدہ ان کی اولاد شام میں رہی، کتنے انبیاء علیہم السلام اسی مقدس سرزمین میں مبعوث ہوئے سب کا قبلہ بیت المقدس رہا، پھر تم حجاز کے رہنے والے جنہوں نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو اپنا قبلہ بنالیا ہے اور سرزمین شام سے دور ایک طرف پڑے ہو کس منہ سے دعویٰ کرسکتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام و ملت ابراہیم علیہ السلام سے تم کو زیادہ قرب و مناسبت حاصل ہے۔ اس آیت میں معترضین کو بتلایا گیا کہ بیت المقدس وغیرہ مقامات مقدسہ تو بعد میں تعمیر ہوئے ہیں، دنیا میں سب سے پہلا متبرک گھر جو لوگوں کی توجہ الی اللہ کے لئے مقرر کیا گیا اور بطور ایک عبادت گاہ اور نشان ہدایت کے بنایا گیا، وہ یہ ہی کعبہ شریف ہے جو اس مبارک شہر مکہ معظمہ میں واقع ہوا ہے"۔ (تفسیر عثمانی)

بکہ اور مکہ : یہاں کعبہ شریف کو بکہ میں بتایا، عام طور سے اس شہر کو مکہ کہا جاتا ہے جس میں کعبہ شریف ہے اور سورۃ فتح میں مکہ میم سے وارد ہوا ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ با اور میم قریب المخرج ہیں اور اہل عرب ایک کو دوسری جگہ استعمال کرلیتے ہیں جیسے لازم کو لازب کہتے ہیں، لہٰذا مکہ

میں با کو میم سے بدل دیا اور بعض حضرات نے دونوں میں فرق بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ بکہ بیت اللہ کی جگہ ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان بکہ ہے اور باقی مکہ ہے ایک قول یہ بھی ہے کہ پورا حرم مکہ ہے۔ (الجامع اللطیف فی فضل مکۃ و بناء بیت الشریف: ص ۱۳۶، انوار البیان) یہ بھی کہا گیا ہے کہ بکہ مسجد الحرام کی جگہ کو کہا جاتا ہے جب کہ مکہ سارے شہر کو کہا جاتا ہے۔ (الوسیط للطنطاوی)

بعض اہل علم و فضل نے بکہ اور مکہ کے لغوی معانی بیان فرمائے ہیں، بکۃ، البک سے مشتق ہے اور اس کا معنی اژدحام اور بھیڑ ہے، جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کہا جاتا ہے تَبَاكَ القَومُ، طواف کی جگہ لوگوں کی بھیڑ اور اژدحام ہونے کی وجہ سے اس کا نام بکہ رکھا گیا ہے اور اَلبَك کا معنی ہے دَقَّ العُنُق، گردن توڑنا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام بکہ اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے، جب وہ اس میں ظلم و زیادتی کی طرف مائل ہوں، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی کسی جابر نے برائی کی نیت سے اس کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پاش پاش کر دیا اور رہا مکہ! تو کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام پانی کی قلت کی وجہ سے رکھا گیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لیے ہے کیونکہ اس کا قصد کر کے آنے والا اتنی مشقت پاتا ہے جو اس کی ہڈیوں سے گودے اور مغز کو خشک کر دیتا ہے۔ (قرطبی) یہ بھی کہا گیا ہے کہ بکہ بکات الناقہ اور بکات الشاۃ سے ماخوذ ہے یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اونٹنی اور بکری کا دودھ کم ہو جاتا ہے، اس لحاظ سے بکہ کو بکہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں پانی کی قلت ہے۔ (الوسیط) یہ صرف اس زمانے کی بات نہیں ہے جب قرآن کریم میں یہ آیات نازل ہو رہی تھیں، بلکہ زمانہ قدیم سے ہی وہاں پانی کی قلت ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی لگنے اور جبریل کے پر سے زمزم کا چشمہ جاری ہوا، جو اس وقت سے اس وقت تک جاری ہے اور دنیا بھر کے مسلمان یہاں سے پانی بھر کر لے جاتے ہیں، مگر عام استعمال کا پانی آج بھی مکہ میں اس طرح دستیاب نہیں ہے، نہر زبیدہ اسی لیے بنائی گئی تھی کہ یہاں کے لوگوں کو پانی کی مشکلات کا سامنا تھا، آج بھی عام استعمال کا پانی سمندر سے پائپ لائنوں کے ذریعے مکہ مکرمہ میں پہنچایا جاتا ہے۔

مُبَارَكًا: وہ بابرکت ہے یہاں بیت اللہ کی عظمت کو مزید چار چاند لگاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اسے برکت والا گھر قرار دیا ہے، برکت کا معنیٰ ہوتا ہے کثیر الخیر، بیت اللہ کو کثیر الخیر اس لیے قرار دیا گیا کہ اس میں عبادت کا ثواب بہت زیادہ ہے جو شخص حج یا عمرہ کرے اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں، ان برکات کے علاوہ اس کی ظاہری برکات بھی بہت ہیں، قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ان برکات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، کہ یہاں ہر چیز کے پھل جو بطور رزق اللہ کی طرف سے دیے جاتے ہیں وہ یہاں لائے جاتے ہیں، بیت اللہ کے ارد گرد ظاہری برکات کی بھی فراوانی ہے اور معنوی برکات کی بھی فراوانی ہے، یہاں ہر موسم کے پھلوں کی بہتات ہوتی ہے، دنیا بھر کی منڈیوں میں شاید وہ پھل فروٹ دستیاب نہیں جو یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں، یہاں قربانیاں بھی اس کثرت سے ہوتی ہیں جو کسی اور شہر میں نہیں ہوتیں۔

وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ: یعنی وہ جنت کی طرف ہدایت کا ذریعہ ہے اور سارے عالم کے مسلمان جو اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اس میں بھی هُدًى لِّلْعَالَمِينَ کا خوب مظاہرہ ہے۔ (انوار البیان)

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ: اس میں بہت سی واضح علامات ونشانیاں ہیں جو روئے زمین کی تمام مساجد وعبادت گاہوں کے مقابلے میں اس کی فضیلت وشرف کو ظاہر کرتی ہیں، اس میں حجر اسود ہے، اس میں حطیم ہے، مقام ابراہیم ہے، صفا ومروہ ہے جنہیں دوسرے مقام پر شعائر اللہ کہا گیا ہے۔

مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ: تعمیم کے بعد تخصیص ہے، بیت اللہ میں نشانیاں اور علامات کا عمومی ذکر کرنے کے بعد مقام ابراہیم کا خصوصی طور پر ذکر کیا جارہا ہے، یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ تعمیر کرتے تھے، ہزاروں سال گزرنے کے باوجود آج بھی یہ پتھر اس عظیم انسان کی یاد دلاتا ہے جس نے اللہ کی خاطر اس کے گھر کو بہت ہی خلوص ومحبت کے ساتھ تعمیر کیا ہے، اس کی تعمیر کے بعد اس کی قبولیت کی دعا کی تھی، جس شہر میں بیت اللہ تعمیر ہوا اس میں امن وشانتی کی دعا کی تھی، یہاں کے رہنے والوں کے لیے برکت کی دعا کی تھی، جس کے ثمرات اور اثرات آج تک دکھائی دے رہے ہیں اور رہتی دنیا تک دکھائی دیتے رہیں گے۔ ابو العباس کہتے ہیں کہ مقام یہاں مقامات کے معنیٰ میں ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، ایک روایت میں ہے کہ حج سارے کا سارا

مقام ابراہیم ہے۔

وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا: یہ ایسا امن وشانتی والا گھر ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالائی جاتی ہے، یہاں اللہ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے، جو شخص اس میں داخل ہو جاتا ہے وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے، کس قدر کسی انسان کو کسی کے ساتھ دشمنی اور عداوت ہو اگر وہ یہاں موجود ہو گا تو اسے امن حاصل ہو گا، یہاں کوئی شخص کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتا، یہاں کسی کو ہمت نہیں پڑتی کہ کسی دشمن پر ہاتھ اٹھائے، اگر کتنا پرانا دشمن یہاں تک کہ اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ لیتا ہے تو چشم پوشی کرتے ہوئے گزر جاتا ہے، وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ حرم شریف میں نہیں لیتا۔ اسی طرح خود خانہ کعبہ بھی محفوظ ومامون ہے، جس کسی نے بھی کعبہ شریف پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا وہ خود تہس نہس ہو گیا، ہاتھی والوں کا واقعہ تو مشہور ہی ہے کہ ابرہہ یمن کا حاکم ہاتھی لے کر حملہ کرنے کے لیے آیا تھا اللہ تعالیٰ نے پرندے بھیج دیئے، جنہوں نے ان پر کنکریاں پھینکیں اور ہاتھی اور ہاتھی والے سب چورہ ہو کر رہ گئے تھے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا: ان لوگوں پر حج کرنا فرض بتایا ہے جن کو مکہ معظمہ تک پہنچنے کی طاقت ہو آیت میں جو مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً وارد ہوا ہے اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ مَا السَّبِيْلُ کہ سبیل سے کیا مراد ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا زادٌ وَّرَاحِلَةٌ سفر خرچ اور سواری، ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا چیز حج کو فرض کرتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا زادٌ وَّرَاحِلَةٌ کہ سفر خرچ اور سواری ہونے سے حج فرض ہو جاتا ہے۔ (انوار البیان) مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کے پاس مال، صحت اور امن ہے اس پر حج فرض ہے۔ (اوضح التفاسیر) حج اسلام کے اہم ترین ارکان میں سے ایک ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، لا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔ (بخاری)

شان نزول: حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت {وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ} نازل ہوئی تو یہود نے کہا کہ ہم لوگ اسلام پر ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت والی یہ آیت {وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا} نازل فرمائی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

ترک حج پر وعیدیں: در منثور میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے ارادہ کر لیا ہے شہروں میں لوگوں کو بھیجوں وہ ان کو دیکھیں جو مالدار ہیں اور انہوں نے حج نہیں کیا میں ان لوگوں پر جزیہ مقرر کر دوں، یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر لوگ حج کو چھوڑ دیں گے تو میں ان سے قتال کروں گا جیسا کہ نماز اور زکوۃ چھوڑنے پر قتال ہو گا۔

آیت مبارکہ سے اور حدیث سے معلوم ہوا کہ حج اس شخص پر فرض ہے جس کے پاس مکہ معظمہ تک آنے جانے کا اور سفر خرچ کا انتظام ہو، اتنا پیسہ بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے مگر حج نہیں کرتے، ایسے لوگ وعید پر غور کریں، لوگوں نے حج کے بہت سے خرچے اپنے ذمہ لگا لیے ہیں، سامان خرید کر لاتے ہیں، عزیزوں کو قیمتی ہدایا دیتے ہیں، ان سب کو انہوں نے حج کے خرچ میں شمار کر رکھا ہے، بہت سے لوگ مر جاتے ہیں اور اس لیے حج نہیں کر پاتے کہ ان کے پاس رواجی خرچ نہیں ہوتا، یا خرچ ہوتا تو ہے لیکن لڑکیوں کی رواجی شادیاں اور دوسرے دنیاوی انتظامات کی وجہ سے حج کرنے میں تاخیر کرتے ہیں ان میں بعض لوگ ایسے وقت حج کرتے ہیں جبکہ بوڑھے کھوسٹ ہو جاتے ہیں، احکام حج ادا کرنے سے بوجہ ضعف اور کمزوری قاصر رہتے ہیں اور بعض لوگ گھر بار کے انتظامات کے انتظار میں مر جاتے ہیں اور حج سے رہ جاتے ہیں۔ (انوار البیان)

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جسے کسی مجبوری نے یا کسی ظالم بادشاہ نے یا روکنے والے مرض نے حج سے نہ روکا اور مر گیا اور حج نہ کیا تو اسے چاہیے کہ یہودی ہونے کی حالت میں مر جائے یا نصرانی ہونے کی حالت میں مر جائے۔ (مشکوۃ المصابیح، الدارمی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا حج ہر سال ہے یا ایک مرتبہ (زندگی میں)؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ ایک مرتبہ اور جس نے ایک سے زیادہ دو مرتبہ حج کیا تو اس نے نفل ادا کیا۔ (در منثور)

اس پاک گھر میں جمال خداوندی کی کوئی خاص تجلی ہے جس کی وجہ سے ادائے حج کے لیے اسے مخصوص کیا گیا کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کی ہر ادا اس جمیل مطلق اور محبوب برحق کے عشق و محبت کے جذبہ کا اظہار کرتی ہے پس ضروری ہے کہ جسے اس کی محبت کا دعویٰ ہو اور بدنی و مالی حیثیت سے بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو، کم از کم عمر میں ایک مرتبہ دیار محبوب میں حاضری دے اور دیوانہ وار وہاں کا چکر لگائے۔ (عثمانی)

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ: اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے کفر کیا یعنی حج کی فرضیت کے اس قدر تاکیدی مضامین و فضائل کے باوجود جس نے حج نہیں کیا اس نے کفر کیا، ایک مطلب یہ ہے کہ جس نے حج کی فرضیت کا انکار کیا، ایک مطلب یہ ہے کہ جس نے کفران نعمت کیا (نعمت کی ناقدری) یعنی جس نے اس پر شکر ادا نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے صحت جیسی نعمت سے مالا مال کر رکھا ہے، اللہ نے اسے مال میں فراوانی عطا فرمائی ہوئی ہے، اس کے باوجود حج نہیں کیا تو اس نے کفر کیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ انتہائی شدت اور سختی کے محل میں وارد ہوئی ہے اور اسی لیے ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ جو آدمی فوت ہوا اور اس نے حج نہ کیا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا تھا تو وعید اس کی طرف متوجہ ہوگی اور کسی دوسرے کا اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اگر غیر کا حج کرنا اس سے فرض کو ساقط کر دے تو اس سے وعید ساقط ہو جائے اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر میرا کوئی پڑوسی فوت ہوا اور اس کے پاس وسعت اور خوشحالی ہو اور اس نے حج نہ کیا تو میں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (قرطبی)

شان نزول: ① حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ ان سے حج کا کہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حج کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ

ہمارے اوپر حج لازم نہیں ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے {وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ} نازل فرمائی، انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ہم پر حج لازم نہیں ہے۔ (العجاب فی بیان الاسباب، لباب)

② حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ جب یہ آیت حج نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے تمام ادیان والوں کو جمع کیا، پھر آپ ﷺ نے انہیں مخاطب ہو کر فرمایا، اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج ادا کرو، یہ سن کر ایک دین کے پیروکاروں نے قبول کر لیا، یہ وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی، آپ ﷺ پر ایمان لائے اور پانچ ادیان والوں نے اس کا انکار کیا، انہوں نے کہا کہ ہم اس پر ایمان نہیں لاتے، ہم اس کی طرف منہ کر کے نماز نہیں پڑھتے، ہم اس کی طرف منہ نہیں کرتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ جس نے کفر کیا تو اللہ تعالیٰ جہان والوں سے بے نیاز ہے۔ (تفسیر طبری، العجاب فی بیان الاسبا)

حج البیت میں حج کی اضافت بیت کی جانب بتا رہی ہے کہ کعبہ وجوب حج کا سبب ہے اور چونکہ کعبہ متعدد نہیں اس لیے عمر میں حج کا وجوب بھی بار بار نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے حج (فرض) ایک بار ہے جو زیادہ کرے تو نفل ہو گا۔ (رواہ احمد والنسائی) کعبہ نام کسی خاص چھت یا پتھر مٹی کی دیواروں کا نہیں ہے۔ پتھر مٹی کو اٹھا کر کہیں دوسری جگہ ڈال دیا جائے تو کعبہ منتقل نہیں ہو جائے گا اگر اس مصالحہ سے کسی دوسری جگہ کوئی عمارت بنا دی جائے تو وہ قبلہ سجود نہ بن جائے گی بلکہ کعبہ ایک ربانی لطیفہ ہے جس کی فرود گاہ ایک موہوم مکان ہے جہاں تجلیات ذاتیہ کی بارش ہوتی ہے پس ظاہر کعبہ اگرچہ مخلوق ہے اور اس کا تعلق عالم خلق سے ہے مگر حقیقت میں کعبہ ایک باطنی نسبت ہے جس کا ادراک نہ حس کر سکتی ہے نہ خیال بلکہ محسوس (ظاہری) ہونے کے باوجود وہ محسوس نہیں ہے اور جہت مخصوصہ میں ہونے کے باوجود اس کی کوئی جہت نہیں، یہ ظاہر کعبہ کی شان ہے، رہی کعبہ کی حقیقت تو وہ کون جانے، پاک ہے وہ ذات جس نے ممکنات کو وجوب کا آئینہ (اور پرتو گاہ) بنایا اور عدم (ذاتی) کو وجوب و وجود کا مظہر قرار دیا، پھر کعبہ کی حقیقت سے بالا حقیقت قرآن ہے، (جو مخلوق بھی نہیں ہے) اور حقیقت قرآن سے بالاتر نماز کی حقیقت ہے اور اس مقام پر پہنچ کر سالک کی

سیر بوساطت پیغمبر ختم ہو جاتی ہے اور فنا وبقاء کا مقام آتا ہے اور اس سے بھی اوپر خالص معبودیت (اُلوہیت) کا مقام ہے جس کی سیر صرف نظری ہی ہو سکتی ہے (سلوکی نہیں ہو سکتی) (مظہری)

تاریخ کعبہ ایک نظر میں

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ زمین پہ سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسجد الحرام میں نے عرض کیا پھر کون سی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلمَسجِدُ الاَقصیٰ میں نے عرض کیا ان دونوں میں کتنی مدت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! اَربَعُونَ عَاماً، ان میں چالیس سال کی مدت ہے۔ (مسلم)

علامہ ازرقی رحمہ اللہ نے علی بن حسین رحمہ اللہ کی ایک روایت کے حوالہ سے کہا کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں نقل کیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے اس وقت فرشتوں نے ان سے ملاقات کی اور کہا کہ آدم تمہاری عبادت اچھی ہے۔

جعفر بن محمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ان کے والد سے کسی نے بیت اللہ کی ابتدائی تعمیر سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا: اِنِّی جَاعِلٌ فِی الاَرضِ خَلِیفَۃً، میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں، اس پر فرشتوں نے کہا: اَتَجعَلُ فِیہَا مَن یُّفسِدُ فِیہَا وَیَسفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحنُ نُسَبِّحُ بِحَمدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ، کیا تو ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جو دھرتی پہ فساد برپا کریں گے، خون ریزی کریں گے حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحمید کرتے اور تیری تقدیس کے گن گاتے ہیں۔

فرشتوں کی اس بات پر اللہ تعالیٰ کو جلال آیا، اس پر فرشتوں نے اللہ کے عرش کا طواف شروع کر دیا، ایک روایت کے مطابق فرشتوں نے بیت المعمور کا طواف شروع کر دیا، جو رب تعالیٰ کے غصّے سے پناہ مانگ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ تم بیت المعمور کی سیدھ میں زمین پر ایک کعبہ بناؤ، تاکہ بنی آدم میں سے جس پر غضبناک ہوں وہ اس کی پناہ میں آجائے، پھر فرشتوں نے کھدائی کی

یہاں تک کہ ساتویں زمین تک اُتر گئے، اس گڑھے میں انہوں نے چٹانیں پھینکیں یہاں تک کہ وہ سطح زمین کے برابر ہو گیا، پھر انہوں نے اس کی تعمیر کی، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین پہ موجود اپنی مخلوق کو حکم دیا کہ وہ اس گھر کا اس طرح طواف کرے جس طرح فرشتے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔

حضرت وھب بن منبہ رحمہ اللہ سے ایک خبر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے جنّت کے خیموں میں سے ایک خیمہ اُتارا، جسے خانہ کعبہ کی جگہ پہ رکھا گیا، تاکہ آدم علیہ السلام اس میں سکونت اختیار کریں اور اس کے گرد طواف کریں، جب تک آدم علیہ السلام اس دھرتی پہ موجود رہے یہ خیمہ بھی رہا، جب آدم علیہ السلام کی روح قبض کر لی گئی تو یہ خیمہ بھی اٹھا لیا گیا۔

ایک خبر میں یہاں تک آیا کہ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو زمین پہ اتارا تو ان کے ساتھ ایک گھر بھی تھا، آپ اس کا طواف کرتے تھے اور آپ کی اولاد میں جو اہل ایمان تھے وہ بھی طواف کرتے تھے، یہ سلسلہ طوفان نوح تک جاری رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان پر اٹھا لیا اسی کو "بیت المعمور" کہا جاتا ہے، بعض نے اس کی وضاحت یوں کی کہ آدم علیہ السلام کے ساتھ جو گھر آسمان سے زمین پہ آیا اس سے مراد یہ ہے کہ بیت المعمور جتنا گھر آیا۔

اللہ تعالیٰ نے زمین بچھانے کا آغاز مکّہ سے کیا، بیت اللہ جہاں موجود ہے اس جگہ سے زمین کو پھیلانا شروع کیا، پھر اس کا نام ام القریٰ رکھا گیا، زمین پہ سب سے پہلا پہاڑ "جبل ابو قبیس" رکھا گیا جو بیت اللہ کے پڑوس میں ہے، آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے فرشتوں نے بیت اللہ کا طواف کیا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کے اوّل بانی ہیں، جن لوگوں نے ان کی تعمیر سے پہلے بیت اللہ کی موجودگی کا ذکر کیا اس کا صرف اتنا مطلب لیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس جگہ خانہ کعبہ تعمیر کیا جائے گا۔ ایک روایت کے مطابق آدم علیہ السلام نے یہاں ایک قبہ بنایا تو فرشتوں نے کہا کہ ہم اس گھر کا طواف کر چکے ہیں، سفینہ نوح علیہ السلام چالیس روز تک اس گھر کا طواف کرتی رہی۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ جب تو زمین پر اترے تو میرے لیے ایک گھر بنا، پھر

اس کا اس طرح طواف کر جس طرح فرشتے آسمان پر میرے عرش کا طواف کرتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام نے پانچ پہاڑوں سے بیت اللہ تعمیر کیا۔ ① حرا ② طور سینا ③ لبنان ④ جودی ⑤ طور زیتا۔ (وصف الکعبہ و تاریخھا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مطابق جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو ارشاد فرمایا اے آدم: تو جا اور میرے لیے ایک گھر بنا، اس کا طواف کر اور اس کے پاس مجھے یاد کر، جیسے فرشتے میرے عرش کے گرد کرتے ہیں، آدم علیہ السلام نے چلنا شروع کر دیا، ان کے لیے زمین کو سکیڑ دیا گیا، جنگلات کو ہٹا دیا گیا، جہاں قدم پڑتا گیا وہاں آبادی ہوتی گئی، یہاں تک کہ آپ بیت الحرام کے پاس پہنچ گئے، حضرت جبریل علیہ السلام نے زمین پہ پَر مارا تو ساتویں زمین تک ایک گڑھا بن گیا، فرشتوں نے اس میں چٹانیں پھینکیں، تیس تیس ایک چٹان کو اٹھا سکتے تھے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے وادی سراندیپ میں اتارا تو اس کی تا حد نگاہ وسعت اور ویرانی کی وجہ سے خوف زدہ ہوئے، اس وقت عرض کرنے لگے اے میرے رب: کیا تیری کوئی آباد زمین نہیں جہاں میرے سوا تیری تسبیح و تقدیس کی جاتی ہو؟ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طرف وحی کی، میں عنقریب ایسا گھر بناؤں گا جن کو میرے ذکر کے لیے اٹھایا جائے گا، میری مخلوق ان میں میری تسبیح کرے گی؟ میں اس میں ایک ایسا گھر تجھے دکھاؤں گا جسے میں نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے، اسے میں نے اپنی بزرگی سے ڈھانپ لیا ہے، میں اسے اپنے نام سے ترجیح دوں گا، اس کا نام رکھوں گا "میرا گھر" میں اپنے کام کے لیے اسے صاف کرواؤں گا، اپنی رحمت کے لیے اسے حرمت والا بناؤں گا، اسے ایسی جگہ پہ رکھوں گا جسے میں نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے، اسے تیرے لیے اور تیرے بعد والوں کے لیے حرمت والا اور امن والا گھر بنا دوں گا، اس کی رحمت کی وجہ سے میں اس کے اوپر، اس کے نیچے اور اس کے ارد گرد رہنے والوں کو حرمت والا بنا دوں گا، جو شخص یہاں کے رہنے والوں کو امان دے گا اس کے لیے میری امان واجب ہو گئی، جو ان کو ڈرائے گا وہ انہیں میری ذمّہ داری میں خوف دلائے گا، جو ان کو عظمت دے گا وہ میری نگاہوں میں عظمت پائے گا، جو ان کی توہین کرے گا وہ میری نگاہوں سے گر جائے گا۔

جو شخص یہاں اس طرح آئے گا کہ کسی دوسری چیز کا ارادہ نہیں رکھتا ہو گا، پس اس نے میرا دیدار کر لیا، میری مہمانی قبول کی، وہ میرے پاس آیا اور میرا مہمان بنا، میرا حق ہے کہ میں اسے اپنی بزرگی کی چادر میں ڈھانپ لوں، اور ہر شریف و کریم کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مہمان، اپنے دیدار کرنے والے کا اکرام کرے اور ان میں سے ہر ایک کی حاجت پوری کرے، جب تک تو زندہ رہے اسے آباد رکھ، پھر اسے تیری اولاد میں سے تیرے بعد امتیں اور انبیاء علیہم السلام آباد رکھیں، امۃً بعد امۃٍ، نبیاً بعد نبیٍ یہاں تک کہ یہ سلسلہ میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے، جو آپ کی اولاد میں سے ہوں گے، جو کہ خاتم النبیین ہوں گے، میں اسے اس کے آباد کنندگان میں سے بناؤں گا، اس کے رہائشیوں میں سے بناؤں گا، اس کے محافظوں سے بناؤں گا، اس کے والیوں سے بناؤں گا، اس کے سقایہ میں سے بناؤں گا، وہ جب تک زندہ رہے گا میرا امین ہو گا، جب وہ میری طرف پلٹے گا مجھے پالے گا، میں نے اس کے لیے اجر و فضیلت کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ (وصف الکعبہ و تاریخھا ص ۳۶، ص ۳۷)

یہی در ہے جہاں شاہانِ دنیا سر جھکاتے ہیں سوالی بن کے آتے ہیں، مرادیں لے کے جاتے ہیں
اسی گلشن میں تیرا غنچہ امید کھلنا ہے اسی درگاہ سے مل جائے گا جو تجھ کو ملنا ہے

وھب ابن منبہ رحمہ اللہ کی خبر کے مطابق سب سے پہلے پتھر اور گارے سے بیت اللہ شریف تعمیر کرنے والے حضرت شیث علیہ السلام ہیں، جب آدم علیہ السلام فوت ہو گئے تو وہ خیمہ اٹھ گیا، اس کی جگہ ان کی اولاد نے پتھر سے کچھ تعمیر کی، طوفان تک یہ سلسلہ یونہی رہا، طوفان کے وقت اسے اٹھا لیا گیا، دو ہزار سال تک زمین غیر آباد رہی، یہ سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک یونہی چلتا رہا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے مطابق طوفان نوح میں بیت اللہ اٹھا لیا گیا تھا، اس کے بعد جو انبیاء علیہم السلام حج و طواف کرتے تھے انہیں اس کا علم نہ تھا کہ بیت اللہ کہاں ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو راہ سجھائی تو انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی بنیاد پہ اسے اٹھایا، انہوں نے اس کی لمبائی سات ہاتھ رکھی، زمین میں تین ہاتھ اس کی بنیاد تھی، حجر اسود کو بیت اللہ میں شامل کیا، انہوں نے چھت نہیں بنائی تھی، ایک دروازہ بنایا تھا، اس کے قریب ایک کنواں کھودا جس میں نذرانہ دینے والوں کے نذرانے ڈالے جاتے تھے۔

بیت اللہ شریف کا جہاں جہاں ذکر آتا ہے معاً ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی ہوتا ہے، کسی نبی اور رسول کا تذکرہ بیت اللہ کے ساتھ اس قدر نہیں ہوا جتنا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ہوا، اس لیے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر بیت اللہ کی تعمیر کی، اللہ نے اپنے خلیل کا اسے ٹھکانہ بنایا، اللہ نے اس کی طرف ان کی راہنمائی کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے انہیں راہنمائی کی، آسمان کی صفات میں یہ بات آئی ہے کہ آسمانوں پہ فرشتوں کا ایک کعبہ ہے جسے بیت المعمور کہا جاتا ہے، فرشتوں کا کعبہ بیت اللہ کی سیدھ میں ہے، اگر بیت المعمور سے کوئی چیز گرائی جائے تو عین خانہ کعبہ کی چھت پہ گرے، اسی طرح ساتوں آسمانوں کے عبادت خانے ہیں، بعض اسلاف نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہر آسمان پہ ایک گھر ہے، جس پہ اس آسمان کے رہنے والے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

اس عبادت خانے کی حیثیت ان کے نزدیک ایسی ہی ہے، جیسے زمین والوں کے ہاں بیت اللہ شریف کی، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ جس طرح آسمان کے فرشتوں کے لیے ہر آسمان پر عبادت خانہ ہے آپ اسی طرح زمین والوں کے لیے زمین پر عبادت خانہ تعمیر کریں، اللہ تعالیٰ نے خود اس جگہ کی طرف ان کی راہنمائی بھی کی، یہ مقام اللہ کے علم میں آسمان وزمین کی تخلیق کے وقت بھی تھا، اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش کے وقت حرمت عطاء کی اور یہ حرمت قیامت کی صبح تک یونہی رہے گی۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا چکے تو بارگاہ خداوندی میں دست دعاء بلند کرتے ہوئے عرض کرنے لگے، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اے اللہ: ہم سے یہ خدمت قبول فرما، بے شک تو خوب سننے اور خوب جاننے والا ہے۔

پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعاء کی رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اے اللہ: اس شہر کو امن کا گہوارا بنا، اس کے باشندوں کو پھلوں میں سے رزق کی فروانی دے، جو ان میں سے اللہ اور آخرت پر ایمان لائے، جو کفر کرے اسے بھی تھوڑا سا دے پھر اسے دوزخ کی آگ کی طرف دھکیل دے جو بُرا ٹھکانہ ہے۔

قرآنی اُسلوب اور عربی قواعد کی رُو سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بنیادیں اٹھا رہے تھے ساتھ ہی ساتھ قبولیت کی دعاء بھی کرتے چلے جا رہے تھے اور یہ بھی دعاء کر رہے تھے کہ اے اللہ: ہمیں اپنا تابع دار بنا، ہماری اولاد کو تابع دار امت بنا، ہمیں عبادت کے گُر سکھا، ہماری توبہ قبول کر لے، تو توبہ قبول کرنے والا خوب رحم کرنے والا ہے۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب دیوار کو حجر اسود تک اٹھا چکے تو اسماعیل علیہ السلام کو فرمانے لگے کہ اے اسماعیل: مجھے پتھر لا دے جو میں اس مقام پہ رکھوں، تاکہ وہ لوگوں کے لیے ایک نشان رہے جہاں سے وہ طواف شروع کریں گے، اللہ تعالیٰ نے طوفان نوح علیہ السلام کے دوران اسے جبل ابو قبیس پہ رکھوا دیا تھا، جبل ابو قبیس بیت اللہ شریف کے قریب ہی ہے، پھر اللہ نے اس پہاڑ کو حکم دیا کہ جب تو دیکھے کہ میرا خلیل بیت اللہ بنا رہا ہے تو تُو اسے نکال دینا، حضرت جبریل علیہ السلام یہ پتھر لائے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے اس جگہ پہ رکھ دیا، اس وقت یہ پتھر اپنی سفیدی کی وجہ سے خوب چمکتا تھا، اس کی روشنی شرق و غرب، یمن اور شام کو چمکا رہی تھی، اس کی روشنی ہر سمت سے حدود حرم کے آدھے حصّے کو روشن کر رہی تھی۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجر اسود کو حضرت جبریل علیہ السلام جنت سے لائے اور جہاں آج تم اسے رکھا ہوا دیکھتے ہو اسے یہاں جبریل علیہ السلام نے ہی رکھا تھا اور تم ہمیشہ خیر و عافیت میں رہو گے جب تک یہ تمہارے بیچ میں موجود ہے، اسے پکڑو جہاں تک ہو سکے، کیونکہ ہو سکتا ہے یہ وہاں ہی لوٹ جائے جہاں سے آیا ہے۔

"وصف الکعبہ" نامی ایک کتاب جو عربی زبان میں دارالغد مصر سے شائع ہوئی ہے میں سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ: وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ الخ نقل کرنے کے بعد ابن جریج کے حوالے سے ایک عجیب بات لکھی گئی ہے وہ یہ کہ "کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا، اس بادل میں ایک سر تھا، اس سر نے کہا اے ابراہیم علیہ السلام! آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے کہ اس بادل کے بقدر لے لو، ابراہیم علیہ السلام نے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور اس کو حقیر

سمجھ رہے تھے، پھر اس سر نے کہا! اس نے ایسا کیا اور کھدائی کی، زمین سے ایک صحیح وسالم بنیاد ظاہر ہوئی" (وصف الکعبہ ص ۴۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب شام میں ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تو ان کے ساتھ ان کا بیٹا اسماعیل علیہ السلام اور اس کی ماں حضرت ہاجرہؓ بھی تھیں، ان کے ساتھ ایک سکینہ بھی بھیجا، جس کی زبان تھی اور وہ اس سے گفتگو کرتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سکینہ کے ساتھ صبح کرتے جب وہ صبح کرتا اور شام کرتے جب وہ شام کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ سکینہ ان کو مکہ لے گیا، اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا کہ میری اس جگہ پر بنیاد بنا، پھر انہوں نے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیت اللہ کو اٹھایا، یہاں تک کہ حجر اسود تک بلند کر دیا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو فرمایا کہ میرے لیے پتھر ڈھونڈ کر لا جسے میں لوگوں کے لیے بطور نشان رکھ دوں، حضرت اسماعیل علیہ السلام ایسا پتھر لائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پسند نہ آیا، ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کوئی اور پتھر دیکھو، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پتھر کی تلاش کے لیے چلے گئے اور اس پتھر کے پاس پہنچے، حضرت ابراہیم علیہ السلام حجر اسود لائے اور انہوں نے اسے وہاں رکھ دیا، بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا اے ابا جان! آپ علیہ السلام کے پاس یہ پتھر کون لایا؟ انہوں نے فرمایا، یہ پتھر میرے پاس وہ ذات لائی جس نے مجھے تیرے حوالے نہیں کیا، یہ پتھر جو حضرت ابراہیم علیہ السلام لائے یہ سفید تھا، جو یاقوتِ جنّت سے تھا، آدم علیہ السلام اسے جنّت سے ہمراہ لائے تھے، مختلف روایات میں آدم علیہ السلام اور جبریل علیہ السلام کا ذکر ملتا ہے، بہر حال جس نے بھی جنّت سے اسے زمین تک پہنچایا، پہنچا دیا، مگر اتنی بات ہے کہ یہ پتھر جنّت سے آیا ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نقد صلہ یہ عطاء کیا کہ انہیں ایک گھوڑا عطاء فرمایا، یہ گھوڑا دوسرے وحشی جانوروں کی طرح تھا، جب اللہ تعالیٰ نے دونوں باپ بیٹے کو تعمیر کعبہ کا حکم دیا تو دونوں کو ارشاد فرمایا! اِنِّیْ مُعْطِیْکُمَا کَنْزاً اَدَّخَرْتُہٗ لَکُمَا میں نے تم دونوں کو ایک خزانہ دیا ہے، جسے میں نے تمہارے لیے ذخیرہ کیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اجیاد کی سمت نکلیں، پھر پکاریں وہ خزانہ تمہارے

پاس آئے گا، حضرت اسماعیل علیہ السلام اجیاد کی سمت نکلے جو ان کا وطن تھا، مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ پکارا کیا ہوتا ہے اور خزانہ کیا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں بات ڈالی، پھر ارض عرب پہ کوئی گھوڑا ایسا نہ تھا جو ان کے پاس نہ آتا، اللہ نے انہیں ان کی دسترس میں دیا اور فرمایا کہ ان پہ سوار ہو جاؤ، انہیں چارہ ڈالو، یہ تمہارے لیے برکت کی چیزیں ہیں، گھوڑے کو اسی بناء پر عربی گھوڑا کہا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو انہیں بلانے کا حکم دیا گیا اور یہ ان کے پاس آئے (وصف الکعبہ ص ۴۱)

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ کعبہ اس وقت تک رہا جب تک اللہ نے چاہا، پھر یہ گر گیا تھا، پھر اسے عمالقہ نے تعمیر کیا، کچھ عرصہ بعد وہ بھی گر گیا تو جرہم نے اسے تعمیر کیا پھر قصی بن کلاب نے تعمیر کیا۔

مختلف احادیث و روایات کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں حصہ لیا، پہلی مرتبہ اس وقت جب آپ کا بچپن تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معصوم اور نازک کاندھے پہ پتھر اٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے، دوسری مرتبہ جب آپ کی عمر مبارک پینتیس سال تھی، قریش کے درمیان حجر اسود کی تنصیب کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نزاع میں ان کے مابین فیصل کا کردار ادا کیا۔

قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کا ارادہ کیا تو ان کے لیے یہ مشکل پیدا ہو گئی کہ ایک سانپ انہیں بیت اللہ کی قدیم عمارت کے گرانے کے راستے میں سخت رکاوٹ بن گیا، اس مشکل کے وقت قریش مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو گئے، بارگاہ الٰہی میں زاری کرنے لگے، کہ اے اللہ! ہم تیرے گھر کی تزئین و آرائش کا ارادہ کر چکے، ہمیں محروم نہ فرما، اگر تو ہمارے اس ارادے پہ راضی ہے تو فبہا ورنہ جو تیری مرضی ایسا کر، اتنے میں انہوں نے آسمان کی طرف ایک بڑے پرندے کے پھڑ پھڑاتے پر کی آواز سنی، جو گِدھ سے بڑا تھا، وہ سیاہ پشت، سفید شکم اور دو ٹانگوں والا تھا، اس نے سانپ کی گدی میں اپنے پنجے گاڑھے، پھر اسے اس طرح لے گیا کہ سانپ کی دم گھسٹ رہی تھی، یہ پرندہ اسے اجیاد کی سمت لے گیا، بعد میں قریش نے اسے گرا دیا اور پتھروں سے اس کی تعمیر کی، قریش اپنے کندھوں پر پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، بیس ہاتھ لمبائی تک تعمیر کیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضرت نبی اکرم ﷺ اور حضرت عباسؓ جب بیت اللہ کے پتھر اٹھانے کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت نبی کریم ﷺ کو فرمایا کہ آپ ﷺ اپنا تہبند اپنے کندھے پہ رکھ لیں، نبی کریم ﷺ نے ایسا کیا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے، فرمانے لگے کہ مجھے میری تہبند دے دو، پھر آپ ﷺ نے اپنی تہبند دوبارہ باندھ لی۔ (بخاری و مسلم کتاب الحج و کتاب الحیض)

اسلام کی آمد سے پہلے لوگ بیت اللہ شریف کا طواف بھی ننگے ہو کر کرتے تھے، وہ اسے عیب نہیں سمجھتے تھے، خانہ کعبہ کے لیے پتھر اٹھا کر لاتے، پتھر کی چبھن سے بچاؤ کے لیے کندھے پہ کپڑا رکھنے کی ضرورت پڑتی، غربت کا زمانہ تھا، وہ اپنے تہبند ہی اتار کر کندھے پہ رکھ لیتے تھے، حضرت نبی اکرم ﷺ کے بچپن میں جب خانہ کعبہ تعمیر ہوا تو آپ کم عمر بچے تھے، آپ کا احساس کرتے ہوئے چچا نے کندھے پہ تہبند رکھنے کا ارشاد فرمایا، تو آپ ﷺ نے جونہی تہبند نکالا تو گر پڑے اور حضرت عباسؓ کو فرمانے لگے میرا کپڑا لاؤ، پھر اس کے بعد آپ ﷺ کبھی ننگے نہیں ہوئے سوائے غسل کے آپ ﷺ کا ارشاد ہے فَاعتَفَلَت رِجلِی فَخَرَرتُ وَسَقَطَ ثَوبِی فَقُلتُ لِلعَبَّاسِ: هَلُمَّ ثَوبِی، فَلَستُ أَتَعَرَی بَعدَهَا اِلَّا اِلَی الغُسلِ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا کہنا ہے کہ مجھے میرے والد گرامی حضرت عباسؓ نے بتایا کہ جب قریش نے خانہ کعبہ بنایا تو دو دو آدمی علیحدہ ہو کر جاتے اور پتھر ڈھو کر لاتے تھے، میں اور میرا بھتیجا (حضرت محمد ﷺ) تھے، ہم اپنے تہبند پہن لیتے تھے، حضرت محمد ﷺ میرے آگے ہوتے تھے، اچانک وہ گر پڑے، میں نے انہیں اٹھانے کی کوشش کی، ان کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں، میں نے اپنے بھتیجے کو پوچھا، تجھے کیا ہوا؟ تو اس نے کہا نُهِيتُ أَنْ أَمشِی عُرياناً، مجھے ننگے ہو کر چلنے سے روکا گیا ہے، میں نے اس واقعہ کو صیغہ راز میں رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نبوت کو ظاہر کر دیا۔ (وصف الکعبہ ص ۴۴)

حضرت عکرمہ نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے یوں نقل کیا کہ :فَكَانَ أَوَّلُ شَئ رَأَى مِنَ النُّبُوَّةِ نبوت کی باتوں میں سے پہلی بات تھی جو آپ ﷺ نے دیکھی تھی۔ (وصف الکعبہ)

آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایک ارشاد گرامی سیرت ابن اسحاق میں یوں لکھا ہوا ہے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: إِنِّي لَمَعَ غِلْمَانٍ هُمْ أَسْنَانِي قَدْ جَعَلْنَا أُزُرَنَا عَلَى أَعْنَاقِنَا لِحِجَارَةٍ نَنْقُلُهَا، نَلْعَبُ بِهَا، إِذْ لَكَمَنِي لَاكِمٌ لَكْمَةً شَدِيدَةً، ثُمَّ قَالَ: اشْدُدْ عَلَيْكَ إِزَارَكَ (دلائل النبوۃ) میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ تھا، ہم نے پتھر اٹھانے کے لیے اپنے کندھوں پہ اپنے تہبند رکھے، اچانک مجھے کسی مکّا مارنے والے نے زوردار مکّا مارا، پھر کہا اپنے اوپر اپنی تہبند باندھ لو۔

زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کی تعمیر تہہ بہ تہہ پتھروں سے ہوئی تھی، اس کی چنائی میں صرف اور صرف اسی وادی کا پتھر استعمال ہوا تھا، یہ پتھر اجیاد سے لایا جاتا تھا، گارے کی لِپائی تک بھی نہیں کی گئی تھی، کھلے کھلے سوراخ نمایاں دکھائی دیتے تھے، بکری کا ایک سالہ بچہ بآسانی ان سوراخوں سے گزر سکتا تھا، خانہ کعبہ پر کپڑا لٹکا دیا جاتا تھا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کا ایک واقعہ یوں بھی ہے کہ روم سے ایک سمندری جہاز آیا، جو جدّہ کی سمت بڑھتا ہوا آگے چل رہا تھا، جدّہ کے قریب پہنچ کر یہ جہاز ٹوٹ گیا، قریش کو اطلاع ملی تو اس طرف چلے گئے تاکہ اس جہاز کی لکڑیاں لے آئیں، انہوں نے اس جہاز میں ایک رومی ترکھان "باقوم" کو دیکھا، جسے وہ لکڑیوں سمیت لے آئے تاکہ بیت اللہ کی تعمیر کریں۔

ایک واقعہ اور بھی ہے جو قریش کے لیے خانہ کعبہ کی تعمیر کا باعث بنا کہ ایک شخص نے خانہ کعبہ کے قریب انگیٹھی جلائی، اس کی انگیٹھی سے چنگاریاں اُڑ اُڑ کر غلاف کعبہ کو پہنچ گئیں، جس سے خانہ کعبہ کا کپڑا جل گیا، قریش نے آپس میں مشورہ کیا کہ خانہ کعبہ کیسے؟ اور کیونکر گرایا جائے؟ کیونکہ وہ کعبہ کے تقدس کی وجہ سے اس کے انہدام سے بہت خائف تھے، ولید نے کہا کہ: إِنَّ اللّٰهَ لَا يُهْلِكُ مَنْ يُّرِيدُ الْإِصْلَاحَ جو درستگی کا ارادہ کرتا ہے اللہ اسے ہلاک نہیں کرتا، پھر وہ خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھا حضرت عباس رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اس کے ہمراہ تھے، انہوں نے عرض کیا اَللّٰهُمَّ لَا نُرِيدُ اِلَّا الْإِصْلَاحَ اے اللہ: ہم درستگی کا ارادہ رکھتے ہیں، پھر انہوں نے خانہ کعبہ کو گرا دیا، لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ صحیح و سالم ہیں تو انہوں نے بھی ان کی پیروی کی، مؤرخین کے مطابق خانہ کعبہ کی تعمیر کا یہ واقعہ حضرت نبی پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعلان نبوت سے پندرہ سال پہلے کا ہے۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ جس مقام پر خانہ کعبہ ہے یہ نشیب میں ہے، جب کہ اس کے ارد گرد پہاڑ تھے، پہاڑوں سے بارشی پانی نالوں کی شکل دھارتا ہوا اس مقام پہ جمع ہو جاتا تھا، جو خانہ کعبہ کی بنیادوں میں داخل ہو جاتا تھا، اس وقت پتھروں کی چنائی ہوتی تھی، قریش نے جب یہ منظر دیکھا تو انہوں نے خانہ کعبہ کو بلند کرنے اور اس پر چھت ڈالنے کا ارادہ کر لیا، یہ وہ وقت تھا جب چور خانہ کعبہ کا خزانہ لے اڑے تھے، اس خزانے کی کھوج خزاعہ قبیلہ کے ملیح بن عمرو کے ایک غلام ''دویکا'' نے لگائی تھی، قریش نے اس غلام کا ہاتھ کاٹ دیا تھا، قریش کا خیال تھا کہ چوروں نے خزانہ لوٹ کر اس غلام کے پاس رکھا تھا۔

جب قریش اپنے عزم و ارادے کی تکمیل کے لیے تیار ہو گئے تو ابو وھب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم اٹھا، کعبہ سے ایک پتھر اٹھایا، وہ پتھر اس کے ہاتھ سے پھسل کر دوبارہ اپنی جگہ پہ پہنچ گیا، پھر اس نے کہا! اے گروہ قریش: تم میں کوئی شخص بیت اللہ کی تعمیر میں پاکیزہ مال کے علاوہ نہ خرچ کرے، کوئی شخص کسی بدکارہ عورت کی کمائی نہ لگائے، کوئی شخص سودی رقم نہ لگائے، کوئی شخص ظلم و ستم سے حاصل شدہ کمائی نہ لگائے۔

ابو وھب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ کے والد کے خالو تھے، وہ ایک شریف آدمی تھے، ان کے بارے میں ایک عرب شاعر نے کچھ اشعار بھی کہے تھے۔

وَلَوْ بِأَبِي وَهْبٍ أَنَخْتُ مَطِيَّتِي ... غَدَتْ مِنْ نَدَاهُ رَحْلُهَا غَيْرَ خَائِبِ
بِأَبْيَضَ مِنْ فَرْعَيْ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبٍ ... إِذَا حُصِّلَتْ أَنْسَابُهَا فِي الذَّوَائِبِ
أَبِيٍّ لِأَخْذِ الضَّيْمِ يَرْتَاحُ لِلنَّدَى ... تَوَسَّطَ جَدَّاهُ فُرُوعَ الْأَطَايِبِ
عَظِيمِ رَمَادِ الْقِدْرِ يَمْلَأُ جِفَانَهُ ... من الخبز يعلوهُنَّ مثل السَّبَائِب

ایک وقت ایسا آیا جب قریش نے کعبۃ اللہ کی برکات ہر قبیلے تک پہنچانے کے لیے اسے کئی حصّوں میں بانٹ دیا تھا، بنی عبد مناف اور زہرہ کے لیے باب الکعبہ والا حصّہ آیا، بنی مخزوم کے لیے حجر اسود اور رکن یمانی والا حصّہ، بنو جمح کے لیے کعبۃ اللہ کی پشت والا حصہ آیا، بنو عمرو بن ہصیص بن کعب

بن لوئی کے لیے بھی ایک حصہ تھا، بنی عبد الدار بن قصی کے لیے حجر اسود کا ایک حصہ تھا اور بنو اسد بن عبد العزی بن قصی اور بنو عدی بن کعب بن لوئی کے لیے حطیم والا حصہ تھا۔

مؤرخ ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ مجھے بتایا گیا کہ قریش کو حجر اسود کے پاس سے ایک کتاب ملی جو سریانی زبان میں تھی، انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ کیا ہے؟ چنانچہ زفر قبیلے کے ایک آدمی نے یہ کتاب انہیں پڑھ کر سنائی، اس میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:

أَنَا اللهُ ذُو بَكَّةَ، خَلَقْتُهَا يَوْمَ خَلَقْتُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ، وَصَوَّرْتُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ، وَحَفَفْتُهَا بِسَبْعَةِ أَمْلَاكٍ حُنَفَاءَ لَا تَزُولُ حَتَّى يَزُولَ أَخْشَبَاهَا مُبَارَكٌ لِأَهْلِهَا فِي الْمَاءِ وَاللَّبَنِ میں اللہ ہوں، بکّہ والا، میں نے اسے پیدا کیا جس دن میں نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا اور سورج، چاند کو بنایا تھا، اسے میں نے سات املاک سے گھیر رکھا ہے، یہ اس وقت تک رہے گا جس وقت تک اس کے پہاڑ باقی ہیں، یہاں کے باشندوں کے لیے دودھ اور پانی کے لحاظ سے برکت والا ہے۔

مقام ابراہیم سے ایک کتاب ملی جس میں لکھا تھا مَكَّةُ (بيت) اللهِ الْحَرَامُ، يَأْتِيهَا رِزْقُهَا مِنْ ثَلَاثَةِ سُبُلٍ مکہ میں اللہ کا حرمت والا گھر ہے، یہاں تین طرف سے رزق پہنچتا ہے، لیث بن ابی سلیم کا کہنا ہے کہ حضرت نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے چالیس سال پہلے انہیں کعبۃ اللہ سے ایک پتھر ملا، اس پہ لکھا تھا مَنْ يَزْرَعْ خَيْرًا يَحْصُدْ غِبْطَةً، وَمَنْ يَزْرَعْ شَرًّا يَحْصُدْ نَدَامَةً، يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ وَيُجْزَوْنَ الْحَسَنَاتِ؟ أَجَلْ كَمَا يُجْتَنَى مِنَ الشَّوْكِ الْعِنَبُ، جو نیکی اور بھلائی کاشت کرے گا وہ رشک کاٹے گا، جو بدی اور برائی کاشت کرے گا وہ شرمندگی کاٹے گا، تم برے عمل کرتے ہو اور نیکیوں کی آرزو رکھتے ہو؟ ہاں: اسی طرح جس طرح کانٹے سے انگور نہیں چنا جاتا۔

قریش نے کعبۃ اللہ کی تعمیر کے لیے پتھر اکٹھے کیے، ہر قبیلہ علیحدہ علیحدہ اس کی تعمیر کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا تھا، انہوں نے تعمیر شروع کر دی، جب اس جگہ تک پہنچے جہاں حجر اسود رکھا ہوا ہے، تو ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ حجر اسود کو وہ اسے اپنے مقام پہ نصب کرے، دوسرا کوئی قبیلہ یہ سعادت حاصل نہ کر سکے، بحث مباحثے اختلاف و انتشار کا سلسلہ باہم ضرب و قتال کی تیاری تک جا پہنچا، بنو عبد الدار نے خون سے بھرا ہوا ایک پیالہ قریب کیا پھر انہوں

نے اور بنو عدی بن کعب بن لوئی نے اس پر موت کا عہد و پیمان کیا، انہوں نے خون بھرے اس پیالے میں اپنے ہاتھ ڈال دیئے، قریش چالیس یا پچاس راتوں تک ٹھہرے رہے، اس کے بعد وہ مسجد میں جمع ہوئے جہاں انہوں نے اس سلسلہ میں ایک دوسرے سے مشاورت کی۔

چنانچہ قریش کے ایک سن رسیدہ شخص ابو امیہ بن مغیرہ نے قریش کو کہا: یَا مَعْشَرَ قُرَیْشٍ اِجْعَلُوا بَیْنَکُمْ فِیمَا تَخْتَلِفُونَ فِیهِ أَوَّلَ مَنْ یَدْخُلُ مِنْ بَابِ هَذَا الْمَسْجِدِ یَقْضِی بَیْنَکُمْ فِیهِ. فَفَعَلُوا، اے گروہ قریش: جس بات پہ تم آپس میں کشاکش کا شکار ہو اس میں آپس میں کسی کو فیصل مقرر کرو ایسے شخص کو جو سب سے پہلے اس مسجد کے دروازے سے داخل ہو گا وہی تمہارا فیصلہ کرے گا، پھر وہ ایسا کر گزرے۔

چنانچہ سب سے پہلے حضرت نبی اکرم ﷺ وہ شخص تھے جو دروازے سے داخل ہو رہے تھے، جب قریش نے آپ ﷺ کے روئے انور کو دیکھا تو پکار اٹھے هَذَا الْأَمِینُ رَضِینَا، هَذَا مُحَمَّدٌ، یہ امانت دار ہیں، ہم راضی ہیں، یہ محمد ہیں۔

جب نبی اکرم ﷺ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے آپ ﷺ کو پورا معاملہ بتا دیا، یہ نبوت و رسالت سے پہلے کا واقعہ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا: هَلُمُّوا إِلَیَّ ثَوْبًا کپڑا میرے پاس لاؤ، چنانچہ کپڑا آپ ﷺ کے پاس لایا گیا، آپ ﷺ نے حجر اسود کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کپڑے پر رکھ دیا، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لِتَأْخُذْ کُلُّ قَبِیلَةٍ بِنَاحِیَةٍ مِنَ الثَّوْبِ ثُمَّ ارْفَعُوهُ جَمِیعًا، ہر قبیلہ کو چاہیے کہ وہ اس کے کنارے سے پکڑے، پھر سب اسے اٹھاؤ، چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا، جب اس جگہ تک اٹھا چکے جہاں حجر اسود کو رکھنا تھا، آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر حجر اسود کو وہاں نصب کر دیا، یہ آپ کی دانائی، حکمت اور تدبیر تھی کہ قبائل باہم دست و گریبان اور خون ریزی سے بچ گئے۔

قریش نے بڑے چاؤ سے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی، یہ تعمیر ۶۴ھ تک رہی، یزید بن معاویہؓ کا دور حکومت تھا کہ ۶۴ھ میں یزید کے ایک کمانڈر حصین بن نمیر کندی نے مسجد الحرام کا محاصرہ کر لیا، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یہاں ہی موجود تھے، حصین بن نمیر نے جبل ابی قبیس پر منجنیق لگائی اور

بے دریغ سنگباری شروع کر دی، اس سنگباری سے کعبۃ اللہ کی تمام دیواریں ہل کر رہ گئیں، حجر اسود تین جگہ سے اسی سنگباری سے پھٹا تھا، مسجد الحرام کو سخت نقصان پہنچا تھا، اسی محاصرے کے دوران یہاں اطلاع پہنچی کہ یزید مر گیا ہے، اطلاع پاتے ہی حصین بن نمیر کندی نے محاصرہ ختم کر دیا، بھاگم بھاگ مدینہ کی راہ لی، مدینہ سے ہوتے ہوئے شام کی طرف نکل گیا۔

حالات کی سنگینی اختتام کو پہنچی، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ کے حکمران مقرر ہوئے، آپ نے تخت شاہی پہ جلوہ افروز ہوتے ہی کعبہ کی تعمیر نو کی طرف اپنی توجہات مبذول کیں، آپ نے جمادی الثانی ۶۴ھ میں کعبہ کو مکمل شہید کروا کر حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پہ نئے سرے سے تعمیر کا آغاز کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا: يَا عَائِشَةُ، لَوْلَا اَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثَ عَهدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ لَأَمَرتُ بِالبَيتِ فَأُدخِلتُ فِيهِ مَا أُخرِجَ مِنهُ وَأَلزَقتُهُ بِالأَرضِ وَجَعَلتُ لَهُ مَابَينَ شَرقِيًّا وَّ بَاباً غَربِياً فَبَلغتُ بِهِ اَسَاسَ اِبرَاهِيمَ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی تعمیر کو نامکمل قرار دیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے مطابق اسے تعمیر کرتا۔

یہی ارشاد نبوی عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو نئی تعمیر پہ ذہنی یکسوئی مہیا کر رہا تھا، جب حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرش تک کعبہ کو منہدم کروا چکے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رکھی ہوئی بنیاد تک پہنچنے کے لیے حجر اسماعیل کی طرف سے کھدائی شروع کی گئی، چھ ہاتھ ایک بالشت کھدائی کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد تک پہنچے، جب چاروں طرف سے کھدائی ہو چکی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی رکھی ہوئی بنیاد ظاہر ہوئی، یہ بنیاد اُونٹ کی کوہان کی طرح تھی۔

حصین نمیری نے کعبہ کو سخت نقصان پہنچایا تھا، دیواریں ہلا دی گئی تھیں، اگر ایک پرندہ بھی دیوار پہ بیٹھتا تو پتھر گرنے لگتے تھے، حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اسے شہید کروا دیا، موسم حج سر پہ آن پہنچا، آپ نے بیت اللہ کو یونہی رہنے دیا تاکہ آنے والے لوگوں کو علم ہو سکے کہ اہل شام نے اللہ کے

گھر کے ساتھ کس قدر زیادتی کی، چنانچہ اگلے سال حج تک اس کی تعمیر مؤخر کر دی تھی، اگلے موسم حج یعنی ۶۵ھ میں اس کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک اشارہ ملتا ہے کہ انہوں نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو روک دیا تھا کہ وہ اسے نہ گرائیں، مگر انہوں نے یہ جواب دیا کہ جب تم لوگوں میں سے کوئی شخص اپنے گھر کو جلا دے تو اسے بناتا ہے، اسے نیا کرتا ہے، میں نے تو تین بار اللہ سے خیر طلب کی ہے، پھر اسے گرانے کا ارادہ کیا ہے۔

شروع میں لوگ گھبرا رہے تھے، مگر ایک شخص نے ہمت کی، وہ کعبہ پر چڑھا، پھر لوگوں میں ہمت پیدا ہو گئی، انہوں نے بھی انہدامی سلسلے میں حصّہ ڈالا اور خانہ کعبہ کو گرا دیا، یہاں تک کہ اسے زمین کے ساتھ ملا دیا، بعض روایات کے مطابق ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے خود گرایا۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی رکھی ہوئی بنیاد تک جب پہنچے تو بڑے بڑے سرداروں کو بلایا گیا اور انہیں اس حسنِ تعمیر سے آگاہ کیا گیا، رب العالمین کی حمد و ثناء کی گئی۔

مکہ کے اَعیان و سردار جب بنیاد ابراہیمی کو دیکھ چکے تو انہیں گواہ بنانے کے بعد حضرت عبد اللہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق تعمیر کعبہ کی تکمیل کی، حجر اسود سے رکن عراقی کی مشرقی دیوار ۳۲ ہاتھ، رکن عراقی سے رکن شامی کی شمالی دیوار ۲۲ ہاتھ، رکن شامی سے رکن یمانی کی مغربی دیوار ۳۱ ہاتھ، رکن یمانی سے حجر اسود کی جنوبی دیوار ۲۰ ہاتھ رکھی، دیواروں کی لمبائی ۲۷ ہاتھ رکھی، تمنائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق آپؓ نے مشرقی دروازے کے علاوہ غربی دروازہ بھی رکھا، کعبہ کے اندرونی فرش کو زمین کے برابر رکھا، تاکہ حجاج، معتمرین اور زائرین شرقی دروازے سے داخل ہو کر غربی دروازے سے آسانی کے ساتھ باہر نکل سکیں، ان دروازوں کی لمبائی زمین سے اوپر تک گیارہ ہاتھ رکھی، ان دونوں دروازوں کے "دو کواڑ تھے، پہلے کی طرح چھت لکڑی کی ڈالی، اسے سہارا دینے کے لیے تین ستون کعبہ کے درمیان میں ایک ہی صف میں برابر فاصلوں پہ رکھے، چھت تک پہنچنے کے لیے رکن عراقی کی طرف ٹیڑھی لکڑیوں کی سیڑھی بنائی، روشنی کے لیے چھت کے چاروں

گوشوں میں ایک ایک روشن دان رکھا، ان میں بلق نامی سنگ مرمر رکھا گیا تھا، جو دن کے وقت خود ہی روشن ہو جاتا اور رات کو خود بخود تاریک ہو جاتا تھا۔

تعمیر کعبہ کے دوران لکڑی کے کچھ ستون باہر کھڑے کیے گئے تھے، جن پر پردے ڈالے گئے تھے، یہ پردے تعمیر کی تکمیل تک لکڑی کے ستونوں پہ پڑے رہے، لوگ باہر ہی سے طواف کرتے اور اشارے سے استلام حجر اسود کرتے تھے، تعمیر کی تکمیل ہو گئی تو حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبۃ اللہ کے اندرونی حصّے کو مشک وغیرہ اور بیرونی حصے کو مشک سے اوپر سے نیچے تک معطر کرنے کا اہتمام فرمایا، کعبہ پر مصری ریشم کا غلاف چڑھایا، تعمیر سے بچے ہوئے پتھروں سے مطاف کی تعمیر کی گئی جو کعبہ کے چاروں طرف گولائی میں دس ہاتھ چوڑی دیوار تھی، کعبہ کی چھت پر شمالی جانب میزاب رحمت کو حسبِ سابق رکھا گیا اس طرح کہ بارش کا پانی حضرت اسماعیل علیہ السلام والے حصے میں گرے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تنعیم سے احرام باندھا اور عمرہ کرتے ہوئے کعبہ کے چاروں ارکان کا پہلی بار استلام کیا، یہ استلام دس سال تک جاری رہا، دس سال بعد ۷۳ھ میں حجاج بن یوسف نے عبد الملک بن مروان کے اشارے پہ لشکر جرّار لے کر مکہ پہ چڑھائی کر دی تھی، حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تھا، عبد الملک بن مروان کے کہنے پر چالیس ہزار فوج نے حجاج کی کمان میں مکہ کو گھیر لیا تھا، ایک ماہ تک یہ محاصرہ جاری رہا، منجنیق کے ذریعے حجاج مکہ پر پتھر برساتا رہا، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھی اس سخت ترین حملے کا مقابلہ نہ کر سکے، چنانچہ وہ عاجز آکر خفیہ طور پر حجاج سے مل گئے، ۱۷ جمادی الاوّل ۷۳ھ منگل کے دن حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پھانسی دے دی گئی تھی۔

حجاج نے عبد الملک بن مروان کو خط لکھا کہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر کو تبدیل کر دینا چاہیے، عبد الملک نے حجاج کو اجازت دے دی، چنانچہ اس نے تعمیر کعبہ کو زمانہ جاہلیت کی تعمیر کی طرز پر کر دیا، یعنی حجر اسماعیل کی جانب سے کعبہ مشرفہ کو پھر چھ ہاتھ ایک بالشت چھوٹا کر دیا، دو دروازوں کے بجائے ایک دروازہ کر دیا، کعبہ کے فرش کو پھر سے چار ہاتھ ایک بالشت اونچا کر دیا، اس وجہ سے گیارہ ہاتھ لمبا دروازہ چھوٹا ہو گیا، اس کے علاوہ باقی تعمیر کو اسی طرح رہنے دیا گیا۔

۷۵ھ کو عبد الملک بن مروان حج کے لیے گیا تو اسے پتہ چلا کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے تو نبوی خواہش پر اس طرح تعمیر کی تھی، اس نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کی تعمیر پر ہی کعبہ کی تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو بڑے بڑے علماء جن میں امام مالک رحمہ اللہ کا نام بھی آتا ہے نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ اس طرح جو بادشاہ آئے گا وہ اپنی خواہش کے مطابق اسے تعمیر کرتا رہے گا، یوں بیت اللہ بادشاہوں کے ہاتھ کا کھلونا بن جائے گا، چنانچہ عبد الملک مان گیا اور حجاج بن یوسف والی تعمیر ہی رہنے دی۔

حجاج کی تعمیر ۷۴ھ سے لے کر ۱۰۲۹ھ تک کعبہ کی دوبارہ تعمیر کی ضرورت پیش نہیں آئی، بس اتنا ہوتا رہا کہ میزاب رحمت والی شمالی دیوار کی مرمت ہوتی رہی، یا پھر باب کعبہ کو تبدیل کیا جاتا رہا، کعبہ کی اندرونی سیڑھیاں تبدیل کر دی گئیں، ستون بدل دیئے گئے یا میزاب رحمت پر سونے کا پترا چڑھایا گیا، یوں معمولی سی اصلاح کی جاتی رہی۔

اہل کتاب کی اسلام دشمنی

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ وَاللهُ شَهِيدٌ عَلَى مَا تَعْمَلُونَ {۹۸} قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ {۹۹} آل عمران

جواب ترجمہ: میرے حبیب! آپ فرما دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم جو بھی کرتے ہو وہ اللہ کے سامنے ہے۔ میرے حبیب! آپ فرما دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کے راستہ میں ٹیڑھ تلاش کر کے ایمان لانے والوں کو اس سے روکتے ہو جبکہ تم خود گواہ ہو اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ: اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، ان کے برے احوال و قبیح خصائل کی وجہ سے انہیں مخاطب کیا گیا ہے، وہ لوگ جانتے بوجھتے قرآن کریم کا انکار کرتے

تھے، انہیں قرآنی آیات بالکل سمجھ میں آرہی تھیں پھر بھی وہ ماننے سے انکار کرتے تھے، انہیں کہا گیا کہ تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو، تمہارے پاس سمعی اور عقلی دلائل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں، یہاں (لِمَ) استفہام توبیخ کے لیے ہے، یہ ان کی عاجزی کی طرف اِشارہ ہے کہ وہ اپنے کفر پر برقرار رہنے کا کوئی عذر پیش کرنے سے قاصر وعاجز ہیں، گویا کہ اس عبارت میں انہیں یہ کہا جارہا ہے کہ تم لوگ اگر کوئی عذر پیش کرسکتے ہو تو کرو۔

وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ جو کچھ بھی تم لوگ کررہے ہو اس پر گواہ ہے، وہ تمہارے کیے کی تمہیں سزا اور جزا دے گا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ: یہاں بھی تاکید وتکرار کے لیے یہود ونصاریٰ کو مخاطب کیا گیا ہے، ان سے پوچھا جارہا ہے کہ تم لوگ دوسرے لوگوں کو راہ خدا سے کیوں روکتے ہو، صد کا معنیٰ ہے روکنا، اہل کتاب راہ خدا پر چلنے سے کنی کتراتے تھے، اپنا یہ حال تھا کہ وہ اس راہ پر گامزن نہیں ہوتے تھے، مگر ان کے شریر طبائع میں یہ تھا کہ وہ دوسروں کو بھی راہِ حق سے بھٹکاتے تھے، سبیل اللہ اس راہ کو کہتے ہیں جو اللہ تک پہنچاتا ہے اور یہ اسلام کا راستہ ہے، اہل ایمان کے بارے میں اہل کتاب کی خواہش یہ ہے کہ یہ اسلام سے پھر جائیں، جو لوگ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہیں ان کی کوشش یہ ہے کہ یہ اس عظیم الشان دین میں داخل نہ ہوں۔

تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا: یہود ونصاریٰ کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہ اسلام اور اسلامی تعلیمات میں کیڑے نکالیں، ٹیڑھ تلاش کریں، تاکہ یہ اس پر ڈٹ جائیں کہ اسلام درست اور صحیح دین نہیں ہے، وہ اس میں کوشاں ہیں کہ اسلام کا کوئی کمزور پہلو ان کے ہاتھ میں آئے جسے بنیاد بنا کر وہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے میں تیزی لائیں، ویسے تو وہ کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے جس میں اسلام اور مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچائیں، لیکن اسلام کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی مضبوط دلیل اور ہتھیار حاصل کرنا چاہتے ہیں، جس کی موجودگی میں اسلام کے خلاف بجائے جانے والے ڈھولک کی آواز میں تیزی پیدا ہو۔

وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ: اہل کتاب سے کہا جارہا ہے کہ تم لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہو، گواہ ہو کہ تمہاری کتابوں میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں کیا کچھ لکھا ہوا ہے، حضرت محمد ﷺ کی صداقت و حقانیت پر تمہاری کتابیں بولتی ہیں تم اس پر گواہ ہو۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ: یہ ان کے لیے وعید ہے پہلی آیت میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ تم لوگ اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ یہاں ان کے اس کفر پر مہر کر دی گئی کہ وہ راہ حق سے روکتے ہیں اگر یہ لوگ اسلام میں ٹیڑھ اور کجی تلاش کرتے ہیں تو اللہ جو اس دین اسلام کو نازل کرنے والا ہے وہ بھی ان پر نظر رکھے ہوئے ہے، وہ بھی ان کی سیاہ اعمالیوں اور کور بختیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ ان کے کسی عمل سے غافل نہیں ہے۔

یہودیوں کی پیروی کا نقصان

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، یہ بتائیے کہ یہودیوں کی پیروی کا کیا نقصان ہے؟

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ {۱۰۰} وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللّٰهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ {۱۰۱} آل عمران

جواب ترجمہ: اے اہل ایمان! اگر تم اہل کتاب میں سے کسی بھی گروہ کی بات مان لوگے تو وہ تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر بنادیں گے۔ اور تم کس طرح کفر کرسکتے ہو جب کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تمہیں اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائی جارہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول تشریف فرما ہے، اور جو بھی اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہ سیدھے راستہ پر پڑ گیا۔

شان نزول: عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ دور جاہلیت میں اوس اور خزرج کے دو قبیلوں میں جنگ تھی جب اسلام آیا تو انہوں نے ایک دوسرے سے صلح کرلی اور اللہ نے ان کے دل باہم جوڑ دیے، ایک دفعہ ایک یہودی کسی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، جس میں اوس اور خزرج کے کچھ لوگ تھے اس یہودی نے ایک ایسا شعر پڑھا جو ان قبیلوں کی باہم جنگ کے دوران ایک شاعر نے کہا تھا وہ اس

بات سے بھڑک اٹھے، ایک قبیلے والوں نے کہا کہ ہمارے شاعر نے فلاں جنگ کے موقع پر فلاں بات کہی تھی، دوسرے قبیلے والوں نے کہا کہ ہمارے شاعر نے فلاں جنگ کے موقع پر فلاں فلاں بات کہی تھی، راوی کا کہنا ہے کہ اس پر دونوں فریقوں کے لوگوں نے آکر کہا آؤ از سر نو جنگ شروع کر دیں، جس طرح پہلے تھی اوس والوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو پکارا، دوسروں نے خزرج کے لوگوں کو پکارا، اسلحہ اٹھا کر دونوں فریق اکٹھے ہو گئے اور لڑائی کے لیے صف آراء ہوئے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

نبی کریم ﷺ موقع پر تشریف لائے اور دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو گئے اور یہ آیت تلاوت کی اور اپنی آواز بلند کی، جب لوگوں نے آپ کی آواز سنی تو خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے جب آپ ﷺ تلاوت سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے ہتھیار رکھ دیے اور ایک دوسرے سے گلے ملے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ (اسباب النزول)

② زید بن اسلم کا قول ہے مرشاس بن قیس یہودی دور جاہلیت میں ایک عمر رسیدہ شخص تھا، بہت بڑا کافر تھا، اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف سخت بغض اور حسد تھا، اس کا گزر اوس اور خزرج قبیلے کے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس ہوا، جو کسی مجلس میں جمع ہو کر باہم گفتگو کر رہے تھے، اسے انہیں اکٹھا دیکھ کر اور ان کا باہم میل ملاپ دیکھ کر غصہ آیا، نیز اسلام میں ان کی بہتر حالت دیکھ کر سخت غصہ آیا، جبکہ دور جاہلیت میں ان کے درمیان شدید عداوت تھی، اس نے کہا کہ بنی قیلہ کا گروہ اس ملک میں یکجا ہو کر بیٹھا ہے، نہیں خدا کی قسم! اگر وہ اکٹھے ہو گئے تو ہمیں چین نصیب نہیں ہو گا۔

لہٰذا اس نے اپنے پاس موجود ایک یہودی نوجوان کو حکم دیا اور کہا کہ تم ان کے پاس جاؤ، ان کے ساتھ بیٹھو پھر جنگ بعاث کا ذکر چھیڑو اور اس سے پہلی لڑائی کا ذکر کرو اور کچھ اشعار پڑھ سناؤ جو یہ لوگ ان باہم جنگوں میں ایک دوسرے کے خلاف کہتے تھے، بعاث وہ جنگ تھی جس میں اَوس اور خزرج کے قبیلوں نے ایک دوسرے قبیلے کے آدمیوں کو قتل کیا تھا، اس جنگ میں اوس کے قبیلے کو خزرج کے قبیلے پر فتح حاصل ہوئی تھی۔

چنانچہ اس نوجوان نے اس کے حکم کی تعمیل کی، تب اَوس اور خزرج کے لوگوں نے باہم باتیں کیں، تو جھگڑا کھڑا ہو گیا، انہوں نے ایک دوسرے پر فخر جتایا، یہاں تک کہ دونوں قبیلوں کے دو شخص اَوس بن قیظی قبیلہ اَوس کی بنی حارثہ کی شاخ سے اور جبار بن صخر خزرج قبیلے کی بنو سلمہ کی شاخ سے ایک دوسرے کے ساتھ الجھ گئے، ان کے درمیان تو تکار شروع ہو گئی، ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں ابھی از سر نو جنگ شروع کر سکتا ہوں، دونوں فریقوں کے لوگ غضبناک ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ پھر جنگ ہو جائے، ہتھیار سنبھالو اور کھلے میدان میں چلو یہ رہا کھلا میدان لہٰذا وہ باہر نکلے اور دور جاہلیت کے دعویٰ پر اوس اور خزرج کے لوگ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

اس حادثہ کی خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ اپنے ساتھ مہاجرین کو لے کر ان کی طرف نکلے، یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا اے گروہ مسلم! کیا میرے ہوتے ہوئے تم جاہلیت کا دعوی کر رہے ہو اور یہ حرکت اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تم کو اسلام سے سرفراز کیا اور اسلام کے ذریعے تمہارے درمیان دور جاہلیت کی خرابی کو منقطع کر دیا، تمہارے درمیان الفت و محبت ڈال دی، کیا اس کے بعد اب تم کافر ہو کر اپنی سابقہ روِش کی طرف لوٹ رہے ہو۔

اللہ اللہ، اَوس اور خزرج کے لوگوں کو محسوس ہوا کہ یہ شیطانی وسوسہ تھا اور ان کے دشمن کی ایک چال تھی، انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیے اور رو پڑے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہو گئے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مطیع و فرماں بردار بن کر چل دیے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت نازل کی یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا اے اَوس اور خزرج کے لوگو اگر تم یہودی شاس اور اس کے ساتھیوں کی بات مانو گے وہ تم کو کافر بنا چھوڑیں گے۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ سامنے آنے والا کوئی شخص ہمیں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ناپسند نہ تھا آپ نے اپنے دست مبارک سے ہماری طرف اشارہ کیا تو ہم رک گئے، اللہ نے ہمارے درمیان صلح کرا دی اس کے بعد ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب کوئی شخص نہ تھا، میں نے اس دن کے آغاز میں اس دن سے زیادہ برا ہر گز نہ دیکھا تھا اور اس کے آخری حصے سے بہتر کوئی دن نہیں دیکھا۔ (اسباب النزول للواحدی)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ: یہاں جن ایمان والوں کو مخاطب کیا گیا ہے یہ خاص مدینہ کے انصار تھے، لفظ کے عموم میں قیامت تک آنے والے اہل ایمان شامل ہیں، اہل کتاب کو مخاطب ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو فرمایا کہ وہ اپنے انصار کو مخاطب کریں کیونکہ وہ اس خطاب کے زیادہ مستحق تھے، انہیں مخاطب کرنا ان کی عظمت شان کو چار چاند لگاتا ہے۔

فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ: فریق عربی میں لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں، یہاں فریق سے مراد یہود کے بڑے بڑے سردار ہیں، ان میں شاس بن قیس اور اس کے ساتھی ہیں یا اس فریق سے اکیلا شاس مراد ہے، اسے فریق اسی طرح کہہ دیا جس طرح دوسرے مقام پر ابوسفیان کو ناساً کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جگہ جگہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ قلبی دوستی اور تعلق سے مسلمانوں کو منع کیا ہے، ان کے بارے میں واضح کیا گیا کہ یہ کبھی بھی تم سے راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو، یہاں فرمایا کہ اے اہل ایمان! اگر تم ان کی پیروی کروگے تو یہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر کر کافر بنادیں گے، یہ یہود کی شناعت و قباحت بیان کی ہے، اس میں کافر مجرموں کی اس بری عادت کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ تمہیں ایمان سے پھیر کر کافر بنادیں گے، یہ تمہیں محمد ﷺ اور قرآن کریم سے دور کردیں گے، کیونکہ ان کا مشن یہ ہے کہ یہ کفر کی طرف دعوت دیتے ہیں، وہ اپنے مذہب کی اتباع کی دعوت دیتے ہیں، ان کی انہی سرگرمیوں کے باعث بعض منافقین نے ان کی پیروی شروع کردی تھی، جس سے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو منع فرمایا کہ تم ان کی پیروی نہ کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو اہل کتاب کے دجل و فریب سے خبردار کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے مومنین کی عظمت شان کو پیش نظر رکھتے ہوئے براہِ راست مخاطب کیا ہے، اے اہل ایمان! جب کہ اس سے پہلی آیات میں جب یہود سے خطاب کیا تو اپنے حبیب ﷺ کو بیچ میں ڈالا کہ میرے حبیب! آپ ﷺ ان سے فرمادیجیے۔

مسلمانوں کو اس آیت کی روشنی میں اپنے کو ہوشیار کر لینا چاہیے، اگر وہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ کسی بھی نوعیت سے محبت اور دوستی کی پینگیں بڑھائیں گے تو وہ انہیں راہ راست سے ہٹا کر چاہ ضلال میں پھینک دیں گے، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے دلی دوست بن ہی نہیں سکتے، ان کی سرشت میں سرکشی اور راہ راست کے برعکس چلنا ہے، ان کے جتنا بھی قریب ہوا جائے گا وہ کوئی نہ کوئی چال ایسی چل دیں گے جس سے مسلم معاشرے کا امن تباہ ہو جائے گا۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اسی بات سے آگاہ فرما رہے ہیں کہ " اگر تم یہودیوں کی بات ماننے لگو گے تو یہ تمہیں اسلام سے مرتد کر کے ہی دم لیں گے اور دوسرے یہ کہ تمہیں آپس میں لڑا بھڑا کر کافر بنا دیں گے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کا آپس میں لڑنا کفر ہے اور خطبہ حجۃ الوداع کے دوران آپ نے مسلمانوں کے عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: سن لو! تمہاری جانیں، تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں، جیسے تمہارے اس دن کی، اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرمت ہے، سن لو! میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کر کافر نہ بن جانا۔ (بخاری، کتاب الفتن)

اگر مسلمان توجہ اور غائر نظر سے دیکھیں تو انہیں پتا چل جائے کہ آج پوری دنیا کے مسلمان ممالک میں انتشار اور افتراق کا بیج کس نے بویا، کس نے مسلمانوں کو آپس میں دست و گریبان کیا ہوا ہے، کافر جسد واحد بن کر مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلى عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ: یہاں استفہام انکاری کے ساتھ مسلمانوں کی عظمت شان کو پھر سے بلندی عطا کی گئی کہ تم لوگ کب ان کافروں کی چالوں میں آنے والے ہو، کیونکہ تم وہ خوش نصیب لوگ ہو جن پر قرآن کریم کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان ہے، ان میں رسالت محمدی ﷺ کا بیان ہے، پھر بڑی بات یہ ہے کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کا رسول موجود ہے، وہ رسول تمہیں اللہ کی کتاب سکھاتے ہیں، وہ تمہارے دلوں کا تزکیہ وصفائی کرتے ہیں، وہ حق و صداقت کا پھریرا لہراتے ہیں اور شکوک و شبہات کے تانے بانے کاٹ کر رکھ دیتے ہیں، یہاں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں سے یہ بات بہت دور ہے کہ وہ ایمان

لانے کے بعد کفر میں مبتلا ہو جائیں، ان کے پاس ایسے دواعی ہیں جو کفر کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔

کتاب اللہ اور نبی اللہ یہ دو وہ عظیم الشان نشانیاں ہیں جن کی بدولت کوئی یہودی ہمیں یہودی نہیں بنا سکتا، ان کی بدولت ہمیں کوئی عیسائی نصرانی نہیں بنا سکتا، ان کی بدولت ہمیں کوئی ہندو ہندوازم قبول نہیں کروا سکتا، ان دو عظیم الشان ربانی تحائف کی موجودگی میں ہمارے قدم کوئی بھی نہیں اکھیڑ سکتا، ان دو میں سے ایک ہستی نبی کریم ﷺ تو دنیا سے کوچ کر گئے، وہ جنت میں بسیرا کر رہے ہیں، جب کہ اللہ کی عظیم الشان کتاب قرآن کریم ہمارے اندر موجود ہے، یہ ہمارے لیے اللہ کی رحمت ہے، یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس میں اللہ کی طرف سے بیان کردہ حلال اور واضح کردہ حرام کو بیان کیا گیا ہے، اس کی اطاعت و نافرمانی کا بیان اس میں موجود ہے۔

کیف میں استفہام انکاری کے ساتھ تعجب بھی ہے، مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف کفر کیسے آسکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی معجز نما کتاب قرآن کریم کی آیات تم پر پڑھی جاتی ہیں، یہ نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے تلاوت کی جاتی ہیں، تمہارے اندر اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں تو وہ تمہیں خبردار کرتے ہیں، وہ تمہیں وعظ و نصیحت کرتے ہیں، وہ تمہارے دلوں میں پیدا ہونے اور کیے جانے والے شبہات کو دور کرتے ہیں، تمہارے لیے نبی کریم ﷺ کے طریقوں میں خیر ہی خیر ہے، نبی کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ تمہارے ایمان کو غذا دیتا ہے، تمہارے دلوں کو منور کرتا ہے، تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم ان کی باتوں پر دھیان ہی نہ دو، بلکہ تم پر لازم ہے جب بھی تم کسی یہودی کی طرف سے پیدا کیے جانے والے شک وشبہ کو سنو تو رسول کریم ﷺ تک پہنچاؤ، آپ ﷺ ان شکوک وشبہات کو دور کر دیں گے، تمہارے دلوں میں کھٹکنے والے شبہات کو بھی آپ ﷺ دور کر دیں گے۔

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ: يَعتَصِمُ اعتصام سے ہے، اعتصام باب افتعال کی مصدر ہے، اس کے معنی کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے ہیں، یہ عصمت سے ہے، عصمت کا معنیٰ کسی آفت میں پڑنے سے رک جانا، اعتصام باللہ کے معنی اللہ کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب پر مضبوطی سے نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں مخالفت و موافقت سے بے نیاز ہو کر قائم رہنا ہے، آیت کے اس حصے

کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی عظیم الشان کتاب قرآن کریم اور اللہ کے محبوب اور لاڈلے رسول حضرت محمد ﷺ کو جس نے مضبوطی سے تھام لیا تو وہ ابدی و دائمی ہلاکت میں پڑنے سے بچ گیا، یہاں ترغیب دی گئی ہے کہ کافروں کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجانا چاہیے۔

فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ: اعتصام باللہ اور تمسک بدین اللہ کرنے والوں کی راہنمائی صراط مستقیم کی طرف کی گئی ہے، صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو سیدھا، مضبوط اور جنت کی طرف پہنچانے والا ہو، جنت کی طرف پہنچانے والا طریق دین اسلام ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو شخص شکوک و شبہات کے وقت اپنے رب کو جائے پناہ، ملجا و ماویٰ و مفزع بنالے تو اللہ تعالیٰ اسے ان شکوک و شبہات سے محفوظ رکھتے ہیں۔

صراط مستقیم دین حق کا نام ہے، اس کی طرف وہی شخص راہ پا سکتا ہے جو اس کو مضبوطی سے تھام لے، یہاں صراط مستقیم کو تھامنے کی ترغیب دی گئی ہے، حکیم ترمذی رحمہ اللہ نے امام زہری رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ جو بندہ میری مخلوق کو چھوڑ کر میرے ساتھ تعلق مضبوط بنائے گا، اگرچہ اسے زمین و آسمان نے کیوں نہ گھیر رکھا ہو میں اس کے نکلنے کی سبیل پیدا کروں گا اور جو بندہ مجھے چھوڑ کر میری مخلوق کے ساتھ تعلق مضبوط بنائے گا تو میں اس کے سامنے آسمان کے وسائل کاٹ دوں گا، اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لوں گا۔ (حکیم ترمذی، المقتطف من عیون التفاسیر)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ غدیر خم کے موقع پر ہم میں کھڑے خطبہ دے رہے تھے، غدیر خم مکہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے، آپ ﷺ نے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور لوگوں کو وعظ فرمایا، پھر فرمایا اے لوگو! میں تمہارے جیسا انسان ہوں، قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا نمائندہ آجائے، پھر میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں، میں تمہارے اندر دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، ان دو میں پہلی چیز کتاب اللہ ہے، پھر فرمایا اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں اللہ کی

یاد دلاتا ہوں، میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں۔ (مسلم) دوسری روایت میں آیا ہے کہ اللہ کی کتاب ہی اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے جو اس کے حکم پر چلے گا ہدایت پر ہو گا جو اس کو چھوڑ دے گا گمراہ ہو گا۔ (رواہ مسلم)

ترمذی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ میں تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اس کو تھامے رہو گے تو میرے بعد ہر گز گمراہ نہ ہو گے (یہ دو چیزیں ہیں جن میں سے) ایک دوسری سے مرتبہ میں زائد ہے (ایک) اللہ کی کتاب ہے جو آسمان سے زمین تک ایک آویختہ رسّی ہے (اس کو پکڑ کر آسمان تک پہنچا جا سکتا ہے دوسری چیز) میری عزت یعنی میرے اہل بیت ہیں حوض پر اترنے کے وقت تک یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، اسی لیے تم کو دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں کے معاملہ میں تم میری نیابت کس طرح کرتے ہو۔

ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے حج میں عرفہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہونے کی حالت میں خطبہ دیتے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے لوگو! میں نے تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر اس کو پکڑ لو گے تو ہر گز گمراہ نہ ہو گے اللہ کی کتاب اور اپنی عترت یعنی اہل بیت۔ (مظہری)

قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت رضی اللہ عنہم کو پکڑے رہنے کا اس لیے مشورہ دیا کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم ہی ولایت کے سلسلہ میں راہنمائی کے قطب ہیں، اگلوں اور پچھلوں میں سے کوئی بھی ان کے وسیلہ کے بغیر درجہ ولایت تک نہیں پہنچ سکتا، نمبر اوّل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادگان ہیں۔

حسن عسکری رحمہ اللہ تک یہ سلسلہ آتا ہے اور آخری نمبر غوث الثقلین محیٔ الدین عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کا ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اسی طرح بیان کیا ہے کہ ان کے بعد دوسرے اولیاء اور علماء امت کا مرتبہ ہے، جو بطور وراثت اہل بیت رضی اللہ عنہم کے حکم میں داخل ہیں، کیونکہ سب کے سب اہل بیت رضی اللہ عنہم ہی کے تابع ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ (مظہری)

تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ

سوال ان آیات مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتایئے حبل اللہ کیا ہے؟۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ {۱۰۲} وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ {۱۰۳} آل عمران

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو دل سے جس طرح اس سے ڈرنا چاہیے اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب کہ تم آپس میں دشمن تھے پھر تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی پھر تم اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے پھر تم کو اس سے نجات دی اس طرح تم پر اللہ اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ: مسلمانوں کی عظمت شان بیان کرنے کے لیے یہاں انہیں پھر دوبارہ مخاطب کیا گیا ہے، حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حَقَّ تُقَاتِهِ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے، شکر کیا جائے ناشکری نہ کی جائے، اور اسے یاد کیا جائے بھولا نہ جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حَقَّ تُقَاتِهِ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں اور انصاف کے ساتھ اللہ کے لیے کھڑے ہوں اگر اپنے خلاف اور اپنے ماں باپ کے خلاف بھی انصاف کرنا پڑے تو ایسے وقت میں بھی انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ (در منثور) جہاں تک ہو سکے احکامات کی بجا آوری کی جائے اور منہیات سے رکا جائے، جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جتنا کہ تم ڈر سکتے ہو، یہاں تاکید کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف وڈر رکھا جائے، اہل کتاب کی اطاعت و فرمانبرداری نہ کی جائے۔

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ: یعنی حقیقی اسلام پر ہی تم مرو، مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تمام نواہی و اوامر کے پابند رہو، تمام اعمال و افکار میں خلوص رکھو، اپنے تمام کام اللہ کے سپرد کر دو، اس کے فیصلہ پر دل سے راضی رہو اس کے علاوہ تمہاری کوئی حالت نہ ہونی چاہیے اسی حالت پر تمہاری موت ہو، اگر کسی صفت یا حالت کے ساتھ کوئی فعل مقید ہو اور اس فعل کی ممانعت کی جائے تو کبھی (وہ قید محض اتفاقی ہوتی ہے اور) مقصد ہوتا ہے مطلق فعل سے منع کرنا جیسے اللہ کی زمین پر زنا نہ کرو (لفظ زمین پر محض اتفاقاً مذکور ہے اس سے مراد ہے مطلق زنا کی ممانعت، خواہ زمین پر ہو یا ہوائی جہاز میں) کبھی نفی اور نہی کا رخ قید کی طرف ہوتا ہے جیسے اس آیت میں ہے (کہ مطلق مرنے سے روکنا مقصود نہیں ہے بلکہ اسلام کے علاوہ کسی دوسری حالت پر مرنے کی ممانعت کی ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ تمہاری کوئی دوسری حالت ہی نہ ہو کہ غیر اسلام پر تمہاری موت کبھی آجائے) کبھی مجموعہ کی طرف نہی کا رخ ہوتا ہے جیسے مچھلی نہ کھاؤ جب کہ دودھ پی رہے ہو۔ (یعنی دودھ مچھلی ایک وقت میں نہ کھاؤ، الگ الگ مختلف اوقات میں دونوں چیزیں کھاسکتے ہو) کبھی ممانعت کا رجوع دونوں میں سے ہر ایک کی طرف انفرادی حالت میں ہوتا ہے جیسے ہمسایہ کی بیوی سے زنا نہ کرو (اس سے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنے کی ممانعت بھی مقصود ہے اور مطلق زنا کی بھی)۔ (مظہری)

بغوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اہل تفسیر کا بیان ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے بڑی دشواری ہوگئی اور انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! اس حکم کی (پوری) تعمیل کرنے کی کس میں طاقت ہے؟ اس قول کے بعد اللہ نے نازل فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ جہاں تک طاقت ہو تقویٰ اختیار کرو، پس اس آیت سے اوّل آیت کا حکم منسوخ کر دیا گیا، مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ آل عمران میں سوائے اس آیت کے کوئی دوسری آیت منسوخ نہیں۔ (مظہری)

قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ حق تقویٰ کا وجوب منسوخ ہو گیا کیونکہ غرور، بے جا غصہ، حسد، کینہ، نفاق، بد خلقی دنیا کی محبت، اللہ کی طرف توجہ میں کمی، دوسروں سے دل کی لگاوٹ اور اسی طرح کی دوسری نفسانی خباثتیں بہر حال ہر وقت حرام ہیں، ان کی حرمت کے منسوخ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ان بزرگوں کے قول کا مقصد یہ ہے کہ ایک دم تمام

امراض نفسانیہ کا دور کر دینا تو کسی شخص کے اختیار میں نہیں ہے، بلکہ اللہ کا طریقہ یوں جاری ہے کہ امراض سے تزکیہ (رفتہ رفتہ) اہل دل اور مقدس نفوس والوں کی صحبت اور مختلف ریاضتیں کرنے سے ہوتا ہے یکدم نہیں ہو جاتا، اسی لیے اللہ نے اجازت دیدی اور بقدر امکان نفس کو پاکیزہ بنانے اور دل کو جلا دینے کی کوشش کو واجب قرار دیدیا، اب جو شخص بالکل تزکیہ نفس کی کوشش سے منہ موڑ کر خواہشات کی طرف اپنا رخ پھیر لے گا اس پر تمام رذائل نفس کا گناہ ہو گا، جو کچھ دلوں کے اندر ہو گا خواہ اس کو ظاہر کرو یا نہ کرو اللہ اس کی حساب فہمی ضرور کرے گا، پھر جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جو شخص ازالہ امراض کے طریقہ کی جستجو میں لگا رہے گا اور اندرونی بیرونی خباثتوں کو دور کرنے کی امکانی کوشش کرتا رہے گا، خواہ وہ درجہ کمال تک نہ پہنچا ہو مگر چونکہ ادائے فرض کر رہا ہے، اس لیے امید ہے کہ اللہ اس کمی کو معاف کر دے گا، جس کو پورا کرنا اختیار سے باہر ہے۔ (مظہری)

شان نزول: یہ آیت اوس اور خزرج دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ كَانَ الْأَوْسُ وَالْخَزْرَجُ يَتَحَدَّثُونَ، فَغَضِبُوا، حَتَّى كَادَ يَكُونُ بَيْنَهُمْ حَرْبٌ، فَأَخَذُوا السِّلَاحَ وَمَشَى بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ، (اسباب النزول) اوس اور خزرج کے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ غصہ میں آگئے، قریب تھا کہ ان کے درمیان لڑائی چھڑ جاتی، انہوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور ایک دوسرے کی طرف دوڑ پڑے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”حنین کی فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے مصلحت دینی کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو زیادہ مال دیا تو کسی شخص نے کچھ ایسے ہی نامناسب الفاظ زبان سے نکال دیئے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت انصار کو جمع کر کے ایک خطبہ پڑھا اس میں یہ بھی فرمایا تھا کہ اے جماعت انصار! کیا تم گمراہ نہ تھے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی؟ کیا تم متفرق نہ تھے پھر رب تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، کیا تم فقیر نہ تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں میری وجہ سے غنی کر دیا؟ ہر ہر سوال کے جواب میں یہ پاکباز، جماعت یہ اللہ والا گروہ کہتا جاتا تھا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسان اور بھی بہت

سے ہیں اور بہت بڑے بڑے ہیں۔

حضرت محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اوس و خزرج جیسے صدیوں کے آپس کے دشمنوں کو یوں بھائی بھائی بنا ہوا دیکھا تو یہودیوں کی آنکھوں میں کانٹا کھٹکنے لگا انہوں نے آدمی مقرر کئے کہ وہ ان کی محفلوں اور مجلس میں جایا کریں اور اگلی لڑائیاں اور پرانی عداوتیں انہیں یاد دلائیں ان کے مقتولوں کی یاد تازہ کرائیں اور اس طرح انہیں بھڑکائیں۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ كَانَتِ الْأَوْسُ وَالْخَزْرَجُ أَخَوَيْنِ لِأَبٍ وَأُمٍّ فَوَقَعَتْ بَيْنَهُمَا عَدَاوَةٌ بِسَبَبِ قَتِيلٍ قُتِلَ بَيْنَهُمْ، فَتَطَاوَلَتْ تِلْكَ الْعَدَاوَةُ وَالْحَرْبُ بَيْنَهُمْ عِشْرِينَ وَمِائَةَ سَنَةٍ إِلَى أَنْ أَطْفَأَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ ذَلِكَ بِالْإِسْلَامِ، وَأَلَّفَ بَيْنَهُمْ بِرَسُولِهِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اوس اور خزرج دونوں سگے بھائی تھے، ان دونوں کے درمیان ایک قتل کے سبب دشمنی پیدا ہو گئی، یہ دشمنی اتنی لمبی ہو گئی کہ ایک سو بیس سال تک ان کے درمیان لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اللہ نے اسلام کے ذریعے ان کی اس دشمنی کو ختم کیا، اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ان کے دلوں میں محبت اور لفت ڈالدی تھی۔ (تفسیر بغوی ۱/ ۴۸۲)

عداوتیں اور دشمنیاں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ختم ہوئیں، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ایک دوسرے کی خاطر خون دینے والے بن گئے، ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے ایک دوسرے کے رکھوالے اور پاسبان بن گئے، صدیوں لڑائیوں میں گزارنے والے امن و آشتی کے پیامبر بن گئے، کینہ، بغض اور حسد کی بیماریوں میں مبتلا روحانی معالج اور طبیب بن گئے، یہ اسلام کی بدولت ہوا، یہ رحمتٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمتٌ للعالمینی کے صدقے میں ہوا، یہ لوگ جو راہ راست سے ہٹے ہوئے تھے نہ صرف خود راہ راست پر آئے بلکہ اوروں کے لیے بھی نمونہ ہدایت بن گئے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا: اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ مت ڈالو، حبل اللہ سے مراد یا تو دین اسلام ہے، یا کتاب اللہ ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حبل اللہ، اللہ تعالیٰ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک دراز ہے نیز

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی رسی سے مراد جماعت ہے۔

قتادہ رحمہ اللہ نے کہا اللہ کی مضبوط رسی جس کو ہمیں پکڑنے کا حکم دیا ہے وہ یہ قرآن ہے، نیز قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس سے مراد عہد اور اس کا حکم ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صراط مستقیم پر شیاطین آکر اپنی طرف بلاتے ہیں، سو تم اللہ کی رسی کو پکڑ لو، اللہ کی رسی کو پکڑ لو، اللہ کی رسی کتاب اللہ ہے، ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا اللہ کی رسی پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ (جامع البیان) یہاں رسی بطور استعارہ استعمال فرمایا ہے، کیونکہ قرآن کریم کو تھامنے والا ہلاکت سے نجات پاجاتا ہے جس طرح رسی کو تھامنے والا گرنے سے نجات پاجاتا ہے، جَمِیعًا سے اشارہ کر دیا کہ یہ انفرادی کام نہیں ہے، یہ اجتماعی کام ہے، سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

یہ جملہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کی پاسداری کرو، اس کے دین کے ساتھ مضبوط تعلق رکھو، اس کی کتاب کو تھامے رہو، سب لوگ جسد واحد کی طرح ہو جاؤ، جب جسم کے کسی ایک حصہ میں تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔ تفرقہ واختلاف ختم کیا جائے جو کمزور کرتا ہے، جو اتحاد کی فضاؤں کو پارہ پارہ کرتا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لینا چاہیے کہ جو شخص بھی باریک راستے پر چلتا ہے اسے پھسلنے کا ڈر ہوتا ہے، جب وہ باریک راستے کے دونوں اطراف میں بندھی ہوئی رسی کو تھام لے گا تو وہ اس باریک راستے کی پھسلن سے بے خوف رہے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ راہ حق بھی باریک راستہ ہے، بہت سے لوگ اس راہ سے پھسل گئے ہیں، لیکن جس نے اللہ کے بیان کردہ دلائل، اس کی بتائی ہوئی نشانیوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا وہ ہر خوف اور ڈر سے محفوظ ہو گیا، تو یہاں حبل (رسی) سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے دین حق کے راستے کی طرف پہنچا جائے، اس کی بہت سی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک اللہ کا عہد ہے۔ (الوسیط للطنطاوی)

وَلَا تَفَرَّقُوا: اس آیت میں تفرقہ کی ممانعت سے مراد یہ ہے کہ عقائد میں ایک دوسرے کی مخالفت کر کے مختلف گروہ نہ بناؤ، یا اس سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ عداوت اور مخاصمت نہ

رکھو اور دنیاوی امور اور اغراض باطلہ کی وجہ سے ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو اور فروعی اور اجتہادی مسائل میں مجتہدین اور ائمہ فتوی کا اختلاف اس اختلاف کی ممانعت میں داخل نہیں ہے۔

عقائد حقہ میں اختلاف سے ممانعت :عقائد میں اختلاف کی ممانعت اس لیے ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کے عقائد واحد تھے، الوہیت، توحید، فرشتے، آسمانی کتابیں، نبوت اور رسالت، تقدیر، اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کا واجب ہونا اور اس کی ناشکری کا حرام ہونا، وحی سے حاصل شدہ احکام پر عمل کرنے کا وجوب اور استحباب وغیرہ، مرنے کے بعد اٹھنا اور جزاء اور سزا کو ماننا یہ وہ عقائد ہیں جن کو اصول اور دین کہا جاتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی نبی کے دور میں ان میں اختلاف جائز نہیں رہا کیونکہ حق بات صرف ایک ہی ہوتی ہے اس میں اختلاف نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ (یونس ۳۲) سو حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ تم کہاں حق سے پھرے جارہے ہو۔ (تبیان القرآن)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود کے اکہتر یا بہتر فرقے تھے، نصاریٰ کے بھی اسی طرح تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ (ترمذی) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت بنی اسرائیل کے برابر برابر عمل کرے گی حتی کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھلم کھلا بدکاری کی ہو تو میری امت میں بھی لوگ اس طرح کریں گے اور بنی اسرائیل کے بہتر فرقے تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اور ایک فرقے کے سوا سب دوزخ میں جائیں گے، پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کونسا گروہ ہوگا؟ فرمایا جس ملت پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔ (جامع ترمذی)

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں تشریف فرما ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سنو تم سے پہلے اہل کتاب کے بہتر فرقے تھے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، بہتر فرقے جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا۔ (دارمی) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کے اکہتر فرقے تھے

اور عنقریب میری امت کے بہتر فرقے ہوں گے اور ایک فرقے کے سوا سب دوزخ میں ہوں گے، عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ وہ کونسا فرقہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے مٹھی بند کی اور فرمایا جماعت، تم سب مل کر اللہ کی راسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ نہ کرو۔ (جامع البیان) ان احادیث میں جس امت کے اکہتر یا بہتر فرقے بیان کیے گئے ہیں اس سے مراد امت دعوت بھی ہو سکتی ہے اور امت اجابت بھی، لیکن زیادہ تر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد امت اجابت ہے۔ (تبیان القرآن)

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً: یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو متوجہ فرمایا جو اسلام اور ہدایت ملنے سے پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت عطا کی اور اسلام کی دولت سے مالا مال فرمایا، ہدایت اور اسلام ہی وہ نعمتیں ہیں جن کی بدولت انسانی قلوب میں الفت و مودّت پیدا ہوتی ہے، دشمنی، عداوت اور باہمی کشاکش سے جان چھوٹتی ہے، یہ آیت اَوس اور خزرج کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو چالیس سال تک ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے، ایک تفسیر کے مطابق ایک سو بیس سال تک ان کے درمیان جنگ و جدال کی فضا رہی، ایک طویل عرصہ تک ان کے درمیان اختلافات، انتشارات، جنگ و جدل کی خوفناک فضا قائم رہی، یہ لوگ فنا ہونے کے قریب تھے، اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں نبی بنا کر بھیج دیا، اوس اور خزرج مدینہ میں آباد تھے، یہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے، یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس مکہ مکرمہ میں تشریف لائے، ہجرت سے پہلے ان میں سے ستر لوگوں نے آپ ﷺ سے ملاقات کی تھی، نبی کریم ﷺ اپنے چچا حضرت عباس کے ہمراہ مدینہ سے آنے والے ان ستر لوگوں کی ملاقات کے لیے عقبہ میں پہنچے تھے، ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے عہد و پیمان کیا تھا، پھر یہ مدینہ کی طرف واپس چلے گئے تھے، اس عہد و پیمان کے دو سال بعد نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، اللہ تعالیٰ نے دولت اسلام اور وجود محمدی ﷺ کی برکت سے ان کے درمیان الفت و محبت، بھائی چارگی اور دوستی کا تعلق قائم فرما دیا اور زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان جو نفرت تھی اللہ تعالیٰ نے اسے ختم فرما دیا، عداوت کی جگہ محبت پیدا کرنے والا اللہ ہے، دشمنی کی جگہ دوستی پیدا کرنے والا اللہ ہے، مخاصمت و جدال کی بجائے امن و شانتی دینے والا اللہ ہے، اسی کو یہاں نعمت دے تعبیر کیا گیا،

دوسرے مقام پر سورۃ الانفال کی آیت ۶۳ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اگر آپ روئے زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی خرچ کر ڈالتے تو ان کے دلوں میں محبت نہیں ڈال سکتے تھے۔

فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَاناً : حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار کے دو آدمیوں کے درمیان کوئی نزاع و جھگڑا پیدا ہو گیا، وہ اپنے کسی معاملے پر ایک دوسرے کے سامنے فخریہ گفتگو کرنے لگے، جس سے وہ لڑ پڑے، اس لڑائی میں انہوں نے اپنی اپنی قوم سے مدد کی درخواست کی، اوس اور خزرج جمع ہو گئے، ہتھیار اٹھا کر لڑائی کے لیے نکل کھڑے ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیس مہاجرین کے ساتھ ان کی طرف نکلے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گدھے پر بیٹھے ہوئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے، تمہیں ایمان کی حالت میں موت آئے، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقوں میں نہ پڑو، اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی، پھر تم اس کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے، رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سن کر لڑائی کا ماحول ختم ہو گیا، ہتھیار رکھ دیے گئے، لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی، ان لوگوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ رو رہے تھے، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس دن جس قدر لوگ کثرت سے رو رہے تھے اتنا رونا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ وہ دن تھا کہ رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر سب سے زیادہ مجھے محبوب دکھائی دے رہے تھے، شاس بن قیس یہودی نے ان کے درمیان یہ جنگ بھڑکائی تھی۔

وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا: اور تم لوگ جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں گرنے سے بچایا، شَفا کسی چیز کے کنارے کو کہا جاتا ہے، عربی میں کنویں کو کنارے کو شَفَا البِئر کہا جاتا ہے، عربی زبان میں جب کوئی شخص کسی چیز کے کنارے پر ہو تو کہا جاتا ہے فُلَانٌ أَشفَى عَلَى الشَّيءِ گویا کہ وہ اس کے کنارے پر پہنچ گیا ہے، عربی میں شفا، حد، حرف قریب المعنیٰ الفاظ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل ایمان! تم لوگ اپنی عقلوں اور دلوں

کے ساتھ اللہ کی نعمتوں پر متوجہ رہو، جس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالی، جس نے تمہارے دلوں سے کھوٹ کو ختم کیا، تم لوگ زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے کے مقابل دشمن تھے، ایک دوسرے سے لڑنے، جھگڑنے میں مصروف تھے، اللہ تعالیٰ نے اسلامی بھائی چارے کی بدولت تمہارے دلوں میں الفت و محبت ڈال دی، اس کی بدولت تم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھنے والے، ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کرنے والے، ایک دوسرے کے ساتھ مودّت رکھنے والے بن گئے، تمہاری صورت حال یہ تھی کہ تم باہمی اختلافات و جھگڑوں کے باعث وہاں پہنچ چکے تھے کہ تم جہنم میں گر جاتے، موت تمہارے اور جہنم کے درمیان فاصلہ تھا، اگر تم اسی حالت میں مر جاتے تو جہنم کے گڑھے میں گر جاتے، اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بدولت تمہیں جہنم کے گڑھے میں گرنے سے بچالیا، تمہیں دین حق کی طرف ہدایت دے دی، اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر رحمت للعالمین ﷺ کو نبی بنا کر بھیجا، اس لیے تمہارے اوپر یہ بات لازم ہے کہ تم لوگ ان نعمتوں کی شکر گزاری کرو، اپنے پیغمبر ﷺ کی اطاعت کرو، جو باہمی محبت، مودّت اور اسلامی بھائی چارہ تمہارے اندر ہے اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔

یہ سب کچھ خصوصی طور پر اوس اور خزرج جیسے قبیلوں کو سمجھایا جارہا ہے، اگرچہ عمومی طور پر قیامت تک سب مسلمان اس پیغام کے مخاطب ہیں، جو بھی قیامت تک اس ہدایت وارشاد کی روشنی میں اپنا سفر زندگی طے کرتا جائے گا وہ کامیاب و کامران ہوگا، اوس اور خزرج کے درمیان زمانہ جاہلیت میں بہت زیادہ لڑائیاں ہوتی تھیں، ان میں بہت زیادہ دشمنیاں تھیں، ان کے دل کھوٹ اور کینے سے بھرپور تھے، اسی بناء پر ان کے مابین لڑائیوں کا ایک طویل ترین دورانیہ تھا، بہت سے واقعات تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں، جب اللہ تعالیٰ اسلام کی دولت لائے تو ان میں سے جو اسلام میں داخل ہوا وہ داخل ہوا، پھر یہ لوگ اللہ کی عظمت و جلال کے باعث ایک دوسرے کے دوست، حبدار اور تعلق دار بن گئے، اللہ تعالیٰ کی ذات عالی انہیں جوڑنے والی تھی، جلال الٰہی کے باعث باہمی محبت، ذات الٰہی ان کے باہمی ملاپ کا ذریعہ، ذات حق کی خاطر یہ لوگ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاونین و مساعدین بن گئے، یہ لوگ اس سے پہلے اپنے کفر و شرک کے باعث جہنم کے کنارے

پہنچے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں وہاں سے بچایا اور ہدایت کی دولت سے مالا مال کیا، پھر اللہ نے ان پر بڑا احسان رسول کریم ﷺ کی بعثت کے ساتھ فرمایا۔

معرکہ حنین میں نبی کریم ﷺ نے اپنے انصار کی بہ نسبت دوسرے لوگوں کو مال غنیمت میں سے کچھ زیادہ ہی عنایت کر دیا، ان لوگوں کے دلوں میں انسانی فطرت کے تحت بوجھ آیا کہ ہمارے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو ترجیح دی گئی، اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک بار پھر مخاطب فرمایا کہ اے گروہ انصار! میں نے تمہیں گمراہ پایا پھر اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی، تم ایک دوسرے سے جدا جدا تھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں میری وجہ سے الفت پیدا کی، تم لوگ نادار تھے اللہ تعالیٰ نے میری بدولت تمہیں مالدار کیا، ہر ہر سوال کے جواب میں یہ پاکباز، جماعت یہ اللہ والا گروہ کہتا جاتا تھا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے احسان اور بھی بہت سے ہیں اور بہت بڑے بڑے ہیں۔ (ابن کثیر، الوسیط)

اس آیت میں مسلمانوں کی اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کی صورتحال بیان کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تصویر کشی فرمائی ہے، وہ کس طرح کفر، اختلاف اور باہمی قتل و قتال میں مشغول تھے، وہ اسلام سے پہلے اس طرح کی بدتر زندگی گزار رہے تھے کہ الامان والحفیظ، ان کی اسی حالت کو فرمایا گیا کہ تم جہنم کے گڑھے کنارے تھے، قریب تھا کہ یہ لوگ اس میں گر جاتے، اسلام لانے سے پہلے ان کی زندگی کوئی قابل رشک و فخر نہ تھی، اسلام لانے کے بعد وہ قابل رشک انسان بن گئے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: یعنی اس بلیغ بیان کی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے قرآن کریم کی آیتیں واضح کرتا ہے، جن میں تمہیں کچھ چیزوں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کچھ چیزوں کو کرنے سے روکا گیا ہے، تاکہ تم لوگ ہدایت پر ڈٹے رہو، راہ مستقیم پر گامزن رہو، اس راہ میں چلتے چلتے تمہارے معاملات بڑھتے رہیں، تم ترقی کرتے جاؤ، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات بڑی وضاحت سے بیان فرمائی ہیں تاکہ کسی گمراہی کے لیے کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ (تدبر قرآن) یہ باتیں اس قدر کھول کھول کر سنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ ٹھیک راستہ پر چلتے رہو، ایسی مہلک و خطرناک غلطی کا پھر اعادہ نہ کرو اور کسی شیطان کے اغوا سے استقامت کی راہ نہ چھوڑو۔ (عثمانی)

دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ {۱۰۴} آل عمران

جواب ترجمہ: اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلاتی رہے اور بھلائی کے لیے کہتی رہے اور برائی سے روکتی رہے اور یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ: یہاں امت کا معنیٰ جماعت ہے، جو کسی بھی مقصد کے لیے اٹھ کھڑی ہو، یہ لفظ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے پیروکاروں پر بولا جاتا ہے، جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہ لفظ ایسے شخص پر بھی بولا جاتا ہے جو خیر و بھلائی کا جامع ہو، جس کی پیروی واتباع کی جاتی ہے، جیسے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلَّهِ حَنِيفاً، اسی طرح یہ لفظ دین اور ملت پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ، اسی طرح یہ لفظ وقت اور زمانے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ، یہاں امت سے مراد لوگوں کا وہ گروہ یا وہ جماعت ہے جو لوگوں کی اصلاح و بھلائی و خیر کے لیے کوشاں ہو، خیر کی دعوت دیتی رہے، نیکی کی دعوت دیتی رہے، برائی سے روکتی رہے، کلبی نے امۃ کا معنیٰ جماعت کیا ہے، مقاتل نے امۃ کا معنیٰ گروہ کیا ہے، زجاج کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سارے کے سارے امت واحدہ بن کر لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دو، زجاج کہتے ہیں کہ یہاں مِن تمام اقسام کے لوگوں میں سے بعض کو خاص کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

کلام عرب میں "امت" کا لفظ لوگوں کے اس گروہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ایک ہی ارادے کے ساتھ اٹھے، نسبی لحاظ سے ہو، وطنی لحاظ سے ہو، دینی لحاظ سے ہو یا ان سب کاموں کے مجموعہ کے لیے ہو، اس کی تعیین ان امور کی طرف اضافت کی وجہ سے ہوگی، جیسے یوں کہا جائے امت العرب، امت غسان، امت نصاریٰ وغیرہ۔ (التحریر والتنویر)

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اصلاح ذات کا حکم دیا تھا کہ تم لوگ اللہ سے ڈرو جس طرح اس عالی ذات سے ڈرنے کا حق ہے، یہاں اللہ تعالیٰ اصلاح غیر یعنی دوسروں کی اصلاح کی طرف متوجہ کر رہے ہیں، تاکہ یہ امت ھادی بھی بنے اور مہدی بھی بنے، برعکس اس امت کے دشمنوں کے، وہ لوگ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے فرمارہے ہیں کہ اے اہل ایمان! تم میں ایک ایسی جماعت ہونا چاہیے جو مضبوط ایمان والی ہو، بہت زیادہ اخلاص والی ہو، جو اپنی انتہائی طاقت و کوشش کرتے ہوئے خیر کی طرف لوگوں کو بلائے، جس سے لوگوں کی اصلاح ہو، لوگوں کے معاملات میں ایسی تعلیمات واخلاقیات اختیار کی جائیں جو کتاب وسنت اور عقول سلیمہ کے مطابق ہوں، انہیں ایسی برائیوں سے روکا جائے جن کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور حسین طبیعتیں ان سے نفرت کرتی ہیں۔ یہاں اکثر علماء کا قول ہے کہ مِنۡكُمۡ میں مِن تبعیضیہ ہے، یعنی تم میں کچھ لوگ ایسے ہونا چاہییں جو اپنی کوشش کریں اور اللہ تعالیٰ کے پیغامات لوگوں تک پہنچائیں، لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیں، نیکی کی طرف بلائیں اور انہیں برائیوں سے روکیں۔ یہاں جب من تبعیضیہ اور امۃٌ میں تنکیر ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ ایسا کام کرنے والے کم ہی لوگ ہوتے ہیں، اس کے ذریعے صرف خواص ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

یہ آیت کریمہ دو باتوں کا تقاضا کرتی ہے، ① ایک یہ کہ ساری امت کو اس طرف متوجہ کیا گیا کہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرے جو اس عظیم الشان کام میں مشغول ہو جائے، یہ کام لوگوں کو خیر کی طرف دعوت دینا ہے، اس عظیم الشان کام کے لیے اس امت سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر گزرے تاکہ یہ اہم کام ادا ہو سکے۔

② دوسری یہ کہ امت کا یہ نیک طبقہ اس عظیم الشان کام کی طرف اپنی توجہات مرکوز کرے، اس میں اخلاص سے کام لے، یہ فریضہ اکمل طریقہ سے انجام دے تاکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، بعض علماء کرام کا خیال ہے کہ یہاں امت کے ساتھ امت بیانیہ مراد ہے، یعنی وَلۡتَكُنۡ مِنۡكُمۡ أُمَّةٌ بَيَانِيَةٌ، اس کا معنیٰ اور مطلب یہ ہے کہ ساری امت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین

ہے فرض کفایہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل ایمان! تم ساری امت خیر کی دعوت دو، تم سب لوگ نیکی کا حکم دو، تم سب لوگ برائی سے روکو، اس لحاظ سے یہاں مِنۡکُمۡ میں من تبعیضیہ نہیں ہے، بلکہ یہاں مراد بیان ہے۔

مصری عالم محمد سید طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یہ بات ظاہر ہوگئی کہ کہ پہلی رائے جس میں کہا گیا کہ من تبعیضیہ ہے یہ درستگی کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ ساری کی ساری امت اپنے مردوں، عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں سمیت اس اہم ترین اور عظیم الشان کام کو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اس کام کی صلاحیت وہی رکھتا ہے جو اسے اچھی طرح اور عمدہ طریقہ سے سرانجام دے سکتا ہے، جو آدمی دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے عقلی، علمی، نفسی اور خلقی لحاظ سے اس عظیم کام کو سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے وہی یہ کام کر سکتا ہے۔ (الوسیط للقرآن الکریم)

علامہ زمخشری نے کشاف میں اسی لیے مِنۡکُمۡ میں من کو تبعیضیہ قرار دیا ہے، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرائض کفایہ میں سے ہے، اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صلاحیت وہی شخص رکھتا ہے جو معروف و منکر کو سمجھتا اور جانتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس معاملے کے قیام کے لیے کیسے ترتیب قائم کی جائے گی، کیونکہ بہت دفعہ جاہل آدمی نیکی کے کام سے روک دیتا ہے اور برائی کے کام کا حکم دیتا ہے، بہت دفعہ اپنے مذہب کے حکم کو جانتا ہے اور دوسرے کے مذہب سے ناواقف ہوتا ہے، چنانچہ وہ اسے غیر منکر سے روکتا ہے، کبھی کبھی وہ نرمی کے مقام پر سختی کرتا ہے اور سختی کے مقام پر نرمی کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مِنۡکُمۡ کی من تبیین کے لیے ہے یعنی تم لوگ ایسی جماعت بن جاؤ جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتی رہے۔

علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرائض کفایہ میں سے ہے۔ (المقتطف) رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں بہترین کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ نیکی کا حکم کرنے والا ہے، جو ان میں سب سے زیادہ برائی سے روکنے والا ہے، جو ان میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے، جو ان میں سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہے۔ (مسند احمد، المقتطف)

يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ: خیر سے مراد وہ چیز جس میں لوگوں کی دینی یا دنیوی بھلائی ہو، خیر قرآن وسنت کی اتباع وپیروی کا نام ہے، خیر کی طرف دعوت دینے سے مراد اسلام کی طرف دعوت دینا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام خیر کے کاموں کی طرف بلانا مقصود ہے (بحر العلوم) نبی کریم ﷺ کی دعوت کو پھیلانا یہ خیر کی طرف دعوت دینا ہے۔ (التحریر والتنویر) اسلام کے تمام خصائل کو خیر کہا گیا ہے، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم جاہلیت اور برائی میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ ہمارے پاس یہ خیر لائے ہیں، تو کیا اس خیر کے بعد کوئی شر ہو گا؟ (التحریر والتنویر) خیر کی طرف دعوت دینے میں تمام بھلائیاں آجاتی ہیں، ان میں نیکی کی طرف دعوت دینا، برائی سے روکنا بھی ہے۔ کلبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اتباع کی طرف بلایا جائے۔

پھر يَدْعُونَ کو صیغہ مضارع سے لاکر بتلایا کہ اس جماعت کا وظیفہ دعوت الی الخیر ہو گا، یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہو گا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص مواقع پر ہو گی، جب وہ منکرات دیکھے جائیں، لیکن یدعون الی الخیر کہہ کر بتلادیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہو گا، اگرچہ اس وقت منکرات موجود نہ ہوں، یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلاً آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک نماز کا وقت نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی کہ وقت نماز آنے کے بعد نماز ادا کرنا ضروری ہے یا روزہ کا وقت نہیں آیا ابھی رمضان کا مہینہ دور ہے، لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہو گا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہو گا۔

پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو رجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا ہے مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے، زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال وجہاد کا حکم دیا وہاں سچے مومنین کی اس طرح تعریف کی: الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا

الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (حج ۴۱) یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تمکین و قدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین میں نظام اطاعت قائم کرتے ہیں جس کا ایک مظہر نماز ہے اور اپنا مالیاتی نظام زکوۃ کے اصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد حیات بناتے ہیں، اگر آج امت مسلمہ اپنا مقصد دیگر اقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہو جائیں گی جو دوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، کیونکہ جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت الی الخیر) پر مجتمع ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں علمی اور عملی حیثیت سے اقوام عالم پر غالب آنا ہے اور اقوام کی تربیت و تہذیب ہمارے ذمہ ہے تو اس کی نااتفاقیاں بھی یکسر ختم ہو جائیں گی، اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لیے لگ جائے گی، رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کامیابیوں کا راز اسی میں مضمر تھا۔

حدیث میں ہے کہ حضرت ضحاک نے یہ آیت وَلْتَكُن مِّنكُمْ تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا ھم خاصۃ اصحاب رسول اللہ ﷺ (ابن جریر) یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوس قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ دعوت الی الخیر کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے، کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعت خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ اور فریضہ دعوت الی الخیر انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہو گی، یعنی تمام مسلمانوں کو ضروری احکام و اسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے، دوسری دعوت الی الخیر خاص ہو گی یعنی امت مسلمہ میں علوم قرآن و سنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دوسری آیت میں رہنمائی کی گئی: فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ [التَّوْبَة: ۱۲۲] (معارف القرآن للمفتیؒ)

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ: معروف وہ چیز ہے جس کی شریعت نے تحسین کرتے ہوئے نیکی قرار دیا ہے، جو ارباب عقل و دانش کے نزدیک اچھائی اور بھلائی ہو، ، معروف اسے کہا جاتا ہے جسے پہچانا جائے، یہ مقبول، پسندیدہ کے لیے مجازی معنیٰ ہے، کیونکہ جب کوئی چیز معروف ہوتی ہے تو وہ محبوب و مقبول

وپسندیدہ ہو جاتی ہے، یہاں معروف سے مراد وہ چیز ہے جو اہل عقل کے نزدیک قبول کی جائے، شریعت میں معروف سے مراد حق اور صلاح ہے، کیونکہ عوارض کے ختم ہونے کے بعد یہ مقبول ہو جاتی ہے۔

ارباب تفسیر فرماتے ہیں کہ ”یہ حسن مقابلہ ہے، یہ خطابت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اہل کتاب کی برائیاں گنواتے ہوئے ذکر کیا کہ وہ کفر کرتے ہیں، وہ لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں، انہیں اپنے حبیب ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا کہ اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو؟ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، اے اہل کتاب تم اللہ کی راہ سے لوگوں کو کیوں روکتے ہو؟ (آل عمران ۹۹،۹۸) اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ وہ ایمان اور نیکی کی طرف دعوت دیں، اے اہل ایمان! اللہ تعالیٰ سے یوں ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے، (آل عمران ۱۰۲) اسی طرح یہاں فرمایا کہ تم میں ایک جماعت ہونا چاہیے جو دعوت الی الخیر کرے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔ آل عمران کی آیت ۱۱۰ میں اس امت مرحومہ کی کوالٹی اور خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ تم بہترین امت ہو، اس لیے کہ تم نیکی کی دعوت دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ کی ذات پر ایمان رکھتے ہو۔

دوسرے مقامات پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے احکامات سے اچھی طرح یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ دعوت الی اللہ والا کام استحبابی نہیں ہے بلکہ وجوبی ہے، سورۃ العصر میں فرمایا کہ نقصان سے بچنے والے وہ لوگ ہیں جو تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کرتے ہیں۔

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: منکر وہ چیز ہے جس کی شریعت نے قباحت بیان کی ہے، برائی قرار دیا ہے، جو ارباب عقل ودانش وبینش کے نزدیک برائی اور قباحت ہے، علامہ سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جبت وطاغوت سے لوگوں کو روکا جائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ منکر سے مراد وہ کام ہیں جو کتاب وسنت کے خلاف ہوں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ منکر سے مراد وہ ہے جسے عقل درست قرار نہ دے، حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن چیزوں میں علماء کا اختلاف ہے ان کے علاوہ جو منکر ہیں ان سے روکنا مراد ہے، یہاں بعض لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ نیکی کی دعوت دیں

اور برائی سے روکیں، کیونکہ ہر شخص نیکی کی دعوت اور برائی سے نہیں روک سکتا، کیونکہ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو اسے کرنا جانتا ہو۔ حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ نیکی کو ہاتھ سے نافذ کریں اور برائی کو ہاتھ سے روکیں، علماء پر لازم ہے کہ وہ نیکی کا حکم زبان سے دیں اور برائی کے کام کو زبان سے روکیں، عوام الناس کو چاہیے کہ وہ برائی کو دل سے روکیں۔ منکر سے یہاں باطل اور فساد مراد ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا إذا رَأَى أَحَدٌ مُنكَراً، فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وذَالِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ، تم میں جو شخص برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے، پس اگر وہ شخص اس کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے اسے روکے، پھر اگر وہ زبان سے روکنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو اسے اپنے دل میں برا جانے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور ترین درجہ ہے۔ (بحر العلوم) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بِحَسبِ امرِءٍ إِذَا رَأَى مُنكَراً، لَا يَستَطِيعُ النَّكِيرَ أَن يَّعلَمَ اللهُ مِن قَلبِهِ أَنَّهُ كَارِهٌ کسی شخص کے لیے اس وقت اتنا ہی کافی ہے جب وہ کسی برائی کو دیکھے اور وہ اسے روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ایسا کرے کہ وہ دل سے اسے برا جانے۔ (بحر العلوم) بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہاں تک مروی ہے کہ ایک آدمی جب کسی برائی کو دیکھے پھر اسے روکنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو تین بار یہ کلمات کہہ دے اَللّٰهُمَّ إِنَّ هَذَا مُنكَرٌ، فَإِذَا قَالَ ذَالِكَ فَقَد فَعَلَ مَا عَلَيهِ، ان کلمات کی ادائیگی کے ساتھ وہ ایسا ہو گیا کہ گویا جو ذمہ داری اس پر عائد تھی وہ اس نے پوری کر دی۔

وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ: یہاں اللہ تعالیٰ نیکی کی طرف بلانے والوں کو کامیابی، کامرانی اور فائز المرامی کی خوشخبری دے رہے ہیں، کہ یہ لوگ کامیاب ہیں، فلاح کا معنیٰ ہوتا ہے کامیابی اور مطلوب کو پالینا، مطلب یہ ہے کہ دعوت الی الخیر کے فریضے کو انجام دینے والے، نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی سے روکنے والے یہی لوگ فلاح اور نجات میں باکمال ہیں، ان کے سوا جو لوگ اس فرض کی ادائیگی نہیں کرتے، جو اس حکم ربانی کی تعمیل نہیں کرتے وہ کیونکر کامیاب ہوں گے، ان کی کیا شکل ہو گی کامیابی کی، وہ اس تمغہ کو کیسے پائیں گے، ہاں میرے خیال میں ایک صورت ہو سکتی ہے جو لوگ دعوت الی الخیر کے کام میں مشغول ہوں، جو لوگ نیکی کا حکم کرنے میں ہمہ تن مشغول ہوں، جو لوگ

برائی سے روکنے میں منہمک ہوں ان کا دست وبازو بن جائیں، ان کے مشن وکاز کو آگے پہنچانے میں ان کو قوت مہیا کریں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ اے علی! اگر اللہ تعالیٰ تیرے ذریعے سے ایک شخص کو ہدایت دے دے تو یہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

اس آیت مبارکہ کے اولین مخاطب وہ لوگ تھے جن کے سامنے یہ آیت نازل ہوئی، وہ لوگ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، جنہیں اس آیت کا اولین مخاطب ہونے کا شرف ملا، جنہیں براہ راست فرمایا گیا کہ تم میں ایک جماعت ہونا چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، جو نیکی کا حکم کرے، جو برائی سے روکے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب ان اوصاف سے متصف ہو گئے جو اس آیت میں مطلوب تھے تو وہی امت مطلوبہ مقصودہ بن گئے، اسی بناء پر تو اس امت کو افضل الامت کہا گیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سارے کے سارے داعین الی الخیر تھے، اس میں کوئی شک کی بات نہیں اور کوئی دوسری رائے نہیں ہے کہ ان لوگوں نے دین وشریعت نبی کریم ﷺ سے براہ راست حاصل کی، تو یہ لوگ باقی لوگوں کی بہ نسبت زیادہ حقدار تھے کہ وہ اس دین کی تبلیغ کرتے جو انہوں نے اپنے آقا ومولیٰ ﷺ سے حاصل کیا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی وہ خوش نصیب انسان تھے، وہ بہترین لوگ تھے جن کے سامنے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ چاہیے کہ موجود لوگ غائب لوگوں تک پیغام پہنچادیں، پھر آپ ﷺ نے انہی نورانی صفات لوگوں کو مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا تھا کہ کیا میں نے تم تک بات پہنچادی ہے؟

بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ کے مخاطبین خصوصی طور پر اصحاب پیغمبر ﷺ تھے، ہم نے افریقہ میں حضرت منیذر رضی اللہ عنہ کی قبر پر حاضری دی ہے، وہ وہاں کیوں پہنچے تھے؟ استنبول میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کیسے بنی؟ پاکستان کے مختلف مقامات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں کیوں بنیں؟ یہ لوگ دور دراز علاقوں میں کاروبار روزگار کے لیے تو نہیں آئے تھے، ان کی ایک ہی دھن اور ایک ہی لگن تھی کہ اللہ کا دین دور سے دور تک پہنچے۔

اس آیت کے اولین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، ان کے ذمہ دعوت الی الخیر خصوصی طور پر تھی، جب کہ قیامت کی صبح تک آنے والے تمام مسلمان اس آیت کے مخاطب ہیں، ان میں علماء اور دین جاننے والے خصوصی طور پر اس دعوت کو دوسروں تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں، جب کہ عامۃ الناس عمومی طور پر اس آیت کے مخاطب ہیں، الحمدللہ دنیا بھر کے علماء کرام اس حکم کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں، مساجد میں خطبات کے ذریعے، پروگراموں کے ذریعے، محافل و مجالس کے ذریعے، خانقاہوں میں اصلاح نفس کے ذریعے، اہل قلم تصنیف و تالیف کے ذریعے، اہل دعوت و تبلیغ ایک ایک شخص کے پاس جاکر اس حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔

پاکستان اور بھارت میں گزشتہ صدی سے باقاعدہ تبلیغی جماعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ایک ڈیوٹی سمجھ کر سرانجام دے رہی ہے، دنیا کے سارے ممالک میں تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں جاری ہیں، بڑے بڑے مراکز قائم کر رکھے ہیں، جہاں سے جماعتیں بن بن کر پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں، اس جماعت نے حقیقی معنٰی میں ایک انقلاب برپا کر رکھا ہے، اربوں انسانوں میں سے کروڑوں انسانوں تک اس جماعت نے انتہائی خلوص، تندہی، جانفشانی کے ساتھ اللہ کا پیغام پہنچایا ہے، لاکھوں لوگ ان کی دعوت و نقل و حرکت دیکھ کر مسلمان ہوئے ہیں، یہ اس وقت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے بعد ایک قابل رشک جماعت ہے، جس نے دین اسلام کے گلشن کی آبیاری میں اپنا بہت بڑا حصہ شامل کیا ہے، اس جماعت کی سرگرمیاں شبانہ روز جاری ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے یدعون میں مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا، جس کی تہہ میں جائیں تو تبلیغی جماعت کا مشن اس لفظ کا مصداق ہے، جن کی دعوت میں کوئی آرام اور ٹھہراؤ نہیں بلکہ ہمہ وقت اس جماعت کے سر پر یہ بات سوار رہتی ہے کہ اللہ کا دین کس طرح پھیلے۔ اللہ اس جماعت کو مزید ہمت دے۔ آمین

امت محمدیہ کے تہتر فرقے

سوال کن لوگوں نے تفرقہ بازی کی اور کن لوگوں نے اس آیت میں اختلاف کیا؟

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ {۱۰۵} آل عمران)

جواب ترجمہ: کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے جنہوں نے یہ روِش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ: تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں تقسیم ہو گئے، دین میں اختلاف کرنے لگے، کج مج اور ٹیڑھی تاویلات کرتے رہے، رسالت سے متعلقہ آیات کو چھپاتے رہے، کمینی دنیا کے مفادات سمیٹنے کی خاطر آیات میں تحریف کرتے رہے، جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا، ان لوگوں نے بہت سے فرقے بنا لیے تھے، ایک دوسرے کی تکفیر کرتے تھے۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ يَنْهَى هَذِهِ الْأُمَّةَ أَنْ تَكُونَ كَالْأُمَمِ الْمَاضِيَةِ فِي تَفَرُّقِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ، وَتَرْكِهِمُ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ مَعَ قِيَامِ الْحُجَّةِ عَلَيْهِمْ (ابن کثیر) اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں اس امت کو سابقہ امتوں کی طرح ہونے سے روکا ہے، ان کی تفرقہ بازی اور ان کے اختلاف کے باعث، حجت اور دلیل قائم ہونے کے باوجود انہوں نے نیکی کی دعوت دینا اور برائی سے روکنا ترک کر دیا تھا، اس لیے اس امت کو کہا جا رہا ہے کہ تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔

حضرت معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ حج کیلئے جب مکہ شریف میں آئے تو ظہر کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابَيْنِ افْتَرَقُوا فِي دِينِهِمْ عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، وَإِنَّ هَذِهِ الْأُمَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً يَعْنِي الْأَهْوَاءَ كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ، وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ تُجَارَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ، كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ بِصَاحِبِهِ، لَا يَبْقَى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ وَاللهِ يَا مَعْشَرَ الْعَرَبِ لَئِنْ لَمْ تَقُومُوا بِمَا جَاءَ بِهِ نَبِيُّكُمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَغَيْرُكُمْ مِنَ النَّاسِ أَحْرَى أَلَّا يَقُومَ بِهِ (مسند احمد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے دو کتابوں والوں اپنے دین میں تفرقہ کر کے بہتر گروہ بن گئے اور اس میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے خواہشات نفسانی اور خوش فہمی میں ہوں گے بلکہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کی رگ رگ میں نفسانی خواہشیں اس طرح گھس جائیں گی جس طرح کتے کے کاٹے ہوئے انسان

کی ایک ایک رگ اور ایک ایک جوڑ میں اس کا اثر پہنچ جاتا ہے اے عرب کے لوگو! اگر تم ہی اپنے نبی کی لائی ہوئی چیز پر قائم نہ رہو گے تو اور لوگ تو بہت دور ہو جائیں گے۔

ابن جریر رحمہ اللہ ابن ربیع رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں کہ امت محمدیہ تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔ (تفسیر در منثور) حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں کہ ان کی طرح تم نہ ہو جانا، جنہوں نے اختلاف کیا اور فرقوں میں بٹ گئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِفْتَرَقَتِ الْيَهُوْدُ عَلَى إِحْدَى وَسَبعِينَ فِرقَةً وَّتَفَرَّقَتِ النَّصَارَى عَلَى إِثنَتَينِ وَسبعِينَ فِرقَةً وَّتَفتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَّسَبعِينَ فِرقَةً (ابو داؤد، ترمذی، حاکم) یہودی اکہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، نصاریٰ بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

مسند احمد اور ابو داؤد کی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ والی روایت میں یہاں تک فرمایا کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی، سب کے سب جہنم میں جائیں گے، سوائے ایک کے، وہ ایک وہ ہو گا جو جماعت ہو گا۔ ایک روایت میں یہاں تک فرمایا کہ سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک کے اور وہ وہ ہو گا جو میری اور میری جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کرے گا۔

اس فرمان گرامی کی طرح ہر شخص دیکھ اور سن سکتا ہے کہ آیا وہ اپنی خواہشات کا غلام بنا ہوا ہے یا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کر رہا ہے، چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایمان وہدایت کی کسوٹی قرار دیا گیا ہے، جو ان کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے گا یقیناً کامیابی کی کلید اسی کو حاصل ہو گی، جو بدعات، خرافات، رواجات کا پیروکار رہے گا وہ کبھی بھی اپنے کو سرخرو نہ خیال کرے۔

وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ: آیت کے اس جملے پر غور کرتے ہوئے انسانی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ ان لوگوں کے لیے وعید شدید ہے جنہوں نے دین میں تفرقہ بازی کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بالشت بھر جس نے جماعت میں تفرقہ ڈالا اس کے بارے میں شدید الفاظ استعمال فرماتے ہوئے

فرمایا کہ اس نے اسلام کا کڑا اپنی گردن سے نکال دیا۔ یہ ان لوگوں کے مقابلے میں سزا کے مستحق ہیں، عذاب عظیم کے سزاوار ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ کامیاب لوگ ہیں۔

سیاہ اور سفید چہرے والے

سوال ان آیات کریمہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ ترجمہ و تفسیر مطلوب ہے

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ {۱۰۶} وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ {۱۰۷} تِلْكَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ {۱۰۸} وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِلَى اللهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ {۱۰۹} آل عمران

جواب ترجمہ: جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ پڑ جائیں گے پھر جن کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے (ان سے کہا جائے گا) ایمان لا کر تم کافر ہو گئے بس اپنے کفر کی وجہ سے تم عذاب چکھو۔ اور جن کے چہرے سفید ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت میں جگہ پائیں گے اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی وہ آیتیں ہیں جو ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ذرا بھی ظلم نہیں چاہتا۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام کام لوٹائے جائیں گے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ: چہرے کی سفیدی اور سیاہی یہ دونوں الفاظ چہرے کی مسرت وبشاشت اور خوف و غم سے کنایہ ہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اہل حق کو سفید چہرے سے موسوم کیا جاتا ہے، کتابی چہرے سے موسوم کیا جاتا ہے، چہرے کی روشنی سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ ان کے سامنے نور چلتا ہو گا، جب کہ اہل باطل کو سیاہ چہرے والے کہا جاتا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ: یہاں سیاہ چہرے والے دوسرے گروہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ مقام ڈر اور خوف دلانے کا ہے، اس لیے انہیں کہا گیا کہ کیا تم لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے، اس میں واضح کیا گیا کہ تمام کفار دوزخ میں جائیں گے، امام حسن

بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ منافقین ہوں گے، بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ اہل بدعت اور خواہشات کے بندے ہوں گے۔ حضرت یونس بن مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس آیت کے بارے میں حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے پوچھا تو فرمانے لگے کہ اگر میں اس آیت کی تفسیر کروں تو تین دن تک اس سے باہر نہیں نکل پاؤں گا، لیکن میں تمہیں مختصراً عرض کروں کہ یہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ تھے جو انبیاء کرام علیہم السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تو ان پر ایمان رکھتے تھے، جب انہیں نبی بنا کر بھیجا گیا تو ان لوگوں نے ان کا انکار کر دیا۔ (ثعلبی، العجاب فی بیان الاسباب)

فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ: جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا یہ لوگ اللہ کے ہاں سخت معتوب و مغضوب ہوں گے، انہیں جہنم کا سخت عذاب دیا جائے گا، یہ لوگ سخت ذلت سے دوچار ہوں گے، انہیں کہا جائے گا کہ تم لوگ سخت عذاب چکھو اس لیے کہ تم لوگ کفر کرتے تھے، یہاں تکفرون کا صیغہ استعمال کیا گیا جو اس بات کی طرف اشارہ دے رہا ہے کہ یہ لوگ جو اس عذاب میں داخل کیے جائیں گے ان کا کفر یہ عمل استمرار اور تسلسل کے ساتھ جاری رہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن کچھ لوگ میری امت کے میرے حوض پر آئیں گے، انہیں میرے حوض سے دھکیلا جائے گا، میں کہوں گا کہ اے میرے رب یہ تو میرے ساتھی ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا بدعات کی تھیں، یہ لوگ تو اپنی ایڑیوں پر پلٹ گئے تھے، یعنی مرتد ہو گئے تھے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ: ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ اہل سنت والجماعت کے منہ سفید اور نورانی ہوں گے مگر اہل بدعت و منافقت کے کالے ہوں گے، حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ کالے منہ والے منافق ہوں گے جن سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان کے بعد کفر کیوں کیا اب اس کا مزہ چکھو اور سفید منہ والے اللہ رحیم و کریم کی رحمت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (ابن کثیر) یہاں رحمت اللہ سے مراد جنت ہے، رحمت کو جنت سے کیوں تعبیر کیا؟ اس بات سے خبردار کرنے کے لیے کہ مومن اگر ساری زندگی اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزار دے تو وہ

اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جاسکتے سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل ہر گز جنت میں نہیں داخل کرے گا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و فضل کی چادر میں ڈھانپ رکھا ہے۔ (بخاری و مسلم)

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ: ایسے لوگ ہمیشہ جنت میں رہیں گے، جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے، وہاں سے کہیں نہیں جائیں گے اور نہ انہیں موت آئے گی، یہ کسی مسلمان کے لیے کس قدر خوشخبری ہے، جو اس دنیا میں کسی نہ کسی درجے میں پریشانیوں میں مبتلا رہا لیکن اس کی زندگی ایسی کامیاب رہی کہ وہ ہمیشہ کی نعمتوں کا مستحق بن گیا۔

تِلْكَ آيَاتُ اللهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ: یہ آیات جن میں کہیں جنت کی خوشخبریاں سنائی جاتی ہیں، جن میں جنت کی لطف اندوزی بیان کی جاتی ہے، جن میں دوزخ سے ڈرایا جاتا ہے، وعیدیں سنائی جاتی ہیں، یہ آیات ہم آپ کو تھوڑی تھوڑی کرکے سناتے چلے جاتے ہیں، یہ آیات ہم نازل کرتے چلے جاتے ہیں، یہ آیات برحق ہیں، ان میں کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔

وَمَا اللهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ: حقیقی معنیٰ میں ظلم تو وہاں ممکن ہی نہیں لیکن ظاہری طور پر جسے تم ظلم کہہ سکتے ہو، اس کا صدور بھی خدا تعالیٰ سے نہیں ہوتا، مثلاً ایسے سخت احکام بندوں کو بھیجے جن سے غرض محض ستانا اور دق کرنا ہو، یا مستحق رحمت پر عذاب کرنے لگے یا تھوڑی سزا کی جگہ زائد سزا جاری کردے، یا کسی کی ادنیٰ ترین نیکی کا صلہ نہ دے وغیر ذلک، خوب سمجھ لو، اس کا جو حکم ہے خالص بندوں کی تربیت کے لیے اور جو معاملہ کسی کے ساتھ ہے عین حکمت و مصلحت کے موافق ہے۔ (عثمانی) یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بغیر گناہ کے عذاب نہیں دے گا۔ (بحر العلوم) اللہ تعالیٰ کے لیے ظلم کرنا محال ہے، وہ علی الاطلاق مالک ہے، اس میں کافروں پر تعریض ہے کہ ظلم کرنے والے یہی کافر لوگ ہیں، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے، اللہ ہی اس کا مالک ہے، اللہ ہی متصرف الامور ہے، ساری کائنات اس کی مٹھی میں ہے، ملکیت اسی کی ہے، اختیارات اسی کے ہیں۔

وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ: سارے معاملات واُمور اللہ کے سامنے پیش کیے جائیں گے، اچھے امور انجام دینے والوں کو ان کے عمل خیر کے بدلے میں بہترین جزا دے گا، برے عمل بجالانے والوں کو ان کے کیے پر سزا دے گا۔

امت محمدیہ بہترین امت ہے؟

سوال بتایئے اس آیت میں امتِ حضرت محمد ﷺ کو بہترین اُمت کیوں قرار دیا گیا ہے؟

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ {۱۱۰} آل عمران.

جواب ترجمہ: (مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں (لیکن تھوڑے) اور اکثر نافرمان ہیں۔

شان نزول: عکرمہ رحمہ اللہ اور مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، اس کا شان نزول یہ ہے کہ مالک بن الضیف اور وھب بن یہوذا دو یہودیوں نے ان سے کہا کہ ہمارا دین اس دین سے بہتر ہے جس کی تم دعوت دیتے ہو نیز ہم تم سے بہتر اور افضل ہیں اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

آیت کا مصداق: علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز تفسیر الدر المنثور میں مختلف روایات جمع کی ہیں، جن میں کچھ سے پتا چلتا ہے کہ بہترین امت سے مراد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، بعض روایات کے مطابق خیر امت سے مراد بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تخصیص ہے، بعض روایات کے

مطابق نیکی کی دعوت دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر ایمان رکھنے والے خیر امت کا مصداق ہیں، بعض روایات کے مطابق خیر امت سے مراد اہل بیت رضی اللہ عنہم ہیں۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خَيْرَ النَّاسِ لِلنَّاسِ تَأْتُونَ بِهِمْ فِي السَّلاَسِلِ فِي أَعْنَاقِهِمْ، حَتَّى يَدْخُلُوا فِي الإِسْلاَمِ، تم اوروں کے حق میں بہتر ہو، تم زنجیروں میں جکڑ کر لوگوں کو لاتے ہو، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (بخاری کتاب التفسیر)

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ: اس امت میں اللہ نے بے شمار خوبیاں رکھی ہیں، جن کے باعث اسے بہترین امت کہا گیا، لیکن سورۃ آل عمران کی اس آیت میں امت محمدیہ کی ان عظیم خوبیوں کا واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے، جن کے باعث اسے بہترین امت قرار دیا گیا ہے، تمام مفسرین کرام کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہترین امت پیدا کی گئی ہو، یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم بہترین امت ہو لوگوں کے نفع کے لیے نکالے گئے ہو، اگر کان ناقصہ مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم لوگ اللہ کے علم میں بہترین تھے، یا مطلب یہ ہے کہ تم بہترین امت ہو گئے، جو لوگوں کے فائدے کے لیے نکالے گئے ہو۔

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانوں کے گروہ! جو اسلامی تعلیمات، اسلامی آداب و سنن، اور اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہو، تم بہترین امت پائی گئی ہو جو لوگوں کے لیے نکالی اور ظاہر کی گئی ہو، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی کی خاطر، کلمہ باطل کو نیست و نابود کرنے کے لیے، زمین میں اصلاح و نفع کو پھیلانے کے لیے۔ (الوسیط)

حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو عطا نہیں کی گئیں، ① رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی۔ ② مجھے زمین کی چابیاں دی گئیں۔ ③ میرا نام احمد رکھا گیا۔ ④ میرے لیے زمین پاک بنائی گئی۔ ⑤ میری امت کو خیر الامم بنایا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! جسے یہ بات اچھی لگتی ہو کہ وہ اس امت میں سے ہو تو اسے چاہیے کہ یہ شرط پوری کرے، انہوں نے اس طرف اشارہ کیا کہ نیکی کی دعوت دے، برائی سے روکے اور اللہ پر ایمان رکھے۔

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ: یہاں امت کی وہ خوبیاں اور کمالات بیان کیے گئے ہیں جس کی بدولت اسے خیر امت یعنی بہترین امت ہونے کا اعزاز حاصل ہے، یہاں تین باتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ تم لوگ نیکی کا حکم کرتے ہو، دوسری یہ کہ تم لوگ برائی سے روکتے ہو، تیسری بات یہ کہ تم لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ ابن ابی زمنین مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم نیکی کا حکم کرتے ہو سے مراد توحید ربانی کی دعوت دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو سے مراد اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کو منع کرتے ہو۔ (تفسیر القرآن) نیکی کی دعوت اور برائی سے منع کرنے نے امت اسلامیہ کو امتوں میں بہترین اور افضل بنا دیا ہے۔ (اوضح التفاسیر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلی امتوں کی کمزوری و نقص بیان کرتے ہوئے فرمایا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِنَّ أَوَّلَ مَا دَخَلَ النَّقْصُ عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ، كَانَ الرَّجُلُ يَلْقَى الرَّجُلَ، فَيَقُولُ: يَا هَذَا، اتَّقِ اللهَ وَدَعْ مَا تَصْنَعُ، فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ لَكَ، ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ، فَلَا يَمْنَعُهُ ذَلِكَ أَنْ يَكُونَ أَكِيلَهُ وَشَرِيبَهُ وَقَعِيدَهُ، فَلَمَّا فَعَلُوا ذَالِكَ ضَرَبَ اللهُ قُلُوبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ، ثُمَّ قَالَ: {لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ} إِلَى قَوْلِهِ {فَاسِقُونَ} [المائدة: ٨١]، ثُمَّ قَالَ: كَلَّا وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَلَتَأْخُذُنَّ عَلَى يَدَيِ الظَّالِمِ، وَلَتَأْطُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا، وَلَتَقْصُرُنَّهُ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا (ابو داؤد)

پہلی خرابی جو بنی اسرائیل میں داخل ہوئی وہ یہ تھی کہ ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا کہ اے شخص اللہ سے ڈر اور جو کچھ تو کرتا ہے اس کو چھوڑ دے اس لیے کہ وہ تیرے لیے حلال نہیں ہے، پھر جب اس سے دوسرے روز ملتا تو اسے منع نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اس کے ساتھ کھاتا پیتا تھا، اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، جب انہوں نے اس طرح کیا تو اللہ نے بھی ان کو ایک دوسرے کے دل سے ملا دیا، پھر فرمایا کہ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت کئے گئے آخر آیت فاسقون تک تلاوت کی۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی قسم تم لوگ ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو گے اور تم ضرور ظالم کے

دونوں ہاتھوں کو پکڑ لو گے اور اسے حق کی طرف مائل کرو گے اور تم اسے حق پر روکے رکھو گے، جیسا کہ حق پر روکنے کا حق ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی روایت میں کچھ الفاظ زائد ہیں، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرنے والوں کے لیے سخت وعید فرمائی گئی ہے، ارشاد ہے أَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللهُ بِقُلُوبِ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ، ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ اللہ تم میں سے بعض کے دلوں کو بعض کے دلوں سے ملا دے گا، پھر تم پر بھی لعنت کرے گا جیسے ان پر لعنت کی ہے۔ (ابو داؤد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلَى يَدَيْهِ، أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللهُ بِعِقَابٍ بیشک جو لوگ ظالم کو (ظلم کرتا) دیکھیں اور اس کے ہاتھ کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر ڈالے گا۔ (ابو داؤد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مَا مِنْ قَوْمٍ يُعْمَلُ فِيهِمْ بِالْمَعَاصِي، ثُمَّ يَقْدِرُونَ عَلَى أَنْ يُغَيِّرُوا، ثُمَّ لَا يُغَيِّرُوا، إِلَّا يُوشِكُ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ کوئی قوم ایسی نہیں کہ اس قوم میں گناہ کیے جاتے ہوں پھر وہ ان کو ختم کرنے کی طاقت ہونے کے باوجود انہیں ختم نہ کرے تو یہ بات قریب ہے کہ اللہ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔ (ابو داؤد) حضرت جریر رضی اللہ عنہ کی روایت میں تو یہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو گناہ کو ختم کرنے کی طاقت کے باوجود ختم نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اسے مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کرے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا نیکی کا حکم کرتے رہو اور ایک دوسرے کو برائی سے روکتے رہو یہاں تک کہ تم یہ دیکھو کہ کسی کنجوس آدمی کی اطاعت کی جاتی ہے اور خواہش نفسانی کی اتباع کی جاتی ہے اور دنیا کے پیچھے بھاگا جاتا ہے اور ہر صاحب رائے اپنی رائے کو پسند کر کے اس پر بیٹھا ہے تو پھر تمہارے ذمہ اپنے نفس کو لازم پکڑنا ہے اور عوام کو اپنی جانب سے چھوڑ دو کیونکہ تمہارے بعد ایسے دن آنے والے ہیں کہ جن میں صبر کرنا (دین پر) ایسا ہے کہ جیسے انگارہ کو پکڑنا، ان دنوں میں دین پر عمل کرنے والے کو پچاس عامل افراد کا اجر ملے گا جو اس جیسا عمل کرتے ہیں۔ (ابو داؤد)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تم لوگوں کو دیکھو کہ اپنے عہدوں کو توڑ رہے ہیں اور اپنی امانتداری کو چھوڑ دیں اور وہ ایسے ہو جائیں (اختلاف کرتے ہوئے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ملا دیا۔ عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا اور میں نے عرض کیا کہ اللہ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا کر دے میں اس وقت کیا کروں؟ فرمایا کہ اپنے گھر کو لازم پکڑو اور اپنی زبان کو قابو میں رکھو، جو بات (شرعی اعتبار سے) اچھی ہو اسے لے لو اور جسے غلط سمجھو اسے چھوڑ دو اور تم پر خاص اپنے نفس کی اصلاح ضروری ہے اور عوام کے معاملات کو چھوڑ دو۔ (ابو داؤد)

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم: اللہ تعالیٰ نے یہاں امت محمدیہ کو بہترین امت قرار دینے کے بعد اہل کتاب کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر یہ لوگ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا، یعنی ان کا ایمان لانا ان کی دنیا اور آخرت دونوں جہان کے لیے بہتر تھا، ان سے انہیں وہ خیر و بھلائی ملتی جس سے امت محمدیہ کو کامیابی ملی ہے، وہ ایمان نہیں لائے اس لیے یہ خیر و بھلائی ایمان نہ لانے کی وجہ سے انہیں حاصل نہ ہو سکی، ان لوگوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلے میں ترجیح دی۔

مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ: ان میں سے کچھ اہل ایمان ہیں سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔ اہل کتاب کی ایک بہت تھوڑی سی تعداد نے ایمان قبول کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کیا اور اس پر ایمان لائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام ربانی لے کر آئے ان لوگوں نے اس کی تصدیق کی، لیکن ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کافر ہیں اور تمہارے خلاف سازشیں کرنے والے ہیں۔

یہود کی ذلت اور مسکنت کی وجہ قتل انبیاء علیہم السلام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَن يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِن يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنصَرُونَ{۱۱۱} ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ{۱۱۲} آل عمران

جواب ترجمہ: وہ تم کو تھوڑا بہت ستانے کے سوا ہر گز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر وہ تم سے لڑیں گے تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ رسوائی ان کے سر تھوپ دی گئی خواہ وہ کہیں بھی پائے جائیں سوائے اللہ کی رسی کے سہارے اور لوگوں کی رسی کے سہارے اور وہ غضب کے مستحق ہو چکے اور پستی ان کے سر مڑھ دی گئی اس لیے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے رہتے تھے۔

شان نزول: مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہود کے سردار کعب، بحری، نعمان، ابورافع اور ابو یاسر اور ابن صوریا اپنے میں سے ایمان لانے والے عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کے پاس گئے اور ان کے اسلام لانے کی وجہ سے انہیں تکلیف دینے لگے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ: زمانہ نبوت میں یہودیوں کی دشمنی ظاہراً بھی تھی اور پوشیدہ بھی تھی مسلمانوں کو ان سے تکلیف پہنچتی رہتی تھی، خطرہ تھا کہ کوئی ایسی کارروائی نہ کر بیٹھیں جس سے زیادہ تکلیف پہنچ جائے۔ بلکہ رؤسا یہود نے حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان عوام کو جو یہودیت چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ زبانی طور پر ایذا دینے کا سلسلہ شروع بھی کر دیا تھا۔ اللہ جل شانہٗ نے مسلمانوں کے اس خطرہ کو دور فرما دیا۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ تمہیں بس ذرا سی تکلیف پہنچا سکیں گے اور اگر انہوں نے جنگ چھیڑی تو پشت پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ (انوار البیان)

تھوڑے ضرر سے مراد طعن و تشنیع ہے، دھمکیاں اور گیدڑ بھبھکیاں ہیں، یہ زبانوں سے تمہیں ایذا پہنچا سکتے ہیں۔ یہاں پیٹھ پھیر کر بھاگنے سے مراد شکست و ہزیمت ہے، یہاں جو فرمایا کہ پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے مقابلے میں ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا، یہاں تمہاری گرفت ان سے ہٹانے والا کوئی نہیں ہو گا، یہ آیت ہمارے نبی کریم ﷺ کی رسالت و نبوت

پر واضح دلالت ہے، کیونکہ یہ اخبار غیبیہ میں سے ہے، جو واقعہ کے مطابق ہے، کیونکہ یہود بنو قینقاع اور بنو قریظہ مسلمانوں سے لڑے تو میدان میں نہیں ٹھہر سکے تھے، انہیں کچھ حاصل نہ ہو سکا اور نہ ہی سرداری ان کے پاس رہی۔

اذی کا معنی دکھ اور تکلیف ہے ، اس آیت میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں کا ذکر ہے، نبی کریم ﷺ نے ابتداء ان کے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تھے وہ ان کی عہد شکنیوں اور شرارتوں کی وجہ سے ختم کر دیئے گئے اور بعد میں یہ اپنی ریشہ دوانیوں اور جرائم کی سزا میں قتل کر دیئے گئے یا جلاوطن کر دیئے گئے اور دوسرے قبائل سے جو انہوں نے معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آگئے اور دوسرے قبائل سے جو انہوں نے معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آگئے، سو وہ معاہدے بھی عملاً بے اثر ہو کر رہ گئے اور جس درخت کی تمام جڑیں کٹ چکی ہوں وہ محض تنے کے سہارے کب تک کھڑا رہ سکتا ہے، اس آیت میں مدینہ کے یہودیوں کی اسی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اب ان کی جڑ کٹ چکی ہے اور ان کے اندر اتنی قوت نہیں رہی کہ وہ تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے تم کو اپنی زبانوں سے کچھ دکھ اور تکلیف پہنچائیں، مسلمانوں کو طعن و تشنیع کریں ان کے خلاف افترا پردازی اور تہمت تراشی کریں یا کلمات کفریہ کہیں مثلاً یہ کہ عزیر ابن اللہ ہیں، یا توراۃ کی عبارات میں تحریف کریں، یا کمزور مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک اور شبہات ڈالیں، اس سے زیادہ مسلمانوں کو کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچانے کی سکت اب ان میں نہیں رہی اور بالفرض یہ اگر کسی مقابلہ میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلے تو پیٹھ دکھائیں گے اور ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ کسی طرف سے بھی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ (تبیان)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ: ان یہودیوں پر ذلت کی مہر لگا دی گئی ہے یعنی ان کی جان، اہل و عیال اور مال کو مباح کر دیا گیا ہے۔ (مظہری) یہودیوں پر ذلت لازم کر دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل کیا ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

قرآن کریم میں کافروں کے لیے اعلان ہے کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، انہیں بڑے عذاب سے دوچار کیا جائے گا، مشرکین کے لیے واضح فرمان ہے ان کی بخشش نہیں ہو گی، یہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، انہیں ذلت آمیز عذاب دیا جائے گا، منافقین کے بارے میں فرمایا گیا کہ یہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں داخل کیے جائیں گے، انہیں دردناک عذاب سے دوچار کیا جائے گا، لیکن جس طرح کی ذلت اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی قرآن کریم میں بیان کی ہے کسی اور کی نہیں کی، ان کے لیے فرمایا کہ ان پر ذلت مسلط کر دی گئی ہے، یہ جہاں شکنجے میں آجائیں انہیں پکڑا جائے اور انہیں سزا دی جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کی ہے، انہوں نے من پسند باتیں کلام ربانی میں ملا کر لوگوں کو کہا کہ یہ کلام اللہ شریف ہے، وہ ہاتھوں سے لکھ کر لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے کہ یہ آسمانی کلام ہے، وہ سر تاپا بے شمار برائیوں میں ملوث تھے، جب سے انہوں نے شنیع و قبیح حرکات کا ارتکاب کیا تب سے اللہ تعالیٰ نے ذلت و رسوائی ان کا مقدر کر دی تھی، قرآن کریم میں جگہ جگہ یہودیوں اور ان کی بری حرکات و نافرمانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مفسر قرآن صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ان کی رسوائی کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی سیاسی عروج اور اقتدار سے محروم کر دیے گئے ہیں، گزشتہ اڑھائی ہزار سالہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں ان کو اقتدار حاصل نہیں ہوا، اس سے پہلے ان کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں، مگر اب اس سے محروم ہیں اور محکومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں أَيْنَ مَا ثُقِفُوا کا یہی مطلب ہے کہ یہ لوگ جہاں کہیں بھی ہیں ذلیل و خوار ہو کر ہی گزر اوقات کر رہے ہیں، یہودیوں کی ذلت کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ عزت نفس سے محروم رہے ہیں، کروڑ پتی ہونے کے باوجود بھکاریوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں، مال سے محبت، ہر کام میں سازش اور ہر قوم سے مکاری اور چالاکی ان کی خصوصیت رہی ہے، ان کو کہیں بھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، ایک جگہ شرارت کی تو دوسری جگہ چلے گئے وہاں سازش کی تو وہاں سے نکالے گئے، گزشتہ تاریخ سے واضح ہے کہ دنیا کی کوئی قوم انہیں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی، کچھ عرصہ پہلے نصاریٰ سے بھی ان کی ایسی ہی اَن بن تھی، جیسے مسلمانوں کے ساتھ، یہودی کبھی عیسائیوں کے ماتحت رہے، کبھی

مسلمانوں کے اور کبھی دیگر اقوام کے دست نگر رہے۔ (معالم العرفان)

أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ: یہ جہاں بھی پائے جائیں ان پر ذلت اور رسوائی مسلط ہو گی إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ ہاں! اگر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں تو رسوائی سے بچ جائیں گے، بعض مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رسی سے مراد توراۃ کی وہ بچی کچھی رسمیں ہیں جن پر یہ لوگ عمل کرتے ہیں، گویا توراۃ سے کسی حد تک وابستگی کی بنیاد پر یہ دنیا میں جیسی زندگی گزار رہے ہیں، اگر اتنا بھی نہ ہوتا تو یہ لوگ صفحہ ہستی سے مکمل طور پر مٹ چکے ہوتے، بعض دوسرے مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی رسی سے مراد اللہ کا عہد و پیمان ہے، لہٰذا اگر یہ ایمان قبول کر لیں، تو عزت کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ (معالم العرفان)

وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ: یہودیوں کے لیے دنیا میں رسوائی سے بچنے کی دوسری صورت وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کی ماتحتی میں رہنا قبول کر لیں، تو پھر بھی ذلت سے بچ جائیں گے، بعض مفسرین نے حَبْلٍ مِنَ اللّٰهِ کا ترجمہ اللہ کی دستاویز اور حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ کا ترجمہ لوگوں کی دستاویز کیا ہے، مقصد ایک ہی ہے کہ یا توراۃ سے کسی حد تک لگاؤ کی وجہ سے یا پھر دوسری اقوام کے ساتھ عہد و پیمان کر کے گزر اوقات کر سکیں گے، دوسرے لوگوں کی ماتحتی قبول کرنا ہو گی اور ان کی رعیت بن کے رہنا پڑے گا۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہ اللہ یہی تفسیر کرتے ہیں۔ بعض مفسرین رحمہم اللہ نے حبل کا معنی ذمہ کیا ہے، یعنی اللہ کا ذمہ اور مسلمانوں کا ذمہ، اگر اللہ تعالیٰ ان کو اپنی امان میں لے لیں یا مسلمان ان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائیں تو ذلت سے بچ سکیں گے۔ بعض مفسرین رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ناس سے مراد عام لوگ ہیں، اگر کوئی دوسری قوم بھی ان کی پشت پناہی کرنے لگے، تو یہ رسوائی سے بچے رہیں گے۔ (معالم العرفان)

وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ: اور اللہ کے غضب کے سزاوار ہو کر اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹیں گے یعنی مریں گے یا مرنے کے بعد زندہ ہوں گے۔ (مظہری)

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ: مسکینی یعنی کنجوسی اور حرص کا احاطہ ان پر کر دیا گیا جیسے نصب کردہ ڈیرہ خیمہ اپنے اندر رہنے والوں کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے، کنجوس آدمی مال خرچ نہیں کرتا ہمیشہ

مسکینوں کے حلیہ سے رہتا ہے اور حریص ہمیشہ کمائی کی کوشش اور مشقت میں لگا رہتا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہودی بیشتر فقراء اور مساکین ہوتے ہیں۔ (بیضاوی، مظہری)

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ: یہودی مغضوب کیوں ہیں؟ یہودی پھٹکارے ہوئے کیوں ہیں؟ یہودیوں پر اللہ کیوں غصے میں ہیں؟ یہودیوں پر مسکنت کیوں ڈال دی گئی، اس کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، یہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں، یہ قرآن کریم کا انکار کرتے ہیں، وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بلاوجہ قتل کرتے ہیں، حضور ﷺ کے زمانے کے یہودیوں نے اگرچہ انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل نہیں کیا، لیکن ان کے آباؤ واجداد نے چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کیا، یہ اس پر خوش ہیں کہ ان کے بڑوں نے یہ سیاہ کارنامے سرانجام دیے ہیں، تو گویا انہی نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا ہے، ان کے قتل کی کوئی وجہ بھی نہیں پھر بھی بے شمار نبی ان ظالموں کی شمشیروں کی دھار سے شہادت کا جام پی گئے اور بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام ان کے مظالم کی بھینٹ چڑھ گئے، ان کے عقائد و نظریات کی روشنی میں بھی انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کرنا جائز نہیں تھا، مگر انہوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات کے برخلاف ایسا کیا، ان کے جرائم و قبائح کی فہرست بہت طویل ہے، ان کی تاریخ سیاہ کاریوں سے لبریز ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ: اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غصے کی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ انہوں نے نافرمانی کی، صرف نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے وہ حدود پھلانگی ہیں جن کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے روکا تھا، یہ کسی ممانعت کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے، شر انگیزیوں کی انتہاء کرتے رہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں واضح اعلان فرمایا کہ ان پر ذلت و مسکنت پھینک دی گئی ہے، مگر دیکھنے میں آرہا ہے کہ اسرائیل میں یہودی آئے اور انہوں نے اپنی حکومت قائم کی، پھر پورے علاقے پر ان کی دھاک بیٹھ گئی، ساری دنیا کو انہوں نے یرغمال بنا رکھا ہے، کیا عیسائی اور کیا مسلمان حکمران سبھی ان سے سہمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ذلت و مسکنت والے تو ایسا نہیں کرسکتے؟

جواب اس کا ایک جواب یہ ہے کہ درحقیقت قرآن کے اعلان میں کوئی بات قابل شک وشبہ نہیں ہے کیونکہ اول تو قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ ہمیشہ ہمیش تا قیامت ان لوگوں کا یہی حال رہے گا۔ دوام ذلت تو کسی آیت یا حدیث سے ثابت نہیں، پھر یہودیوں کی جو حکومت قائم ہے وہ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کی وجہ سے ہے، یہودیوں سے کچھ معاہدے کر کے بعض نصرانی حکومتوں نے ان کی حکومت قائم کی ہے اور نصاریٰ ہی کے بل بوتے اور سہارے پر ان کی حکومت قائم ہے قرآن کریم نے جو حبل من الناس فرمایا ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ان کے بعض حالات انسانوں سے جوڑ توڑ رکھنے کی وجہ سے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جن میں ان کو کچھ عزت مل جائے اور ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کا اطلاق عام مستثنیٰ ہو جائے۔ (انوار البیان)

② یہودیوں پر اس طرح ذلت لازم کر دی گئی ہے کہ وہ کرہ ارض پر ہر خطہ میں ذلیل وخوار ہیں اور اپنے زور بازو سے انہیں کہیں پر بھی غلبہ حاصل نہیں ہے، ماسوا اس کے کہ کہیں مسلمانوں نے ان کو امان دے دی اور کہیں غیر مسلموں نے ان کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا، اس زمانہ میں انگلینڈ، امریکہ اور روس نے باہمی اشتراک سے فلسطین میں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی ہے اور آج کل امریکہ ان کا پشت پناہ ہے، یہ صرف اپنی انفرادی قوت سے کہیں حکومت قائم نہیں کر سکے، ان کا ایٹمی قوت بننا بھی امریکی مدد کی وجہ سے ہے۔ (تبیان القرآن)

③ یہود کا وجود اہل دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ ہے، انسانی اسٹیج پر بے شمار قومیں نمودار ہوئیں جو عروج وزوال کے مختلف ادوار سے گزریں اور بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئیں، آج تاریخ میں سوائے ان کے ذکر کے کوئی چیز بھی باقی نہیں ہے، لیکن یہ واحد قوم ہے جو ہزاروں سال سے دنیا کے سٹیج پر زندہ ہے، اس نے زوال کا شکار ہونے کے بعد کبھی عروج کا منہ نہیں دیکھا، ایک عظیم منصب سے معزول کیے جانے کے بعد دنیا کی نگاہوں میں بھی کبھی اسے عزت نہیں مل سکی، اللہ نے شاید اس کو اسی لیے زندہ رکھا ہے تاکہ انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ جو قوم اللہ کی ناشکر گزاری کے جرم میں ماخوذ ہوتی ہے اس کے طور اطوار کیا ہوتے ہیں اور وہ کن حوادث کا شکار ہوتی ہے۔ (روح القرآن)

④ کشاف کی تفسیر کے مطابق استثناء کو متصل قرار دے کر معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہود پر ذلت و

خواری لگی ہی رہے گی، مگر صرف دو صورتوں میں وہ اس ذلت سے بچ سکتے ہیں، ایک اللہ کا عہد مثلاً نابالغ بچہ یا عورت ہونے کی بناء پر بحکم خداوندی وہ قتل وغیرہ سے مامون ہیں، دوسرے بحبل من الناس یعنی لوگوں سے معاہدہ صلح کی بناء پر ان کی ذلت وخواری کا ظہور نہ ہو، اس جگہ الفاظ قرآن بحبل من الناس ہیں، جو مومنین وکافر سب کو شامل ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے معاہدہ صلح کر کے بے فکر ہو جائیں گے اور یہ بھی محتمل ہے کہ دوسری غیر مسلم طاقتوں سے معاہدہ صلح کر کے محفوظ ہو جائیں، جیسا کہ حکومت اسرائیل کی موجودہ صورت ہے کہ کسی صاحب بصیرت پر مخفی نہیں کہ اسرائیل کی حکومت درحقیقت اہل یورپ کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ نہیں، اس کی جو کچھ قوت نظر آتی ہے وہ سب غیروں کے بل بوتہ پر ہے اگر امریکہ، برطانیہ، روس وغیرہ آج اس پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیں تو وہ ایک دن اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ (کشاف۔ معارف القرآن للمفتی)

اہل کتاب کے صالحین

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَيْسُوا سَوَاءً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُونَ آيَاتِ اللهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ {۱۱۳} يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ {۱۱۴} وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوهُ وَاللهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ {۱۱۵} آل عمران

جواب ترجمہ: یہ لوگ سب برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق پر قائم ہے رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور امر بالمعروف کرتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔ اور یہ لوگ جو بھی کچھ خیر کا کام کریں گے تو اس کی ناقدری نہ کی جائے گی اور اللہ متقیوں کو جاننے والا ہے۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جب عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعیہ اَسید بن سعیہ اور اسد بن عبید اور یہود کے کچھ دوسرے لوگ ایمان لائے تو یہود کے احبار نے کہا کہ محمد پر تو صرف ہمارے برے لوگ ایمان لائے، وَلَوْ كَانُوا مِنْ أَخْيَارِنَا لَمَا تَرَكُوا دِينَ آبَائِهِمْ یہ لوگ اگر ہمارے اچھے آدمیوں سے ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کا دین ہرگز ترک نہ کرتے، ان احبار نے ان سے کہا کہ لَقَدْ خَسِرْتُمْ حِينَ اسْتَبْدَلْتُمْ بِدِينِكُمْ دِينًا غَيْرَهُ تم اپنا دین دوسرے دین سے بدل کر خسارے میں رہے ہو، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی لَيْسُوا سَوَاءً ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ آیت نماز عتمہ کے بارے میں نازل ہوئی جسے صرف مسلمان ہی پڑھتے تھے ان کے سوا دوسرے اہل کتاب یہ نماز نہ پڑھتے تھے۔ (اسباب النزول)

② ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات عشاء کی نماز مؤخر کر دی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی طرف نکلے دیکھا تو لوگ نماز کی انتظار میں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِ الْأَدْيَانِ أَحَدٌ يَذْكُرُ اللَّهَ فِي هَذِهِ السَّاعَةِ غَيْرُكُمْ تمہارے سوا اور کسی دین کے پیرو اس گھڑی اللہ کے ذکر میں مصروف نہیں ہیں راوی کا کہنا ہے کہ اس پر یہ آیات لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ سے وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ تک نازل ہوئیں۔ (اسباب النزول)

③ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے رُکے رہے، اس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی رشتہ دار کے ہاں تھے، یا کسی زوجہ کے ہاں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز کے لیے تشریف لائے، یہاں تک کہ تہائی رات گزر گئی، تب وہ تشریف لائے، ہم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا تھا اور کوئی لیٹا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خوش خبری سنائی اور فرمایا کہ إِنَّهُ لَا يُصَلِّي هَذِهِ الصَّلَاةَ أَحَدٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اہل کتاب میں سے کوئی شخص یہ نماز نہیں پڑھتا، اس پر یہ آیت لَيْسُوا سَوَاءً نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

④ حضرت عطاء رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت نجران عرب کے چالیس (۴۰)، حبشہ کے بتیس (۳۲) روم کے آٹھ (۹) لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ لوگ دین عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی، ہجرت سے پہلے

انصار میں سے کچھ لوگ ان کے دوست بھی تھے، جیسے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ، براء بن معرور رضی اللہ عنہ، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ، صرمہ بن قیس رضی اللہ عنہ، یہ لوگ مؤحدین تھے، غسل جنابت کیا کرتے تھے، دین حنیفی میں سے جو کچھ جانتے تھے اس پر کھڑے تھے۔ (العجاب فی بیان الاسباب)

لَيْسُوا سَوَاءً: اہل کتاب میں یہود کس قدر بد نصیب تھے، اللہ تعالیٰ ان سے کس قدر ناراض ہیں کہ ان پر لعنت کی گئی، ان پر اللہ کا غضب ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے کتنی حلال چیزیں ان پر حرام کیں، ان کے علاوہ کچھ اہل کتاب قابل تعریف وستائش ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہاں وضاحت فرمائی ہے کہ سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں، سب برابر نہیں ہیں، کچھ ان میں اچھے، نیک، متقی، پرہیز گار اور صالح بھی ہیں، یہ آیت انہی خوبیوں والے، محاسن ومناقب والے اہل کتاب کے بارے میں وضاحت کر رہی ہے۔

مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ: اہل کتاب میں ایک جماعت ہے، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر قائم ہے، اہل کتاب میں سے ہی ایک گروہ ہے جو نماز میں کھڑا رہتا ہے، قائمۃ سے مراد ہے نماز میں کھڑا رہنے والا لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کہ اس سے مراد ہے ہدایت یافتہ اللہ کے امر پر قائم رہنے والا، مجاہد رحمہ اللہ نے کہا امت عادلہ مراد ہے یہ لفظ اس جگہ اقَمْتُ الْعُوْدَ سے ماخوذ ہے، میں نے لکڑی کو سیدھا کر دیا، سدی رحمہ اللہ نے کہا اللہ کی کتاب کا فرماں بردار اور ضوابط کا پابند گروہ مراد ہے۔ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ سے مراد ہیں حضرت عبد اللہ بن سلام اور آپ کے یہودی مسلمان۔ (مظہری، المقتطف)

وہ رات کی گھڑیوں میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، وہ سجدے کرتے ہیں سے مراد یہ ہے کہ وہ تہجد کی نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، یہاں شان نزول میں جس طرح بیان کیا گیا ہے اس میں عشاء کی نماز کی طرف اشارہ دیا گیا ہے، جب کہ اس سے مراد نماز تہجد ہے، کیونکہ یہاں سیاق کلام سے نماز تہجد مراد ہے نہ کہ نماز عشاء، کیونکہ ان لوگوں کا معمول یہی تھا کہ وہ قیام اللیل کرتے تھے، یعنی تہجد کی نماز پڑھتے تھے، علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے بھی یہاں تہجد کی نماز مراد لی ہے، جہاں تک عشاء کو تاخیر سے پڑھنے کا معاملہ ہے تو یہ ہمیشہ کی ترتیب نہیں تھی، ایک آدھ واقعہ ہے۔

یہاں تلاوت کا الگ ذکر ہے اور سجدہ کرنے کا الگ ذکر ہے، اس لیے کہ تلاوت نماز کی حالت میں قیام کی صورت میں ہوتی ہے، جب کہ سجدہ میں تلاوت نہیں کی جاتی، لیکن حالت نماز میں سجدہ کی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے، حدیث شریف میں یہاں تک آتا ہے کہ بندہ سب سے زیادہ اپنے رب کے قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا أَلَا إِنِّي نُهِيتُ أَن أَقرَأَ القُرآنَ رَاكِعاً أَو سَاجِداً فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ فَقُمِنَ أَن يُّستَجَابَ لَكُم، خبر دار! مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ میں رکوع یا سجدے کی حالت میں قرآن کریم پڑھوں، پس تم لوگ اس میں رب کی تعظیم کرو، رہے سجدے پس ان میں دعا کی کوشش کرو، پھر یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے قبول فرمائے، نماز کے جتنے ارکان ہیں ان کی اللہ کے ہاں بڑی اہمیت ہے، قرآن کریم میں ان سب ارکان کا اپنے اپنے مقام پر ذکر موجود ہے۔

يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: ان لوگوں کی دوسری صفت یہ بیان کی جارہی ہے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس ایمان لانے سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ تمام چیزیں جو نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں، ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ لوگ ان سب پر ایمان لائے۔ آخرت پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں نیک اعمال پر ثواب ملے گا، برے اعمال پر سزا ملے گی، نیک اعمال پر جنت ملے گی، برے اعمال پر دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ ان سب پر ایمان رکھتے تھے۔

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: ان لوگوں کی تیسری صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، ان لوگوں کی یہ صفت یہود کی مخالفت میں ہے کیونکہ وہ نیکی کی دعوت نہیں دیتے، برائی سے نہیں روکتے، بلکہ وہ اپنی گمراہی کے ساتھ لوگوں کو برائی کا حکم دیتے ہیں، نیکی سے روکتے ہیں، لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں۔ جن لوگوں کی صفات یہاں بیان کی جارہی ہیں وہ لوگ صرف اپنی ذات کو اعمال سے سجانے اور سنوارنے کی فکر نہیں کرتے کہ قرآن کریم کی تلاوت کر لی، وظائف پڑھ لیے، نمازیں ادا کر لیں، سجدہ ریزیاں کر لیں، ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر اکتفا کر لیا، بلکہ ان لوگوں کو یہ بھی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی

رشد وہدایت کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں، وہ توحید وسنت کی دعوت دیتے ہیں، نیکی کا حکم کرتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بہت ہی محبوب اور پسندیدہ ہے۔

وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ: ان لوگوں کی یہ چوتھی صفت ہے، یہ محاسن وخوبیوں کی جامع صفت ہے، ایسے اعمال بجالاتے ہیں جو انہیں اللہ تعالیٰ کا محبوب بنادیتے ہیں، وہ نیکیوں میں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں، مسارع کا معنیٰ ہے جلدی کرنے والا، نیکی کے کاموں میں وہ کسی تردد اور کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتے، کسی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتے، انہیں نیکیاں پھیلانے کا اشتیاق رہتا ہے، اسی شوق کی تکمیل کے لیے وہ سباق الاقدام دکھائی دیتے ہیں، نیکی کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں، خیر کے کاموں میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں، کسی شر سے خیر کی طرف پیش قدمی نہیں کرتے بلکہ ایک خیر سے دوسری خیر کی طرف، دوسری سے تیسری خیر کی طرف، یوں وہ آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی وہ صفات بیان کی ہیں جو یہودیوں میں نہیں تھیں، وہ حق سے انحراف کرتے تھے، رات کو رب کی بندگی بجا نہیں لاتے تھے، وہ شرک کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی صفات میں الحاد کرتے تھے، احتساب میں مداہنت سے کام لیتے تھے، نیکی کے کاموں میں سست روی کا شکار تھے، جب کہ یہ صاحبان ایمان نیکیوں میں پیش قدمی کرتے تھے۔

وَأُولٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ: یہاں أُولٰئِكَ کے ساتھ ان مذکورہ صفات والے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی حالت اچھی اور عمدہ ہے، یہ یہودیوں کی اس بات کا جواب دیا گیا ہے جو کہتے تھے کہ ہم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا، نبی ﷺ پر ایمان لائے وہ برے لوگ ہیں، انہیں بتایا گیا کہ ایسی صفات جمیلہ کے حاملین برے وشریر نہیں بلکہ صالح اور نیکوکار ہیں۔ یہاں اشارہ فرمادیا کہ جو اہل کتاب اپنے غلط خیالات، نظریات و افکار کو چھوڑ کر دین اسلام میں داخل ہوگئے وہ ان مذمتوں کے حقدار نہیں ہیں جن کے منکرین ومنحرفین یہودی ہیں، جن کی مذمت کی گئی، جن کے قبائح سے دنیا کو آگاہ کیا گیا ایمان لانے والے لوگ اس زمرے میں شامل نہیں ہیں، بلکہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ یہ صالحین ہیں۔

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ: وہ جو نیکی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی یعنی ہم نہ

اس نیکی کو گھٹائیں گے، نہ ثواب میں کمی کریں گے، جس طرح تکمیل ثواب کو شکر کہا گیا ہے اسی طرح ثواب سے محرومی یا ثواب کے نقصان کو ناشکری فرمایا۔ (مظہری) جن لوگوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں ان کے پچھلے نیک اعمال کسی صورت ضائع نہیں کیے جائیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے سابقہ تمام اعمال کا انہیں پورا پورا بدلہ عطا کریں گے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ: مذکورہ صفات کے حاملین کو بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کے نیک وصالح اعمال کو جانتے ہیں اور بہت ہی خوب جانتے ہیں، یہاں یہ بات بھی بتائی جارہی ہے کہ تقویٰ ہر خیر کی ابتدا اور بنیاد ہے، ہر نیک عمل کی ابتدا تقویٰ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کامیاب و کامران لوگ اہل تقویٰ ہی ہیں۔

کافر کو مال واولاد کام نہیں آئے گی

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیں کیا کافر کو مال واولاد کام آئے گی؟

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ {۱۱۶} مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ {۱۱۷} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے آگے ان کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور وہی لوگ دوزخ والے ہیں، اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ یہ لوگ دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سخت سردی والی تیز ہوا ہو جو ان لوگوں کی کھیتی کو جالگے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہو اور وہ اس کھیتی کو برباد کر دے۔ ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا: یہاں عام کافروں کا ذکر کیا جارہا ہے، کیونکہ وہ اپنے مال ودولت کی کثرت پر بہت گھمنڈ کرتے ہیں، وہ اپنی اولاد کی

کثرت پر بڑا ناز کرتے ہیں، ببانگ دہل کہتے ہیں کہ نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَّأَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ہمارے پاس مال واولاد کی کثرت ہے اور ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا، اسی گھمنڈ وغرور میں وہ نبی کریم ﷺ اوران کے غریب، فقیر اور مسکین پیروکاروں کو عار دلاتے ہیں کہ ہمارے پاس مال واولاد کی فراوانی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں فرمارہے ہیں کہ کافروں کا سب کچھ اکارت وبرباد ہو جائے گا، انہیں ان کے مال کام نہیں آئیں گے، انہیں ان کی اولادیں کام نہیں آئیں گی، جب اللہ تعالیٰ انہیں ان کی سیاکاریوں اور بدکاریوں کی سزا دیں گے تو یہ سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ یہاں شَيْئًا ذکر فرماکر ایک باریک اشارہ کر دیا کہ یہ چیزیں انہیں ذرّہ بھر کام نہیں آئیں گی، یہاں اغناء (کام آنا) سے مراد دفع کرنا اور دور کرنا ہے، یہاں مال اور اولاد کو خصوصیت سے اس لیے ذکر فرمایا کہ انسان بعض اوقات اپنے سے کسی سزا یا عذاب کو دور کرنے کے لیے مال خرچ کرتا ہے، بعض اوقات کسی مصیبت سے نجات پانے کے لیے اولاد کی مدد لیتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ قیامت کے دن کافروں کو یہ دونوں چیزیں کچھ بھی نفع دینے والی نہیں ہیں۔

وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ: کافروں کے لیے یہ بات واضح فرمادی گئی ہے کہ وہ جہنمی لوگ ہیں، جہنم میں تھوڑی سی مدت انہوں نے نہیں رہنا بلکہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی دھکتی اور خوفناک آگ میں انہیں رہنا ہے اور جلنا ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ: کافر لوگ جو کچھ بھی ڈھلتی دنیا کی زندگانی میں خرچ کرتے اور اُڑاتے ہیں، چاہے وہ فخر ومباہات کے لیے کرتے ہوں یا نیکی اور خیر سمجھ کر کرتے ہوں، اس کی مثال شدید ترین ٹھنڈی ہوا کی سی ہے۔

أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ: یہ ٹھنڈی اور یخ بستہ ہوا ان لوگوں کی کھیتیوں پر آن پڑے جنہوں نے گناہوں اور کفر کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے۔

فَأَهْلَكَتْهُ: وہ ان کے کفر ومعاصی کی سزا کی وجہ سے اسے ہلاک وبرباد کر دے۔ یہاں تشبیہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ اگر ان کا یہ مال لٹانا اور اُڑانا اسلام کی دشمنی کے لیے تھا تو پھر انہوں نے اس سے نفع نہ اٹھایا، کیونکہ اس کا وبال

اور عذاب انہی کو ملے گا، اگر ان کا یہ مال اُڑانا اور خرچ کرنا آخرت کے نفع کے لیے تھا تو کفر کی وجہ سے انہیں اس کا فائدہ نہیں ملے گا، کیونکہ کفر نفع اٹھانے کے راستے میں رکاوٹ ہے، معلوم ہوا کہ کفار کے تمام مصارف، خیراتی کام، صدقات ضائع ہوگئے، انہیں دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں کسی چیز نے فائدہ نہیں پہنچایا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ: ان کافروں کی کھیتی ضائع ہوگئی، تباہ و برباد ہوگئی، جو مال انہوں نے لگایا اور اڑایا وہ سب تباہ ہوگیا، اس کا الزام وہ اللہ پر نہیں دھر سکتے کہ اللہ نے ضائع کیا، بلکہ اپنی جانوں پر انہوں نے خود ظلم کیا وہ اس طرح کہ انہوں نے ایسے جرائم کا ارتکاب کیا جو سزا دلانے والے تھے، جو تباہی و بربادی لانے والے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان شرط اوّلین ہے چھوٹے سے چھوٹے عمل کی قبولیت کے لیے، ایمان نہیں تو بڑے سے بڑا عمل بھی ضائع ہو جائے گا۔

کافروں کو اپنا بھیدی نہ بنانے کا حکم

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ کافروں کو بھیدی بنانا کیسا ہے؟۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ {۱۱۸} هَاأَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ {۱۱۹} إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ {۱۲۰} آل عمران

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو اپنا راز دار مت بناؤ وہ لوگ تمہارے بگاڑ میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے، ان کو وہ چیز پسند ہے جس سے تمہیں تکلیف ہو بغض ظاہر ہو چکا ہے، ان کے مونہوں سے اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ اس سے بڑھ کر ہے، تحقیق ہم نے بیان کر دیں تمہارے لیے آیات اگر تم عقل رکھتے ہو، تم لوگ ایسے ہو کہ ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے

محبت نہیں کرتے اور تم پوری کتاب پر ایمان لاتے ہو، اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور وہ جب آپس میں تنہائیوں میں جاتے ہیں تو مارے غصہ کی جلن کے اپنی انگلیوں کو دانتوں سے کاٹ لیتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ مر جاؤ اپنی جلن میں، بیشک اللہ جاننے والا ہے ان سب چیزوں کو جو سینوں میں ہیں۔ اگر تم کو کوئی اچھی حالت پہنچ جائے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر تمہیں کوئی بری حالت پہنچ جائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی مکاری تمہیں کچھ بھی ضرر نہ پہنچائے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا احاطہ فرمائے ہوئے ہے۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت مؤمنون کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو منافقوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اور جن کا یہود کے کچھ لوگوں کے ساتھ میل ملاپ تھا کیونکہ ان کے درمیان رشتہ داری دوستی معاہدے ہمسائیگی اور رضاعت کے تعلقات تھے لہٰذا اللہ نے یہ آیت نازل کر کے انہیں ان لوگوں کے ساتھ رازداری کے تعلقات رکھنے سے منع کیا اس ڈر سے کہ کہیں یہ لوگ مؤمنوں کے لیے کوئی فتنہ پیدا نہ کریں۔

② حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منافقین مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اہل ایمان کو منع کیا گیا کہ ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھیں۔

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بعض مسلمان یہودیوں سے میل جول رکھتے تھے کیونکہ وہ ان کے پڑوسی تھے، یا زمانہ جاہلیت میں وہ ان کے حلیف رہ چکے تھے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور یہودیوں کو رازدار بنانے سے منع فرمایا اور ان کے فتنوں سے ڈرایا۔ (جامع البیان)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ: اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنے لوگوں کے علاوہ کسی کو رازدار بنانے سے منع فرمایا ہے، اس اعتبار سے اس حکم کے تحت تمام کافر لوگ آجاتے ہیں، چاہے وہ یہودی ہوں، نصاریٰ ہو، سکھ ہوں، آریہ سماج ہوں، بدھ مذہب ہوں، دنیا کے کسی بھی کفریہ نظام سے تعلق رکھنے والے ہوں، انہیں رازدار اور بھیدی بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ بطانہ کی جمع بطائن آتی ہے، بطانہ انسان کے اس لباس کو کہا جاتا ہے جو اس کے بیرونی کپڑوں سے اندر ہوتا ہے جو جسم

کے ساتھ متصل ہوتا ہے، انسان کے ظاہری کپڑوں کو ظہارہ کہا جاتا ہے جب کہ اندرونی لباس کو بطانہ کہا جاتا ہے، انسان کا وہ لباس جو جسم کے ساتھ متصل ہوتا ہے اسے شعار کہتے ہیں، اس سے اوپر والے کپڑے کو دثار کہتے ہیں۔

تو بطانہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو انسان نے کپڑوں کے نیچے پہنا ہوتا ہے جو اس کے باطن سے ملا ہوتا ہے جیسے بنیان اور چونکہ انسان کا گہرا دوست بھی اس کے تمام باطنی اوصاف اور خصائل پر مطلع ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی بطانہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کافروں کو اس طرح کا راز دان بنانے سے منع کر دیا ہے۔ اسی معنیٰ میں قرآن کریم میں لفظ ولیجہ بھی آیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں "مِنْ دُونِكُمْ کا لفظ رافضیوں، خارجیوں اور دوسرے بدعتیوں کو بھی شامل ہے اس لیے کافروں کی طرح ان کو بھی اندرونی راز دار بنانا جائز نہیں۔ (مظہری)

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نَهَى اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ الْمُؤْمِنِينَ بِهَذِهِ الْآيَةِ أَنْ يَتَّخِذُوا مِنَ الْكُفَّارِ وَالْيَهُودِ وَأَهْلِ الْأَهْوَاءِ دُخَلَاءَ وَوُلَجَاءَ، يُفَاوِضُونَهُمْ فِي الْآرَاءِ، وَيُسْنِدُونَ إِلَيْهِمْ أُمُورَهُمْ ، اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس آیت کے ساتھ منع فرمایا ہے: کہ وہ کفار، یہود اور اہل ھوا کو اپنے معاملات میں دخیل اور راز دار بنائیں کہ وہ آراء اور مشاورت میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کر کے اپنے معاملات ان کے سپرد کر دیں۔ (قرطبی) مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستانہ تعلقات اور قلبی تعلق بنانے سے کیوں منع کیا گیا، اس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلمَرءُ عَلَى دِينِ خَلِيلِهِ فَلْيَنظُر أَحَدُكُم مَّن يُّخَالِل (ابو داؤد) انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے تم میں سے کوئی دیکھے کہ وہ کسے دوست بناتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو کاتب بنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف شدید عتاب آمیز خط لکھا اور یہ آیت بھی ساتھ تحریر فرمائی، حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ حساب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ رضی اللہ عنہ کو وہ پیش کیا اور آپ کو حیران کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک تحریر لائے اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تیرا کاتب کہاں ہے یہ کتاب لوگوں پر پڑھے ؟ تو انہوں

نے عرض کی وہ تو مسجد میں داخل نہیں ہو گا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کیوں! کیا وہ جنبی ہے؟ انہوں نے عرض کی، وہ نصرانی ہے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں خوب جھڑکا اور فرمایا تو انہیں قریب نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کیا ہے اور تو ان کی عزت و تکریم نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل ورسوا کیا ہے اور تو انہیں امین نہ بنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خیانت کار قرار دیا ہے لَا تُدْنِهِمْ وَقَدْ أَقْصَاهُمُ اللّٰهُ، وَلَا تُكْرِمْهُمْ وَقَدْ أَهَانَهُمُ اللّٰهُ، وَلَا تَأْمَنْهُمْ وَقَدْ خَوَّنَهُمُ اللّٰهُ (قرطبی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لَا تَسْتَعْمِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ فَإِنَّهُمْ يَسْتَحِلُّونَ الرِّشَا وَاسْتَعِينُوا عَلَى أُمُورِكُمْ وَعَلَى رَعِيَّتِكُمْ بِالَّذِينَ يَخْشَوْنَ اللّٰهَ تَعَالَى تم اہل کتاب کو عامل نہ بناؤ کیونکہ وہ سود اور رشوت کو حلال سمجھتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے مدد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا، یہاں حیرہ کے عیسائیوں میں سے ایک آدمی ہے اس سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی قلم کے ساتھ اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے، کیا وہ آپ کی طرف سے کاتب نہ ہو جائے؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لَا آخُذُ بِطَانَةً مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ میں مومنین کے سوا کسی کو راز دار نہیں بناؤں گا۔ (المحرر الوجیز، تفسیر القرطبی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مَا بَعَثَ اللّٰهُ مِنْ نَبِيٍّ وَلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِيفَةٍ إِلَّا كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالْمَعْرُوفِ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ وَبِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ فَالْمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللّٰهُ تَعَالَى (الوسیط، القرطبی) اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھیجا، جو خلیفہ بنایا اس کے دو راز دار بنائے، ایک راز دار وہ ہے جو اسے نیکی کرنے کا کہتا ہے اور نیکی کرنے کی اسے ترغیب دیتا ہے اور ایک راز دار وہ ہوتا ہے جو اسے برائی کا کہتا ہے اور اس پر اسے ترغیب دیتا ہے، معصوم وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ بچالے۔

اللہ تعالیٰ نے وصف ایمان کے ساتھ ندا دی ہے، یہ بتانے کے لیے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ اہل ایمان کے عقائد و نظریات کے خلاف ہیں انہیں راز بتا کر مطمئن نہ ہو جائیں، اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بنائیں، ان کی طرف دوستی کی پینگیں نہ بڑھائیں، جن رازوں کو چھپانا ضروری ہے ان سے انہیں مطلع نہ کریں، خصوصاً وہ امور جن کا تعلق اہل ایمان کے ساتھ

ہو، وہ اغیار کو نہ بتلائیں۔ جس زمانے میں ہم لوگ موجود ہیں اس زمانے میں دوستی تعلق کے بغیر ایسی ایسی ایجادات ہوگئی ہیں جو ہماری خبریں دشمنوں تک پہنچا دیتی ہیں، ڈرون کیمروں کی شکل میں جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اندرونی خبریں محفوظ کی جاتی ہیں، لیکن غیور اہل ایمان افواج و ملکی دفاع پر مامور ادارے کسی صورت میں انہیں محفوظ واپس نہیں جانے دیتے۔

لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا: يَأْلُو یہ اُلُوٌّ سے ہے، اس کا معنیٰ کمی کرنا، کوتاہی کرنا، عربی زبان میں جب انتہائی کوشش کے ساتھ کسی کام کو سرانجام دینا ہو تو کہتے ہیں کہ لَا آلُو جَهْدًا أَيْ لَا أُقَصِّرُ، میں اپنی کوشش میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا، عربی زبان میں جب کوئی کوتاہی اور کمی کا ارتکاب کرے تو یوں کہتا ہے أَلَوْتُ أَلَوًا قَصَّرْتُ کہ کوتاہی تو مجھ ہی سے ہوگئی ہے۔ یعنی جو لوگ دوسرے مذہب پر ہیں وہ تمہارے اندر شر اور بگاڑ پیدا کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے بلکہ تمہارے اندر شر فساد کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر دیں گے۔ (مظہری) خبال اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی حیوان کو لاحق ہو جائے، پھر وہ اسے اضطراب میں مبتلا کر دے جیسے بیماری اور جنون، لیکن یہ لفظ شر اور مطلق فساد کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی طاقت و قوت کے مطابق تمہارے اندر فساد اور خرابی پیدا کرنے میں کمی و کوتاہی نہیں کریں گے، وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہیں اپنی دشمنی کا نشانہ بنائیں گے۔

وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ: مَا عَنِتُّمْ میں ما مصدریہ ہے یعنی وَدُّوا عَنِتَّكُمْ یعنی وہ پسند کرتے ہیں اسے جو تم پر شاق گزرتی ہے اور العنت کا معنی مشقت ہے۔ (معالم التنزیل)

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ: تمہارے لیے دشمنی اور جھٹلانا تو ان کی زبانوں سے ظاہر ہو چکا ہے، الْبَغْضَآءُ بمعنی بغض ہے اور یہ حب (محبت) کی ضد ہے اور الْبَغْضَآءُ مصدر مؤنث ہے اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر أَفْوَاه (مونہوں) کا ذکر کیا ہے نہ کہ زبانوں کا یہ ان کی اپنی ان باتوں میں لغویات اور بے احتیاط گفتگو کرنے کی طرف اشارہ ہے پس وہ اس چھپنے والے سے فوق اور اوپر تھے جس کی آنکھوں میں بغض ہوتا ہے اور اس معنی کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ کی نہی ہے کہ أَنْ يَسْتَحِيَ الرَّجُلُ فَاهُ فِي عِرْضِ أَخِيهِ آدمی اپنے بھائی کی عزت کے بارے میں اپنے منہ کو حیاء میں

رکھے اس کا معنی منہ کھولنا ہے، عربی محاورے میں کہا جاتا ہے،: شَحَى الْحِمَارُ فَاهُ بِالنَّهِيقِ (گدھے نے رینکتے ہوئے اپنا منہ کھولا)، شَحَى الْفَمُ نَفْسَهُ (منہ بذات خود کھل گیا) وَشَحَى اللِّجَامُ فَمَ الْفَرَسِ شَحْيًا (لگام نے گھوڑے کا منہ مکمل طور پر کھول دیا،)، وَجَاءَتِ الْخَيْلُ شَوَاحِيَ، یعنی گھوڑے اپنے منہ کھولے ہوئے آئے، اس حدیث سے جواز پر دلیل خطاب نہیں سمجھی جاسکتی کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت میں خفیہ داخل ہو جائے، کیونکہ باتفاق علماء وہ حرام ہے۔ (المحرر الوجیز، قرطبی)

وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ: یہ خبر دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو بغض وحسد چھپائے رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا وہ اپنے مونہوں سے اظہار کرتے ہیں۔ (المحرر الوجیز) اور جو بغض ان کے دلوں کے اندر چھپا ہوا ہے وہ ظاہر شدہ بغض سے بہت بڑا ہے کیونکہ وہ دھوکہ اور فریب دینے کے لیے (عموماً) دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔ (مظہری)

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ: ہم نے تمہارے لیے واضح نشانیاں بیان کر دی ہیں، جن سے ان کی دشمنی واضح ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ان نشانیوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ کس قدر مخلص ہیں، جب کہ کفار اہل ایمان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ دشمنی رکھنا واجب ہے۔ قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں "بہر صورت کلام سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسلمان سے اس کے ایمان کی وجہ سے دشمنی نہ رکھتا ہو اور شر و فساد اس کا مقصود نہ ہو یا رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے مسلمان سے مودّت رکھتا ہو اس سے موالات کرنے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ مسلمان ہونے سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہما اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاملہ تھا یا ابو طالب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ابو طالب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فائدہ پہنچایا وہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد گھومتے رہتے تھے (یعنی آپ کی حفاظت کرتے تھے) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں دوسروں پر غصہ کرتے تھے فرمایا: ہاں وہ ٹخنوں تک آگ میں ہے لیکن اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے نچلے طبقہ میں ہوتا۔ (رواہ مسلم، مظہری)

إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ: یہ شرطیہ جملہ ہے جس کو جزاء کی ضرورت نہیں کیونکہ کلام سابق مفہوم جزاء پر

دلالت کر رہا ہے یعنی اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو کافروں کی اندرونی دوستی سے باز رہو ان کو دشمن ہی سمجھو اللہ سے خلوص رکھو اور مسلمانوں سے موالات کرو۔ (مظہری)

هَاأَنْتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ: اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے واضح فرمایا کہ وہ کفار کے ساتھ تعلقات نہ رکھیں، پھر فرمایا کہ یہ جن لوگوں سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیا جارہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تم اپنا محبوب بناتے ہو، جب کہ یہ لوگ تمہیں اپنا محبوب نہیں رکھتے، یہ تمہارے دین، تمہارے عقیدے اور تمہارے نظریات کے مخالف ہیں، جب کہ تم اتنے بھلے مانس ہو کہ ان کے لیے ہدایت کی تمنائیں کرتے ہو، ان کے لیے خیر و بھلائی کے طلب گار ہو، باوجود یکہ وہ تم سے کسی طرح کی محبت نہیں رکھتے، وہ تمہارے لیے کوئی خیر نہیں چاہتے بلکہ وہ تمہارے لیے شر کے طالب ہیں، تمہیں شکست وریخت سے دوچار کرنا چاہتے ہیں، تمہیں کمزور کرنا چاہتے ہیں، تم ہو کہ یکطرفہ ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے چلے جاتے ہو، انہیں اپنے راز بتاتے ہو، ان کی مداخلت برداشت کرتے ہو۔

وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ: تم ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو، تمہاری یہ خوبی ہے کہ تم لوگ تو اللہ کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو، تم ان کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہو، جو پہلے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل ہوئیں اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے تم جو ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو انہیں اس کا کوئی پاس اور لحاظ نہیں ہے، ان میں منافقت ہے۔

وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ: یہ منافقین کی پرانی روش ہے کہ جب اہل ایمان سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اہل ایمان ہیں، انہیں قرآن کریم میں منع بھی کیا گیا کہ تم لوگ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں، پھر جب یہ لوگ مسلمانوں سے الگ ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیوں کے پورے دانتوں تلے دے کر غصے کا اظہار کرتے ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یعنی اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت و محبت دیکھ کر یہ لوگ جلے مرتے ہیں اور چونکہ اس کے خلاف کچھ بس نہیں چلتا، اس لیے فرط غیظ و غضب سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ (عثمانی) انگلیاں کاٹنا یہ بہت زیادہ غصے کے اظہار سے کنایہ ہے، انامل انملہ کی جمع ہے انگلیوں کے پورے۔

قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ: یعنی خدا تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو اور زیادہ ترقیات و فتوحات عنایت فرمائے گا، تم غیظ کھا کھا کر مرتے رہو، اگر ایڑیاں رگڑ کر مر جاؤ گے تب بھی تمہاری آرزوئیں پوری نہ ہوں گی، خدا اسلام کو غالب اور سربلند کر کے رہے گا۔ (عثمانی) غیظ بہت شدید غصے کو کہا جاتا ہے، علامہ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بد دعائیہ جملہ ہے، یعنی تمہارا غصہ اتنا بڑھے کہ تم اسی میں ہلاک ہو جاؤ، غصے کے ساتھ مرنا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری انہیں تسلسل کے ساتھ لگی رہے، یہ ہمہ وقت مسلمانوں پر غصے کا اظہار کرتے رہیں، آج کل ہمارے وطن میں یہ بیماری عام ہے کہ دوسروں کی غلطیوں کو دیکھ کر دوسرے انسان میں غصہ کی لہر دوڑتی ہے، بہت زیادہ غصے کا اظہار کرنے والا جب اپنے غصہ پر بعد میں قابو پالیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا، بہت سے لوگ آج بلڈ پریشر کی زیادتی کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں، ایسی ایسی مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں جو بتاتی ہیں کہ فلاں آدمی کا بلڈ پریشر کتنا ہے۔ بِغَيْظِكُمْ کی باملابست کے لیے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے بغض و کینہ کے ساتھ مر جاؤ۔

إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ: اللہ تعالیٰ سینوں کے بھید جانتا ہے، جو کچھ ان منافقین کے سینوں کے سفینوں میں مسلمانوں کے بارے میں خیالات مچل رہے ہیں ان سب سے اللہ تعالیٰ آگاہ ہے، یہود و نصاریٰ کی ریشہ دوانیوں سے اللہ تعالیٰ پوری طرح آگاہ ہے، اللہ تعالیٰ ان سے بہت ہی مشکل حساب لے گا، انہیں اللہ تعالیٰ ان جرائم کی بناء پر دردناک عذاب سے دوچار کرے گا۔

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ: مس کا معنیٰ ہاتھ کے ساتھ کسی چیز کو چھونا ہوتا ہے، پھر یہ لفظ ہر اس چیز پر بولا جانے لگا جو کسی دوسری چیز کو پہنچے، قرآن کریم میں بھوک اور مشقت پر بھی مس کا لفظ بولا گیا ہے، تکلیف پہنچنے پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ شر اور خیر پہنچنے پر بھی مس کا لفظ بولا گیا ہے۔ حَسَنَةٌ کا معنی ہے اچھائی اور یہاں اس سے دنیاوی منفعت مراد ہے مثلاً صحت، خوشحالی، دشمنوں پر غلبہ اور دوستوں کے درمیان الفت اور محبت کا حصول (کبیر للرازی) اگر مسلمانوں کو کوئی کامیابی ملتی ہے تو انہیں تکلیف ہوتی ہے، اگر مسلمانوں کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو اس پر وہ پریشان ہوتے ہیں، اگر مسلمانوں کو کوئی منفعت و خوشحالی ملتی ہے تو اس پر انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔

وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا: سَيِّئَةٌ کا معنی ہے برائی اور یہاں اس سے مراد ہے مرض، فقر، جہاد میں شکست دوستوں میں رنجش اور جدائی، قتل، غارت گری اور لوٹ مار وغیرہ، اگر مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، قحط سالی کا سامنا ہوتا ہے، کہیں کوئی آزمائش آجاتی ہے، کہیں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس پر یہ لوگ شادیانے بجاتے ہیں، مسرت کا اظہار کرتے ہیں، خوش ہوتے ہیں۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی بناء پر یہ لوگ دوستی اور تعلق کے قابل نہیں ہیں، چہ جائیکہ تم انہیں بطانہ یعنی دلی دوست بناؤ، انہیں رازدان سمجھو یا ان سے اپنے راز شئیر کرو، یہ کسی بھی صورت میں مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا: یہاں مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کی جارہی ہے کہ وہ کافروں کے مکر و فریب، سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اس کے لیے دو اہم ترین ہتھیار مسلمان کو دیے جارہے ہیں، ایک ان میں صبر ہے اور دوسرا تقویٰ، صبر و تقویٰ دو ایسے ہتھیار ہیں اگر مسلمانوں نے انہیں لازم رکھا تو کافروں کا کوئی مکر، کوئی فریب، کوئی سازش، کوئی ریشہ دوانی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، تقویٰ میں ہر امر الٰہی کی تعمیل کرنا اور نواہی سے بچنا مراد ہے، ذرا سی کوتاہی دشمنوں کو حملہ سے نہیں روک سکتی، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں سے موالات، تعلقات اور گہری دوستی سے منع فرمایا ہے، اس حکم کی پابندی یہ تقویٰ ہے، اگر ان کی طرف کسی شکل میں بھی میلان قلبی رکھا تو یقین جانیے یہ تقویٰ کے خلاف ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس حکم پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں تسلی دی ہے کہ کفار کی سازشیں انہیں شَيْئًا ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتیں۔ كَادَ، كَيْدًا کا معنیٰ ہے دھوکہ دینا، فریب میں مبتلا کرنا۔

إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ: جو کچھ یہ کفار کرتے ہیں اس سب کا اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ احاطہ کیے ہوئے ہیں، وہ سب دیکھ رہے ہیں کہ کون کیا کرتا ہے، وہ تمہیں جزا و سزا دے گا تمہارے اعمال کے اعتبار سے، انہیں اللہ تعالیٰ جزا و سزا دے گا ان کے نفاق اور جرائم کے لحاظ سے، اس لیے کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہمیں کوئی دیکھ نہیں رہا، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔

جنگ اُحد

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ {۱۲۱} إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ {۱۲۲} آل عمران

جواب ترجمہ: اور (وہ وقت یاد کیجیے) جب آپ اپنے گھر والوں کے پاس سے صبح کو نکلے مسلمانوں کو جنگ کے ٹھکانوں پر ٹھہراتے ہوئے اور اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔ جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ بزدل ہو جائیں اور اللہ ان کا ولی تھا اور اللہ پر بھروسہ کریں مومن بندے۔

شان نزول: مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ میں نے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے میرے ماموں؟ مجھے جنگ اُحد کے موقع پر اپنا قصہ بیان کریں انہوں نے فرمایا کہ سورۃ آل عمران کی ایک سو بیسویں آیت کے بعد والی آیت پڑھو وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ سے لے کر ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُعَاسًا تک تم یہ واقعہ پاؤ گے۔ (اسباب النزول)

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ: میرے حبیب! اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اپنے صبح کے وقت نکلنے کا تذکرہ کرو تاکہ انہیں یہ واقعہ یاد آجائے، جب آپ اپنے گھر سے نکل رہے تھے، یہ گھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا، اس سے انہیں یہ یاد آجائے گا کہ صبر و تقویٰ کے دو ہتھیار استعمال نہ کرنے پر مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچا اور آئندہ بھی پہنچ سکتا ہے، معمولی سی غلطی اور حکم عدولی کس قدر بڑا امتحان لے کر آتی ہے، یہ واقعہ انہیں یاد دلاتا رہے گا کہ صبر و تقویٰ کا دامن تھام لیتے تو دشمنوں کی سازش انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، یہاں صبح کو نکلنے سے مراد غزوہ اُحد کی طرف جانا ہے۔

نکتہ: آیت میں اہل سے باجماع مفسرین و محدثین و علماء سیرت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے نکلنا مراد ہے، جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا طاہرہ اور مطہرہ اور سرتاپا عمل صالح تھیں، اس لیے کہ خداوند کریم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

اہل فرمایا اور اللہ کے رسول ﷺ کا اہل وہی ہو سکتا ہے، جو سر تا پا عمل صالح ہو اور نوح علیہ السلام کے بیٹے کو نوح علیہ السلام کی اہل سے اسی لیے خارج کیا گیا کہ اس کے اعمال صالح نہ تھے۔ (معارف القرآن)

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ: بَوَّأَ يُبَوِّئُ کے معنی ٹھہرانا، ٹکانا، مقیم کرنا، مامور کرنا۔ مَقَاعِدَ، مقعد کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں لیکن وسیع استعمال میں اس کے معنی گھات لگانے کی جگہ کے بھی ہو سکتے ہیں اور قرینہ موجود ہو جیسا کہ یہاں ہے تو اس سے جنگ کا مورچہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یہ آیت تمہید ہے اس تبصرے کی جو جنگ احد کے واقعات اور ان سے پیدا شدہ اثرات پر آگے آرہا ہے۔ یہ جنگ چونکہ ابھی تازہ تازہ ہوئی تھی، اس وجہ سے ہر شخص کے سامنے تھی، نام لیے بغیر بھی اس کے واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔ (تدبر قرآن)

وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ: اللہ تعالیٰ آپ کی دعائیں سننے والا اور کافروں کے کرتوت اور سیاکاریاں خوب جاننے والا ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری باتیں خوب سننے والا ہے، تمہارے افعال خوب جاننے والا ہے، تمہاری نیتوں کے احوال سے خوب آگاہ ہے، یہاں یہ اطلاع دینا مقصود ہے کہ ان لوگوں سے اس طرح کی باتیں صادر ہوئی ہیں جن کا صادر نہ ہونا مناسب تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا تھا تو کسی نے کہا تھا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، کسی نے کہا تھا کہ میدان کارزار کی طرف آگے بڑھا جائے، کہنے والے نے جو مشورہ دیا اس کے علاوہ بھی اس کے دل میں کوئی خیال ہو سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح کیا کہ اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

إِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا: طائفتان یہ طائفہ کا تثنیہ ہے، دو گروہ، دو قبیلے، یہ انصار کے دو قبیلوں کا ذکر ہے، ان میں ایک خزرج کے بنو سلمہ تھے، دوسرے اوس میں سے بنو حارثہ، یہ لشکر کے دونوں بازو تھے، جب عبداللہ بن ابی نے بزدلی اور منافقت کرتے ہوئے مسلمانوں کے لشکر سے اپنے تین سو پیروکاروں کو نکال لیا اور میدان جنگ میں جانے کی بجائے واپس آگیا تو ان دو قبیلوں میں بھی بددلی پیدا ہو گئی، ان کے دل میں خیال آیا کہ اس کی پیروی کریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا اور یہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ڈٹے رہے، علماء میں سے بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان دو قبیلوں کے ذکر کو مبہم رکھا اور پردہ پوشی فرمائی تو ہمارے لیے

جائز نہیں ہے کہ ہم اس پردہ کو فاش کریں۔ فَشَلٌ کے معنی ہمت ہار دینے اور حوصلہ چھوڑ دینے کے ہیں، جنگ میں اصل اہمیت حوصلہ وہمت کو حاصل ہے، اسلحہ اور دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں، اس وجہ سے سب سے پہلے بعض جماعتوں کی اس کمزوری پر گرفت فرمائی۔ (تدبر قرآن) وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا یعنی اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی حفاظت فرمارہا تھا۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ: مسلمانوں کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ کسی بڑی فوج ولشکر اور سازوسامان پر مسلمانوں کو بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ حکم الٰہی کے مطابق اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو ڈرانے کے لیے اسلحہ کی تیاری کرنا چاہیے، اپنی ہمت اور طاقت کے مطابق مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر ہونا چاہیے۔

جنگ اُحد پر ایک سرسری نگاہ

سورۃ آل عمران کی آئندہ کئی آیات میں جنگ احد کے ضروری احوال آئیں گے، لیکن یہاں ہم صرف سرسری نگاہ ڈالتے ہیں، جنگ احد کا واقعہ سن ۳ ہجری ۱۱ شوال بروز ہفتہ پیش آیا تھا، جنگ بدر میں مشرکین کو کامل شکست ہوئی تھی ان کے سردار موت کے گھاٹ اترے تھے، اب اس کا بدلہ لینے کیلئے مشرکین نے بڑی بھاری تیاری کی تھی، وہ تجارتی مال جو بدر والی لڑائی کے موقع پر دوسرے راستے سے بچ کر آگیا تھا، وہ سب اس لڑائی کیلئے روک رکھا تھا اور چاروں طرف سے لوگوں کو جمع کر کے تین ہزار کا ایک لشکر جرار تیار کیا اور پورے سازوسامان کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کی۔

ادھر رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کی نماز کے بعد مالک بن عمرو رضی اللہ عنہ کے جنازے کی نماز پڑھائی جو قبیلہ بنی النجار میں سے تھے، پھر لوگوں سے مشورہ کیا کہ ان کی مدافعت کی کیا صورت تمہارے نزدیک بہتر ہے؟ تو عبداللہ بن اُبیّ (منافق) نے کہا کہ ہمیں مدینہ سے باہر نہ نکلنا چاہیے اگر وہ آئے اور ٹھہرے تو گویا ہمارے جیل خانہ میں آگئے، رکیں اور کھڑے رہیں اور اگر مدینہ میں گھسے تو ایک طرف سے ہمارے بہادروں کی تلواریں ہوں گی دوسری جانب تیر اندازوں کے بے پناہ تیر ہوں گے پھر اوپر سے عورتوں اور بچوں کی سنگ باری ہوگی اور اگر یونہی لوٹ گئے تو بربادی اور خسارے کے

ساتھ لوٹیں گے، لیکن اس کے برخلاف بعض صحابہ رضی اللہ عنہم جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے ان کی رائے تھی کہ مدینہ کے باہر میدان میں جا کر خوب دل کھول کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور ہتھیار لگا کر باہر آئے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو اب خیال ہوا کہ کہیں ہم نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خلاف منشاء تو میدان کی لڑائی پر زور نہیں دیا، اس لیے یہ کہنے لگے کہ یارسول اللہ! اگر یہیں ٹھہر کر لڑنے کا ارادہ ہو تو یونہی کیجئے، ہماری جانب سے کوئی اصرار نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نبی کو لائق نہیں کہ وہ ہتھیار پہن کر اتارے، اب تو میں نہ لوٹوں گا جب تک کہ وہ نہ ہو جائے جو اللہ عزوجل کو منظور ہو چنانچہ ایک ہزار کا لشکر لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ شریف سے نکل کھڑے ہوئے۔

شوط پر پہنچ کر اس منافق عبداللہ بن اُبیّ نے دغابازی کی اور اپنی تین سو کی جماعت کو لے کر واپس آ گیا، عبداللہ بن اُبیّ اور اس کے ساتھی کہنے لگے لَوْ نَعْلَمُ الْيَوْمَ قِتَالًا لَاتَّبَعْنَاكُمْ، وَلَكِنَّا لَا نَرَاكُمْ تُقَاتِلُونَ الْيَوْمَ، اگر ہم اسے لڑائی (جہاد) سمجھتے تو ہم تمہارے ساتھ چلتے، لیکن ہم لوگ آج کے دن تمہیں لڑائی کرتے ہوئے نہیں دیکھ رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی پروانہ کی اور صرف سات سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر میدان میں اترے اور حکم دیا کہ لَا يُقَاتِلَنَّ أَحَدٌ حَتَّى نَأْمُرَهُ بِالْقِتَالِ جب تک میں نہ کہوں لڑائی شروع نہ کرنا، پچاس تیر انداز صحابیوں کو الگ کر کے ان کا امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو بنایا اور ان سے فرمادیا انْضَحُوا الْخَيْلَ عَنَّا، وَلَا نُؤْتَيَنَّ مِنْ قِبَلِكُمْ. وَالْزَمُوا مَكَانَكُمْ إِنْ كَانَتِ النُّوبَةُ لَنَا أَوْ عَلَيْنَا، وَإِنْ رَأَيْتُمُونَا تَخَطَّفُنَا الطَّيْرُ فَلَا تَبْرَحُوا مَكَانَكُمْ کہ پہاڑی پر چڑھ جاؤ اور اس بات کا خیال رکھو کہ دشمن پیچھے سے حملہ آور نہ ہو دیکھو ہم غالب آجائیں یا (اللہ نہ کرے) مغلوب ہو جائیں تم ہرگز اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔

یہ انتظامات کر کے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تیار ہو گئے، دوہری زرہ پہنی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو جھنڈا دیا، آج چند لڑکے بھی لشکر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں نظر آتے تھے، یہ چھوٹے سپاہی بھی جانبازی کیلئے ہمہ تن مستعد تھے، بعض اور بچوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ لیا تھا، انہیں جنگ خندق کے لشکر میں

بھرتی کیا گیا جنگ خندق اس کے دو سال بعد ہوئی تھی، قریشی کا لشکر بڑے ٹھاٹھ سے مقابلہ پر آڈٹا، یہ تین ہزار سپاہیوں کا گروہ تھا، ان کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے، جنہیں موقع پر کام آنے کیلئے ساتھ رکھا تھا، ان کے داہنے حصہ پر خالد بن ولید تھا اور بائیں حصہ پر عکرمہ بن ابو جہل تھا (یہ دونوں سردار بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، ان کا جھنڈا بردار قبیلہ بنو عبد الدار تھا، پھر لڑائی شروع ہوئی (ابن کثیر)

مدینہ سے میدان کارزار کی طرف جانے سے پہلے کے کچھ اور واقعات بھی ہیں، جنہیں قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے "اس روز رسول اللہ ﷺ کے سامنے کچھ لڑکے جن کی عمریں ۱۴ برس کی تھیں لشکر میں شامل کئے جانے کے لیے پیش کیے گئے، آپ ﷺ نے ان کو لوٹا دیا، ان کی تعداد سترہ تھی، کچھ اور لڑکے جن کی عمریں پندرہ سال کی تھیں پیش ہوئے، آپ ﷺ نے ان کو لڑائی میں شامل ہونے کی اجازت دیدی، جن میں سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، براء بن عازب رضی اللہ عنہ، ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔

رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو لوٹا دیا گیا تھا لیکن جب بتایا گیا کہ یہ تیر انداز ہے تو شامل ہونے کی اجازت عطا فرما دی، اس پر سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ بولے کہ رافع بن خدیج کو تو رسول اللہ ﷺ نے اجازت دیدی اور مجھے لوٹا دیا حالانکہ کُشتی میں میں اس کو پچھاڑ دوں گا، اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو بھی دی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: دونوں کُشتی لڑلو، کُشتی ہوئی تو سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع کو پچھاڑ لیا، اس لیے سمرہ رضی اللہ عنہ کو بھی جنگ میں شامل ہونے کی اجازت مل گئی۔

فوج کا معائنہ ختم ہو گیا اور سورج ڈوب گیا تو بلال رضی اللہ عنہ نے مغرب کی اذان دی اور رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں کو نماز پڑھائی پھر (کچھ دیر کے بعد) عشاء کی اذان دی اور آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور رات "شیخین" میں بسر کی، اس رات لشکر کی نگرانی کے لیے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو پچاس آدمی دے کر مقرر کیا گیا، ان لوگوں نے لشکر کے گرد گھوم پھر کر چوکیداری کی اور رسول اللہ ﷺ سو گئے، سحر ہوئی تو فجر کی نماز پڑھ کر فرمایا: کیا کوئی ایسا رہبر ہے جو دشمنوں کی طرف سے گذارے بغیر ہم کو ٹیلہ سے نکال کر لے جائے؟ ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں ایسا کروں گا چنانچہ ابو خیثمہ بنی حارثہ کے میدان اور ان کے باغات کے درمیان سے لے کر چلا،

یہاں تک کہ مربع بن قیظی کے باغ میں لے کر پہنچا، مربع منافق اور نابینا تھا، رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کی آہٹ پا کر ان حضرات کے منہ کی طرف خاک اُڑانے لگا اور کہنے لگا اگر تم رسول اللہ ﷺ بھی ہو تب بھی میں اپنے باغ میں داخل ہونے کی تم کو اجازت نہیں دیتا، یہ کہہ کر اس نے لپ بھر مٹی لی اور بولا اگر مجھے علم ہو جاتا کہ جس وقت میں یہ مٹی ماروں گا تو تمہارے چہرہ پر ہی پڑے گی تو ضرور مار دیتا، لوگ اس کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے، مگر حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو قتل نہ کرو یہ اندھا کور دل (دل کا اندھا) بھی ہے اور کور چشم (آنکھوں کا اندھا) بھی لیکن حضور ﷺ کی ممانعت سے پہلے ہی سعد بن زبدہ رضی اللہ عنہ اشہلی اندھے کے پاس پہنچ چکے تھے اور کمان مار کر اس کو زخمی کر دیا تھا۔ (مظہری)

آتش انتقام: صفون ابن امیہ جنگ کے لیے تیاری میں پیش پیش تھا، ابو عزّہ شاعر جنگ بدر کے قیدیوں میں شامل تھا، اس کے پاس فدیے کے لیے کچھ نہ تھا، رسول اللہ ﷺ سے ملتجی ہوا کہ میں کثیر العیال اور ضرورت مند ہوں، اس وقت مجھ پر احسان فرمائیں، رسول اللہ ﷺ نے اس پر احسان رکھ کر رہا کر دیا، وہ قریش کی نئی تیاریوں میں شرکت کے لیے تیار نہ تھا لیکن صفوان بن امیہ نے لالچ دے کر ساتھ ملا لیا، اس نے اور مسافع عبد مناف نے بنو کنانہ کو قریش کی معیت پر آمادہ کرنے کے لیے انتہائی سرگرمی سے کام کیا۔ (رسول رحمت ﷺ)

جبیر بن مطعم کا ایک حبشی غلام تھا جس کا نام وحشی تھا، جسے حبشیوں کے طریق پر حربہ پھینکنے میں بدرجہ کمال مہارت تھی، جبیر نے اس سے کہا کہ اگر تو محمد ﷺ کے چچا حمزہ کو قتل کر دے گا تو میرے چچا طعیمہ بن عدی کا بدلہ پورا ہو جائے گا اور تو میری طرف سے آزاد ہو گا۔

ہند بنت عتبہ (زوجہ ابوسفیان) بھی اپنے والد عتبہ بن ربیعہ کے انتقام کی طلب گار تھی، اس نے بھی وحشی کو خوش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا، بشرطیکہ وہ حمزہ کو قتل کر دے، چنانچہ ہند میدان جنگ میں بھی وحشی کے پاس سے گزرتی تو کہتی ابو دسمہ! میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا کر اور اپنا بھی یعنی میرے بدلے کا بھی انتظام کر دے اور خود بھی غلامی سے آزاد ہو جا۔

ابو عامر راہب بھی جس کے لیے "فاسق" کا موزوں لقب اسی زمانے میں عام ہو گیا تھا، اس انگیخت میں قریش کا ساتھی تھا جنگ کے لیے ساتھ آیا، مجوزہ میدان جنگ میں جابجا گڑھے کھدوائے اور غالباً کھجور کی پتلی پتلی شاخیں رکھ کر مٹی ڈلوادی تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے، ایسے ہی ایک گڑھے میں رسول اللہ ﷺ اتفاقیہ گر گئے تھے۔ (رسول رحمت ﷺ مولانا آزاد)

قریش کی تیاریوں کے متعلق تمام خبریں عباس کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو مل گئیں، جو اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر رسول اللہ ﷺ کی خیر خواہی میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے جو ان کے امکان میں تھا، بہر حال قریش مکہ کی فوج تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی جس میں اہل تہامہ اور بنو کنانہ بھی شامل تھے، ان میں سے سات سو زرہ پوش تھے، دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور پندرہ عورتیں ساتھ تھیں، مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں "لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوش جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونان حرم تھیں، جس لڑائی میں خاتونیں ہوتیں عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوئی تو عورت بے حرمت ہو گی"

قریش کے ساتھ جو عورتیں آئی تھیں وہ نہایت معزز گھرانوں کی تھیں، نیز ان کے دل مقتول اقرباء کے جوش انتقام سے لبریز تھے، مثلاً ① ہند، قریش مکہ کے سالار اعظم ابو سفیان کی بیوی تھی، اس کا باپ عتبہ بدر میں مارا گیا تھا۔ ② ام حکیم بنت حارث، ابو جہل کی بھتیجی اور عکرمہ بن ابی جہل کی بیوی، یہ ابو جہل کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ ③ فاطمہ بنت ولید، خالد کی بہن، حارث بن ہشام برادرِ ابو جہل کی بیوی، ابو جہل کے علاوہ اپنے باپ ولید کے بدلے کی خواہاں تھی۔ ④ برزہ بنت مسعود ثقفی، صفوان بن امیہ کی بیوی، امیہ کے انتقام کی غرض سے آئی تھی۔ ⑤ ریطہ بنت منبہ بن الحجاج، عمرو بن العاص کی بیوی اپنے باپ کے انتقام کے لیے۔ ⑥ خناس، مصعب بن عمیر کی مشرکہ ماں اپنے مشرک فرزند ابو عزیز کے ساتھ۔

قریش ذوالحلیفہ میں آاترے تو رسول اللہ ﷺ نے فضالہ کے بیٹوں انس اور مونس کو بھیجا کہ ضروری معلومات فراہم کر لائیں، وہ واپس ہوئے تو بتایا کہ قریش نے اپنے اونٹ اور گھوڑے العریض میں چھوڑ دیے تھے، جب وہاں سے روانہ ہوئے تو گھاس بالکل ختم ہو چکی تھی، پھر حباب بن منذر کو

بھیجا گیا، وہ قریش کے لشکر میں داخل ہو کر تعداد کا صحیح اندازہ کر لائے، قریش اس جگہ ٹھہر گئے تھے، جو مدینہ منورہ کے شمال مغرب میں بئیر رومہ اور غابہ کے درمیان تھی، یہاں انہیں پانی بھی حسب ضرورت مل سکتا تھا، جانور چرانے کی بھی سہولت تھی، جنگ خندق میں بھی وہ اسی جگہ ٹھہرے تھے۔ (رسول رحمت ﷺ) رسول اللہ ﷺ نے شہر میں پہرے کا مکمل انتظام کرا دیا، سعد بن معاذ، اُسید بن حضیر اور سعد بن عبادہ نے مسلح ہو کر خود رسول اکرم ﷺ کے دروازے پر پہرہ دیا۔ (رسول رحمت ﷺ مؤلفہ مولانا ابو الکلام آزادؒ)

مدینہ منورہ کی آبادی: مدینہ منورہ کے مشرق، مغرب اور جنوب میں کھجور کے گھنے باغ تھے، ان میں سے گزرتے ہوئے کسی بستی یا محلہ پر حملہ آسان نہ تھا، کیونکہ باغوں میں سے دشمن کا صرف ایک ایک آدمی بمشکل آگے بڑھ سکتا تھا، اس صورت میں حملہ آور بہ آسانی مارے جاتے، صرف شمالی جانب سے حملہ ہو سکتا تھا، اس لیے قریش نے شمالی و مغربی جانب پڑاؤ ڈالا تھا، پھر پوری آبادی ایک مقام پر نہ تھی بلکہ پہاڑوں کے درمیان وسیع میدان میں بکھری بستیاں یا محلے آباد تھے، بعض قبیلوں نے اپنی زمینوں اور باغوں کے پاس آبادی کا انتظام کر لیا تھا اور کئی دو منزلہ گڑھیاں بنالی گئی تھیں، وہ ہر خطرے کے وقت بچوں اور عورتوں کو گڑھیوں کی بالائی منزلوں پر پہنچا دیتے اور خود فارغ البال ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے۔ (رسول رحمت ﷺ)

اسلامی لشکر: مدینہ منورہ سے رسول اللہ ﷺ عصر کے وقت نکلے، آپ ﷺ نے تین نیزے طلب فرمائے اور تین جھنڈے بنائے، ایک حباب بن منذر کو عطا ہوا، دوسرا اسید بن حضیر کو اور تیسرا علی ابن ابی طالب کو عنایت فرمایا، حضور ﷺ گھوڑے پر سوار ہوئے، کمان کندھے پر ڈالی، نیزہ ہاتھ میں لیا، مسلمانوں کی کل تعداد اس وقت ایک ہزار تھی، جن میں عبد اللہ بن ابی کے تین سو آدمی بھی شامل تھے، لشکر میں صرف ایک سو آدمی زرہ پوش تھے، سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ مرکب مبارک کے آگے آگے دوڑ رہے تھے، باقی لشکری دائیں بائیں اور پیچھے تھے، حضور ﷺ نے مشرقی جانب کے حرے یعنی حرہ واقم کے دامن کا راستہ اختیار فرمایا، جدھر بنی عبد الاشہل کی بستی تھی، جب

آپ مقام شوط میں پہنچے تو عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا، عذر یہ پیش کیا کہ میری رائے کے مطابق مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ نہیں کیا گیا، گویا اسلامی لشکر کے افراد صرف سات سو رہ گئے، ساتھ دو گھوڑے تھے۔

طبقات ابن سعد کے مطابق رسول اللہ ﷺ شیخین میں شب باش ہوئے، محمد بن مسلمہ کو پچاس آدمیوں کے ساتھ پہرہ داری پر مامور فرمایا گیا، یہ اصحاب رات بھر لشکر کے گرد گشت کرتے رہے، رات کے پچھلے حصے میں ابو خیثمہ حارثی کو رہبر بنایا اور احد کی جانب روانہ ہوئے، القنطرہ پہنچے تو نماز کا وقت ہو گیا، وہیں آپ ﷺ نے بلال کو اذان کا حکم دیا اور نماز پڑھائی، پھر جبل احد کے پاس اس مقام پر پہنچ گئے جسے بظاہر پہلے سے فوج کی ترتیب کے لیے تجویز فرما رکھا تھا۔ (طبقات ابن سعد)

جبل اُحد مدینے کے شمال میں قریباً تین میل پر شرقاً غرباً بخط مستقیم پھیلا ہوا ہے، اس کی جنوبی جانب وسط میں نعل نما خلا ہے، جو خاصا وسیع ہے یعنی یہاں سے پہاڑ کے پیچھے کی طرف ہٹ گیا ہے، اسی کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نزل الشعب من احد فی عدوۃ الوادی الی جبل (یعنی آپ ایک گھاٹی میں اترے، یہ مقام وادی قنات سے پہاڑ کی جانب اونچائی میں واقع ہے) جہاں سے یہ خلا یا جھکاؤ شروع ہوتا ہے وہاں سے جبل اُحد کے ساتھ ساتھ وادی قنات گزرتی ہے جس میں بارش کے ساتھ خاصا پانی بہنے لگتا ہے، بارش نہ ہو تو یہ عموماً خشک ہوتی ہے۔

قنات کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی طرف ہے، خلا کی زمین قنات سے اونچی ہے، اس کے عین سامنے وادی کے جنوبی کنارے پر ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے، جسے جبل عینین کہتے ہیں، یعنی دو چشموں والا ٹیلا، کیونکہ اس سے دو چشمے نکلتے ہیں، جنگ احد کے بعد اسے جبل الرماۃ بھی کہنے لگے، یعنی وہ ٹیلہ جس پر تیر اندازوں کا مورچہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے احد کے اسی جھکاؤ کو صف بندی کے لیے منتخب فرمایا، پشت پر پہاڑ تھا، سامنے جبل عینین پر پچاس تیر انداز مقرر فرما دیے جن کی سالاری عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو سونپی اور تاکید فرما دی کہ ہمیں فتح ہو یا شکست مگر تیر اندازوں کو کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑنی چاہیے، وہ ٹیلے پر بدستور جمے رہیں اور مقررہ مورچے سے ادھر ادھر نہ ہوں۔ (رسول رحمت ﷺ، تاریخ الخمیس فی احوال انفس النفیس)

قریش کی صف آرائی: قریش کی صف آرائی کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ لکھتے ہیں ”رسالہ دوسو گھوڑوں پر مشتمل تھا، ایک سو گھوڑے لشکر کے میمنہ پر تھے اور ایک سو میسرہ پر، میمنہ پر خالد بن ولید مامور ہوئے جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، میسرہ عکرمہ بن ابی جہل کے حوالے کر دیا گیا، ایک سو تیر اندازوں کی کمان عبداللہ بن ربیعہ کو سونپی گی، قلب کی فوج آگے بڑھی تو اس کے پیچھے عورتیں دفیں بجا بجا کر اور اشعار گا گا کر مردوں کو جوش دلا رہی تھیں،

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقْ نَمْشِي عَلَى النَّمَارِقِ

ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں، ہم قالینوں پر چلتی ہیں

إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقْ إِنْ تُدْبِرُوا نُفَارِقْ

آگے بڑھ کر مقابلہ کروگے تو تمہارے گلے لگ جائیں گی، پیٹھ پھیروگے تو تم سے جدا ہو جائیں گی۔

فِرَاقَ غَيْرَ وَامِقْ جدائی ایسی ہوگی جو نفرت کرنے والے کی ہوتی ہے۔

قریش نے علم طلحہ بن ابی طلحہ کو دیا، جو عبدالدار کے خاندان سے تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو اسلامی علم مصعب بن عمیر کے حوالے کر دیا، وہ بھی عبدالدار کے خاندان سے تھے۔ (ایضاً)

آغاز جنگ: مولانا آزاد رحمہ اللہ لکھتے ہیں ”جنگ کی ابتدا ابوعامر فاسق سے ہوئی، وہ قبیلہ اوس میں سے تھا، خدا جانے اسے کیوں یہ خیال ہو گیا تھا کہ میرے ہم قوم مجھے دیکھتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیں گے، اس کے ساتھ متفرق آدمیوں کا ایک گروہ تھا، انصار نے اسے دیکھتے ہی کہا او فاسق! خدا تجھے بینائی سے محروم کر دے، اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پتھر بھی پھینکے، پھر یہ کہتا ہوا لوٹ گیا کہ میرے دور ہو جانے کے باعث میری قوم کے خیالات بگڑ گئے ہیں۔

ابوسفیان نے طلحہ بن ابی طلحہ سے کہا کہ بدر میں بھی ہمارا جھنڈا عبدالدار ہی کے پاس تھا، وہاں ہم پر جو مصیبت آئی اس کا ذکر غیر ضروری ہے، لوگ جھنڈا ہی دیکھ کر میدان جنگ میں ثابت قدم رہتے ہیں، جھنڈا جگہ سے ہٹ جائے تو سب کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں، اے بنو عبدالدار یا تو اطمینان دلاؤ کہ جھنڈے کو بہر حال بلند رکھوگے یا اسے چھوڑ دو تاکہ ہم خود سنبھال لیں، بنو عبدالدار نے

جھنڈے کی حفاظت کے متعلق پورا اطمینان دلایا اور اس فرض کی بجا آوری میں خاندان کے بیشتر افراد کٹوا دیے۔ (رسول رحمت ﷺ)

تیر اندازوں کی غلطی: تیر اندازوں کے سر عسکر عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کو بار بار رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یاد دلاتے تھے اور کہتے تھے کہ میں تو حضور ﷺ کے حکم سے تجاوز نہ کروں گا، باقی سب کو بھی اس فرمان کا پورا پاس تھا لیکن وہ کہتے تھے کہ اس فرمان کا مطلب یہ نہیں کہ دشمن میدان جنگ بھی چھوڑ دے تو بدستور مورچے پر جمے رہو، چنانچہ چالیس تیر انداز جبل عینین سے اتر کر مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے اور صرف دس اپنے سر عسکر کے ساتھ مورچے پر قائم و اُستوار رہے، اسی غلطی نے دشمن کو ایک ایسی تدبیر پر عمل پیرائی کا موقع دے دیا جس سے مسلمانوں کی بدیہی فتح شدید جانی نقصان میں بدل گئی۔ (رسول رحمت ﷺ)

خالد بن ولید کا حملہ: خالد بن ولید کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی جنگی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں، انہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ اپنی شکست کی تلافی کا بہترین ذریعہ کیا ہے، چنانچہ فوراً اپنا رسالہ لے کر جبل اُحد کی شمالی جانب سے ہوتے ہوئے مشرقی سمت آ گئے، جبل عینین اور اُحد کے درمیان سے ان مسلمانوں پر حملہ کر دیا جن کا رخ بھاگنے والے قریش کے تعاقب میں مغربی جانب تھا، نیز وہ مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے، عکرمہ بن ابی جہل بھی خالد کے ساتھ ہو گیا۔

ایسے ہی حملے کی روک تھام کے لیے تیر انداز جبل عینین پر بٹھائے گئے تھے، لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے تاکیدی حکم کی تعبیر ظاہری حالات کے پیش نظر ایسے انداز میں کر لی، جس سے ان کی نیت پر تو کوئی زد نہیں پڑتی تھی، تاہم اس نقصان کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو اس تعبیر سے اسلامی لشکر، ملت اسلامیہ اور خود مقاصد تبلیغ اسلام کو پہنچا، پھر یہی تعبیر قریش مکہ کی مزاحمت کو ختم کرنے میں موجب تاخیر ہوئی، جو اسلام اور عربوں کے درمیان ایک دیوار کی حیثیت میں کھڑے ہو گئے تھے۔

خالد کا حملہ اس درجہ ناگہانی تھا گویا یکایک ایک بجلی مسلمانوں کے خرمن تنظیم و ترتیب پر آ گری اور اُن کی شاندار فتح شدید نقصان میں بدل گئی، جن چالیس تیر اندازوں نے مورچہ چھوڑنے کی

غلطی کی تھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا انجام کیا ہوا، لیکن جن دس نیک بختوں نے عبد اللہ بن جبیر کی سرکردگی میں مورچہ نہیں چھوڑا تھا وہ بھی شہادت پا گئے۔ (رسول رحمت ﷺ)

نزول آفات: جب تک جبل عینین کا مورچہ قائم تھا، مسلمان جس طرف بڑھتے تھے گردو پیش موت بکھیرتے جاتے تھے، خالد کے حملے نے صورت حالات بالکل منقلب کر ڈالی، حمزہ بن عبد المطلب ارطاۃ بن عبد شرحبیل کو قتل کر کے سباع بن عبد العزیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے، عین اس وقت وحشی نے حملے سے پیدا افراتفری دیکھ کر جبل عینین کے پاس سے حربہ حمزہ کی طرف پھینکا، جو ناف سے اوپر ان کے پیٹ میں گھسا اور ٹانگوں کے بیچ سے نکل گیا، وہ لڑکھڑائے، گرے اور جاں بحق ہو گئے، مصعب بن عمیر اسلامی فوج کے علمدار تھے، ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ سے تھام لیا، وہ بھی قلم ہو گیا تو علم کو سینے سے لگا لیا، اسی حالت میں انہیں عمرو بن قمیہ نے شہید کر دیا، مصعب شکل اور وضع قطع میں رسول اللہ ﷺ سے مشابہ تھے، اسی بناء پر ابن قمیہ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ محمد ﷺ کو قتل کر آیا ہے، ابو عامر فاسق کفر و شرک کی حمایت میں مصروف تگ و دو تھا، لیکن اس کے فرزند ارجمند حنظلہ جان ہتھیلی پر رکھے راہ حق میں سرگرم جہاد تھے، اتفاقیہ حنظلہ کی مڈبھیڑ ابو سفیان سے ہو گئی، قریب تھا ابو سفیان کا خاتمہ حنظلہ کے مقدس ہاتھوں سے ہو جاتا کہ مشرکین میں سے شداد بن الاسود نے حنظلہ کو شہید کر ڈالا۔ (رسول رحمت ﷺ)

خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات بھی چشمہائے زخم سے محفوظ نہ رہی، سعد بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے جو مسلمان نہیں ہوا تھا حضور ﷺ کا نیچے کا داہنا دانت شہید کر دیا اور اسی کی ضرب سے لب مبارک پر بھی زخم آیا، عبد اللہ بن شہاب نے پیشانی مبارک کو زخمی کیا، عمرو بن قمیہ نے ایک پتھر اس زور سے مارا کہ خود کی دو کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں، ایسے ہی حالات میں زبان حق ترجمان پر یہ الفاظ آئے "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کرتی ہے، پھر آپ ﷺ کی شفقت و رحمت بے پایاں یہی فرماتی رہی، اے خدا! میری قوم کو راہ ہدایت دکھا دے، یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں یا انہیں معاف کر دے۔

ابو عامر فاسق نے جو گڑھے خفیہ خفیہ کھدوائے تھے اور مسلمانوں کو ان کا پتا نہیں لگ سکا تھا، ان

میں سے ایک میں رسول اللہ ﷺ بھی گر گئے، علی بن ابی طالب نے آپ ﷺ کا دست مبارک پکڑا، طلحہ بن عبید اللہ نے سہارا دے کر کھڑا کیا، ابو عبیدہ بن الجراح نے دانتوں سے خود کی کڑیاں یکے بعد دیگرے کھینچ کر نکالیں اور اس عمل میں ان کے آگے کے دو دانت گر گئے، ابو سعید الخدری کے والد مالک بن سنان نے چہرہ مبارک سے خون چوس کر نکالا۔ (رسول رحمت ﷺ)

انسانی فداکاری کے معجزے: رسول اللہ ﷺ کے پاس تھوڑے سے صحابہ رہ گئے تھے، اسلامی لشکر میں خالد کے حملے سے افراتفری پیدا ہوئی، تو قریش از سر نو منظم ہو کر حملوں پر آمادہ ہو گئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کرتا ہے، ایک انصاری جن کا نام ایک روایت میں زیاد بن السکن اور دوسری روایت میں عمارہ بن زیاد السکن آیا ہے، پانچ یا سات انصار کو لے کر کھڑے ہو گئے، ان میں سے ایک ایک نے لڑتے لڑتے جان دے دی، سب سے آخر میں زیادہ بن السکن یا عمارہ بن زیاد السکن زخموں سے چور ہو کر گر گئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اسے میرے قریب لے آؤ، پھر اس پاک باز مجاہد نے اپنا رخسار پائے مبارک پر رکھ لیا، اسی حالت میں وہ جاں بحق ہوا، مولانا شبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں " آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ، لوگ اٹھا کر لائے، کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی"

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے کہ بوقت جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

ام عمارہ (نسیبہ بنت کعب الازنیہ) نے بھی بڑی دلیری سے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا حق ادا کیا، تلوار سے عمرو بن قمیہ کے کئی ضربیں لگائیں، لیکن اس نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں، اس لیے محفوظ رہا، خود ابن قمیہ نے ام عمارہ کے کندے پر شدید زخم لگایا جس کا نشان مدت العمر باقی رہا، یہی ام عمارہ ہیں جن کے فرزند حبیب بن زید بن عاصم نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا تھا۔ (مسیلمہ کو قتل کرنے والے دو شخص تھے، ایک وحشی، دوسرے حبیب بن زید، خود وحشی کا بیان ہے کہ میں مسیلمہ کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا تو ایک انصاری بھی بڑھے، میں نے حربہ مسیلمہ پر پھینکا اور وہ اس کے لگ گیا، انصاری نے بھی نہایت تیزی سے تلوار کا وار کیا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم دونوں میں سے کس کے وار سے مسیلمہ کا خاتمہ ہوا۔ (ابن ہشام)

ابو دجانہ نے اپنے جسم کو رسول اللہ ﷺ کے لیے ڈھال بنا دیا تھا، تیر پر تیر کھاتے گئے، حتی کہ جسم چھلنی ہو گیا، مگر ذرا بھی جنبش نہ کی تا کہ کوئی تیر حضور ﷺ تک نہ پہنچنے پائے، طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی یہ فرض بوجہ احسن انجام دیا۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ تیر دیتے جاتے تھے، ساتھ ہی فرماتے جاتے تھے اِرْمِ فِدَاكَ اَبِی وَاُمِّی (میرے ماں باپ قربان، چلاتے جاؤ) سعد مدت العمر اس محبت بھرے ارشاد مقدس پر فخر کرتے رہے، ابن قمیہ نے رسول اللہ ﷺ پر ایک سخت وار کیا، اس وار کو طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے برہنہ ہاتھ پر روکا، جس سے ہاتھ کٹ گیا اور ابن قمیہ کے ہاتھ کا زور کم ہو گیا، نیز رسول اللہ ﷺ نے دو زرہیں پہن کر رکھی تھیں، اس لیے آپ ﷺ بفضل اللہ گزند سے محفوظ رہے۔

انس اور ابن عوف: انس بن مالک کے چچا انس بن نضر بعض صحابہ کے پاس پہنچے، جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے، ان میں عمر اور طلحہ بن عبید اللہ بھی تھے، پوچھا: آپ لوگ کس لیے بیٹھے ہیں؟ جواب ملا کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے، انس نے کہا پھر آپ کے بعد زندگی کس کام کی؟ اٹھو اور اس مقصد کے لیے مر مٹو، جس کے لیے رسول اللہ ﷺ مر مٹے، یہ کہتے ہی انس کفار سے جنگ میں مشغول ہو گئے اور جب تک شہادت نہ پا گئے قتال سے نہ رکے، بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم پر کم و بیش ستر زخم تھے، نعش پہچانی نہیں جاتی تھی، انس کی ہمشیرہ نے انگلیاں دیکھ کر پہچانا، عبد الرحمن بن عوف کے منہ پر ایک پتھر لگا جس سے ان کا اگلا دانت ٹوٹ گیا اور بیس یا اس سے بھی زیادہ زخم لگے، بعض زخم پاؤں پر لگے تھے، جن کی وجہ سے وہ لنگڑے ہو گئے۔ (رسول رحمت ﷺ)

مسلمانوں کو بشارت: جس صحابی نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو پہچانا وہ کعب بن مالک تھے، انہوں نے پکار کر کہا، مسلمانو! بشارت ہو یہ رسول اللہ ﷺ ہیں، جو صحابہ مایوس اور شکستہ بیٹھے تھے یہ بشارت سنتے ہی ان کے جسموں میں گویا از سر نو جان پڑ گئی، وہ سب حضور ﷺ کی طرف دوڑے، حضور ﷺ گھاٹی کی طرف چلے، ابو بکر، عمر، علی، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، حارث طن صمہ اور بعض دوسرے مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے، طلحہ بن عبید اللہ نیچے بیٹھے اور ان کی مدد سے حضور ﷺ چٹان پر چڑھے، قریش کا ایک گروہ پہاڑ پر چڑھ آیا

تھا، عمر بن خطاب اور بعض دوسرے اصحاب نے زبردست مقابلہ کرکے اس گروہ کو پہاڑ سے اترنے پر مجبور کر دیا، علی بن ابی طالب اپنی سپر میں احد کے چشمے سے، جس کا نام مہرا تھا پانی لائے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، آپ ﷺ کو اس میں سے بدبو آئی لہذا پانی پیا نہیں، البتہ اس سے چہرہ مبارک کا خون دھویا۔ (رسول رحمت ﷺ)

اللہ اعلیٰ واجل: ابوسفیان اور اس کے ساتھی میدان میں پھر پھر کر رسول اللہ ﷺ، ابو بکر اور عمر کی نعشیں تلاش کرتے رہے، پھر ابوسفیان پہاڑ پر چڑھ کر اس مقام کے قریب پہنچا، جہاں مسلمانوں تک اس کی آواز جاسکتی تھی، اس نے پہلے پوچھا: مسلمانو! تم میں محمد ﷺ ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کوئی جواب نہ دیا جائے، پھر باری باری ابو بکر اور عمر کے متعلق پوچھا، کچھ جواب نہ ملا تو ابوسفیان نے کہا کہ سب مارے گئے، زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے، عمر چپ نہ رہ سکے اور بولے دشمن خدا، تو جھوٹ کہتا ہے، ہم سب زندہ ہیں، یہ سن کر کہا پھر ابن قمیہ جھوٹ کہتا ہے، کیونکہ میں تمہیں اس سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔

پھر ابوسفیان نے اپنے خاص بت ھبل کا نام لے کر کہا، تیرے لیے سربلندی ہو، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں نے نعرہ لگایا، اللہ اعلیٰ واجل، ابوسفیان نے کہا لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُم (ہمارے لیے عزیٰ ہے تمہارے لیے کوئی عزیٰ نہیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو اَللّٰہُ مَولَانَا وَلَا مَولَا لَکُم، اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا مددگار کوئی نہیں، پھر وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان آئندہ سال انہی دنوں میں جنگ کا وعدہ رہا۔ (رسول رحمت)

شہدا کی تدفین: لڑائی عملاً ختم ہو گئی لیکن قریش مکہ شقاوت و بے دردی سے باز نہ رہے، انہوں نے مقدس اسلامی شخصیتوں کی نعشوں کو بگاڑا جن میں سے حمزہ، عبداللہ بن جحش اور مصعب بن عمیر بطور خاص قابل ذکر ہیں، اس میں سب سے پیش پیش ابوسفیان کی اہلیہ ہند تھی، حمزہ کی ہمشیرہ حضرت صفیہ کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو وہ نعش دیکھنے کے لیے آئیں، رسول اللہ ﷺ نے نعش کی حالت کے پیش نظر انہیں روکا، وہ بولیں میں ماجرا سن چکی ہوں، لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں، چنانچہ بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر دعائے مغفرت کرتی ہوئی

لوٹ گئیں۔

رسول اللہ ﷺ نے تمام شہدا کو احد کے دامن میں دفن کرادیا، بعض قبروں میں دو دو شہیدوں کو رکھا گیا، انہیں غسل نہ دیا گیا اور اس وقت نماز جنازہ بھی نہ پڑھی گئی، مولانا شبلی فرماتے ہیں ”آٹھ برس کے بعد جب آپ ﷺ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپ ﷺ پر رقت طاری ہوئی، اس طرح آپ ﷺ نے پر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو۔ (سیرت النبی ج ۱ ص ۳۵۴) مصعب بن عمیر کا سر ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے، پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا، آخر پاؤں کو اِذخر کی گھاس ڈال کر چھپایا گیا، بعد میں ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن عوف کے سامنے اِفطاری کے لیے کھانا آیا تو شاید ذرا پر تکلف تھا، یہ دیکھتے ہی انہیں اُحد کا زمانہ یاد آگیا، جب بدنوں کو چھپانے کے لیے گھاس کاٹ کاٹ کر ڈالتے تھے، عبدالرحمٰن بیتاب ہو کر رونے لگے اور کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ (رسول رحمت ﷺ)

شہدا کی تعداد: مولانا ابوالکلام رحمہ اللہ آزاد نے میدان احد میں شہید ہونے والوں کی تعداد لکھی ہے، اس کے مطابق مہاجرین میں ۵، انصار (خزرج) کے ۶۴، انصار (اوس) کے ۱۶ اور متفرق اصحاب ۱۳ شہید ہوئے، کل تعداد شہدائے احد کی ۱۰۸ ہے۔ (رسول رحمت ﷺ)

کیا احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی؟: مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیادہ تر لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُحد میں شکست ہوئی، میرے نزدیک یہ تاثر صحیح نہیں، بلاشبہ اس جنگ میں تیر اندازوں کے جیش کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا جانی نقصان بہت ہوا، لیکن شکست وہ ہوتی ہے جس میں شکست خوردہ میدان چھوڑ دیتا ہے، احد میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا، قریش مکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر رخصت ہو گئے، اگلے روز مسلمانوں نے حمراء الاسد تک قریش کا تعاقب کیا اور تین روز وہاں ٹھہرے رہے، اس لیے اُحد کو شکست قرار دینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ (رسول رحمت ﷺ)

آئندہ آیات میں غزوہ اُحد کے واقعات کا اجمال بیان ہو گا، یہاں ابتدائی مقام پر ضروری سمجھا گیا کہ قارئین کی خدمت میں اس واقعہ کی چند جھلکیاں پیش کر دی جائیں تاکہ تلاوت میں اور اس

کی تفسیر پڑھنے میں اشتیاق زیادہ ہو۔

معرکہ بدر میں نصرت خداوندی

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ{۱۲۳} إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ أَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ{۱۲۴} بَلَى إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هَذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ {۱۲۵} وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرَى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ{۱۲۶} لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ{۱۲۷} آل عمران

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ اللہ نے بدر میں تمہاری مدد فرمائی، حالانکہ تم کمزور حالت میں تھے، پس اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار ہو۔ جب آپ مومنین سے فرمارہے تھے کیا تمہیں یہ کافی نہ ہو گا کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد فرمادے جو اتارے گئے ہوں۔ ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور دشمن تم پر فوراً آپہنچے تو اللہ تمہاری مدد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعہ جن پر نشان لگے ہوئے ہوں گے۔ اور اللہ نے یہ مدد صرف اس لیے کی کہ تمہارے لیے بشارت ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہوں، اور مدد نہیں ہے مگر صرف اللہ کی طرف سے جو زبردست حکمت والا ہے۔ تاکہ کافروں میں سے ایک گروہ کو ہلاک کردے یا ان کو ذلیل کردے تو وہ واپس ہو جائیں محروم ہو کر۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ: اور البتہ تحقیق ہم نے بدر کے میدان میں تمہاری مدد کی جب کہ تم کمزور حالت میں تھے، اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے غزوہ احد کا ذکر فرمایا، اس کے بعد جنگ بدر کا ذکر فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ بدر کے دن مسلمان انتہائی فقر و عجز میں تھے، جب کہ کافر لوگ انتہائی شدت اور قوت میں تھے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین پر غالب کیا تو یہ بات مضبوط ترین دلائل میں سے ہو گئی کہ ایک داناو بینا، عاقل انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی کسی

غرض اور مطلوب کے حصول کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ وتوکل کرے اور اللہ ہی کی ذات سے مدد مانگے۔

اس قصہ کو یہاں تاکیداً ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ اس سے پہلے آل عمران کی آیت ۱۲۰ میں فرمایا تھا کہ اگر تم لوگ صبر سے کام لوگے، تقویٰ اختیار کروگے تو تمہیں کافروں کا کوئی مکروفریب کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاسکے گا، پھر آل عمران کی آیت ۱۲۲ میں فرمایا کہ اہل ایمان اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ رکھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں کا ذکر کیا جو بزدلی اور جبن دکھانا چاہ رہے تھے، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کا دوست ومددگار ہے، اس لیے اہل ایمان اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں، یعنی جس شخص کا اللہ مددگار ہو، اللہ معین ہو تو اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ بزدلی، کمزوری اور جبن دکھائے، پھر قصہ بدر کو تاکیدی طور پر ذکر فرمایا کیونکہ بدر میں مسلمان انتہائی کمزور تھے، لیکن جب اللہ تعالیٰ مددگار ومعین بن جائے تو وہ اپنے مطلوب کے حصول میں کامیاب ہوجاتے ہیں، وہ اپنے دشمن پر غالب آجاتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی فرمایا گیا ہے۔

بدر کیا ہے؟: امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، بدر ایک کنویں کا نام ہے، اس کنویں کے مالک کا نام بدر تھا، اسی مناسبت سے اس کنویں کا نام بھی بدر رکھا گیا، واقدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بدر کنویں کا نام ہے جیسا کہ کسی شہر کا نام ہوتا ہے اسی طرح کنویں کا نام بھی ہے، یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ہے۔

بدر مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی اسّی میل کے فاصلہ پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے، اس وقت اس کو اس لیے اہمیت حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی اور یہ عرب کے ریگستانی میدانوں میں بڑی چیز تھی، توحید اور شرک کے درمیان یہیں سب سے پہلا معرکہ بروز جمعہ ۱۷، رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۱۱ مارچ ۶۲۴ء کو پیش آیا تھا، یہ غزوہ بظاہر تو ایک مقامی جنگ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا، اسی لیے قرآن کی زبان میں اس کو یوم الفرقان کہا گیا ہے، فرنگی مؤرخوں نے بھی اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے، امریکی پروفیسر ہٹی اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربین میں کہتا ہے: یہ اسلام کی سب سے پہلی فتح مبین تھی۔ (معارف القرآن للمفتی)

وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ: یہ حال کا مقام ہے، واؤ حالیہ ہے، أَذِلَّةٌ ذلیل کی جمع ہے، لیکن یہاں یہ معنیٰ مراد نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے حبیب ﷺ اور اپنے حبیب ﷺ کے جانثاروں کا ذکر فرمایا ہے، دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے بہت ہی واضح الفاظ میں فرمایا کہ عزت کا حقدار اللہ ہے، اللہ کا رسول ہے اور عزت کے حقدار اہل ایمان ہیں۔ (المنافقون ۸) یہاں جو أَذِلَّةٌ قرار دیا اور دوسرے مقام پر انہیں عزت دار قرار دیا گیا تو ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے، کیونکہ وہ عزت اپنے اصلی معنوں میں ہے، جب کہ یہاں أَذِلَّةٌ مشہور معنوں کے علاوہ دوسرے غیر معروف معنوں میں ہے، یہاں أَذِلَّةٌ کا معنیٰ ہے بدر میں تمہاری تعداد تھوڑی تھی، بدر میں تم کمزور حالت میں تھے، بدر میں تمہارے پاس اسلحہ کم تھا، بدر میں تمہارے پاس مال و دولت کی قلت تھی، بدر میں تم لوگ دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، معلوم ہوا کہ أَذِلَّةٌ کا معنیٰ کمزور ہے، یعنی تم دشمن کے مقابلہ کی سکت نہیں رکھتے تھے، اس کی نقیض عزت ہے، عزت کا معنیٰ قوت اور غلبہ ہے، یہ مروی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بدر کے دن تین سو سے کچھ اوپر تھی، اس دن مسلمانوں کے پاس ایک ہی گھوڑا تھا، ان میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی پیدل تھی، کئی کئی لوگ ایک ایک اونٹ پر سوار تھے، کفار مکہ کے پاس ایک ہزار جنگجو تھے، ان کے پاس ایک سو گھوڑے تھے، بہت بڑی تعداد میں اسلحہ تھا، پھر کافروں کی پوری تیاری تھی۔

ایک مفہوم اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافروں کی نگاہوں اور عقیدہ میں یہ لوگ أَذِلَّةٌ سمجھے جاتے تھے کیونکہ ان کے پاس تعداد زیادہ نہیں تھی، ان کے پاس اسلحہ زیادہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بارے میں کافروں کی گندی زبانوں سے نکلے ہوئے اس جملہ کو قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے وہ کہتے تھے کہ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ (الْمُنَافِقُونَ: ۸) سب سے زیادہ عزت والے لوگ ذلیل لوگوں کو باہر نکالیں گے۔ یہاں أَذِلَّةٌ لانے کا مقصد یہ ہے کہ تم لوگ کافروں کی نگاہ میں ذلیل تھے۔

تیسری وجہ یہاں أَذِلَّةٌ لانے کی یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مکہ مکرمہ میں کفار مکہ کو بڑی قوت و ثروت میں دیکھا تھا، اس وقت تک ان لوگوں نے کفار مکہ پر غلبہ نہیں پایا تھا، مسلمانوں

کے دلوں میں کافروں کی ہیبت، رعب اور دبدبہ اب تک باقی تھا، ان کی بڑائی ان کے دلوں میں ابھی تک قائم تھی، اسی وجہ سے وہ ان سے ڈرتے اور خوف کھاتے تھے۔

مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں أَذِلَّةٌ کے یہ معنیٰ کیے ہیں۔ ① تم تھوڑے تھے تمہاری مدد کی۔ (اوضح التفاسیر) ② تمہارے پاس سواریاں اور بہت زیادہ اسلحہ نہیں تھا۔ (البحر المدید) ③ حالات کی کمزوری، سواریوں اور مال کی قلت، (تفسیر الوسیط) ④ قلت، حالات کی کمزوری، ہتھیاروں کی کمی، مال کی قلت، دشمن سے مقابلے کی طاقت نہ ہونا۔ (اللباب) ⑤ تمہاری تعداد تھوڑی تھی تاکہ وہ جان لیں کہ مدد اللہ کی طرف سے آتی ہے، تعداد کی کثرت اور تیاری کی وجہ سے مدد نہیں آتی۔ (ابن کثیر) ⑥ أَذِلَّةٌ ذکر فرمایا ذلائل نہیں، حالات کی کمزوری، سواریوں اور ہتھیاروں کی قلت مراد ہے۔ (بیضاوی) ⑦ تعداد اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے۔ (جلالین) ⑧ أَذِلَّةٌ یعنی وہ تھوڑے تھے۔ (کشاف) ⑨ أَذِلَّةٌ اس کی واحد ذلیل ہے، وہ شخص جس کے پاس طاقت اور قوت نہ ہو، ان کی اسلحہ اور جانوروں کے لحاظ سے بھی بہت تھوڑی تیاری تھی، توشہ اور کفایت کرنے والی چیزوں کی بھی کمی تھی، ضرورت پوری کرنے والی اشیاء بھی کم تھیں۔ (تفسیر المراغی) ⑩ تم اپنی تعداد اور اپنی تیاری میں أَذِلَّةٌ (تھوڑے) تھے، تین سو سے کچھ اوپر، جانوروں کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی کا سامنا تھا۔ (غریب القرآن) ⑪ عَدد (تعداد) اور عُدد (جنگ کی تیاری) کی قلت مراد ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ: تم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ڈٹے رہنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم لوگ اپنے اوپر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے نصرت و مدد کے انعام کی وجہ سے شکر گزار بن جاؤ، یا اللہ تعالیٰ تم پر کسی دوسری نعمت کے ذریعے انعام فرمائے جس کا تم شکر ادا کرو، تو یہاں اللہ تعالیٰ نے انعام کی جگہ پر شکر کو رکھا ہے کیونکہ شکر کا سبب انعام ہی ہوتا ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ منافقین کے کید اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کے لیے تقوی اور صبر بتلایا ہے، انہی دو چیزوں کے اندر ساری تنظیمی جدوجہد اور فتح مبین کا راز مضمر ہے (معارف)

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ:

غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی یہ امداد اس وقت ہوئی تھی (جب کہ آپ) اے محمد ﷺ مسلمانوں سے یوں فرمارہے تھے (کہ کیا تم کو) تقویت قلب کے لیے (یہ بات کافی نہ ہوگی کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ) جو اسی کام کے لیے آسمان سے (اتارے جائیں گے) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجے کے فرشتے ہوں گے ورنہ جو فرشتے پہلے سے زمین پر موجود تھے ان سے بھی یہ کام لیا جاسکتا تھا۔ (فہم القرآن)

شان نزول: غزوہ بدر میں مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کررہے ہیں یہ بات ان پر بہت بھاری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ سے لے کر مُسَوِّمِينَ تک نازل فرمائی، کرز کو جب شکست کی خبر پہنچ گئی تو اس نے مشرکوں کی مدد نہ کی جبکہ مسلمانوں کی مدد بھی پانچ ہزار فرشتوں سے نہ کی گئی۔

بَلَى إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هَذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ: پھر اوپر کے سوال کا خود جواب اس طرح ارشاد فرمایا (ہاں! کیوں نہیں) کافی ہوگی، اس کے بعد اس امداد میں مزید اضافہ کا وعدہ اس طرح فرمایا کہ مقابلہ کے وقت (اگر مستقل رہو گے اور تقوی پر قائم رہو گے) یعنی کوئی امر خلاف اطاعت نہ کرو گے (اور وہ لوگ تم پر یکبارگی حملہ کردیں گے) جس میں عادۃً کسی مخلوق سے مدد پہنچنا مشکل ہوتا ہے (تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو) علامت کے طور پر (ایک خاص وضع بنائے ہوں گے) جیسے عام جنگوں میں اپنی اپنی فوج کی پہچان کے لیے کوئی خاص وردی ہوتی ہے، اس میں اشارہ ہے کہ وہ فرشتے خاص اسی کام کے لیے بھیجے جائیں گے، اس خبر دینے سے یہ فائدہ ہے کہ جو شخص کسی خاص کام کے لیے آتا ہے اس کام کی اس سے زیادہ امید ہوتی ہے تو اس مکرر در مکرر وعدہ سے اور زیادہ دلوں کی تقویت کا فائدہ حاصل ہوا۔ (تفسیر فہم القرآن)

ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کیلئے پہلے تو ایک ہزار فرشتے بھیجے پھر تین ہزار ہوگئے پھر پانچ ہزار، یہاں اس آیت میں تین ہزار اور پانچ ہزار سے مدد کرنے کا وعدہ ہے اور بدر کے واقعہ کے بیان کے وقت ایک ہزار فرشتوں کی امداد کا وعدہ ہے۔ فرمایا أَنِّي مُمِدُّكُمْ

بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (۸۔ الانفال:۹) اور تطبیق دونوں آیتوں میں یہی ہے کیونکہ مردفین کا لفظ موجود ہے پس پہلے ایک ہزار اترے پھر ان کے بعد تین ہزار پورے ہوئے آخر پانچ ہزار ہو گئے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعدہ جنگ بدر کے لیے تھا نہ کہ جنگ احد کیلئے، بعض کہتے ہیں جنگ احد کے موقع پر وعدہ ہوا تھا مجاہد عکرمہ ضحاک زہری موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کا یہی قول ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان میدان چھوڑ کر ہٹ گئے اس لیے یہ فرشتے نازل نہ ہوئے۔ (ابن کثیر)

پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کرنے کو تین چیزوں کے ساتھ مشروط کیا گیا، ایک صبر دوسرا تقویٰ اور تیسرا مشرکین کی طرف سے اچانک حملہ۔ یہ شرط پائی جائے گی تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد آئے گی، جب شرط نہیں پائی جائے گی تو مشروط بھی نہیں پایا جائے گا۔ فور کا معنیٰ اُبلنے اور جوش مارنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، جب ہنڈیا میں پانی اُبلنے لگتا ہے تو اسے فور کہتے ہیں، قرآن کریم میں وفارالتنور کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے، لیکن سُرعت اور جلدی کے معنیٰ میں یہاں اِستعمال ہوا ہے، کہ اگر مشرکین اَچانک اور پھرتی سے تم پر حملہ آور ہوئے تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد آئے گی۔

مُسَوِّمِيْنَ: مُسَوِّمِينَ، سومة، سِيمَةٌ، سے ہے، جس کے معنی علامت اور نشان کے ہیں اَلْخَيْلُ الْمُسَوَّمَةُ، ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جن پر نشان لگے ہوئے ہوں، فرشتوں کے لیے مُسَوِّمِين کی صفت سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خاص اہتمام کے ساتھ اس مہم کے لیے بھیجے گا اور وہ خاص اس جنگ کے لیے اپنے اِمتیازی نشان اور بیج لگائے ہوئے ہوں گے۔ (تدبر قرآن)

فرشتے زرد عماموں کے ساتھ اپنے کو نشان لگائے ہوئے تھے، چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کی دُموں اور پیشانیوں پر سفید رنگ کی روئی تھی، ایک مطلب یہ ہے کہ فرشتوں نے عمامے باندھ رکھے تھے جن کے شملے کاندھوں کے درمیان لٹکے ہوئے تھے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ فرشتوں کی علامت بدر کے دن سفید عمامے تھے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے تمہیں مدد اس لیے دی تاکہ تمہیں فتح کی خوشخبری دی جائے اور تمہارے دلوں کی تسلی واطمینان کا سامان ہو جائے، دشمنان اسلام کی کثرت اور اپنی قلت کی پروانہ کرو، کسی کام کے لیے اسباب ووسائل اختیار

کرنا فطری انسانی میں شامل ہے، جب ان حالات میں مدد و نصرت آجائے تو انسان کے قلب و جگر میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ جایا کرتی ہے، جس سے بندے کو اطمینان قلبی ملتا ہے، تو واضح کر دیا کہ مدد و امداد تمہارے لیے بشارت ہے، کہ تمہیں فتح دی جائے گی۔ اشارہ دیا گیا ہے کہ فرشتے اس دن مباشر تاً قتال نہیں کر رہے تھے، ان کی امداد صرف اہل ایمان کے دلوں کی تسلی اور تقویت کا باعث تھی۔

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ: حقیقی فتح، نصرت اور امداد اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے، فوجوں کی کثرت، اسباب حرب وضرب کی فراوانی کے باعث نہیں ہوتی، انسان ہوں یا ملائکہ سب کے حالات، سب کے افعال کو وجود دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ ذات عالی غلبہ والی ہے، وہ سب پر غالب آسکتا ہے لیکن اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا، وہ حکمت والا ہے وہ اپنی حکمت کے تحت جس کی چاہتا ہے مدد و نصرت کرتا ہے، خواہ یہ مدد کسی ذریعے سے ہو یا بغیر کسی ذریعے کے ہو اور وہ جسے چاہتا ہے بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے، اگر وہ مدد کرتا ہے تو اپنی مہربانی سے کرتا ہے، اس پر لازم نہیں ہے۔ مسلمان کو ایک درس بھی دے دیا کہ اس کا توکل اور بھروسہ صرف ایک اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ مسلمان کو خبردار کیا جارہا ہے کہ اس کا ایمان تب ہی مکمل و کامل ہو سکتا ہے جب اس کا اعتماد واعتقاد اسباب و وسائل سے ہٹ کر خالص مسبب الاسباب پر ہو یہاں عزیز سے اشارہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کی طرف ہے، جب کہ حکیم سے اشارہ اس کے کمال علم کی طرف ہے۔ اپنی مخلوق کی حاجت اس سے پوشیدہ نہیں اور مخلوق کی دعائیں اسے عاجز نہیں کر سکتیں، جب صورتحال یہ ہو تو اس کی رحمت سے نصرت و مدد کی توقع رکھی جاسکتی ہے، اس کے فضل و کرم سے اِعانت و امداد کی آس لگائی جاسکتی ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ: مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تم کو اس لیے غلبہ دیا کہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک فرمادے یا ان میں سے بعض کو ذلیل اور خوار کر دے پھر ناکام ہو کر لوٹ جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بدر میں ستر کافر مارے گئے جو اپنی جماعت کے رؤسا تھے اور ستر قید کر کے لائے گئے، جو بچے تھے وہ ناکام ہو کر واپس ہو گئے ان کی تعداد اور سامان نے کچھ کام نہ دیا اللہ کی مدد کی وجہ سے مسلمان غالب ہوئے حالانکہ وہ تھوڑے سے

تھے۔ (انوار البیان) یہ فرمان بدر میں کی جانے والی نصرت ومدد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کہ وہاں مدد ونصرت کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کفار کے ایک گروہ کو ہلاک کر دیا جائے اور بعض کو ذلیل ورسوا کیا جائے۔ کَبت کا معنیٰ ہوتا ہے منہ کے بل کسی کو پچھاڑنا اور گرانا، عربی محاورے میں کہا جاتا ہے کہ کَبَتُّهُ فَانْكَبَتَ میں نے اسے منہ کے بل گرایا وہ منہ کے بل گر گیا، اس سے مراد رسوا کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، شکست دینا، غیظ وغضب کرنا اور ذلیل کرنا ہے، حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ نے یہ سارے معانی کبت کی تفسیر میں ذکر فرمائے ہیں۔ خائبین یہ خیبہ سے ہے اس کا معنیٰ ہے محروم ہونا، خیبت اور یاس میں فرق یہ ہے کہ خیبت کسی چیز کی توقع کے بعد ہوتی ہے، یاس کبھی توقع کے بعد ہوتا اور کبھی پہلے، یاس کی نقیض رجا (امید) ہے جب کہ خیبہ کی نقیض ظفر (کامیابی) ہے۔

مختار کل اللہ ہے

سوال یہ آیت مبارکہ کس مناسبت سے نازل ہوئی ہے؟

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ {۱۲۸} آل عمران

جواب ترجمہ: (اے میرے حبیب!) ﷺ اس معاملے میں آپ کو کوئی اختیار نہیں اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے اس لیے کہ وہ ظالم ہیں۔

شان نزول: ① انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کا اگلا دانت شہید ہو گیا تھا اور آپ ﷺ کا چہرہ خون آلود ہو گیا تھا، آپ ﷺ کے چہرے سے خون بہنے لگا، آپ ﷺ اس وقت فرما رہے تھے وہ قوم کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے جو اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگ دے، جب کہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف بلا رہا ہے راوی کا کہنا ہے کہ اس پر اللہ نے یہ آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ نازل کی۔ (اسباب النزول)

② رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز میں منافقوں میں سے فلاں فلاں شخص پر لعنت کی اس پر خدا نے یہ آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ نازل کی۔ (بخاری، مسلم)

③ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کا رباعی دانت ٹوٹ گیا اور آپ

ﷺ کے سر پر زخم آگیا، جس سے خون بہنے لگا، آپ ﷺ فرمارہے تھے وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کو زخمی کر دیا اور اس کا رباعی دانت توڑ دیا حالانکہ وہ انہیں ان کے رب کی طرف بلا رہا تھا خدا نے اس پر یہ آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ نازل کی۔ (اسباب النزول)

④ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز فجر میں قرأت سے فارغ ہوتے اور تکبیر کہتے اور سر اوپر اٹھاتے تو کہتے تھے سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ ۔ پھر فرماتے اللّٰهُمَّ أَنْجِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ، وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ، وَعَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ، وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ، اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ، وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ، اللّٰهُمَّ الْعَنْ لَحْيَانَ وَرِعْلًا وَذَكْوَانَ، وَعَصِيَّةَ عَصَتِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ، اے اللہ ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور کمزور مومنوں کو نجات دے، اے اللہ! مضر کے قبیلے پر سختی کر اور ان پر پکڑ سخت کر، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے کا سا قحط نازل کر دے، اے اللہ! لحیان رعل اور ذکوان اور عصیہ پر لعنت کر، انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی ہے، پھر ہمیں اطلاع ملی کہ انہوں نے یہ آیت لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ نازل ہونے کے بعد یہ عمل ترک کر دیا۔ (بخاری)

⑤ احد کے میدان میں نبی کریم ﷺ کو سخت اذیت پہنچی تھی، آپ ﷺ کے ستر ساتھی شہید کر دیے گئے تھے، چچا کو بے دردی سے شہید کیا گیا تھا، شہدا کا مثلہ کیا گیا تھا، آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے، آپ ﷺ کا چہرہ انور خود کے پیوست ہو جانے کی وجہ سے شدید زخمی ہو گیا تھا، آپ ﷺ سخت پریشان ہوئے، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ایسی قوم کو کیسے ہدایت دے گا جس نے اپنے نبی کے ساتھ یہ معاملہ کیا، پھر نماز فجر کے بعد آپ ﷺ کو رکوع کے بعد مخالفین کے خلاف بد دعا اور لعنت کرتے سنا گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ میرے نبی کسی کو راستے سے ہٹانا اور کسی کو راستے پر لانا یہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، ہدایت میرے پاس سے ملتی ہے، چاہے تو میں ان لوگوں کی توبہ قبول کر لوں، چاہے تو میں ان لوگوں کو عذاب دوں، چنانچہ جن جن لوگوں پر آپ ﷺ نے بد دعا کی ان لوگوں کو کچھ دنوں بعد اللہ نے ہدایت کی دولت سے مالا مال کر کے آپ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

مسند احمد کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے چار آدمیوں کے خلاف بد دعا کی تھی اللہ نے انہیں ہدایت کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا، انسانی دل اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جس کا دل جدھر چاہے اُدھر ہی پھیر سکتا ہے۔

⑥ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم میں ستر (۷۰) لوگ بنی سلیم کے دو قبیلوں عصیہ اور ذکوان کی طرف گئے، ان لوگوں نے ان سب کو قتل کر دیا تھا، جس پر نبی ﷺ نے چالیس دن تک ان کے خلاف بد دعا فرمائی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (زاد المسیر)

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ: نبی کریم ﷺ سے فرمایا جارہا ہے کہ آپ ﷺ کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں یا توبہ کرنے پر مجبور کریں، نہ ہی آپ انہیں منع کر سکتے ہیں کہ یہ ایمان نہ لائیں اور توبہ نہ کریں، نہ ہی آپ ﷺ انہیں عذاب دینے کا اختیار رکھتے ہیں، یہ سارے اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے کہ انہیں ذلیل و رسوا کرے، یا اسلام لانے کی صورت میں ان کی توبہ قبول کرے، یا جرائم و نافرمانیوں پر اصرار کرنے کی وجہ سے انہیں عذاب دے، آپ ﷺ میرے بندے ہیں، آپ میرے احکامات کے پابند ہیں، آپ انہیں ڈرائیں اور ان سے جہاد کریں۔ یہ ظالم لوگ ہیں اللہ ان کے ظلم و جرم کی وجہ سے انہیں سزا دے گا، انہیں عذاب سے دوچار کرے گا۔

مالک کل جہاں اللہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ {۱۲۹} آل عمران

جواب ترجمہ: اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ مغفرت فرماتا ہے جس کی چاہے اور عذاب دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ غفور رحیم ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: زمین اور آسمان میں جو کچھ بھی ہے اسے پیدا کرنے والا اللہ

ہے، اس پر ملکیت اللہ کی ہے، اس پر تصرف اللہ کا ہے، اس پر تدبیر اللہ کی چلتی ہے، آسمان وزمین میں رہنے والی کوئی مخلوق اس سے یہ چیزیں چھین نہیں سکتی، کوئی اس سے جھگڑا نہیں کر سکتا، کوئی اس سے معارضہ نہیں کر سکتا۔ اس کے معاملات میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے، وہ اپنی منشاء کے مطابق کام کرتا ہے، وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ: وہ ایسی ذات ہے جو جس کے لیے چاہے معافی ومغفرت کا پروانہ عطا فرمائے، اہل ایمان میں سے جسے چاہے معاف کر دے، ان کے گناہوں پر اپنے فضل وکرم سے عذاب نہ دے اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا، وہ کسی کو عذاب دے تو یہ اس کے عدل میں سے ہے۔ اس کی مشیت حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتی ہے،

غزوہ بدر میں گرفتار ہونے والوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا، جب کہ اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ ان گرفتار شدگان کے خون سے دھرتی کو لالہ زار بنایا جاتا تو بہتر تھا، مگر چھوڑ دینے کو بھی قبول فرما لیا، پھر کسی بھی مقام پر انہیں طعنہ نہیں دیا گیا، اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے ان شرکائے بدر کی تعریف کی ہے، ان کے فضائل ومناقب بیان کیے گئے ہیں، معرکہ احد میں جبل رماۃ چھوڑ دینے والوں کو بھی معافی کا پروانہ دیا گیا، کسی پر کوئی عتاب اور کوئی سزا نہیں مقرر کی گئی، ہلکے پھلکے انداز میں انہیں اشارہ دیا گیا کہ وہ جبل رماۃ کو نہ چھوڑتے تو بہتر تھا۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مغفرت کرنے والا ہے، وہ مغفرت ومعافی کو پسند کرتا ہے وہ رحیم ہے جس کی رحمتیں بے پایاں ووسیع ہیں، وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، وہ اپنے بندوں کو سارے گناہوں پر نہیں پکڑے گا، وہ ان کے گناہوں میں سے بہت سے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

سود خوری، نیک وبرے اعمال کا انجام

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ {۱۳۰} وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ {۱۳۱} وَأَطِيعُوا اللهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ {۱۳۲}

وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ {۱۳۳} الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ {۱۳۴} وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ {۱۳۵} أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ {۱۳۶} آل عمران

جواب ترجمہ: اے اہل ایمان! سود مت کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور جلدی آگے بڑھو مغفرت کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور جنت کی طرف جس کا عرض ایسا ہے جیسے تمام آسمان اور زمین، وہ تیار کی گئی ہے متقیوں کے لیے۔ جو خرچ کرتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں، اور جو ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور جو لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے، اور وہ لوگ جنہوں نے جب کوئی برا کام کیا یا اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اللہ کو یاد کیا اور اپنے گناہوں کی مغفرت چاہی اور گناہوں کو کون بخشے گا سوائے اللہ کے اور انہوں نے اپنے کیے پر اصرار نہیں کیا وہ جانتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کا بدلہ مغفرت ہے ان کے رب کی طرف سے اور باغ ہیں جن کے نیچے جاری ہیں نہریں ان میں ہمیشہ رہیں گے اور اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً: اللہ تعالیٰ اپنے اہل ایمان بندوں کو وصف ایمان سے مخاطب کر رہا ہے، کیونکہ وہی لوگ اس خطاب سے استفادہ کے اہل ہیں، یہ بات انہی کو یاد کروانا ہے جو ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں جہان میں سب سے زیادہ اچھی اور سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو سودی لین دین سے اور سود خوری سے روک رہا ہے، اہل جاہلیت سودی قرضہ دیتے تھے مدت مقرر ہوتی تھی اگر اس مدت پر روپیہ وصول نہ ہوتا تو مدت بڑھا کر سود پر سود بڑھا دیا کرتے تھے، اسی طرح سود در سود ملا کر اصل رقم کئی گنا بڑھ جاتی، اللہ تعالیٰ ایمانداروں

کو اس طرح ناحق لوگوں کے مال غصب کرنے سے روک رہا ہے۔

یہ گناہ ایسا ہے جو انسان کو خالص دنیادار بنا دیتا ہے۔ سود خوروں کے دلوں میں تقویٰ اور خوف باقی نہیں رہتا مال زیادہ ہو جانا ہی ان کا وظیفہ زندگی بن جاتا ہے۔ اور مخلوق پر رحم کھانے کا ان میں جذبہ رہتا ہی نہیں۔ یہ جو فرمایا ہے کہ چند در چند سود نہ کھاؤ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ تھوڑا بہت کھانا جائز ہے۔ کیونکہ سود کا ایک درہم لینا بھی حرام ہے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سود کا ایک درہم بھی کوئی شخص کھاتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ وہ سود کا ہے تو وہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، احمد، دار قطنی بحوالہ انوار البیان)

جو لوگ سود پر رقمیں دیتے ہیں عموماً ان کے اصل مال سے سود کا مال بڑھ جاتا ہے۔ اور ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ماہانہ مقررہ فیصد پر رقم قرض دیتے ہیں پھر جب وقت پر ادا نہیں ہوتا تو اصل اور سود دونوں پر سود لگا دیتے ہیں اور جب تک اصل رقم اور سود ادا نہ ہو گا ہر ماہ سود بڑھتا ہی رہے گا۔ اصل پر اور سود پر برابر سود کا اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس طرح سے اضعافاً مضاعفہ (چند در چند گنا) ہوتا چلا جاتا ہے۔ سود خوروں میں جو طریقہ مروج ہے آیت کریمہ میں اس کا ذکر فرما دیا ہے۔ کوئی سود خور فاسق یہ نہ سمجھ لے کہ تھوڑا بہت سود ہو تو جائز ہے (العیاذ باللّٰہ من ذالک) سود خوری کا خصوصی ذکر اس جگہ غزوہ کے ذیل میں بیان فرمانا اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ سود خور کا جہاد میں حوصلہ نہیں ہو سکتا وہ اپنے مال کی وجہ سے ایمان کے تقاضے پورا کرنے سے عاجز رہے گا۔ (انوار البیان)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ: یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم لوگ تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ، پتہ چلا کہ کامیابی کے لیے تقویٰ اختیار کرنا لازمی ہے، تقویٰ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پورا کرنا ہے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے ان سے رکنا ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ: اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ دوزخ کی آگ سے بچو، کیونکہ دوزخ میں چلے جانا بڑی ناکامی ہے، وہ لوگ بہت بدنصیب ہیں جو دوزخ میں چلے جائیں گے، دوزخ کی آگ بہت سخت ہے، وہاں لوگوں اور پتھروں کو ایندھن بنایا جائے گا، دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کے مقابلے میں بہت ہی سخت ہے، دوزخ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ آگ نہیں ہے جس میں گناہ

گار مسلمان داخل ہوں گے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سود کھانے والا کفر کے گڑھے کے کنارے کھڑا ہے، اس میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ دوزخ بالذات کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور بالعرض گناہ گاروں کے لیے ہے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت سب سے زیادہ خوف زدہ کرنے والی ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس دوزخ سے ڈرایا ہے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ: اللہ تعالیٰ یہاں کامیابی، کامرانی اور فائز المرامی کا ایک بہترین طریقہ بتارہے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم لوگ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، پتہ چلا کہ رحم کا مستحق بننے کے لیے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بہت ضروری ہے۔

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ: اللہ تعالیٰ یہاں فرمارہے ہیں کہ تم لوگ مغفرت کی طرف دوڑو، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی کرواؤ، جرائم پر توبہ اور استغفار کرو، مغفرت کا مستحق تب ہی ٹھہرا جاسکتا ہے جب اسلام، توبہ اور اخلاص کی دولت حاصل کرے، جنت کی طرف آگے بڑھو، جس کا عرض آسمانوں اور زمینوں جتنا ہے، چوڑائی کا تذکرہ کیا گیا لیکن جنت کی لمبائی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اس کی چوڑائی اگر آسمانوں اور زمینوں جتنی ہے تو اس کی لمبائی اندازہ لگانے والے خود ہی لگالیں کہ کتنی ہوگی، یہ اللہ کی نعمتوں سے بھرپور ایک جگہ کا نام ہے، جہاں ہمہ اقسام وانواع کی نعمتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے جنت متقی لوگوں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ یہاں آسمانوں جتنی چوڑائی جنت کی بتائی گئی ہے، یہ مبالغہ کے لیے ہے، کیونکہ عرب لوگ جب کسی چیز کی وسعت بیان کرتے ہیں تو اس میں عرض کا لفظ بول کر اس میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں، یہاں جنت کو آسمانوں جتنی چوڑائی بتاکر محدود کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت وکشادگی بیان کرنا مقصود ہے۔

اہل جنت جب جنت میں جائیں گے تو وہاں اپنی آنکھوں سے انواع واقسام کی نعمتیں دیکھ کر مسرت وشادمانی سے نہال ہوں گے، وہاں جن بستروں پر بیٹھیں گے ان کا اَستر نرم ریشم کا ہو گا،

وہاں جوانی پر بڑھاپا نہیں آئے گا، جنت میں کپڑے کبھی پرانے نہیں ہوں گے، جنت میں بیماریاں اور پریشانیاں نہیں ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے جنت میں اہل جنت کے لیے وہ کچھ تیار کرکے رکھا ہوا ہے جو کسی آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں، کسی کان نے اس کے بارے میں سنا نہیں ہے، کبھی کسی دل پر اس کا کھٹکا تک نہیں ہوا۔ جنت متقی اور پرہیز گار لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جس طرح دوزخ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے إِذَا سَأَلْتُمُ اللهَ الْجَنَّةَ فَاسْأَلُوهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَعْلَى الْجَنَّةِ وَأَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ، وَسَقْفُهَا عَرْشُ الرَّحْمَنِ، جب تم اللہ سے جنت مانگو تو فردوس کا سوال کرو، وہ سب سے اونچی اور سب سے اچھی جنت ہے، اسی جنت سے جنت کی سب نہریں جاری ہوتی ہیں اور اسی کی چھت اللہ تعالیٰ رحمن رحیم کا عرش ہے۔ (بخاری)

ہرقل نے حضور ﷺ کی خدمت میں بطور اعتراض کے ایک سوال لکھ بھیجا کہ آپ مجھے اس جنت کی دعوت دے رہے ہیں جس کی چوڑائی آسمان و زمین کے برابر ہے تو یہ فرمایئے کہ پھر جہنم کہاں گئی؟ حضور ﷺ نے فرمایا سُبْحَانَ اللهِ! فَأَيْنَ اللَّيْلُ إِذَا جَاءَ النَّهَارُ؟ سبحان اللہ جب دن آتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے؟ (مسند احمد)

ایک مرفوع حدیث میں ہے کسی نے حضور ﷺ سے پوچھا تو آپ نے جواب میں فرمایا جب ہر چیز پر رات آجاتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے؟ اس نے کہا جہاں اللہ چاہے، آپ نے فرمایا اسی طرح جہنم بھی جہاں چاہے (بزار) اس جملہ کے دو معنی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ رات کے وقت ہم گو دن کو نہیں دیکھ سکتے لیکن تاہم دن کا کسی جگہ ہونا ناممکن نہیں، اسی طرح گو جنت کا عرض اتنا ہی ہے لیکن پھر بھی جہنم کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا، جہاں اللہ چاہے وہ بھی ہے، دوسرا معنی یہ کہ جب دن ایک طرف چڑھنے لگا رات دوسری جانب ہوتی ہے، اسی طرح جنت اعلیٰ علیین میں ہے اور دوزخ اسفل السافلین میں، تو کوئی نفی کا امکان ہی نہ رہا۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ: اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کا وصف بیان فرماتا ہے کہ وہ سختی میں اور آسانی میں خوشی میں اور غمی میں تندرستی میں اور بیماری میں غرض ہر حال میں راہ اللہ اپنا مال خرچ

کرتے رہتے ہیں جیسے اور جگہ ہے اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ: ۲۷۴) یعنی وہ لوگ دن رات چھپے کھلے خرچ کرتے رہتے ہیں کوئی امر انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باز نہیں رکھ سکتا، اس کی مخلوق پر اس کے حکم سے احسان کرتے رہتے ہیں۔

وَالْكَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ: اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور اہل جنت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ غصے کو پی جانے والے اور لوگوں کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں کَظَم کے معنی چھپانے کے بھی ہیں یعنی اپنے غصہ کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ بعض روایتوں میں ہے ابنَ آدَمَ، اذْكُرْنِي إِذَا غَضِبْتَ، أَذْكُرُكَ إِذَا غَضِبْتُ، فَلا أُهْلِكُكَ فِيمَنْ أُهْلِكُ اے ابن آدم! تو غصے کی حالت میں مجھے یاد کر، میں غصہ کے وقت تجھے یاد رکھوں گا یعنی ہلاکت کے وقت تجھے ہلاکت سے بچالوں گا (ابن ابی حاتم) اور حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللهُ عَنْهُ عَذَابَهُ، وَمَنْ خَزَنَ لِسَانَهُ سَتَرَ اللهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنِ اعْتَذَرَ إِلَى اللهِ قَبِلَ عُذْرَهُ جو شخص اپنا غصہ روک لے اللہ تعالیٰ اس پر سے اپنا عذاب ہٹالیتا ہے اور جو بھی اپنی زبان (خلاف شرع باتوں سے) روک لے اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کرے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف معذرت لے جائے اللہ تعالیٰ اس کا عذر قبول فرماتا ہے (مسند ابو یعلیٰ)

حدیث شریف میں ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرْعَةِ، وَلٰكِنَّ الشَّدِيدَ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ پہلوان وہ نہیں جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ حقیقتاً پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے (احمد) صحیح بخاری صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تم میں سے کوئی ایسا ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کوئی نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا میں تو دیکھتا ہوں کہ تم اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال چاہتے ہو، اس لیے کہ تمہارا مال تو درحقیقت وہ ہے جو تم راہ اللہ اپنی زندگی میں خرچ کر دو اور جو چھوڑ کر جاؤ وہ تمہارا مال نہیں بلکہ تمہارے وارثوں کا مال ہے، تو تمہارا راہ اللہ کم خرچ کرنا اور جمع زیادہ کرنا یہ دلیل ہے اس امر کی کہ تم اپنے مال سے اپنے وارثوں کے مال کو زیادہ عزیز رکھتے ہو، پھر پوچھا تم

پہلوان کسے جانتے ہو؟ لوگوں نے کہا یارسول اللہ! اسے جسے کوئی گرا نہ سکے، آپ نے فرمایا نہیں بلکہ حقیقتاً زور دار پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے جذبات پر پورا قابو رکھے، پھر پوچھا کہ بے اولاد کسے کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا جس کی اولاد نہ ہو، فرمایا نہیں بلکہ فی الواقع بے اولاد وہ ہے جس کے سامنے اس کی کوئی اولاد مری نہ ہو (مسلم)

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ نے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو مفلس کنگال کون ہے؟ لوگوں نے کہا جس کے پاس مال نہ ہو، آپ ﷺ نے فرمایا بلکہ وہ جس نے اپنا مال اپنی زندگی میں راہ اللہ نہ دیا ہو (مسند احمد) حضرت حارثہ بن قدامہ سعدی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت نبوی میں عرض کرتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے کوئی نفع کی بات فرمایئے، جو مختصر ہو تاکہ میں یاد بھی رکھ سکوں آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کر اس نے پھر پوچھا آپ ﷺ نے پھر یہی جواب دیا کئی مرتبہ یہی کہا (مسند احمد) کسی شخص نے حضور ﷺ سے کہا مجھے کچھ وصیت کیجئے آپ ﷺ نے فرمایا غصہ نہ کر وہ کہتے ہیں میں نے جو غور کیا تو معلوم ہوا کہ تمام برائیوں کا مرکز غصہ ہی ہے (مسند احمد)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا تو آپ بیٹھ گئے اور پھر لیٹ گئے ان سے پوچھا گیا یہ کیا؟ تو فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ ﷺ فرماتے تھے جسے غصہ آئے وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اگر اس سے بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جائے (مسند احمد) مسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ عروہ بن محمد رحمہ اللہ کو غصہ چڑھا آپ وضو کرنے بیٹھ گئے اور فرمانے لگے میں نے اپنے استادوں سے یہ حدیث سنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور آگ بجھانے والی چیز پانی ہے پس تم غصہ کے وقت وضو کرنے بیٹھ جاؤ۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ جو شخص کسی تنگ دست کو مہلت دے یا اپنا قرض اسے معاف کر دے اللہ تعالیٰ اسے جہنم سے آزاد کر دیتا ہے لوگو سنو جنت کے اعمال سخت اور مشکل ہیں اور جہنم کے کام آسان اور سہل ہیں نیک بخت وہی ہے جو فتنوں سے بچ جائے کسی گھونٹ کا پینا اللہ کو ایسا پسند نہیں جتنا غصہ کے گھونٹ کا پی جانا ایسے شخص کے دل میں ایمان رچ جاتا ہے (مسند احمد)

حضور ﷺ فرماتے ہیں جو شخص اپنا غصہ اتارنے کی طاقت رکھتے ہوئے پھر بھی ضبط کر لے اللہ

تعالیٰ اس کا دل امن وامان سے پر کر دیتا ہے، جو شخص باوجود موجود ہونے کے شہرت کے کپڑے کو تواضع کی وجہ سے چھوڑ دے اسے اللہ تعالیٰ کرامت اور عزت کا جوڑا قیامت کے دن پہنائے گا اور جو کسی کا سر چھپائے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن بادشاہت کا تاج پہنائے گا (ابوداؤد) حضور ﷺ فرماتے ہیں جو شخص باوجود قدرت کے اپنا غصہ ضبط کرلے اسے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے پسند کرلے (مسند احمد)

وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ: حدیث میں ہے رسول مقبول ﷺ فرماتے ہیں ثَلَاثٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ: مَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَنْ تَوَاضَعَ للهِ رَفَعَهُ اللهُ تین باتوں پر میں قسم کھاتا ہوں ایک تو یہ کہ صدقہ سے مال نہیں گھٹتا دوسرے یہ کہ عفو و درگزر کرنے سے انسان کی عزت بڑھتی ہے، تیسرے یہ کہ تواضع فروتنی اور عاجزی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ بلند مرتبہ عطا کرتا ہے۔

حدیث میں ہے مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُشْرَفَ لَهُ الْبُنْيَانُ، وَتُرْفَعَ لَهُ الدَّرَجَاتُ فَلْيَعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَهُ، وَيُعْطِ مَنْ حَرَمَهُ، وَيَصِلْ مَنْ قَطَعَهُ جو شخص یہ چاہے کہ اس کی بنیاد بلند ہو اور اس کے درجے بڑھیں تو اسے ظالموں سے درگزر کرنا چاہیے اور نہ دینے والوں کو دینا چاہیے اور توڑنے والوں سے جوڑنا چاہیے۔ (مستدرک حاکم)

اور حدیث میں ہے إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ نَادَى مُنَادٍ يَقُولُ: أَيْنَ الْعَافُونَ عَنِ النَّاسِ؟ هَلُمُّوا إِلَى رَبِّكُمْ، وَخُذُوا أُجُورَكُمْ، وَحُقَّ عَلَى كُلِّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ إِذَا عَفَا أَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا کہ لوگوں کو معاف کرنے والے کہاں ہیں؟ اے لوگوں کو معاف کرنے والو! آجاؤ اپنے پروردگار کی طرف، اور اپنے اجر لے لو، ہر وہ مسلمان جو دوسرے مسلمان کو معاف کرتا ہے اسے حق دیا گیا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ (ابن مردویہ)

وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ: آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے غصہ میں آپے سے باہر نہیں ہوتے، لوگوں کو ان کی طرف سے برائی نہیں پہنچتی بلکہ اپنے جذبات کو دبائے رکھتے ہیں اور اللہ سے ڈر کر ثواب کی امید پر معاملہ سپردِ الٰہ کرتے ہیں، لوگوں سے درگزر کرتے ہیں، ظالموں کے ظلم کا بدلہ بھی نہیں لیتے

اسی کو احسان کہتے ہیں اور ان محسن بندوں سے اللہ محبت رکھتا ہے۔ احسان یا تو کسی کو بھلائی پہنچا کر کیا جاتا ہے، یا کسی سے تکلیف ہٹا کر کیا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ: ارشاد فرمایا جن لوگوں نے بے حیائی کا ارتکاب کیا یا اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا، اس کے بعد وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کریں، اللہ کا ذکر کریں، اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، بخشش طلب کریں۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عطاء کی روایت میں کہا ہے کہ یہ آیت نبہان تمر فروش (کھجور فروش) کے بارے میں نازل ہوئی اس کا شان نزول یہ ہے کہ نبہان تمر فروش کے پاس ایک عورت اس سے کھجور خریدنے کے لیے آئی تو نبہان نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کا بوسہ لیا پھر اسے ندامت ہوئی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حرکت کا ذکر کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری اور ایک ثقفی دو شخصوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غزوہ کے لیے تشریف لے گئے تو ثقفی آپ کے ساتھ چل دیا اور انصاری کو گھر کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے چھوڑ دیا چنانچہ یہ ثقفی کے گھر والوں کا خیال رکھتا تھا، ایک دن جب یہ گھر آیا تو اس نے اپنے ساتھی کی بیوی کو اس حالت میں دیکھا کہ اس نے غسل کیا ہوا ہے اور اپنے بال بکھیرے ہوئے ہیں، اس کے دل میں یہ فتور پیدا ہوا تو بغیر اجازت اندر داخل ہوا اور ساتھی کی بیوی تک پہنچ گیا اور اسے بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا عورت نے اپنے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ لیا اور اس نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا، اس کے بعد اسے ندامت ہوئی اور شرم آئی، یہ واپس لوٹا اس عورت نے کہا کہ سبحان اللہ! تو نے اپنی امانت میں خیانت کی اور اپنے رب کی نافرمانی بھی کی اور اپنی مراد بھی نہیں پائی۔

راوی کا کہنا ہے کہ یہ شخص اپنے کیے پر نادم ہوا اور نکل کر جنگلوں میں گھومتا رہا اور اللہ سے اپنے گناہ پر توبہ کرتا رہا حتی کہ ثقفی غزوہ سے واپس آیا، تو اس کی بیوی نے اسے انصاری بھائی کی حرکت اور حالت سے آگاہ کیا چنانچہ وہ اس کی تلاش میں نکلا، اسے اس کا پتہ چل گیا، اس نے اسے اچانک سجدے

میں گرے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا اے اللہ! میرا گناہ میرا گناہ، میں نے اپنے بھائی کی امانت میں خیانت کی، ثقفی نے اسے کہا کہ اے فلاں شخص! اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو اور اپنے گناہ کے بارے میں آپ ﷺ سے دریافت کرو، شاید اللہ تمہارے لیے کشائش اور توبہ کی گنجائش پیدا کرے چنانچہ یہ شخص اس کے ساتھ آیا اور مدینہ کو لوٹا، ایک دن نماز عصر کے وقت جبریل امین علیہ السلام اس کی توبہ کی قبولیت کی بشارت لے کر نازل ہوئے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں یعنی انصاری اور ثقفی کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً، اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا یہ رعایت اس شخص کے لیے مخصوص ہے یا عام لوگوں کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ توبہ کے معاملے میں یہ رعایت عام لوگوں کے لیے ہے۔

③ عطاء رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ أَبَنُو إِسْرَائِيلَ أَكْرَمُ عَلَى اللهِ مِنَّا؟ كَانُوا إِذَا أَذْنَبَ أَحَدُهُمْ أَصْبَحَتْ كَفَّارَةُ ذَنْبِهِ مَكْتُوبَةً فِي عَتَبَةِ بَابِهِ: اجْدَعْ أُذُنَكَ، اجْدَعْ أَنْفَكَ، افْعَلْ كَذَا کیا اللہ کے نزدیک بنی اسرائیل ہم سے زیادہ باعزت اور باکرامت ہیں، ان میں سے کسی سے جب کوئی گناہ سرزد ہوتا تھا تو اس کے گناہ کا کفارہ اس کے دروازے کی دہلیز پر لکھا ہوا یوں پڑھا ملتا تھا کہ تو اپنا کان کاٹ ڈال تو اپنی ناک کاٹ ڈال یہ کروہ کر اس پر نبی ﷺ خاموش رہے تو یہ آیت نازل ہوئی، وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس سے بہتر بات کی خبر دوں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔ (اسباب النزول)

تفسیر آیت: فَاحِشَةً بے حیائی سے مراد یہ ہے کہ کسی نے زنا کیا، کسی نے کسی کو ناحق قتل کیا، کسی نے اپنے جسم سے کپڑے اُتارے اور لوگوں کے سامنے ننگا ہو گیا، یہ سارے کام بے حیائی کے ہیں، اپنی جان پر ظلم سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی درجے میں کسی نے گناہ کا ارتکاب کیا، بعض کہتے ہیں بے حیائی کا ارتکاب بڑا گناہ ہے اور اپنی جان پر ظلم کرنا چھوٹا گناہ ہے، اپنے گناہوں پر استغفار کرے سے مراد یہ ہے کہ اپنے کیے پر ندامت کرے اور توبہ کرے، اگر ایسا نہیں کرتا تو طلب مغفرت کرنا

استہزا کرنے کے مترادف ہے، حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں کہ ہمارے استغفار کے لیے بھی استغفار کی ضرورت ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں إِنَّ رَجُلًا أَذْنَبَ ذَنْبًا، فَقَالَ: رَبِّ إِنِّي أَذْنَبْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ. فَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ عَبْدِي عَمِلَ ذَنْبًا، فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ، قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ عَمِلَ ذَنباً آخَرَ فَقَالَ: رَبِّ، إِنِّي عَمِلتُ ذَنباً فَاغْفِرْهُ. فَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: عَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ، قَدْ غَفَرتُ لِعَبْدِي. ثُمَّ عَمِلَ ذَنْبًا آخَرَ فَقَالَ: رَبِّ، إِنِّي عَمِلْتُ ذَنْبًا فَاغْفِرْهُ لِي. فَقَالَ عَزَّ وجَلَّ: عَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيأْخُذُ بِهِ، قَدْ غَفَرتُ لِعَبْدِي ثُمَّ عَمِلَ ذَنبًا آخَرَ فَقَالَ: رَبِّ، إِنِّي عَمِلَتُ ذَنبًا فَاغْفِرْهُ فَقَالَ عَزَّ وجَلَّ: عَبْدِي عَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ، أُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، فَلْيَعْمَلْ مَا شَاءَ (مسند احمد، ابن کثیر)

جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے پھر اللہ رحمن ورحیم کے سامنے حاضر ہو کر کہتا ہے کہ پروردگار مجھ سے گناہ ہو گیا تو معاف فرما اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے سے گو گناہ ہو گیا لیکن اس کا ایمان ہے کہ اس کا رب گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے اور اگر چاہے تو معاف بھی فرما دیتا ہے میں نے اپنے بندے کا گناہ معاف فرمایا، اس سے پھر گناہ ہو تو فرما دیتا ہے میں نے اپنے بندے کا گناہ معاف فرمایا، اس سے پھر گناہ ہو جاتا ہے یہ پھر توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ پھر بخشتا ہے چوتھی مرتبہ پھر گناہ کر بیٹھتا ہے پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما کر کہتا ہے اب میرا بندہ جو چاہے کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ يَا رَسُولَ اللهِ، إِذَا رَأَيْنَاكَ رَقَّت قُلُوبُنَا، وَكُنَّا مِنْ أَهْلِ الْآخِرَةِ، وَإِذَا فَارَقْنَاكَ أَعْجَبَتْنَا الدُّنْيَا وشَمِمْنَا النِّسَاءَ وَالْأَوْلَادَ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم آپ کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دلوں میں رقت طاری ہو جاتی ہے اور ہم اللہ والے بن جاتے ہیں لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے جاتے ہیں تو وہ حالت نہیں رہتی، عورتوں بچوں میں پھنس جاتے ہیں، گھر بار کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

لَوْ أَنَّكُمْ تَكُونُونَ عَلَى كُلِّ حَالٍ، عَلَى الْحَالِ الَّتِي أَنْتُمْ عَلَيْهَا عِنْدِي، لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ بِأَكُفِّهِمْ، وَلَزَارَتْكُمْ فِي بُيُوتِكُمْ، وَلَوْ لَمْ تُذْنِبُوا لَجَاءَ اللَّهُ بِقَوْمٍ يُذْنِبُونَ كَيْ يُغْفَرَ لَهُمْ

اگر تمہاری حالت یہی ہر وقت رہتی تو پھر فرشتے تم سے مصافحہ کرتے اور تمہاری ملاقات کو تمہارے گھر پر آتے، سنو اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تمہیں یہاں سے ہٹا دے اور دوسری قوم کو لے آئے جو گناہ کرے پھر بخشش مانگے اور اللہ انہیں بخشے، ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہمیں جنت کے بارے میں بتایئے کہ اسے کس طرح بنایا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا

لَبِنَةُ ذَهَبٍ، وَلَبِنَةُ فِضَّةٍ، وَمِلَاطُهَا الْمِسْكُ الْأَذْفَرُ، وَحَصْبَاؤُهَا اللُّؤْلُؤُ وَالْيَاقُوتُ، وَتُرَابُهَا الزَّعْفَرَانُ، مَنْ يَدْخُلُهَا يَنْعَمُ وَلَا يَبْأَسُ، وَيَخْلُدُ وَلَا يَمُوتُ، لَا تَبْلَى ثِيَابُهُ، وَلَا يَفْنَى شَبَابُهُ،

ایک اینٹ سونے کی تو ایک چاندی کی ہے، اس کا گارہ مشک خالص ہے، اس کے کنکر لؤلؤ اور یاقوت ہیں، اس کی مٹی زعفران ہے، جنتیوں کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی ان کی زندگی ہمیشہ کی ہوگی ان کے کپڑے پرانے نہیں ہوں گے جوانی کبھی نہیں ڈھلے گی۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اور تین اشخاص کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی الإِمَامُ الْعَادِلُ، وَالصَّائِمُ حَتَّى يُفْطِرَ، وَدَعْوَةُ الْمَظْلُومِ تُحْمَلُ عَلَى الْغَمَامِ وَتُفْتَحُ لَهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ، عادل بادشاہ کی دعا، افطاری کے وقت روزے دار کی دعا اور مظلوم کی دعا، بادلوں سے اٹھائی جاتی ہے اور اس کے لیے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جناب باری ارشاد فرماتا ہے وَعِزَّتِي لَأَنْصُرَنَّكَ وَلَوْ بَعْدَ حِينٍ مجھے میری عزت کی قسم! میں تیری ضرور مدد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہو (احمد)

امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کوئی گناہ کرے پھر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرے اور اپنے گناہ کی معافی چاہے تو اللہ عزوجل اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے (مسند احمد)

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تم میں سے جو شخص کامل وضو کر کے دعا أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ، يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَاءَ پڑھے اس کیلئے جنت

کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں جس سے چاہے اندر چلا جائے۔

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سنت کے مطابق وضو کرتے ہیں پھر فرماتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ جو شخص مجھ جیسا وضو کرے پھر دو رکعت نماز ادا کرے جس میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے (بخاری مسلم)

مسند احمد میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ابلیس نے کہا يَا رَبِّ، وَعِزَّتِكَ لَا أَزَالُ أُغْوِي (عِبَادَكَ) مَا دَامَتْ أَرْوَاحُهُمْ فِي أَجْسَادِهِمْ. فَقَالَ اللهُ: وَعِزَّتِي وَجَلَالِي وَلَا أَزَالُ أَغْفِرُ لَهُمْ مَا اسْتَغْفَرُونِي اے رب! مجھے تیری عزت کی قسم میں بنی آدم کو ان کے آخری دم تک بہکاتا رہوں گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے میرے جلال اور میری عزت کی قسم جب تک وہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے میں بھی انہیں بخشتا رہوں گا۔ مسند بزار میں ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا مجھ سے گناہ ہو گیا آپ نے فرمایا پھر استغفار کر اس نے کہا مجھ سے اور گناہ ہوا فرمایا اسْتَغْفِرْ رَبَّكَ حَتَّى يَكُونَ الشَّيْطَانُ هُوَ الْمَحْسُورُ استغفار کئے جا، یہاں تک کہ شیطان تھک جائے پھر فرمایا گناہ کو بخشنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قیدی آیا اور کہنے لگا اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَتُوبُ إِلَيْكَ وَلَا أَتُوبُ إِلَى مُحَمَّدٍ. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "عَرَفَ الْحَقَّ لِأَهْلِهِ يا اللہ! میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توبہ نہیں کرتا (یعنی اللہ میں تیری ہی بخشش چاہتا ہوں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس نے حق حقدار کو پہنچایا۔

وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ: ایک اللہ کی ذات ہے جو اپنے بندوں کے پل پل کو جانتی ہے، ان کی حرکات وسکنات سے آگاہ ہے، ان کے چھپے اور علانیہ سب کچھ کو جانتی ہے، ان کے رات کی تاریکی میں اور دن کے اُجالے میں کیے جانے والے جرائم وگناہوں پر بھی نظر رکھتی ہے، سیاہ کار وگناہ گار جب گناہوں سے اٹ کر اللہ کی بارگاہ عالیہ میں

حاضری دیتا ہے تو اللہ کی ذات اس کی توبہ وزاری کو قبول کرتے ہوئے اسے معافی کا پروانہ عطا کرتی ہے، معافی کا پروانہ ان کو ملتا ہے جو اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے، جو اپنے کیے پر شیخیاں نہیں بگھارتے، بلکہ عاجزی و مسکینی کا اظہار کرتے ہیں، روتے اور گڑگڑاتے ہیں، وہ اپنے کیے ہوئے جرائم پر بالکل اصرار نہیں کرتے، یعنی تسلسل کے ساتھ گناہ نہیں کرتے، گناہوں پر دوام اختیار نہیں کرتے، وہ اپنے رب سے تار ملاتے ہیں اور معافی کی عرضی پیش کرتے ہیں۔ اصرار کرنے سے مراد یہ ہے کہ معصیت پر بغیر توبہ کئے اڑ نہیں جاتے اگر کئی مرتبہ گناہ ہو جائے تو کئی مرتبہ استغفار کرتے ہیں، مسند ابو یعلیٰ میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَإِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِينَ مَرَّةً وہ اصرار کرنے والا اور اڑنے والا نہیں جو استغفار کرتا رہتا ہے اگرچہ (بالفرض) اس سے ایک دن میں ستر مرتبہ بھی گناہ ہو جائے۔

وَهُمْ يَعْلَمُونَ: پھر فرمایا کہ وہ جانتے ہیں یعنی اس بات کو کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے جیسے اور جگہ ہے اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ) التوبہ : ۱۰۴) کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور جگہ ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا(النسآء :۱۱۰) جو شخص کوئی برا کام کرے یا گناہ کر کے اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے تو وہ دیکھ لے گا کہ اللہ عزوجل بخشش کرنے والا مہربان ہے۔

مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ نے منبر پر بیان فرمایا ارْحَمُوا تُرْحَمُوا، وَاغْفِرُوا يُغْفَرْ لَكُمْ، وَيْلٌ لِأَقْمَاعِ الْقَوْلِ، وَيْلٌ لِلْمُصِرِّينَ الَّذِينَ يُصِرُّونَ عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ لوگو تم اوروں پر رحم کرو تم پر رحم کیا جائے گا، لوگو تم دوسروں کی خطائیں معاف کرو تمہاری خطائیں معاف کی جائیں گی، باتیں بنانے والوں کے لیے ہلاکت ہے، اصرار کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے، وہ لوگ جو اپنے کیے پر اصرار کرتے ہیں جب کہ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ: یعنی ان عمدہ صفات والے لوگوں کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور بخشش ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں پر ستاری کی چادر ڈال دے گا، اللہ انہیں معاف

فرما کر جنت کا حقدار بنائے گا، ان لوگوں کی زندگانی بڑی قابل رشک گزری ہے، یہ اللہ والے بن کر رہے، اللہ کی پناہ میں رہے، اللہ کے ساتھ دوستانہ قائم کیے رکھا۔

وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا: ان نیکوکاروں کے لیے مغفرت کے ساتھ جنت بھی ہے، جس کا ذکر ہو چکا کہ اس کی چوڑائی آسمان جتنی ہے، ان جنتوں کے بیچوں بیچ نہریں رواں دواں ہوں گی، جو اس کے حسن و جمال کو دوبالا کر رہی ہوں گی، یہ عظیم لوگ ان جنتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ: جنت مل گئی، جنت کی نعمتیں مل گئیں، کوتاہی پر معافی کا پروانہ مل گیا، نیک اعمال کا صلہ بہترین صورت میں مل گیا تو یہ نیک کام کرنے والوں کے لیے بہتر اجر ہے، تین طبقات ہیں ایک متقین، دوسرا تائبین اور تیسرا مصرین، متقین پرہیز گار لوگ، تائبین توبہ کرنے والے لوگ، مصرین گناہ پر گناہ کرنے والے، باز نہ آنے والے لوگ، ان میں بخشش کے حقدار متقین ہیں، تائبین ہیں، رہے مصرین یہ محروم ہو گئے۔

امم سابقہ سے عبرت

سوال یہ آیت کس مناسبت سے نازل ہوئی؟ ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ {۱۳۷} هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ {۱۳۸} وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ {۱۳۹} آل عمران.

جواب ترجمہ: تم سے پہلے کئی واقعات ہو چکے ہیں سو زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ یہ بیان ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت ہے اور نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔ اور ہمت نہ ہارو اور غم گین نہ ہو اور تم ہی بلند ہو گے اگر تم مومن ہو۔

ربط و مناسبت ما قبل: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اطاعت و گناہوں سے توبہ کرنے پر مغفرت اور جنت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا، اب یہاں اس چیز کو بیان کیا جا رہا ہے جو بندے کو اطاعت کرنے اور گناہوں

سے توبہ کرنے کی ترغیب دے رہی ہے، اطاعت کرنے اور گناہوں سے توبہ کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان پچھلے لوگوں کے حالات کو دیکھے، اطاعت کرنے والوں اور نافرمانی کرنے والوں کی تاریخ کا مطالعہ کرے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سے طریقے گزر چکے ہیں۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ: علامہ واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ الْخُلُوّ کا لغوی معنیٰ "تنہا ہونا" اور "وہ خالی مکان جس میں کسی نے سکونت نہ رکھی ہوئی ہو" ہے، اسی طرح یہ لفظ زمانہ پر بھی استعمال ہوتا ہے گزرے ہوئے کے معنیٰ میں، کیونکہ جو چیز گزر جاتی ہے وہ وجود سے خالی ہو جاتی ہے، اسی طرح سابقہ امتیں بھی ہیں۔

سنن سنت کی جمع ہے، سنت کا معنی ہے طریقہ، سنت النبی کا معنی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طریقہ جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم قصد کرتے تھے اور سنت اللہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا طریقہ جیسے فرمایا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ جیسے فرمایا وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً، اس میں یہ تنبیہ ہے کہ احکام شرعیہ ہر چند کہ صورۃً مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کی غرض مقصود مختلف نہیں ہے اور وہ تبدیل نہیں ہوتی اور وہ نفس کو پاکیزہ کرنا اور اس کو اللہ کے قرب اور اس کے ثواب کے قابل بنانا ہے (المفردات لراغب اصفہانی)

علامہ ابن اثیر جزری رحمہ اللہ لکھتے ہیں "لغت میں سنت کا معنی طریقہ اور سیرت ہے اور شریعت میں اس سے مراد ہے جس چیز کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہو یا اس سے منع کیا، یا جس قول اور فعل کو مستحب قرار دیا ہو اور قرآن مجید میں ان امور کا ذکر نہ آیا ہو، اسی لیے دلائل شرع میں قرآن اور سنت کا ذکر کیا جاتا ہے، حدیث میں ہے میں بھول جاتا ہوں تاکہ میں اس کو سنت کر دوں، یعنی مجھ پر اس لیے نسیان طاری کیا جاتا ہے کہ میں لوگوں کو طریق مستقیم کی طرف لاؤں اور ان کو یہ بیان کروں کہ جب ان کو نسیان عارض ہو تو وہ کس طرح عمل کریں۔ (نہایہ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی لکھتے ہیں "لغت میں سنت کا معنی ہے طریقہ خواہ پسندیدہ طریقہ ہو یا غیر پسندیدہ اور شریعت میں اس کا معنی ہے وہ طریقہ جو دین میں مقرر کیا گیا ہے، جو فرض ہے نہ واجب، لہٰذا سنت وہ ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دائماً عمل کیا ہو اور کبھی کبھی ترک

بھی کیا ہو اور اگر یہ دوام بطور عبادت ہو تو سنن ھُدیٰ کی قسم ہے اور اگر یہ دوام بطور عادت ہو تو یہ سنن زوائد کی قسم سے ہے، سنّت ھدیٰ وہ سنّت ہے جس کو قائم کرنا دین کی تکمیل کے لیے ہو اور اس کا ترک کرنا کراہت یا اِساءت ہو اور سنت زائدہ وہ سنت ہے جس پر عمل کرنا نیکی ہو اور اس کے ترک سے کراہت یا اِساءت کا تعلق نہ ہو، جیسے کھڑے ہونے، بیٹھنے لباس پہننے اور کھانے میں نبی کریم ﷺ کی سنتیں ہیں۔ (التعریفات للجرجانی)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں "لغت میں سنت کا معنی ہے عادت اور شریعت میں نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کو سنت کہتے ہیں اور جن کاموں پر نبی کریم ﷺ نے بلاوجوب دوام کیا ہو ان کو بھی سنّت کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، سنن ھُدیٰ اور سنن زوائد، سنّت ھدیٰ جیسے اَذان اِور اقامت ان کو سنّت مؤکدہ بھی کہتے ہیں، ان کا حکم واجب کی طرح ہے اور واجب کی طرح اس پر عمل کا مطالبہ کیا جائے گا، مگر واجب کا تارک سزا کا مستحق ہے اور اس کا تارک سزا کا مستحق نہیں ہے اور سنن زوائد جیسے اکیلے آدمی کا اَذان دینا اور مسواک کرنا اور وہ اَفعال جو نماز اور غیر نماز میں معروف ہیں اور اس کا تارک سزا کا مستحق نہیں ہے۔ (التعریفات)

سنت کا معنی طریقہ اور عادت ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوموں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے، اگر ایک قوم اللہ کو مان لیتی ہے اور اس کے رسول کی تصدیق کرتی ہے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو دنیا میں سرخرو اور کامیاب کرتا ہے اور اس کے برعکس جو قوم اللہ کو نہیں مانتی اور اس کے رسول کی تکذب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم پر عذاب بھیج کر اس کو تباہ اور برباد کر دیتا ہے، اس سنت کے مظاہر عاد، ثمود، اہل مدین اور قوم لوط وغیرہ کے آثار کی شکل میں موجود تھے، اللہ تعالیٰ نے ان ہی مظاہر کو یہاں "سنن" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (الاحزاب:۳۸) ترجمہ: جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے متعلق اللہ کا طریقہ۔ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (فاطر:۴۳) سو وہ صرف پہلے لوگوں کے طریقہ کا انتظار کر رہے ہیں تو آپ اللہ کے طریقہ میں ہرگز تبدیلی نہیں پائیں

گے۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ (غافر۔ سورۃ المؤمن:۸۵) یہ وہ طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور وہاں کافروں نے سخت نقصان اٹھایا۔ (تبیان)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی امت کو یہ ترغیب دی ہے کہ وہ ان اُمم سابقہ کے احوال و حوادث کا مطالعہ کریں تاکہ انہیں پتہ چلے کہ کس بناء پر انہیں قعرِ مذلّت میں پھینکا گیا، کیونکر ان پر عذاب آیا، کیونکر انہیں نشانِ عبرت بنایا گیا، مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ان طریقوں پر غور و فکر کرنا ہے جو کافروں اور مومنوں میں جاری رہے، کیونکہ دنیا ایسا جہان ہے جو نہ کافر کی وجہ سے باقی رہے گی اور نہ مومن کی وجہ سے، نہ کافر دنیا میں باقی رہے گا اور نہ مومن باقی رہے گا، صرف فرق اتنا ہے کہ مومن جب فوت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی عمدہ تعریف و ستائش باقی رہتی ہے، آخرت میں اس کو بڑا اجر و ثواب ملتا ہے، جب کہ کافر پر دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں لعنت پڑتی ہے۔

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ: سار یسیر کا معنیٰ ہوتا ہے چلنا، گھومنا پھرنا، سیر کا لفظ اسی سے ہے، آج کل لوگ سیر و سیاحت کے لیے طول و طویل پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں، خوبصورت اور دلکش ممالک کی سیر گاہوں تک پہنچ جاتے ہیں، موسمیاتی سیر گاہوں میں بڑے شوق سے پہنچ جاتے ہیں، لیکن وہاں جا کر عبرت و موعظت حاصل کریں ایسا بالکل بھی نہیں ہوتا، وہاں عبرت کا سامان ہی نہیں ہوتا، بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ طوفان نوح والی جگہ پر پہنچے ہوں اور وہاں سے عبرت حاصل کی ہو، لوط کی بستی تک پہنچے ہوں جہاں تباہی و بربادی کے مناظر دیکھ کر ہمیشہ کے لیے جرائم سے توبہ کر لی ہو، کبھی دریائے قلزم کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا ہو کہ یہاں فرعون اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ غرقاب ہو گیا تھا، لوگ نئی نئی ایجادات سے لطف اندوز ہونے کے لیے دنیا بھر کے سفر کرتے ہیں، اہل دنیا نے دنیا بھر کے لوگوں کی رسائی اور دلکشی کے لیے سامان تعیش مہیا کر رکھے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ یہاں جس سیر کا ذکر فرما کر ترغیب دے رہے ہیں وہ امم سابقہ اور معذوبہ (جن کو عذاب دیا گیا) کے حالات سے عبرت پکڑنے کے لیے سیر کرنا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں سیر کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ لامحالہ ان علاقوں یا ان

اُمم کے مکانات و کھنڈرات تک پہنچنا ہے بلکہ مقصود و مطلوب یہ ہے کہ ان لوگوں کے حالات سے آگاہی ہو جائے، اگر یہ آگاہی زمین پر گھومے پھرے بغیر حاصل ہو جاتی ہے تو گویا مقصود و مطلوب مل گیا، میرا یہ خیال ہے کہ آج کل کسی بھی معتوب، مغضوب، معذوب قوم کے مکانات اور یادگاروں تک پہنچنا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے، بہت زیادہ سفری اخراجات اٹھتے ہیں، پھر جغرافیائی حد بندیوں کے باعث قانونی رکاوٹیں بھی ہیں، مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ایسی ہے جو اپنے ہی وطن میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک نہیں جا سکتی چہ جائیکہ دنیا بھر کے ممالک میں پہنچا جائے۔

میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کی منشاء و مقصود کو پورا کرنے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے، ان میں جن اقوام و ملل کی تباہی کے حالات بیان کیے گئے ہیں ان کا اجمال پڑھا جائے، پھر ان کی تفصیل کے لیے احادیث کا رخ کیا جائے، پھر کھوج کرید کرتے کرتے تاریخ کے اوراق پلٹائے جائیں، آج کل ساری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، جسے انگریزی میں گلوبل ویلج کہتے ہیں، منٹ سیکنڈ کے اعتبار سے خبریں پوری دنیا میں پھیل رہی ہیں، عبرت آموز واقعات کی متحرک تصویریں بھی وقفے وقفے سے نیٹ پر گھومتی دکھائی دے رہی ہیں، کہیں زلزلے ہیں، کہیں طوفان ہیں، کہیں برفانی تودے پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھسلتے گرتے دکھائی دیتے ہیں، کہیں طوفان بادوباراں ہے، جس میں دیکھنے والی آنکھوں کے لیے عبرت کا سامان ہے۔

آثار قدیمہ پر نگاہ ڈالی جائے، بہت سا سامان عبرت مل جائے گا، ہاں جن کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی وسعت و فراوانی عطا فرما رکھی ہے وہ وقفے وقفے سے ان مقامات کا رخ کریں جہاں اللہ تعالیٰ نے عبرت کا سامان مہیا کیا ہوا ہے، پھر آج کل ہر شخص کے پاس موبائل موجود ہے، موبائل میں کسی بھی مقام کی تصویر محفوظ کرنے کا سامان موجود ہے، پھر سوشل میڈیا کے ذریعے اسے پوری دنیا میں پہنچانے کے اسباب بھی موجود ہیں تو دیر نہیں کیجیے، خود بھی ان مقامہائے عبرت پر عبرت آموزی کے لیے جائیے اور دوسروں کی آگاہی کا سامان بھی کیجیے، تاکہ حکم ربانی کی تعمیل کر سکیں اور دوسروں کے لیے بھی کچھ سوغات عبرت مہیا کر سکیں۔

إِنَّ آثَارَنَا تَدُلُّ عَلَيْنَا ... فَانْظُرُوا بَعْدَنَا إِلَى الْآثَارِ

فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جھٹلانے والوں کا انجام بد دیکھیے، کیونکہ جب انسان فرمانبرداروں اور نافرمانوں میں سے کسی ایک کے حالات جان لیتا ہے تو دوسرے کے خود ہی معلوم ہو جاتے ہیں، معمولی سے غور و فکر کے بعد جھٹلانے والوں اور دشمنی کرنے والوں کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال بیان فرمائے، انہیں اللہ تعالیٰ نے مدد کیے ہوئے اور کامیاب لوگ قرار دیا ہے، پھر فرمایا کہ ہمارا لشکر ہی غالب رہنے والا ہے، یہ بھی واضح کیا گیا کہ بہترین انجام کار اہل تقویٰ کا ہے، پھر زمین کے وارث نیکوکاروں کو قرار دیا گیا ہے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ: یہ لوگوں کے لیے واضح بیان ہے اور اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے، اس آیت میں بیان، ہدایت اور نصیحت کا ذکر ہے، جس کلام سے کسی پیدا ہونے والے شبہ کا ازالہ کیا جائے اس کو بیان کہتے ہیں اور جو کلام اُمور شرعیہ میں رہنمائی پر مشتمل ہو اس کو ہدایت کہتے ہیں اور جو کلام کسی برے کام سے ممانعت کی تلقین پر مشتمل ہو اس کو نصیحت کہتے ہیں، اس آیت میں فرمایا ہے یہ کلام متقین کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس کلام سے ہدایت اور نصیحت متقین ہی حاصل کرتے ہیں اگرچہ یہ کلام تمام دنیا کے لیے پیش کیا گیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہدایت کی پیش کش دنیا کے تمام لوگوں کے لیے ہے لیکن اس سے فائدہ متقین نے ہی اٹھایا ہے۔ (تفسیر الکبیر للرازی، تبیان القرآن) لوگوں کے لیے بیان کیا جارہا ہے کہ جھٹلانے والوں کا انجام برا ہو گا، اس بیان سے ہدایت و نفع اہل تقویٰ اٹھاتے ہیں، جب کہ یہ بیان سارے انسانوں کے لیے ہے، لیکن نفع اٹھانے والے متقی ہیں کیوں کہ وہ ہدایت پانے والے لوگ ہیں۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا: اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے، ان کی ڈھارس بندھائی جارہی ہے، نہ تم کمزوری دکھاؤ اور نہ ہی تم غم گین ہو، میدان اُحد میں جو انہیں زخم لگے، جو جانیں چلی گئیں اس پر انہیں تسلی دی جارہی ہے، تَهِنُ یہ وہن سے ہے، اس کا معنیٰ کمزوری ہے، یہاں فرمایا جارہا ہے کہ میدان جہاد میں تمہیں زخم لگے ہیں، تمہارے لوگوں کی جانیں قربان ہو گئی ہیں، اس بناء پر تم

لوگ جہاد کرنے سے کمزوری نہ دکھاؤ اور جو لوگ تمہارے شہید ہو گئے ہیں ان پر غم گین بھی نہ ہو، یہ شہادت خوش نصیب لوگوں کے مقدر میں لکھی جاتی ہے، شہید مرنے کے بعد اللہ کا مہمان ہوتا ہے، وہ سبز پرندوں کے قالب میں گھومتا ہے، وہ ہمیشہ زندہ ہو جاتا ہے اسے مردہ کہنے اور مردہ سمجھنے پر شرعی لحاظ سے پابندی عائد کی گئی ہے، شہید کو اللہ کے ہاں سے رزق ملتا ہے، شہید کا خون زمین پر بعد میں گرتا ہے اس کی بخشش کا سامان پہلے کر دیا جاتا ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جنگ اُحد میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو شکست ہوئی وہ اسی حالت میں تھے کہ خالد بن ولید مشرکین کا رسالہ لے کر آگے بڑھے، اس نے چاہا کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلے میں پہاڑ پر چڑھے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ

اللّٰهُمَّ لَا يَعْلُونَ عَلَيْنَا، اللّٰهُمَّ لَا قُوَّةَ لَنَا إِلَّا بِكَ، اللّٰهُمَّ لَيْسَ يَعْبُدُكَ بِهٰذِهِ الْبَلْدَةِ غَيْرُ هٰؤُلَاءِ النَّفَرِ اے اللہ! وہ ہمارے اوپر نہ چڑھ سکیں، اے اللہ! ہمارا بس اور ہماری قوت تیرے ساتھ ہے، اے اللہ! ان مٹھی بھر لوگوں کے سوا اس آبادی میں کوئی تیری عبادت نہیں کرتا، اس پر اللہ نے یہ آیات نازل کیں، تب مسلمانوں کے کچھ تیر انداز پہاڑ کے اوپر چڑھے اور انہوں نے مشرک گھڑ سواروں پر تیر برسائے اور انہیں شکست دی وہ قول خداوندی ہے۔ وانتم الاعلون۔

وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: اگر تم اہل ایمان ہو تو تم سربلند رہو گے، تمہاری سربلندی اور عظمت کے لیے ضروری ہے کہ تم اہل ایمان ہو، ایمان کے بغیر کوئی کامیابی نہیں ہے، کوئی بلندی اور اونچائی ملنے والی نہیں ہے، تمہارا لڑنا، جہاد کرنا اللہ کے لیے ہے، تمہارے شہدا جنتی ہیں، مارنے والے، شہید کرنے والے باطل پر ہیں، تمہارے ہاتھوں سے قتل ہونے والے کفار دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، یہ غلبے اور وعدے کی صراحت ہے کہ اگر تم ایماندار رہو گے تو غالب رہو گے، امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس غزوہ کے بعد یہ لوگ جس غزوہ میں گئے اپنی فتح کے جھنڈے گاڑھ کر آئے، حضرات صحابہ کرام کے اکثر و بیشتر واقعات میں کامیابی و فتح ہی دکھائی دیتی ہے، کہیں کہیں امتحان بھی آیا مگر زیادہ فتح و کامیابی ملی، اس لیے کہ وہ ایسے ایمان والے تھے جنہیں قرآن کریم نے پکے، سچے اور کھرے مؤمن قرار دیا تھا۔

غزوۂ اُحد اور غزوۂ بدر

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ اس میں کون سے دو غزوات کا ذکر کیا گیا ہے؟

إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُواْ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاء وَاللهُ لاَ يُحِبُّ الظَّالِمِينَ{۱۴۰} وَلِيُمَحِّصَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ{۱۴۱} آل عمران

جواب ترجمہ: اگر تمہیں زخم پہنچا ہے تو انہیں بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور ہم یہ دن لوگوں میں باری باری بدلتے رہتے ہیں اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو ظاہر کر دے اور تم میں سے بعضوں کو شہید کرے اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تاکہ پاک صاف کرے ایمان والوں کو، اور مٹا دے کافروں کو۔

شان نزول: غزوہ اُحد کے نقصانات میں بڑا بھاری نقصان یہ تھا کہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو مدینہ میں بطور معلم اسلام آئے تھے اور جن کے وعظ سے اوس و خزرج کے قبیلے مسلمان ہوئے تھے شہید ہوئے، ان کی بیوی کا نام حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا تھا، اسی روز اس کے بھائی اور ماموں بھی شہید ہوئے تھے، پہلے اسے بھائی کی شہادت کی خبر ملی، اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور بھائی کے حق میں دعاء کی، پھر اسے بتایا گیا کہ تیرا شوہر بھی شہید ہو گیا ہے، یہ سن کر اس نے بے اختیار چیخ ماری، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو اس کے دل میں شوہر کی کس قدر محبت تھی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسی طرح تمہیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی ضرورت ہے، اس وقت مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول، زاد المسیر، معارف النزول)

إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ: اس آیت میں حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اور دوسرے شرکاء غزوہ احد کو ایک دوسرے انداز میں تسلی اور دلاسا دیا گیا ہے کہ اگر اس لڑائی میں تم کو یا تمہارے متعلقین کو زخم پہنچے تکلیف اٹھانی پڑی تو اس طرح کے حوادث فریق مقابل کو بھی پیش

آچکے ہیں، اگر اُحد میں تمہارے ستر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے تو ایک سال پہلے ان کے ستر آدمی جہنم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں اور خود اس لڑائی میں بھی ان کے بہت سارے آدمی ابتداً مقتول و مجروح ہوئے، اس کے ساتھ ہی اس آیت میں ایک اہم ضابطہ اور اصول کی طرف بھی رہنمائی فرمائی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اس عالم میں یہی ہے کہ وہ سختی، نرمی، دکھ، سکھ، تکلیف راحت کے دنوں کو لوگوں میں ادل بدل کرتے رہتے ہیں اگر کسی وجہ سے باطل طاقت کو عارضی فتح و کامرانی حاصل ہو جائے تو جماعت حقہ کو اس سے بد دل نہ ہونا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کو اب ہمیشہ شکست ہی ہوا کرے گی، بلکہ ان شکست کے اسباب کا پتہ لگا کر ان اسباب کا تدارک کرنا چاہیے، انجام کار فتح جماعت حقہ کو ہی نصیب ہو گی۔ (معارف النزول، معارف القرآن)

اس میں غزوۂ اُحد اور غزوۂ بدر کا ذکر ہے، یعنی اگر تمہیں غزوۂ اُحد میں زخم آئے تو کافروں کو جنگِ بدر میں زخم آئے تھے، یہ حالات تو ہم لوگوں کے درمیان پلٹتے اور پھیرتے رہتے ہیں، ایک وقت حالات ایک فریق کے حق میں اور دوسرے وقت میں حالات دوسرے فریق کے حق میں ہوتے ہیں، تاکہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں، اللہ تعالیٰ اس سے اہلِ ایمان کو دوسروں سے ایمان کی مضبوطی کی بناء پر ظاہر کرتا ہے۔

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "إِن نَالُوا مِنكُم يَومَ أُحدٍ فَقَدْ نِلتُمْ مِّنْهُمْ قَبْلَهُ يَومَ بَدْر ، ثُمَّ لَمْ يَضْعُفْ ذٰالِكَ قُلُوبُهُمْ وَلَمْ يُثَبِّطْهُمْ عَنْ مُّعَاوَدَتِكُم بالقِتَال وَأَنتُمْ أَحَقُّ بِأَنْ لَّا تَضْعُفُوا فَإِنَّكُم تَرْجُونَ مِنَ الله تَعَالىٰ مَا لَا يَرْجُونَ (رُوح المعانی، علامہ آلوسیؒ) اگر آج تم ان سے زخم خوردہ ہو تو کل بدر کے معرکے میں وہ تم سے زخم کھا چکے ہیں، اس کے باوجود وہ نہ کمزور ہوئے اور نہ تمہاری دشمنی اور لڑائی سے باز آئے تو تم اس بات کے زیادہ حق دار ہو کہ کمزوری نہ دکھاؤ، کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار ہو جب کہ وہ امیدوارِ رحمت تو نہیں ہیں۔

تفسیر طبری میں ہے إِنْ يَّقتُلُوا مِنكُم يَومَ أُحُد، فَقَدْ قَتَلْتُمْ مِّنْهُم يَومَ بَدرٍ اگر تم میں سے اُحد کے دن قتل کئے جاتے ہیں تو تم نے بدر میں ان کے قتل کئے تھے۔ زخم مسلمانوں کو بھی لگے اور زخم کافروں کو بھی لگے، بدر میں کافروں کے خون کی ندیاں بہہ گئیں، احد میں مسلمانوں کے خون

کی ندیاں بہہ گئیں، کافر کفر پر ڈٹا ہوا ہے، اس کا انجام دوزخ کی دھکتی آگ ہے، تم تو مسلمان ہو تمہیں بھی ڈٹ جانا چاہیے، تمہارا انجام اچھا ہے، تمہاری محنت کا صلہ جنت ہے۔

یہاں قَرحٌ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے "ق" پر ضمہ اور فتحہ دونوں پڑھے جاسکتے ہیں، جیسے عربی زبان میں جُہد اور جَہد، وُجد اور وَجد، ضُعف اور ضَعف ہے، اسی طرح قُرحٌ اور قَرحٌ ہے، قَرحٌ تہامہ اور حجاز کی زبان ہے، جب کہ قُرحٌ یہ نجد کی زبان میں ہے، قَرحٌ کا معنیٰ زخم ہے، جب کہ قُرحٌ کا معنیٰ زخم کا درد۔ اُحد کے معرکہ میں کافروں کے بیس سے اوپر لوگ مارے گئے تھے، ان کے بہت سے ایسے لوگ زخمی ہوگئے تھے جن کے ہاتھوں میں جھنڈے تھے، ان کے گھوڑوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے نیزوں سے مار ڈالا تھا، ابتدائی مرحلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پلڑا بھاری تھا، بس معمولی سی لغزش جو جبل رماۃ کے تیر اندازوں نے حکم ثانی ملنے سے پہلے اس درّے کو چھوڑ دیا تھا اس پر آزمائش وامتحان سے ساری جماعت دوچار کر دی گئی۔

وَتِلْكَ الأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ: یہاں ایام سے مراد اوقات ہیں، نہ کہ وہ ایام (دن) جو عرف میں مشہور اور معلوم ہیں، یہ وہ ایام ہیں جن میں لوگوں کے مابین فتح رہتی ہے، نداول مداولہ سے ہے، جس کا معنیٰ ایک چیز کا ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا، عربی محاورے میں کہا جاتا ہے الایام الدول یعنی ایک جماعت، گروہ یا امت سے دوسری امت کی طرف چیزوں کا منتقل ہونا، نہ خوشیاں ومسرتیں سدا رہتی ہیں اور نہ ہی غم گینیاں اور پریشانیاں ہمیشہ رہتی ہیں، کوئی دن ہمارے اُوپر بھاری ہوتا ہے، کوئی دن ہمارے لیے آسانیاں لاتا ہے، اس میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا: اور تاکہ ظاہر کر دے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں یہاں علم کا معنی جاننا نہیں ہے کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما معنی کرتے ہیں تاکہ بتادے اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کو کہ اہل ایمان تکلیفیں اٹھا کر بھی ایمان پر قائم رہتے ہیں اور حق کے راستہ کو ترک نہیں کرتے اور جو منافق ہیں وہ قربانی کے وقت چھپتے ہیں اور جھوٹے بہانے بنا کر جان چھڑاتے ہیں۔ (ذخیرۃ الجنان) علم کا لفظ یہاں تمیز سے مجاز ہے، مطلب یہ کہ تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان پر ڈٹے رہنے والوں کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کر دے، چھانٹ لے، جیسے دوسرے مقام پر

خبیث کو پاکیزہ سے ممتاز کرنے کا ارشاد ہے۔

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر اسی طرح کا اُسلوب کلام پیش کیا گیا ہے،

① أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (آلِ عِمْرَانَ: ۱۴۲) کیا تم نے یہ خیال کیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی ظاہر نہیں کیا اللہ نے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے ہیں تم میں سے اور تاکہ وہ ممتاز کر دے ثابت قدم رہنے والوں کو، یہاں دوبار يَعْلَم کا لفظ استعمال ہوا ہے، یہاں بھی ظاہر کر دینے اور ممتاز کر دینے کا معنیٰ مناسب ہے، ورنہ یہ اشکال آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کے وقوعے کے بعد کسی چیز کو جانتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے وہ پہلے سے ہی اشیاء کو جانتے ہیں۔

② وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (العنکبوت: ۳) اور بلاشبہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو آزمایا ہے سو اللہ ضرور ضرور ان لوگوں کو ظاہر کر دے گا جو سچے ہیں اور ضرور ضرور جھوٹوں کو بھی ظاہر کر دے گا۔ یہاں بھی لَيَعْلَمَنَّ دوبار آیا ہے، اگر یہاں بھی جاننے کا معنیٰ کریں تو وہی اشکال آئے گا کہ سچوں کے سچ بولنے اور جھوٹوں کے جھوٹ بولنے کے بعد اللہ کو پتہ چلا کہ یہ سچے ہیں اور یہ جھوٹے ہیں۔ اللہ ضرور بہ ضرور سچوں کو ظاہر کر دے گا اور ضرور بہ ضرور جھوٹوں کو ظاہر کر دے گا میں یہ اشکال نہیں آتا۔

③ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَى لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا (الکہف: ۱۲) پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا تاکہ ہم واضح کر دیں کہ دونوں جماعتوں میں سے کون ہے جو گزری ہوئی مدت کا زیادہ بہتر طریقہ پر احاطہ کر سکتا ہے۔ اردو زبان میں قرآن کریم کے جتنے بھی مترجمین ہیں انہوں نے قریباً سبھی جگہ پر ''ہم جان لیں'' کا معنیٰ کیا ہے، ایک مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے واضح کر دیں کا معنیٰ کیا ہے، لیکن انہوں نے بھی جمع متکلم کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ یہ ترجمہ کیا کہ واضح ہو جائے، ہاں اردو مترجمین میں علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر تبیان القرآن میں جو ترجمہ پیش کیا ہے اس میں انہوں نے '' ظاہر کریں'' والا معنیٰ کیا ہے، جو مناسب ہے، اس پر معترضین و متشککین کو شکوک وشبہات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

④ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ (التَّوْبَةِ: ۱۶) کیا تم گمان کرتے ہو اس بات کا کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک ظاہر نہیں کیا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے۔ یہاں بھی لَمَّا يَعْلَمِ کا معنیٰ ظاہر نہیں کیا ہے، اگر وہ معنیٰ کیا جائے کہ اللہ نے نہیں جانا ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تو معنیٰ بہت ہی غلط ہو جاتا ہے، شکوک و شبہات کے دروازے کھل جاتے ہیں، ایسے مقامات پر متکلم کو، مفسر کو، صاحب قلم کو بہت ہی حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بے دھیانی میں کہیں معنیٰ بگاڑ نہ دیا جائے، جس سے پڑھنے والے غلط مفہوم سمجھ کر بات کہیں سے کہیں لے جائیں۔

⑤ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ (مُحَمَّدٍ: ۳۱) اور ہم ضرور امتحان لیں گے تمہارا تاکہ ہم ممتاز کر دیں مجاہدوں کو تم میں سے اور صبر کرنے والوں کو اور امتحان لیں گے تمہاری خبروں کا۔ یہاں بھی نَعْلَمَ کا معنیٰ ہم جان لیں نہیں ہے، بلکہ ہم ممتاز کر دیں یا ہم واضح کر دیں اور ظاہر کر دیں مجاہدین کو ہے۔

⑥ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ (الْبَقَرَةِ: ۱۴۳) تاکہ ہم ظاہر کر دیں اس کو جو پیروی کرتا ہے رسول کی۔ یہاں بھی اگر یہ معنیٰ کیا جائے کہ تاکہ ہم جان لیں اس کو جس نے پیروی کی رسول کی۔ تو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

⑦ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (هود: ۷، الملك: ۲) تاکہ امتحان لے تمہارا کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے۔

وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ: اور تاکہ بنائے تم میں سے کچھ شہید، شہید کا مقام بہت بلند ہے بظاہر تو وہ شہید ہو گیا ہے، مر گیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بڑی عزت اور قدر ہے حدیث پاک میں آتا ہے کہ شہید کے خون کے قطرے زمین پر گرنے سے پہلے حوریں آجاتی ہیں ان قطروں کو اٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کی روح کو اٹھا کر لے جاتے ہیں جسم تو یہیں رہے گا، ہاں جس وقت جسم کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے، تو روح کا جسم کے ساتھ گہرا تعلق جوڑ دیا جاتا ہے، جسم چاہے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو اور سر کہیں ہو اور دھڑ کہیں ہو، چاہے اس کو جلا کر راکھ بنا کر ذرّہ ذرّہ کر کے اڑا دیا

جائے، پھر بھی روح کا اس کے اجزاء کے ساتھ باقاعدہ تعلق ہوتا ہے یہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔(ذخیرۃ الجنان)

اللہ تعالیٰ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کے ذریعے عزت دیتا ہے، یہ شہدائے احد کا مرتبہ اور مقام بیان کیا جارہا ہے، حضرت عکرمہ فرماتے ہیں، جب گھریلو خواتین کو معرکہ احد کی خبریں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تو وہ اپنے گھروں سے خبریں دریافت کرنے باہر نکلیں، کیا دیکھتی ہیں کہ جنگ احد کے دو شہیدوں کی میتیں ایک جانور پر لاد کر لائی جارہی ہیں، ایک انصاری خاتون نے پوچھا یہ دو کون ہیں؟ لوگوں نے اسے جواب دیا کہ ان میں ایک تیرا بیٹا ہے اور دوسرا تیرا خاوند ہے، اس پر اس انصاری خاتون نے مسرت بھرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی شَرَّفَنِی بِقَتْلِهِمْ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے ان دونوں کی شہادت سے عزت بخشی ہے، پھر اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو شہادت کا رتبہ عطا کرتا ہے۔(المقتطف)

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ: یہاں ظالمین سے مراد کافرین ہیں، اللہ تعالیٰ کافروں سے بالکل بھی محبت نہیں کرتے اور نہ ہی کافروں کو پسند کرتے ہیں، کافروں کی مدد حقیقی طور پر نہیں کی جاتی، کہیں کبھی کبھار انہیں غلبہ مل جاتا ہے تو وہ ان کے لیے استدراج (وقتی مہلت ہوتی ہے تاکہ یہ مسلمانوں سے لڑیں اور انہیں مسلمان ماریں) ہے، اور مسلمانوں کے لیے امتحان وآزمائش ہے، اگر ہمیشہ ہی مسلمانوں کی مدد کی جاتی رہے تو اسے دیکھ کر لوگ ایمان میں داخل ہوتے رہیں کیونکہ اس سے انہیں یقین ہو جائے گا یہ مسلمان سچے ہیں، دین حق ہے، بعض کہتے ہیں کہ ظالمین سے مراد منافقین ہیں، جیسے عبد اللہ بن اُبیّ بن سلول اور اس کے منافق پیروکار، جنہوں نے بیچ راہ کے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور ان کے صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ کی جماعت سے الگ ہو کر واپسی کی راہ لی، میدان جہاد میں معرکہ میں شریک نہیں ہوئے، یوں انہوں نے مسلمانوں پر، لشکر اسلام پر جدا ہو کر ظلم کیا۔ "ظالمین" سے مراد اگر مشرکین ہیں جو "اُحد" میں فریق مقابل تھے تو یہ مطلب ہوگا کہ ان کی عارضی کامیابی کا سبب یہ نہیں کہ خدا ان سے محبت کرتا ہے، بلکہ دوسرے اسباب ہیں اور منافقین مراد ہوں جو عین موقع پر مسلمانوں سے الگ ہو گئے تھے، تو یہ بتلا دیا کہ خدا کے نزدیک مبغوض تھے، اس لیے ایمان وشہادت کے مقام سے

انھیں دور پھینک دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ: اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو گناہوں سے پاک کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے لِيُمَحِّصَ اور کافروں کے لیے يَمْحَقَ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، محص کا معنی ہے تنقیہ، کسی چیز کو پاک اور صاف کرنا اور محق کا معنی ہے کمی کرنا یا کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فتح اور شکست کو گردش دیتا رہتا ہے سو اگر کافر مسلمانوں پر غالب آجائیں تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے گناہوں سے پاک کر دیتا ہے اور اس شکست کا رنج وملال ان کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور اگر مسلمان کافروں پر غالب آجائیں تو اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کے مقابلہ میں آنے والے کافروں کی تعداد کو کم کر دیتا ہے یا ان کو جڑ سے مٹا دیتا ہے۔ (تبیان القرآن)

جنت سستی نہیں ملے گی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ {۱۴۲} وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ {۱۴۳} آل عمران

جواب ترجمہ: کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ یوں ہی تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ ابھی اللہ نے تم میں جہاد کرنے والوں کو ظاہر بھی نہیں کیا اور نہ ہی ثابت قدم رہنے والوں کو ممتاز کیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ تم لوگ موت کے سامنے آنے سے پہلے اس کی آرزو کرتے تھے، سو اب تم نے موت کو دیکھ لیا اس حال میں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ: یعنی جنت کے جن اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر خدا تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یونہی آرام سے وہاں جا پہنچو گے، ابھی تک تو اللہ تعالیٰ نے میدان کارزار میں جہاد کرنے والے مجاہدین کو ظاہر ہی

نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس نے راہ حق میں ڈٹ جانے والوں کو ممتاز کیا ہے، کس کس نے جانفشانی سے جہاد کیا ہے، کون مشقتوں اور آلام و مصائب کے باوجود میدان میں ڈٹ کر کھڑا رہا ہے، ان کو ظاہر کرنا ابھی باقی ہے، تم جہاد اور ثبات کے بغیر کیسے جنت کے طلب گار بنتے ہو، جن لوگوں نے جنت کی طرف دوڑ لگائی ہے وہ میدان کارزار میں اللہ کی خاطر، اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر سینہ تان کر کھڑے رہے ہیں، انہوں نے سینے پر دشمن کے وار برداشت کیے ہیں، تڑپتے لاشوں کو دیکھ کر بھی وہ تکبیر کا نعرہ رُستاخیز بلند کرتے ہیں۔

سید قطب لکھتے ہیں " دعوت اسلامی کے بارے میں مسلمانوں کی سوچ کو درست کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں سنت الٰہی کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ فتح و شکست، اعمال اور ان کے نتائج کے بارے میں اللہ کا ایک اٹل قانون ہے، بتایا جاتا ہے کہ جنت کی راہ میں تو کانٹے بھی بچھے ہوئے ہوتے ہیں، مشکلات بھی ہوتی ہیں اور اس راہ میں مشکلات کو صبر و ثبات کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے، محض خالی خولی تمناؤں اور نیک خواہشات کے ذریعہ یہ گھاٹی عبور نہیں کی جاسکتی، تمہیں اس راہ میں مشکلات انگیز کرنی ہوں گی اور اپنی صفوں کو کمزور لوگوں سے صاف کرنا ہوگا۔ (فی ظلال القرآن)

صیغہ استفہام انکاری اس مقام پر استعمال ہوتا ہے جہاں مخاطب کو ایک نہایت ہی خطرناک فکری غلطی پر متنبہ کرنا مطلوب ہوتا ہے، یہاں فکری غلطی یہ تھی کہ لوگوں نے سمجھا کہ بس زبان سے اس قسم کا اعلان ہی کافی ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں موت کے لیے تیار ہوں، اسلام کی راہ میں مر مٹنے کے لئے، صرف اس اعلان ہی سے گویا انہوں نے دعوت اسلامی کی راہ کی تمام مشکلات برداشت کر لیں اور اب وہ اللہ کی رضامندی اور جنت دونوں کے مستحق ہو گئے ہیں، یہاں انہیں سختی کے ساتھ بتایا گیا کہ تمہاری یہ سوچ درست نہیں ہے، تمہیں مشکلات کے واقعی تجربے سے گزرنا ہوگا عملی امتحان ہوگا، جہاد میں شرکت کرنی ہوگی اور مصائب کو گلے لگانا ہوگا اور اس کے بعد یہ کہ ان مشکلات کی حالت میں جزع و فزع نہیں بلکہ صبر کرنا ہوگا اور ان کو برداشت کرنا ہوگا۔ (فی ظلال القرآن)

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ: اور اس میں شک نہیں کہ تم لوگ موت کے سامنے آنے سے پہلے اس کی آرزو کرتے تھے سو اب تم نے موت کو

دیکھ لیا اس حال میں کہ وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ کاش ہم کو بھی اسی طرح قتل کر دیا جاتا جیسے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کو قتل کر دیا گیا، ہم بھی شہادت پاتے اور بدر کے دن کی طرح ہمارے لیے بھی یہ دن آتا کہ ہم اس میں مشرکوں سے لڑتے اور ہم اس میں خیر کو پاتے اور ہم شہادت کو اور جنت کو اور (جنت والی) زندگی کو اور رزق کو تلاش کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو احد کی شہادت سے نوازا، تو ان دعا کرنے والوں میں سے کوئی بھی نہ بچا وہی جس کو اللہ تعالیٰ نے چاہا (اسی پر) اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (در منثور)

تفسیر: اس میں ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب ہے جو غزوہ بدر میں شریک ہونے سے رہ گئے تھے، بدر میں جنگ کی صورت پیش آجائے گی یہ بات ان کے ذہن میں نہ تھی، اس لیے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے، جب وہاں معرکہ پیش آیا اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت نازل ہوئی جس میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم شہید بھی ہوئے تو یہ پیچھے رہ جانے والے شریک نہ ہونے پر نادم ہوئے یہ حضرات جنگ کی آرزو کرنے لگے اور کہنے لگے کہ کاش ہم بھی ان حضرات کے ساتھ مقتول ہو جاتے جو بدر میں مقتول ہوئے اور ہم بھی شہادت کا درجہ پالیتے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد میں شریک ہونے کا موقع دیا اور مسلمانوں کی فتح کے بعد صورت حال پلٹ گئی اور مشرکین بھاگنے کے بعد پلٹ کر واپس آکر حملہ آور ہوئے جس سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تو ان لوگوں نے بھی ثابت قدمی کا ثبوت نہ دیا جو شہادت کے پیش نظر غزوہ میں شریک ہوئے تھے۔ (روح المعانی، بحوالہ انوار البیان)

موت کی تمنا اور آرزو وہی لوگ کر رہے تھے جو میدان بدر میں معرکہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے، یہاں موت کی تمنا سے مراد شہادت کی تمنا ہے، تمنائے شہادت کرنا سعادت کی بات ہے، اس میں یہ خیال نہیں ہوتا ہے کہ ہم شہید ہو جائیں گے تو کفار غالب آجائیں گے بلکہ شہادت کا اعزاز پانے کی آرزو ہوتی ہے، اس کے علاوہ متمنی شہادت کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے باصرار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میدان اُحد کی طرف نکل کر کافروں کا مقابلہ کیا جائے۔

وفات مصطفےٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خبر پر پریشانی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِينَ {۱۴۴} آل عمران

جواب ترجمہ: اور محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تو اللہ کے رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں اگر وہ وفات پا جائیں یا ان کو شہید کر دیا جائے تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو بھی اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا اور جلد ہی اللہ شکر گزاروں کو بہتر بدلہ عطا فرمائے گا۔

شان نزول: عطیہ العوفی کا قول ہے کہ جب اُحد کے دن لوگوں کو یعنی مسلمانوں کو شکست ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ محمد تو قتل ہو گئے لہٰذا اب اپنے ہاتھ مشرکوں کے حوالے کر دو یعنی ہتھیار ڈال دو وہ تمہارے بھائی ہیں اور بعض لوگوں نے کہا کہ اگر محمد قتل ہو گئے تو کیا تم اس راستے پر نہ چلو گے جس پر نبی چلے تم شہید ہو کر ان کے ساتھ جا ملو، اس موقع پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں " مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک لغزش پر تہدید آمیز تنبیہ کر کے ایک ایسے اصولی مسئلہ کی طرف ہدایت کی گئی ہے کہ سوچنے والوں کو اس سے یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس عارضی شکست اور اس میں آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زخمی ہونے اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات کی خبر پھیل جانے کی اور اس پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی ہمت پست ہو جانے میں یہ راز بھی تھا کہ مسلمان اس اُصولی مسئلہ پر عملی طور پر پختہ ہو جائیں، وہ مسئلہ یہ تھا کہ جہاں اصول اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی عظمت و محبت کو جزو ایمان قرار دیا گیا ہے، جہاں اس میں ادنیٰ کمزوری کو کفر کے مرادف بتلایا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی اتنی ہی اہم تھی کہ کہیں مسلمان اس مرض کا شکار نہ ہو جائیں جس میں نصاریٰ اور عیسائی مبتلا ہو گئے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کو پرستش اور عبادت کی حد تک پہنچا دیا، اور ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک خدائی ٹھہرا لیا۔

غزوہ احد کی عارضی شکست کے وقت جب کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جو کچھ گزری اور گزرنی چاہیے تھی اس کا ادنی سا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لیے آسان نہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتا ہے جس کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری اور عشق رسول ﷺ کا کچھ اندازہ ہو، جس کو یہ پوری طرح معلوم ہو کہ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی محبت میں مال، اولاد اور اپنی جانیں اور سب کچھ گنوا دینے کو دنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھی اور عمل سے اس کا ثبوت دیا ہے۔ ان عشّاقِ رسول اللہ ﷺ کے کانوں میں جب یہ خبر پڑی ہو گی ان کے ہوش و حواس کا کیا عالم ہو گا خصوصاً جب کہ میدان جنگ گرم ہے اور فتح کے بعد شکست کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے، مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں، اس عالم میں وہ ہستی جو ساری کوششوں کا محور اور ساری اُمیدوں کا مظہر تھی، وہ بھی ان سے رخصت ہوتی ہے، اس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بھاری جماعت سراسیمہ ہو کر میدان جنگ سے ہٹنے لگی، یہ میدان جہاد سے ہٹ جانا اگرچہ ہنگامی اور سرسری اور وقتی سراسیمگی کا نتیجہ تھا، خدانخواستہ اسلام سے پھر جانے کا کوئی شبہ یا وسوسہ بھی نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ تو اپنے رسول ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک ایسی پاکباز فرشتہ خصلت جماعت بنانا چاہتا ہے جو دنیا کے لیے نمونہ عمل بنے، اس لیے ان کی ادنی لغزش بھی سخت قرار دی گئی۔ نزدیکاں رابیش بود حیرانی

ان کے لیے میدان جنگ چھوڑنے پر ایسا خطاب کیا گیا جیسے اسلام چھوڑنے پر کیا جاتا ہے اور سخت عتاب کے ساتھ اس بنیادی مسئلہ پر تنبیہ کی گئی کہ دین و عبادت اللہ کے لیے اور جہاد اسی کے لیے ہیں، جو ہمیشہ زندہ اور قائم ہے، اگر بالفرض یہ خبر صحیح بھی ہوتی کہ آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی تو بہر حال یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے اس پر ہمت ہار بیٹھنا اور دین کا کام چھوڑ دینا ان حضرات کے شایان شان نہیں، اس لیے ارشاد فرمایا: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ یعنی محمد ﷺ ایک رسول ہی تو ہیں۔ (خدا تو نہیں) آپ ﷺ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اگر آپ ﷺ کی وفات ہو جائے یا آپ ﷺ کو شہید کر دیا جائے تو کیا تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو کوئی الٹے پاؤں پھر جائے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ تعالیٰ ثواب دے گا شکر گزاروں کو، اس میں تنبیہ

فرمادی کہ رسول اللہ ﷺ تو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں، آپ ﷺ کے بعد بھی مسلمانوں کو دین پر ثابت قدم رہنا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس عارضی شکست کے وقت آنحضرت ﷺ کے مجروح ہونے اور وفات کی خبر مشہور ہونے میں یہ قدرتی راز تھا کہ آپ ﷺ کے بعد جو حالات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر پیش آسکتے تھے وہ آپ ﷺ کی دنیوی حیات ہی میں ظاہر کر دیئے گئے تاکہ ان میں جو لغزش ہو اس کی اصلاح خود آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے ہو جائے اور آئندہ جب یہ واقعہ وفات سچ مچ پیش آئے تو یہ عشاق رسول ﷺ از جا رفتہ نہ ہو جائیں، چنانچہ یہی ہوا آپ ﷺ کی وفات کے وقت جب بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہوش و حواس بجانہ تھے، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی آیات قرآنیہ کی سند لے کر ان کو سمجھایا اور وہ سب سنبھل گئے۔ (معارف القرآن)

موت کا وقت مقرر ہے

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ {۱۴۵} آل عمران

جواب ترجمہ: کسی جان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے اس کے لیے ایک مقرر وقت لکھا ہوا ہے جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور جو آخرت کے اجر کا طلبگار ہو گا اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور ہم جلد ہی احسان ماننے والوں کو بدلہ دیں گے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا: یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی جان اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، یعنی جس کو بھی موت آئے گی اللہ کے حکم سے آئے گی اور اجل مقرر کے مطابق آجائے گی، جس کی جو اجل یعنی موت کا وقت مقرر ہے اس سے پہلے موت نہیں آسکتی اور اس وقت سے ٹل بھی نہیں سکتی جو اس کے لیے مقرر ہے۔

صاحب روح المعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں جہاد کی ترغیب ہے اور قتل کے ڈر سے جہاد کو

چھوڑ دینے پر ملامت کی گئی ہے، پھر فرماتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہو کہ نبی اکرم ﷺ کی موت کی جو خبر سنی اس میں استبعاد کی کوئی بات نہیں، ان کو بھی اللہ کے حکم سے موت آئے گی، جیسا کہ سب جانوں کو موت آنا ہے، اگر ان کو موت ہو ہی گئی جو اللہ کے حکم سے ہے تو ان کے دین کو چھوڑنے کا کیا جواز ہے۔ (روح المعانی، انوار البیان)

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا: میدان اُحد میں مال غنیمت کی طرف مشغول ہو جانے والے حضرات کے لیے باریک اِشارہ دیا گیا ہے، مسلمانوں نے کافروں پر اُحد کے میدان میں حملہ کیا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے، جب وہ بھاگے تو مسلمانوں نے مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا، جبل رماۃ والوں نے جب یہ منظر دیکھا تو انہوں نے بھی جبل رماۃ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا، مشرکوں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے پلٹ کر حملہ کر دیا، عقب سے آکر حملہ کر کے مسلمانوں کو شدید ترین نقصان پہنچایا، تنبیہ فرمادی کہ جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اسے دنیا میں بدلہ دے دیا جائے گا۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا: یعنی جو شخص اللہ کے کلمہ کی بلندی کے لیے جان لگائے گا، اس کے لیے آخرت میں حسب وعدہ اجر و ثواب ہے، اسے ملے گا، یہ آیت اگرچہ جہاد کے موقع کی ہے لیکن اس میں تمام اعمال صالحہ وحسنہ شامل ہیں۔

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ: اور عنقریب ہم شکر گزاروں کو بدلہ دیں گے، اس میں ان حضرات پر تعریض ہے جنہوں نے غنیمت کے مالوں کی طرف توجہ کر لی اور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد میں جو مصلحت تھی اس پر غور نہ کیا اور ان حضرات کی تعریف ہے جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ (انوار البیان)

انبیائے سابقین اور اللہ والوں کے مجاہدات

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ {۱۴۶} وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ {۱۴۷} فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ

الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ {۱۴۸} آل عمران

جواب ترجمہ: کتنے ایسے نبی ہوئے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر اللہ والوں نے لڑائی لڑی تو ان کو اللہ کے راستہ میں جو بھی تکلیف پہنچی نہ اس سے انہوں نے ہمت ہاری نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ دبے اور اللہ جمنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اور وہ کچھ نہ بولے بس یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتی ہوئی (اس سے درگزر فرما) اور ہمارے قدموں کو جمادے اور کافر قوم پر ہماری مدد فرما۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ دیا اور آخرت کا بہتر ثواب بھی اور اللہ بہتر کام کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ: كَاَيِّنْ کم خبریہ کے معنی میں ہے۔ اصل میں أَيٍّ تھا، اس پر کاف تشبیہ کا داخل کر کے نون تنوین کو نون کی شکل میں لکھ دیا۔ كَاَيِّنْ اس میں مشہور لغت کائن بھی ہے۔ علامہ واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سب اہل لغت کا اس پر اجماع ہے کہ كَاَيِّنْ كَمْ کے معنی میں ہے، اعلاء کلمۃ اللہ، دین کی غلبے اور سربلندی کے لیے بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ اللہ والوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے مل کر کفار کے خلاف معرکہ آرائی کی، ان میں علماء بھی تھے، فقہاء بھی تھے اور دیگر بہت سے پیروکار بھی تھے، حضرات مفسرین رحمہم اللہ نے ربیون کا معنی "بہت بڑا جتھا" کیا ہے، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ربیون کا معنی ہزارہا کیا ہے، کلبی رحمہ اللہ نے اس کا معنی دس ہزار کیا ہے، ضحاک رحمہ اللہ نے اس کا معنی ایک ہزار کیا ہے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس کا معنی علماء اور فقہاء کیا ہے، بعض اہل تفسیر رحمہم اللہ نے اس کا معنی اتباع (پیروکار) کیا ہے، رِبِّيٌّ رب کی طرف منسوب ہے جس کا معنی اللہ کی پرستش کرنے والے۔

فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا: اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی اور وہ باطل کے آگے سرنگوں بھی نہیں ہوئے۔ لفظ وَهَن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے معنی جسم کا ٹوٹنا ہیں اور ضعف، قوت میں کمی کو کہتے ہیں۔ لفظ اَلِاسْتِكَانَةُ کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے معنی اظہار ضعف کے ہیں، ایک قول ہے کہ اس سے مراد جھک مارنا اور سرنگوں ہونا ہے۔ (احکام القرآن) اسْتَكَانُوا کا معنی

دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنا، سرینڈر کر دینا، یہ لفظ سکون سے ہے، کیونکہ سرینڈر کرنے والا، دوسروں کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا بڑے سکون سے دوسرے کے سامنے جھک جاتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جو چاہے کرے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ خدا پرست دل شکستہ نہیں ہوئے، نہ ہی دشمنوں کے مقابلہ میں کمزور پڑے اور نہ ہی جہاد میں پہنچنے والی تکلیفوں کی وجہ سے وہ اپنے دین سے ہٹ کر کسی اور طرف جھک گئے۔ آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے، اور انبیاء سابقین کے اہل علم، صحابہ کی راہ پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ نیز جہاد میں صبر و استقامت کے سلسلے میں ان کی اقتدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (احکام القرآن)

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ: اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، صبر کرنے والے وہ لوگ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے حکم پر جمے رہے، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی شہادت کی سنسنی خیز خبر سننے کے باوجود اپنے آپ کو جمائے رکھا، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، ان کے قدم ڈگمگائے نہیں، انہوں نے دشمن کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، دشمن سے امان نہیں مانگی، ان لوگوں نے میدان کارزار میں ثابت قدمی اور استقلال دکھایا، کچھ تو ایسے بھی تھے جو دشمنوں کی طرف سے بارش کی طرح چلنے والے تیروں کو اپنے جسموں پر سہتے تھے مگر نبی کریم ﷺ کو گزند نہیں پہنچنے دیتے تھے، یہ صابرین وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ پسند کرتے ہیں۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوا: مجاہدین اسلام جب میدان کارزار کی طرف اعلاء کلمۃ اللہ اور غلبہ دین کی خاطر سر کی بازی لگانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو ان کا سب سے پہلا کام ہتھیاروں سے اپنے کو مسلح کرنا، دشمن کے خلاف تیاری کرنا ہوتا ہے، اس کے بعد وہ اپنے رب کے ساتھ تعلق استوار کرتے ہیں، وہ اپنے دل کی تار اللہ کے ساتھ جوڑتے ہیں، کیونکہ اگلے مرحلے میں انہیں کامیابی و کامرانی اور فائز المرامی کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی اشد ضرورت ہے، اس کے بغیر کامیابی کا ملنا مشکل ہے، اس لیے وہ اپنے اللہ کے سامنے دعائیں کرتے ہیں، نوافل ادا کرتے ہیں، ان کا ہاتھ کا رول ہوتا اور دل یا رول ہوتا ہے، ہمہ وقت ان کی نگاہ اللہ کی طرف مرکوز ہوتی ہے، پھر ان کی زبانوں پر یہ دعاء

رقصاں ہوتی ہے،

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا: اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو معاف کر دے، ہم نے اپنے معاملات میں جو کوتاہیاں کی ہیں انہیں معاف کر دے، ہمارے قدموں کو جمادے، کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما۔ گناہوں کی وجہ سے اللہ کی مدد نہیں آتی، اس لیے کسی مجاہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمہ وقت اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے۔ یہ لوگ اللہ والے ہیں، یہ ربانی ہیں، یہ علماء اور فقہاء ہیں، اس کے باوجود یہاں گناہوں اور کوتاہی کی نسبت اپنی ذات کی طرف کر رہے ہیں، یہ ان کی کسر نفسی ہے، عاجزی اور انکساری ہے، ایسے لوگوں کو اللہ بہت پسند کرتا ہے جو اللہ کے لیے سارے کام کرتے ہیں اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں۔ میدان کارزار میں قدموں اور دلوں کا جمنا بہت ضروری ہے، میدان کارزار میں اگر مجاہد کا دل شکستہ ہو جائے، قدم اکھڑ جائیں تو پھر ممکن ہے بازی پلٹ جائے اور دشمن فتح پالے، اس لیے مجاہد اللہ سے دعا کرتا ہے کہ اللہ! اسے جمادے اور ثابت قدم رکھ۔

وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ: اور کافر قوموں پر ہم کو فتح عطا فرما، اس قول کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ نے اہل ایمان سے نصرت و غلبہ کا وعدہ فرما لیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے۔ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ دوسری جگہ فرمایا: اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ اور اہل ایمان پر جو دکھ اور مصیبت آتی ہے وہ گناہوں کے اور حدود عبودیت سے تجاوز کرنے کے سبب سے آتی ہے اللہ نے فرمایا ہے: مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ پس مصیبت کے وقت مومن کا فرض ہے کہ اپنے گناہ کا اقرار کرے تاکہ ندامت حاصل ہو اور معافی کا طلب گار ہو پھر اللہ سے امداد دینے اور ثابت قدم رکھنے کی دعا کرے۔ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ گناہوں سے پاک ہونے اور استغفار کرنے کے بعد دعا باب قبول تک جلد پہنچتی ہے۔ (مظہری)

فَآتَاهُمُ اللهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ: اللہ تعالیٰ ان کی ثابت قدمی اور دعاؤں کے سبب ان کی مدد کرتے ہیں، انہیں فتح عطا کرتے ہیں، فتح کے بعد انہیں مال غنیمت سے مالا مال کرتے ہیں، انہیں عزتوں سے نوازتے ہیں، ان کی نیک نامی ہر طرف پھیلا دیتے ہیں اور آخرت کا

ثواب حسن ہے یعنی اچھا ہے، حسن سے مراد جنت میں مرتبہ قرب کا ملنا ہے، جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ: اللہ تعالیٰ محسنین یعنی نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے، فضل واحسان والوں کو دوست رکھتا ہے، جن لوگوں نے نبیوں کے ہمراہ کفار کا مقابلہ کیا، دین کی سربلندی کے لیے آگے بڑھے، دعاؤں اور مناجات کے ذریعے اپنے اللہ سے گناہوں کی معافی چاہی، اپنی جانوں پر کیے جانے والے مظالم کی تلافی کروائی، میدان کارزار میں ڈٹ جانے کی التجائیں کیں، یہ لوگ اللہ کے ہاں نیکوکار ہیں، اللہ تعالیٰ ان محسنین کو پسند کرتا ہے۔

اِطاعت کفار کی ممانعت

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ {۱۴۹} بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ {۱۵۰} آل عمران

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جنہوں نے کفر اختیار کیا تو وہ تم کو الٹے پاؤں پھیر دیں گے، جس کی وجہ سے تم ناکام ہو جاؤ گے۔ بلکہ اللہ ہی تمہارا حمایتی ہے اور وہ مدد کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔

آیات کا پس منظر: غزوہ احد میں جب کفار نے نبی کریم ﷺ کی شہادت کی سنسنی پھیلائی تو منافقین نے بعض کمزور مسلمانوں کو کفر کی طرف آنے کی دعوت دی، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقین کی باتوں کی طرف دھیان دینے اور توجہ کرنے سے منع فرمایا ہے کہ اے اہل ایمان! تم لوگ کافروں کی اطاعت نہ کرو۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا: بعض ارباب تفسیر فرماتے ہیں کہ یہاں إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا سے مراد ابوسفیان ہے، کیونکہ اس دن کافروں کا سپہ سالار وہی تھا، سدی کہتے ہیں کہ اس سے مراد ابوسفیان ہے کیونکہ وہی شجرۃ الفتن (فتنوں کا درخت) تھا، بعض دوسرے مفسرین کہتے

ہیں کہ اس سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے منافق پیروکار ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو کمزور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج ڈالتے تھے، وہ کہتے پھرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے نبی اور رسول ہوتے تو انہیں اس طرح کے واقعے کا کیونکر سامنا کرنا پڑتا، دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتے تھے کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے نبی اور رسول ہوتے تو انہیں شکست کیوں ہوتی؟ وہ کہتے تھے کہ یہ نبی نہیں ہیں بلکہ عام لوگوں کی طرح کے ایک انسان ہیں، کوئی دن ان کے حق میں فائدہ مند ہوتا ہے اور کوئی دن ان کے خلاف بھاری پڑتا ہے، اس لیے تم اپنے اسی دین پر آجاؤ جس دین پر تم ان کے ساتھ ملنے سے پہلے تھے، بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہودی ہیں، کیونکہ وہ مدینہ میں یہودی قوم کے طور پر بسیرے کیے ہوئے تھے، یہی لوگ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے جاتے تھے، خصوصاً غزوہ احد کے اس روح فرسا واقعہ کے وقت انہیں باتیں بنانے کا بڑا موقع ہاتھ آگیا تھا، یہ واقعہ چونکہ تازہ تازہ ہوا تھا، سبھی لوگوں کی زبانوں پر اس کے چرچے تھے، یہودیوں اور منافقوں کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا ہوا تھا، اگرچہ اس واقعہ کا ایک خاص پس منظر تھا لیکن قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے حکم یہی ہے کہ وہ کفار کی اطاعت نہ کریں۔

يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ: یعنی جب تم ان کی باتوں کی طرف دھیان دوگے، ان کی طرف التفات کروگے تو یہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے تمہیں تمہارے دین سے ہٹادیں گے، تم واپس کفر کی طرف پلٹ جاؤ گے، کیونکہ دعوت الی الکفر کو سننا اور اسے قبول کرنا یہ بھی کفر ہے، اس لیے اجتناب کرو۔

فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ: کفار کی پیروی سے تم لوگ نقصان میں چلے جاؤ گے، یہ نقصان دنیوی بھی ہے اور اخروی بھی ہے، دنیوی نقصان یہ ہے کہ کسی بھی دانا وبینا انسان کے لیے یہ بات بہت ہی گراں اور پر مشقت ہوتی ہے کہ وہ کسی دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے، کسی دشمن کے سامنے ذلیل ورسوا ہوجائے، کسی دشمن کے سامنے دست طلب دراز کرے، اپنی حاجات وضروریات کا کاسہ اس کے سامنے پھیلائے اور آخرت کا نقصان یہ ہے کہ دائمی ثواب سے محرومی ہوجائے گی، دائمی عذاب میں گرفتار ہوجائے گا، اس لیے کافروں کی پیروی نہ کی جائے، ان کی باتوں میں نہ آیا جائے ورنہ بصورت

دیگر دونوں جہان کا نقصان اٹھانا پڑے گا، دونوں جہان کا نقصان بہت ہی بڑا نقصان ہے، نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے رہے، دنیا ملی اور نہ ہی عقبیٰ۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ: تم کافروں کی دوستی اس لیے چاہتے ہو کہ وہ تمہاری مدد کریں، وہ تمہاری ضروریات میں تمہاری دستگیری کریں، یاد رکھو یہ بہت ہی جہالت و ناسمجھی کی بات ہے، کیونکہ یہ خود محتاج و فقیر ہیں، یہ تمہاری مدد کہاں سے کریں گے، عاقل و دانا وہ ہوتا ہے جو ہمہ وقت اپنے مولیٰ سے تعلق رکھے، اپنی حاجات کا کشکول اس کے سامنے پھیلائے، اپنا دست طلب اس کے سامنے دراز کرے، اپنی تہی دستی و تہی دامنی اسی کے سامنے رکھے جو کسی کا محتاج نہیں ہے اور وہ دینے پر آئے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے، وہی تمہارا مولیٰ ہے، وہی بہترین مددگار ہے، وہ قوی و قادر ذات ہے، وہ متقی، پرہیزگار اور اپنے دوستوں کی مدد و نصرت کرتا ہے، اس لیے اسی کی خصوصیت سے اطاعت کرو اور اسی سے مدد مانگو۔

کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِينَ {۱۵۱} آل عمران

جواب ترجمہ: عنقریب ہم کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈال دیں گے اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ناانصافوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے۔

شان نزول: اُحد کے دن جب ابوسفیان اور مشرک مکہ کر روانہ ہوئے اور انہوں نے راستے کا کچھ حصہ طے کر لیا پھر انہیں ندامت ہوئی اور انہوں نے کہا کہ آج ہم نے برا کیا ہم نے انہیں یعنی مسلمانوں کو قتل کیا حتی کہ جب ان میں سے تھوڑے سے باقی رہ گئے تو ہم نے انہیں چھوڑ دیا واپس چلو اور ان کو بیخ و بن سے ختم کر دو جب انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا یہاں تک کہ وہ اپنے ارادے سے باز آ گئے اور اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ: غزوہ احد کا ذکر چل رہا ہے، ان آیات کا منظر اور پس منظر دیکھنے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو مختلف پیرائے میں جہاد کی طرف متوجہ فرما رہے ہیں، انہیں جہادی ترغیب دے رہے ہیں، کفار کی باتوں پر کان نہ دھرنے کی طرف توجہ دلا رہے ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا اور مجاہدین کا رعب ڈال دیتا ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں ہیں، کوئی شک وشبہ کی بات نہیں ہے جب کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ودبدبہ بیٹھ گیا تو یقیناً یہ چیز مسلمانوں کے غلبے کا باعث ہوگی۔

رعب عربی زبان میں اس خوف اور ڈر کو کہتے ہیں جو دل میں پڑ جاتا ہے، رعب کا اصل معنیٰ ہوتا ہے بھرنا، جیسے عربی زبان میں کہا جاتا ہے سَيْلٌ رَاعِبٌ وہ سیلاب جو وادیوں اور نہروں کو پانی سے بھر دے، ڈر اور خوف جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اسے رعب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دل کو ڈر سے بھر دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ وعدہ صرف غزوہ احد کے ساتھ خاص تھا یا یہ وعدہ تمام زمانوں کے لیے عام ہے، اس میں اکثر مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ یہ اسی دن کے ساتھ خاص تھا، کیونکہ اس سے پہلے جتنی بھی آیات آئی ہیں وہ اسی واقعہ کے گرد گھومتی ہیں، لیکن مجھے یہاں عرض کرنے دیجیے کہ اگر مجاہدین اپنے پیارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقش قدم پر چلتے رہیں گے، جہادی اصولوں کی پیروی کرتے رہیں گے، قرآن کریم کے جہادی احکام کو پیش نظر رکھیں گے تو قیامت تک ان کا رعب کافروں کے دلوں پر پڑتا رہے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنے بارے میں فرمایا کہ میری ایک مہینہ کی مسافت پر رعب سے مدد کی گئی ہے، اگر مجاہدین اصولوں اور طے شدہ ضابطوں کی روشنی میں جہادی خطوط کھینچتے رہیں گے تو قیامت تک رعب کا سلسلہ رہے گا، دین اسلام پوری دنیا کے ادیان پر غالب آئے گا، ابھی ماضی قریب کی بات ہے ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں مجاہدین نے روس جیسی سپر طاقت کو افغانستان کے پہاڑوں کی چوٹیوں اور دامن ہائے کوہسار میں شکست فاش دی، روس بھاگ گیا، پھر امریکہ جیسی سپر طاقت جسے سپر طاقت ہونے کا صرف خمار ہی سوار نہیں بلکہ دعویٰ بھی ہے، اسے افغانستان کے مجاہدین نے چاروں شانے چت کیا، جدید ترین ہتھیاروں کے باوجود مجاہدین نے اپنا ملک

امریکہ کے قبضہ سے آزاد کروایا، امریکہ اپنا سارا سازوسامان افغانستان میں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے، روس اور امریکہ جیسی طاقتوں پر مجاہدین کا رعب آج بھی موجود ہے، سلطان ٹیپو جیسے شیر دل انسان کا رعب اور دبدبہ دشمنوں پر ایسا تھا کہ وہ ٹیپو کے شہید ہونے کے باوجود اس کی قبر پر بھی لرزہ براندام تھے، شیخ اسامہ بن لادن شہید اس صدی کا مجاہد تھا، جس کو امریکہ نے شہید کر دیا مگر اس کی لاش سے بھی امریکہ خوف زدہ تھا، اسی خوف کے عالم میں اسامہ بن لادن کو زمین کے کسی ٹکڑے پر دفن کرنے کی بجائے اس کی لاش سمندر برد کر دی گئی۔

اب آتے ہیں اس طرف کہ کافروں کے دل میں ڈالے گئے رعب کی کیفیت کیا تھی؟ اس کی دو صورتیں تھیں، ایک یہ کہ جب کافر مسلمانوں پر غالب آ گئے، انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا، مسلمان زخمی ہو گئے، بڑی تعداد شہید ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دل میں ایسا خوف اور رعب ڈال دیا کہ وہ ان مسلمانوں کو بلاوجہ اور بلاسبب چھوڑ کر بھاگ نکلے، یہاں تک کہ ابوسفیان جو کافروں کا احد کے دن سرغنہ تھا وہ پہاڑی پر چڑھا اور پکارنے لگا کہ أَيْنَ ابْنُ أَبِي كَبْشَةَ ابن ابی کبشہ کہاں ہیں؟ أَيْنَ ابْنُ أَبِي قُحَافَةَ ابن ابی قحافہ کہاں ہیں؟ أَيْنَ ابْنُ الْخَطَّابِ ابن الخطاب کہاں ہیں؟ ان سوالوں کے جوابات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیے تھے، ابوسفیان اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان الفاظ کا تبادلہ اور ٹکراؤ بھی ہوا تھا، ابوسفیان نے پہاڑی سے اتر کر ان کی طرف آنے کی جرأت نہیں کی تھی، دوسری کیفیت رعب و دبدبہ کی وہ تھی جو شان نزول میں ذکر کر دی گئی ہے، کہ کفار جب مکہ مکرمہ کی طرف گئے تو راستہ میں کہنے لگے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا، ہم نے مسلمانوں کے بہت سے لوگوں کو مار ڈالا، پھر ہم نے انہیں ایسے وقت میں چھوڑ دیا جب ہم ان پر غالب آ چکے تھے، اس لیے واپس پلٹو تاکہ ہم ان کا بیج ہی ختم کر ڈالیں، جب انہوں نے واپس پلٹ کر یہ شر انگیزی کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب اور دبدبہ ڈال دیا کہ وہ اپنے ناپاک ارادے کی تکمیل نہ کر سکے۔

بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا: ہمارے اس رعب ڈالنے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، جس کی کوئی دلیل اور سند اللہ نے نازل نہیں فرمائی، دنیا میں ان کے دلوں

میں رعب ڈال کر مومنین کو محفوظ رکھا۔ (انوار البیان)

وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ: آخرت میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، یہی ان کی پناہ گاہ ہو گی، اس کے علاوہ ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی، یہ ظالموں کا برا ٹھکانہ ہو گا۔

آیت کے انداز بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ شرک باللہ رعب واقع ہونے کا سبب ہے اور یہ آزمائی ہوئی بات ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب فارس کی طرف رخ کیا تو وہاں کے مشرکین آتش پرست بڑی بھاری تعداد میں ان کے مقابلہ میں آتے تھے، پھر جب معرکہ شروع ہوتا تھا ان کے کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے اور بچے کھچے بے تحاشا بھاگ جاتے تھے صلیبی جنگوں میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے، ہندوستان پر جب مسلمانوں نے حملے کیے تو مشرکین رعب کھا گئے، مقتول ہوئے اور راہ فرار اختیار کی اور فاتحین نے ان کے ملک پر توحید کے جھنڈے لہرا دیئے، شرک کے مزاج میں مرعوبیت اور توحید کے مزاج میں شجاعت دلیری اور بہادری ہے۔ (انوار البیان)

فشل، نزاع، عصیان، طالبان دنیا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ وَاللهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ {۱۵۲} آل عمران

جواب ترجمہ: اور خدا نے اپنا وعدہ سچا کر دیا (یعنی) اس وقت جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ جو تم چاہتے تھے خدا نے تم کو دکھا دیا اس کے بعد تم نے ہمت ہار دی اور حکم (پیغمبر) میں جھگڑا کرنے لگے اور اس کی نافرمانی کی بعض تو تم میں سے دنیا کے خواستگار تھے اور بعض آخرت کے طالب اس وقت خدا نے تم کو ان (کے مقابلے) سے پھیر (کر بھگا) دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور خدا مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

شان نزول: محمد بن کعب القرظی کا قول ہے کہ اُحد کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نقصان اٹھا کر

مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کہا کہ ہمیں یہ نقصان کہاں سے یعنی کیونکر پہنچا جب کہ اللہ نے ہم سے نصرت کا وعدہ کیا ہے، اس پر اللہ نے یہ آیت وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ نازل فرمائی یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ سچ کر دکھایا لیکن تم میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو دنیا چاہتے تھے یعنی مال غنیمت کی حرص نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔ (اسباب النزول)

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ: جب رحمت دوعالم ﷺ میدان احد سے مدینہ منورہ واپس پہنچے تو احد میں مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصان پر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے تو ہم سے نصرت و مدد کا وعدہ کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں عرش بریں سے یہ پیغام دیا کہ اللہ نے تو تمہاری مدد اور نصرت کے لیے یہ شرط عائد کی تھی کہ تم لوگ تقویٰ اختیار کروگے اور صبر و حوصلے سے کام لو گے، قرآن کریم میں واضح فرمایا گیا کہ اگر تم لوگ صبر کروگے اور تقویٰ سے کام لوگے، تیر اندازوں سے کہا گیا تھا کہ تم نے یہاں سے ہلنا نہیں ہے، جب تک تم اسی صورت میں رہو گے ہم غالب رہیں گے، تیر انداز تیر چلاتے رہے، مشرکین کو تاک تاک کر نشانہ لگاتے رہے، نیزے اور برچھیوں کا استعمال کرتے رہے، ابتدائی مرحلے میں مشرکین پر مسلمان غالب آگئے تھے، یہاں تک کہ انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس وعدہ سے مراد نبی کریم ﷺ کے اس خواب کو سچ کر دکھانا ہے جس میں آپ ﷺ نے دیکھا تھا کہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ ایک دنبہ ذبح کر رہے ہیں، اس کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے طلحہ بن عثمان کے قتل کی صورت میں دکھائی، کیونکہ وہ مشرکین کا احد میں علمدار تھا، اس کے بعد مشرکین کے مزید نو (۹) علمدار غزوہ احد میں مارے گئے۔ تو یہاں جو وعدہ سچا کر دکھایا فرمایا گیا ہے اس سے مراد آپ ﷺ کے اس خواب کی تعبیر تھی۔ دوسرا مشروط وعدہ تھا کہ اگر تم لوگ صبر و تقویٰ اختیار کروگے تو تمہاری مدد کی جائے گی، جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی نہیں پایا گیا۔ تیسرا اس وعدہ سے مراد اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرور مدد کریں گے، یہ وعدہ بھی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے، چوتھا اس وعدہ سے وہ رعب مراد ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔ پانچواں اس وعدہ سے مراد نبی

کریم ﷺ کا وہ فرمان تھا جو آپ ﷺ نے تیر اندازوں کو جاری فرمایا تھا کہ لَا تَبْرَحُوا مِنْ هَذَا الْمَكَانِ، فَإِنَّا لَا نَزَالُ غَالِبِينَ مَا دُمْتُمْ فِي هَذَا الْمَكَانِ، تم لوگوں نے اس جگہ کو نہیں چھوڑنا، ہم برابر غالب رہیں گے جب تک تم لوگ اس جگہ پر ڈٹے رہو گے۔، چھٹا اس وعدے سے مراد یہ تھا کہ تم لوگ فشل اور تنازع سے پرہیز کرو گے تو وعدہ نصرت پورا ہو گا، لیکن دیکھا گیا کہ فشل اور تنازع پیدا ہوا جو کہ باعث عصیان ہوا، عصیان کی وجہ سے نصرت نہ آئی، یہاں بھی شرط مفقود ہے تو مشروط بھی مفقود ہو گیا۔ یہاں عصیان سے مراد اس مقررہ جگہ کو چھوڑنا تھا جس پر نبی کریم ﷺ نے ڈٹے رہنے کا حکم دیا تھا۔

إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ: جب اللہ کے حکم و فیصلہ کے مطابق تم کافروں کو بے دریغ تلوار سے کاٹ رہے تھے۔ ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا حَسٌّ کا معنی ہے قتل کر کے بیخ و بن سے اکھاڑ دینا، یہاں قتل عام مراد ہے، یہ لفظ احَسَّهٗ سے نکلا ہے، اَحَسَّ کا معنی ہے حس کو باطل کر دیا، یہ سب کچھ اللہ کے امر و توفیق سے ہوا۔

حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ: جب تمہاری رائے کمزور پڑ گئی اور تم مال غنیمت پر جھک پڑے (گویا کمزوری سے مراد ہے رائے کی کمزوری) کیونکہ مال کی حرص ضعف عقل کی علامت ہے۔ (مظہری)

وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ: اور قیام وعدم قیام کے معاملہ میں تم باہم جھگڑنے لگے، عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے جب مسلمانوں کا غلبہ اور مشرکوں کی شکست دیکھی تو بعض نے کہا اب یہاں ٹھہرے رہنے کی کیا ضرورت، عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کیا تم رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھول گئے؟ انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ کی یہ مراد نہیں تھی (کہ کافروں کو شکست ہو جائے تب بھی تم یہاں سے نہ ہٹنا) ہم تو ضرور جا کر لوٹ کا مال حاصل کریں گے، عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے کہا ہم حکم رسول ﷺ سے بالکل تجاوز نہیں کریں گے۔ (مظہری)

وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ: تیر اندازوں کو جو حکم نبوی ملا تھا اس میں وہ برقرار نہ رہ سکے، ان سے چوک ہو گئی، عصیان کا صدور ہو گیا، بقول شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی اور جب اللہ نے تمہاری پسندیدہ چیز تمہیں دکھائی تو تم نے (اپنے امیر کا) کہنا نہیں مانا۔ (توضیح البیان) تمہاری پسندیدہ

چیزیں دو تھیں ایک مشرکین کی شکست اور دوسری مال غنیمت، انہیں تم نے دیکھا تو فرمان نبوی سے عدول ہو گیا۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا: جب مال غنیمت اور مشرکین کی ہزیمت جیسی پسندیدہ اور محبوب چیز ان لوگوں نے دیکھی تو ان میں دو گروہ دکھائی دینے لگے، ایک وہ جنہیں یہاں دنیا کے طلب گار قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کی کوئی وقعت اور عظمت نہیں تھی، ورنہ شرعی لحاظ سے فتح پانے والوں کے لیے شکست کھانے والے والوں کے مال کو استعمال کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے، تلواروں کے سائے تلے سے رزق جو دیا جاتا ہے وہ مال غنیمت ہی ہوتا ہے، بہر حال یہاں دنیا کے طلب گار ان حضرات کو قرار دیا گیا جو مال غنیمت کو دیکھتے ہوئے اس مقام کو چھوڑ بیٹھے جس کو نہ چھوڑنے کا سختی سے حکم دیا گیا تھا۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ڈٹے رہے، تیر ہاتھ میں تھامے پیغمبر ﷺ کے فرمان عالی شان کو عملی جامہ پہنایا اور جام شہادت نوش کر گئے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے کسی کو میں نے دنیا کا طلبگار نہیں پایا یہاں تک کہ احد کا دن آیا (اور) یہ آیت نازل ہوئی آپ کے کلام کا مقصد یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے مال غنیمت کی طلب کی تھی دنیا کی طلب نہیں کی اور انہی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ (مظہری)

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ: پھر تم کو ان سے پھیر دیا تو مسلمانوں میں سے اتنی تعداد میں لوگ شہید ہو گئے جتنے بدر کے دن (مشرک) قید ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے چچا شہید ہوئے اور آپ کے آگے کے دانت مبارک شہید ہوئے اور آپ کے چہرہ مبارک میں زخم آیا۔ (در منثور) ایسا کرنے کا مقصد تمہیں امتحان و آزمائش میں ڈالنا تھا۔ جب دشمنوں نے پہاڑی خالی دیکھی تو پلٹ کر حملہ آور ہوئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کی ہمت نہ رہی اور دشمنوں کو حملے سے روک نہ سکے، اس کو ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ سے تعبیر فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اس میں تمہاری آزمائش مقصود تھی، رسول اللہ ﷺ نے تیر اندازوں کو جو مقام بتایا تھا کہ وہاں سے ہلنا نہیں ہے، ان میں سے کچھ لوگ

جگہ چھوڑ گئے تھے، کچھ وہ تھے جو اپنی جگہ پر ڈٹے رہے، یہ لوگ جو ڈٹے رہے تھے انہیں دشمن نے گھیر لیا تھا، امام بغوی رحمہ اللہ کے مطابق انہیں شہید کر دیا گیا تھا، اس صورت میں ان کے لیے اب جواز تھا کہ وہ دشمن کی آنکھوں سے بچتے ہوئے کسی محفوظ مکان پر چلے جاتے، اس گروہ کا یہ فعل عصیان کے زمرے میں نہیں آتا، جب کہ دوسرے گروہ نے جو غنیمت جمع کرنے کے لیے پیش قدمی کرتے ہوئے مقررہ مقام چھوڑ دیا تھا ان کا ایسا کرنا عصیان میں آتا ہے۔ جب یہ کوتاہی ہو گئی تو ان لوگوں نے اس کے بعد اپنے عزیز و اقارب کو بے دردی سے شہید ہوتے دیکھا، یہ سب سے بڑی آزمائش اور ابتلاء تھی، یہاں اسی ابتلاء و آزمائش کے بارے میں بتایا گیا ہے، ابو مسلم اصفہانی فرماتے ہیں کہ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دل میں مسلمانوں کا جو رعب و دبدبہ ڈالا تھا اسے ان کے قتل و عصیان کی وجہ سے ان سے ہٹا دیا تھا۔

وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ: غزوہ احد میں جو کچھ ہوا اس کا تقاضا تو کچھ اور تھا لیکن رب العالمین کی مہربانی اور رحمت عامہ اور تامہ کے باعث تمہیں معافی و درگزر کا پروانہ مل گیا، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی ان لوگوں پر کہ انہیں معاف کر دیا گیا، قیامت تک یہ پروانہ بتاتا رہے گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو معاف کر دیا تو کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کے نقائص و عیوب تلاش کرے، وہ ان پر آوازے کسے، وہ انہیں مورد الزام ٹھہرائے، وہ ان کی عزت و ناموس پر ہاتھ ڈالے، یہ پاکیزہ لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی غزوہ احد میں ہونے والی کوتاہی کو معاف کر دیا ہے، معافی سے یہاں مراد یہ ہے کہ انہیں اس کیے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ: اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر فضل والا ہے، یہاں فضل کے لام کے نیچے تنوین اشارہ کرتی ہے کہ وہ ذات عالی احسان کرنے والی اور بڑے فضل والی ہے۔ وہ ایسی ذات ہے جو ہمیشہ اہل ایمان و ایقان پر اپنا فضل فرماتی ہے، صاحب جلالین نے اللہ کی طرف سے تیر اندازوں کے درّہ چھوڑنے پر معاف کرنے کو فضل سے تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں معافی کا پروانہ ملا ہے۔ وہ فضل و طَول والی ایسی عظیم ہستی ہے جو اپنی ذات اور اپنے رسول ﷺ پر ایمان لانے والے مومنین پر فضل و احسان فرماتی ہے، بہت سے ان لوگوں کو اللہ اپنے فضل و کرم سے معاف

فرمادیتا ہے جو اپنے گناہوں کی وجہ سے سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے پریشان کن صورتحال

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلاَ تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلاَ تَحْزَنُواْ عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلاَ مَا أَصَابَكُمْ وَاللّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ {۱۵۳} آل عمران

جواب ترجمہ: جس وقت تم چڑھے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہیں تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا، سو اللہ نے تمہیں اس کی پاداش میں غم دیا بسبب غم دینے کے تاکہ تم مغموم نہ ہو اس پر جو ہاتھ سے نکل گئی اور نہ اس پر جو تمہیں پیش آئی اور اللہ خبر دار ہے اس چیز سے جو تم کرتے ہو۔

إِذْ تُصْعِدُونَ: وہ وقت یاد کرو جب تم بھاگتے ہوئے جنگل کو چڑھے چلے جارہے تھے۔(بیان القرآن للتھانویؒ) اصعاد کا معنٰی ہے زمین میں جانا، اصعد کا معنٰی ہوتا ہے جدھر منہ کیا ادھر ہی چلا گیا۔ ابو حاتم نے کہا کہ بلندی پر چڑھنے کو صعود اور ہموار زمین اور وادیوں میں چلنے کو اصعاد کہتے ہیں۔

وَلاَ تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ: اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ کوئی کسی کے لیے نہیں ٹھہر رہا تھا، کسی دوسرے کا انتظار نہیں کر رہا تھا، اپنے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا، یہ شکست وہزیمت کی غایت اور انتہاء کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ: اور رسول ﷺ تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے کہ ادھر آؤ ادھر آؤ مگر تم نے سنا ہی نہیں، یہ بات واضح ہوگئی کہ جب نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آواز دی تو افراتفری کا عالم تھا، کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دی، اس کے بعد جب حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ نے آواز دی تو وہ سب نے سن لی اور یہ آواز سنتے ہی لوگ ماہتاب عالم ﷺ کے گرد ھالہ کی طرح جمع ہوگئے، گھبراہٹ کی وجہ رحمت دوعالم ﷺ کے انتقال کی سنسنی خیز خبر تھی، جب کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے پکارا تو بات واضح ہوگئی کہ نبی کریم ﷺ حیات ہیں، یہ سنتے ہی سب کو تسلی

ہو گئی اور سب آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے۔ افراتفری، دہشت اور خوف کے اس عالم میں بھی اللہ کا پیارا محبوب اور سچا رسول ﷺ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر جما رہا، نہ دل میں ہراس، نہ چہرہ پر مایوسی، نہ زبان پر شکوہ اور نہ حرکات میں بے ضابطگی، شجاعت رسالت اور وقار نبوت کا صحیح مظاہرہ اسی روز ہوا صرف بارہ جان نثار پاس ہیں اور دشمن کا ٹڈی دل لشکر چاروں طرف سے امڈا چلا آرہا ہے، لیکن یہاں پیشانی پر بل تک نہیں، اس وقت بھی زبان پاک سے اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اے اللہ کے بندو میری طرف آؤ اے اللہ کے بندو میری طرف آؤ کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ (ضیاء القرآن)

فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ: یعنی تم نے حکم نبوی سے سرتابی کر کے حضور ﷺ کو رنج پہنچایا، اس کے بدلے تمہیں بھی غم سے دوچار ہونا پڑا جتنا ہوا میدان ہاتھ سے نکل گیا، تعداد کثیر شہید ہو گئی اور حضور ﷺ کی شہادت کی خبر وحشت اثر نے تو دنیا ہی تاریک کر دی۔ (ضیاء القرآن) زجاج نے کہا کہ جب تم نے رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی کر کے انہیں غم پہنچایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی تمہیں غم پہنچایا، یہ وہ غم تھا جو انہیں شکست اور دوستوں کے قتل کی صورت میں اٹھانا پڑا، اس کا مطلب ہے کہ اس نے تمہیں اس غم کے ساتھ بدلہ دیا اس غم کے بدلے میں۔

ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں فاثابکم میں ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ نبی ﷺ کا چہرہ زخمی ہو گیا ہے، آپ ﷺ کے رباعی دانت شہید ہو گئے ہیں، آپ ﷺ کے چچا امیر حمزہ شہید کر دیے گئے ہیں، اس وجہ سے آپ ﷺ پریشان واندوہگیں ہیں اور جب رسول اللہ ﷺ نے نے دیکھا کہ ان لوگوں نے مال غنیمت طلب کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے، پھر مال غنیمت سے بھی محروم ہو گئے ہیں، ان کے رشتہ دار بھی شہید کر دیے گئے ہیں اس وجہ سے یہ پریشان اور غم گین ہیں، تو اس فرمان فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ کا یہ مطلب ہے۔

وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ: جو کچھ آپ لوگ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے اچھی طرح باخبر ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ اور چھپی ہوئی نہیں ہے۔

غزوہ اُحد میں پہنچنے والے غم

غزوہ احد کی عجیب داستان ہے، ساری داستان پڑھنے، سننے اور لکھنے سے انسانی رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اللہ اکبر کبیرا، ارباب تفسیر فرماتے ہیں کہ غزوہ احد میں لگنے والے زخم اور پہنچنے والے غم کافی ہیں، ان میں سے کچھ نے انہیں تحریر کیا ہے ① پہلا غم تو اس وقت پہنچا تھا جب کمزوری دکھائی گئی اور تنازعہ پیدا ہوا، جس کی طرف قرآن کریم نے فشل اور تنازع کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ② دوسرا غم ہزیمت کے وقت پہنچا، ابتدائی مرحلے میں کامیابی ملی، کافر بھاگ گئے، لیکن جب کافروں نے پلٹ کر وار کیا تو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ ③ غنیمتیں حاصل نہ ہونے کا بھی غم تھا۔ ④ ابوسفیان اور خالد بن ولید نے مسلمانوں پر پلٹ کر وار کیا اور ان کی بہت بڑی تعداد کو شہید کر دیا۔ ⑤ مشرکین جب پلٹے تو باقی مسلمان خوف زدہ ہو گئے کہ اگر یہ آ گئے ہیں تو سب کو قتل کر دیں گے، اس غم نے پہلے والے غم کو بھلا دیا تھا۔ ⑥ ایک غم انہیں اپنی جانوں اور مالوں سے متعلق تھا۔ ⑦ ایک غم نبی کریم ﷺ کی شہادت سے متعلق سنسنی خیز خبر سننے سے ہوا۔ یہاں آیت کریمہ کا اسلوب ہی بتاتا ہے کہ ایک دو غم یا ایک دو زخم مسلمانوں کو نہیں لگے، اس دن کافروں نے عجیب کھیل مسلمانوں کے ساتھ کھیلا ہے، ہر طرف خون ہی خون دکھائی دیتا تھا، شہادت تو ملنے والوں کو ملی مگر ان کی لاشوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی قربانیاں قبول فرمائے۔

تلواروں کے سائے میں نیند

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاساً يَغْشَى طَآئِفَةً مِّنكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الأَمْرِ مِن شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الأَمْرَ كُلَّهُ لِلهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَّا لاَ يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ {۱۵۴} آل عمران.

جواب ترجمہ: پھر اللہ نے اس غم کے بعد تم پر چین یعنی اونگھ بھیجی، اس نے بعضوں کو تم میں سے ڈھانک لیا اور بعضوں کو اپنی جان کا فکر لڑ رہا تھا اللہ پر جھوٹے خیال جاہلوں جیسے کر رہے تھے کہتے تھے ہمارے ہاتھ میں کچھ کام ہے، کہہ دو کہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے دل میں چھپاتے ہیں، جو تیرے سامنے ظاہر نہیں کرتے، کہتے ہیں اگر ہمارے ہاتھ میں کچھ کام ہوتا تو ہم اس جگہ مارے نہ جاتے، کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے البتہ اپنے گرنے کی جگہ پر باہر نکل آتے، وہ لوگ جن پر قتل ہونا لکھا جا چکا تھا اور تا کہ اللہ آزمائے جو تمہارے سینوں میں ہے اور تا کہ اس چیز کو صاف کر دے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔

ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاساً يَغْشَى طَآئِفَةً مِّنكُمْ: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اس غم و رنج کے وقت جو احسان فرمایا تھا اس کا بیان ہو رہا ہے کہ اس نے ان پر اونگھ ڈال دی ہتھیار ہاتھ میں ہیں دشمن سامنے ہے لیکن دل میں اتنی تسکین ہے کہ آنکھیں اونگھ سے جھکی جا رہی ہیں جو امن و امان کا نشان ہے جیسے سورۃ انفال میں بدر کے واقعہ میں ہے آیت إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن بصورت اونگھ نازل ہوا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اَلنُّعَاسُ فِي القِتَالِ مِنَ اللهِ، وَفِي الصَّلَاةِ مِنَ الشَّيطَانِ (تفسیر ابن کثیر) لڑائی کے وقت اونگھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور نماز میں اونگھ کا آنا شیطان کی طرف سے ہے، حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے كُنتُ فِيمَنْ تَغَشَّاهُ النُّعَاسُ يَوْمَ أُحد، حَتَّى سَقَطَ سَيْفِي مِنْ يَدِي مِرَارًا، يَسْقُطُ وَآخُذُهُ، وَيَسْقُطُ وَآخُذُهُ (بخاری کتاب التفسیر) میں ان لوگوں میں سے تھا جنہیں اُحد کے دن اونگھ آگئی تھی، یہاں تک کہ میرے ہاتھ سے کئی بار میری تلوار گر گئی، تلوار گرتی تو میں اسے اٹھا لیتا، پھر گرتی تو پھر میں اٹھا لیتا۔

آپ فرماتے ہیں رَفَعْتُ رَأْسِي يَوْمَ أُحُدٍ فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ، وَمَا مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ أَحَدٌ إِلَّا يَمِيدُ تَحْتَ حَجَفَتِهِ مِنَ النُّعَاسِ (ترمذی) جب میں نے اپنا سر اُحد کے دن اوپر کو اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو نیند کی وجہ سے ڈھال پر نہ پڑا ہوا ہو۔ اہلِ ایمان، اہلِ یقین، اہلِ ثبات، اہلِ توکل اور اہلِ صدق تو یقین کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرور مدد کرے گا اور ان کی

منہ مانگی مراد پوری ہو کر رہے گی۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے لَقَدْ رَأَيْتُنِي مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ اشْتَدَّ الْخَوْفُ عَلَيْنَا، أَرْسَلَ اللّٰهُ عَلَيْنَا النَّوْمَ، فَمَا مِنَّا مِنْ رَجُلٍ إِلَّا ذَقْنُهُ فِي صَدْرِهِ، (تفسیر ابن کثیر) کہ اس سخت خوف کے وقت ہمیں تو اس قدر نیند آنے لگی کہ ہماری ٹھوڑیاں سینوں سے لگ گئیں۔

وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ: لیکن اہل نفاق اہل شک، بے یقین لوگوں کی عجیب حالت تھی ان کی جان عذاب میں تھی وہ ہائے وائے کر رہے تھے اور ان کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے انہیں یقین کامل ہو گیا تھا کہ اب مرے، وہ جان چکے تھے کہ رسول اور مومن (نعوذ باللہ) اب بچ کر نہیں جائیں گے اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، فی الواقع منافقوں کا یہی حال ہے کہ جہاں ذرا نیچا پانسہ دیکھا تو نا امیدی کی کالی گھٹاؤں نے انہیں گھیر لیا ان کے برخلاف ایماندار بد سے بدتر حالت میں بھی اللہ تعالیٰ سے نیک گمان رکھتا ہے، ان کے دلوں کے خیالات یہ تھے کہ اگر ہمارا کچھ بھی بس چلتا تو آج کی موت سے بچ جاتے اور چپکے چپکے یوں کہتے بھی تھے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اس دوسرے طائفے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وَالطَّائِفَةُ الْأُخْرَى الْمُنَافِقُونَ لَيْسَ لَهُمْ هَمٌّ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ، أَجْبَنُ قَوْمٍ وَأَرْعَنَه، وأَخْذَلَه لِلْحَقِّ، ہاں دوسرا گروہ منافقوں کا تھا، انہیں بس اپنی ہی فکر تھی، یہ لوگ بزدل اوچھے اور حق کو چھوڑنے والے تھے۔

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ: یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارے ہاتھ میں بھی کچھ اختیار ہے، اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کا جو وعدہ کر رکھا ہے کیا اس میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن اُبیّ کو بلا کر مشورہ لیا تو اس نے مشورہ دیا تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر جنگ کی جائے، صحابہ رضی اللہ عنہم کا اصرار تھا کہ مدینہ سے باہر جا کر جنگ کی جائے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے مان کر باہر جا کر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا تو عبداللہ بن اُبیّ کو غصہ آیا کہ انہوں نے بچوں کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ جب خزرج کے بہت سے لوگ قتل ہو گئے تو عبداللہ بن اُبیّ کو اس بارے میں بتایا گیا، اس وقت اس نے کہا تھا کہ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب میں نے کہا تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر جنگ کی جائے تو انہوں نے میری بات نہیں مانی تھی، اسی

طرح اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کی بات نقل فرمائی کہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو یہ لوگ قتل نہ ہوتے، ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہماری بات تو یہاں مانی ہی نہیں جاتی۔

قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ: آپ فرمادیجیے کہ بلاشبہ سب اختیار اللہ ہی کو ہے۔ حقیقی غلبہ حزب اللہ اور اللہ کے دوستوں کو حاصل ہوتا ہے، جب کہ کافروں کا مسلمانوں پر غلبہ پانا یہ اللہ کی مدد اور نصرت سے نہیں ہوتا، کیونکہ نصرت و مدد الٰہی وہ ہوتی ہے جس کا انجام کار اچھا ہو، مسلمان اگر وقتی طور پر شکست وہزیمت سے دوچار ہو بھی جائیں تو ان کا انجام کار اچھا ہوتا ہے، مسلمانوں کی مدد حقیقی ہوتی ہے، اللہ کا لشکر ہی ہمیشہ غالب رہتا ہے، رہی کافروں کی یہ زبان درازی کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے تو انہیں شکست نہ ہوتی، ان پر کافر مسلط نہ ہوتے، یہ ان کا خیال و گمان فاسد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنے بندوں کو امتحان و آزمائش میں بھی ڈال دیتا ہے۔

يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ: یہ لوگ اپنے نفسوں میں ایسی بات چھپا رہے ہیں جسے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے دلوں میں ان چیزوں کو چھپاتے ہیں جو آپ ﷺ پر ظاہر نہیں کرتے یعنی وہ شرک، کفر اور تکذیب کو چھپاتے ہیں جو آپ ﷺ پر ظاہر نہیں کرتے۔

يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا: وہ کہتے تھے کاش ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں، قتل نہ کیے جاتے، یعنی وہ کہتے تھے کہ اگر ہماری عقل حاضر ہوتی تو ہم اہل مکہ سے قتال کے لیے نہ نکلتے اور ہمارے بڑے بڑے سردار قتل نہ کیے جاتے، یہ باتیں وہ اپنے دلوں میں کہتے تھے یا ایک دوسرے سے جب ملاقات کرتے تو اس وقت کہتے تھے۔ یعنی محمد ﷺ نے جس طرح ہم سے وعدہ کیا تھا اگر اس طرح ہوتا تو ہم قتل نہ ہوتے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے اپنی اسی نیند کی حالت میں معتب بن قشیر کے یہ الفاظ سنے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا کہ اگر ہمیں کچھ بھی اختیار ہوتا تو یہاں قتل نہ ہوتے۔

قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ: آپ فرمایئے اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کا قتل کیا جانا مقدر ہو چکا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہیں مرنے کا وقت نہیں ٹلتا گو تم گھروں میں ہوتے تو موت

کے وقت موت نے آجانا تھا، لیکن پھر بھی جن پر یہاں کٹنا لکھا جا چکا ہوتا وہ گھروں کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور یہاں میدان میں آکر ڈٹ گئے اور اللہ کا لکھا پورا ہوا۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ: اور یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تمہارے دلوں کی باتوں کو آزمائے، یعنی اللہ تمہارے ساتھ ایسا معاملہ کرے جو آزمانے والا کرتا ہے، تاکہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ بطور غیب جانتا تھا ان کا ظہور بطور مشاہدہ ہو جائے یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو مشاہدہ کرائے، کیونکہ حقیقۃً آزمانا اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے کیونکہ آزمانا وہ ہے جو نتیجہ اور انجام سے بے خبر ہو اور تمہارے دلوں کو (وسوسوں اور اندیشوں سے) صاف کر دے اللہ تعالیٰ نے تم پر جنگ اور قتال کو فرض کیا اور جنگ احد میں تمہاری مدد نہیں کی، تاکہ تمہارے صبر کو آزمائے اور جب تم اخلاص سے توبہ کرو تو تمہارے گناہوں کو مٹا دے، اس آیت میں بھی آزمانے کا یہی معنی ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا معاملہ کرے جو آزمانے والا کرتا ہے۔ (تبیان القرآن)

وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ: ذات الصدور سے مراد وہ چیزیں جو دلوں میں موجود ہیں اور وہ پوشیدہ اور چھپی ہوئی ہیں، اسی کو ذات الصدور کہتے ہیں، سینوں کے وہ راز جو کبھی سینوں سے جدا نہیں ہوتے وہ راز بھی اللہ تعالیٰ بہت اچھی طرح جانتا ہے، منافقین زبانوں سے کیا گل افشانیاں کرتے اور سینوں میں کیا گند چھپاتے تھے یہ اللہ کو معلوم ہے، وہ کیا عزائم رکھتے تھے اور کیا ظاہر کرتے تھے سب اللہ کو پتہ ہیں، اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی ہے، اللہ تعالیٰ تمام خفیہ چیزوں کا احاطہ کرنے والا ہے۔

اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معاف کر دیا

سوال اِس آیت میں جن لوگوں کو شیطان نے بہکایا اُن کا ذکر ہے وہ کون لوگ ہیں؟

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ {۱۵۵} آل عمران.

جواب ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو تم میں پیٹھ پھیر گئے جس دن دونوں فوجیں ملیں سو شیطان نے ان کے گناہ کے سبب سے انہیں بہکا دیا تھا اور اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے بیشک اللہ بخشنے والا تحمل

کرنے والا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ: یہ خطاب کی ضمیر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ان لوگوں کی طرف ہے جو افراتفری کے باعث پیٹھ پھیر گئے تھے، جب اُحد کے میدان میں رسول اللہ ﷺ اور ابوسفیان کی فوج کا آمنا سامنا ہوا تھا۔

إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا: جو لوگ پشت پھیر کر چل دیئے تھے ان کو شیطان نے لغزش دے دی تھی اور اس لغزش کا سبب ان کے بعض گناہ بن گئے اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گناہوں کی طرف کھینچتے ہیں ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے اور گناہوں کے ذریعہ شیطان دوسرے گناہوں پر آمادہ کر دیتا ہے۔ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا سے مراد بھی وہی درّہ کو چھوڑنے اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کرنے کی غلطی تھی جو مسلمانوں سے سرزد ہو گئی تھی اور یہ راہ فرار اختیار کرنا ان مومنوں کے اپنے عزم سے نہ تھا بلکہ یہ ایک شیطانی اغوا تھا ورنہ ان کے دل ایمان پر قائم تھے اس دوران رسول اللہ ﷺ کے پاس صرف تیرہ یا چودہ مسلمان رہ گئے تھے جن میں سات مہاجرین تھے اور سات انصار۔ مہاجرین میں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے، انصار میں سے خباب من منذر رضی اللہ عنہ، ابو دجانہ رضی اللہ عنہ، عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ، حرث بن صمہ رضی اللہ عنہ، سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ، اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے

آٹھ لوگ وہ تھے جنہوں نے اس روز موت کی بیعت کی تھی، ان میں تین مہاجر تھے، ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ تھے اور پانچ انصار تھے، ابو دجانہ رضی اللہ عنہ، حرث بن صمہ رضی اللہ عنہ، خباب بن منذر رضی اللہ عنہ، عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ، سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ، پھر کوئی بھی ان میں سے قتل نہیں کیا گیا، ابن عیینہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تیس لوگ زخمی ہوئے، یہ سب آئے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور یوں کہتے تھے میرا چہرہ آپ ﷺ کے چہرے پر فدا ہو جائے، میری جان آپ ﷺ کی جان پر فدا ہو جائے، آپ ﷺ پر سلامتی ہو جو کبھی ختم نہ ہو۔ (کبیر للرازی)

جبل رماۃ پر ہونے والی معمولی سی غلطی نے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کیا، کافروں کے زوردار اور اچانک حملے سے ہر طرف لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، مسلمانوں کے تین گروہ ہو گئے، ایک گروہ اضطرابی حالت میں مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا، مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہونے والوں میں سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی تھے، دوسرا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی جھوٹی خبر سن کر پریشان ہو گیا، تیسرا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یمین و یسار میں موجود تھا، یہاں کچھ لوگوں نے الفاظ و تعبیر کا درست چناؤ نہ کرتے ہوئے کہہ دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل تھے، جنہوں نے راہ فرار اختیار کی تھی، چنانچہ شیعہ حضرات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ایک یہ طعن بھی کرتے ہیں، حالانکہ خود اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ فرار محض شیطانی اغوا تھا، ایمان کی کمزوری کی بنا پر نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا قصور معاف فرما دیا ہے۔

جب آپ زخمی ہوئے اور کفار نے آپ کے گرد گھیرا ڈال لیا تو اس دوران دو صحابہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی حفاظت کے لیے جانثاری کے بے مثال نمونے پیش کئے، لَمْ يَبْقَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فِي بَعْضِ تِلْكَ الأَيَّامِ الَّتِي قَاتَلَ فِيهِنَّ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، غَيْرُ طَلْحَةَ، وَسَعْدٍ (بخاری، کتاب المناقب) چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفَدِّي رَجُلًا بَعْدَ سَعْدٍ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: ارْمِ فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي (بخاری کتاب الجہاد) کہ میں نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بعد پھر کسی کے لیے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنے آپ کو یا اپنے ماں باپ کو فدا کیا ہو۔

غزوہ احد کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یوں فرماتے تھے، تیر مارو، میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں (بخاری، کتاب الجہاد) اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے، آپ بھی ماہر تیر انداز تھے جو کوئی پاس سے گزرتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے اپنے تیر طلحہ کے حوالے کر دو۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ کافروں کے تیر روکنے کے لیے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی چیز نہ تھی تو اپنا بازو آگے کر دیا اور سب تیر اسی پر برداشت کرتے رہے، حتیٰ کہ ایک بازو شل ہو گیا تو دوسرا آگے

کر دیا، چنانچہ قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ رَأَیتُ یَدَ طَلحَۃَ الَّتِی وَقَی بِہَا النَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَ سَلَّمَ قَد شَلَّت میں نے طلحہ رضی اللہ عنہ کا وہ ہاتھ دیکھا جس سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچایا تھا، وہ بالکل شل ہو گیا تھا۔ (بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر طلحہ بن عبید اللہ)

عَفَا اللّٰہُ عَنْہُمْ إِنَّ اللّٰہَ غَفُورٌ حَلِیمٌ: اس افراتفری میں جو لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے انہیں پہلے مژدہ سنایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی غلطی معاف فرمادی، ان کی مزید تسکین خاطر کے لیے اسی خوشخبری کو دہرایا جارہا ہے۔ (ضیاء القرآن) یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے عیب جوئی کرنے والوں کی زبانوں پر مہر سکوت ثبت فرمادی کہ جن حضرات سے درّہ چھوڑنے کی ایک اجتہادی غلطی سرزد ہو گئی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرمادیا، یہ غلطی بھی صداقت اور راست گوئی پر مبنی تھی، العیاذ باللہ نفاق یا کفر کی کوئی بیماری اس کے پیچھے کارفرمانہ تھی۔ (تفسیر مفتی محمود) بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ بخشنے والا حلم والا ہے۔

دفاع عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

غزوہ احد میں مسلمانوں کو جس طرح کے پریشان کن حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کے تصور سے بھی انسانی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، اس میں جہاں باقی لوگوں کے میدان سے چلے جانے پر قرآن کریم ہمیں آگاہ کرتا ہے وہاں اس آیت کی تفسیر میں مفسرین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے چلے جانے کا بھی ذکر کرتے ہیں، لیکن دشمنان صحابہ روافض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چلے جانے پر سخت تنقیدی نشتر چلاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ اس بناء پر خلافت کے اہل نہیں تھے۔

تفسیر بحر العلوم میں علامہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے درمیان ہونے والی گفتگو نقل فرمائی ہے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ مجھے برا بھلا کہتے ہیں جب کہ میں بدر میں شریک ہوا تھا اور آپ نہیں ہوئے تھے، میں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی جب کہ آپ نے نہیں کی تھی، آپ احد کے دن بھاگنے والوں میں بھاگ گئے تھے، ان اعتراضات کو سن کر حضرت عثمان

رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ① جہاں تک آپ کی بدر سے متعلق بات ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں کسی بھی ایسے مقام سے پیچھے نہیں ہٹا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوئے ہوں، سوائے اس بات کے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی جو میرے نکاح میں تھی وہ بیمار تھی، میں ان کی تیمارداری میں مشغول تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مال غنیمت میں سے حصے مقرر فرمائے تو میرا حصہ بھی نکالا تھا ② رہی بات بیعت رضوان والی تو آپ جانتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کو جواب دینے کے لیے مکہ مکرمہ بھیجا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان میں اپنے داہنے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائیاں ہاتھ میرے دائیں اور بائیں ہاتھ سے بہتر ہے ③ رہی بات احد کے دن بھاگنے کی تو اس بارے میں سنیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ دو جماعتوں کے جمع ہونے کے دن پشت پھیر گئے، جنہیں شیطان نے پھسلایا اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا ہے، میں بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے، یوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سوالوں کے جواب دے کر بازی لے گئے۔ (بحر العلوم سمرقندی)

جب مصر والوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی کی، احد کے دن آپ رضی اللہ عنہ کے فرار ہونے کا ذکر کیا اور جنگ بدر اور بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونے کا بھی اظہار کیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہی بات ان کے جواب میں فرمائی، فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ جنگ احد سے فرار کو تو اللہ نے معاف فرما دیا۔ باقی دو اعتراضات کے وہی جوابات دیے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خود اپنی زبان سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سامنے دیے تھے۔ (مظہری)

کافروں سے مشابہت کی ممانعت

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ {۱۵۶} وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ {۱۵۷} وَلَئِنْ مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ {۱۵۸} آل عمران

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں سے کہا، جب وہ زمین میں سفر کرنے لگیں یا غازی بن جائیں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ اللہ اس بات کو ان کے دلوں میں حسرت بنا دے اور اللہ زندہ فرماتا ہے اور موت دیتا ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھنے والا ہے۔ اور البتہ اگر تم قتل کر دیئے جاؤ یا اللہ کی راہ میں مر جاؤ تو بلاشبہ اللہ کی طرف سے مغفرت اور رحمت بہتر ہے اس چیز سے جسے وہ لوگ جمع کرتے ہیں اور اگر تم مر گئے یا قتل ہو گئے یا ضرور اللہ کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے فرمارہے ہیں کہ تم لوگ کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ یعنی منافقین کی طرح نہ ہو جاؤ، یہ مونہوں سے ایسی باتیں کہتے ہیں کہ اگر ہمارے اختیار میں کچھ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے، ان کے اندرونی حالات مسلمانوں کے سامنے واضح کرنے کے لیے ان کے کفر کا پردہ چاک کیا گیا، پھر مسلمانوں کو ان کے اعمال، افعال اور اقوال سے نفرت دلانے کے لیے کہا گیا کہ تم ان کی مشابہت اختیار نہ کرو، یہاں معلوم ہوا کہ ایمان محض اقرار باللسان کا نام نہیں ہے بلکہ اقرار باللسان کے ساتھ قول و عمل کی تصدیق کا نام ایمان ہے۔

وَقَالُوْا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوْا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوْا غُزًّى لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا: بہت سے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ خیر کا کام نہ خود کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں اور جو لوگ خیر کے کاموں میں لگیں ان کو طعنے دیتے ہیں اور جو خیر انہیں نصیب ہو اسے نقصان سے تعبیر کرتے ہیں جو لوگ حب دنیا میں غرق ہوں انہیں دوسروں کے آخرت کے اعمال نہیں بھاتے، اللہ کے لیے جو ان کی جانی یا مالی قربانی ہو وہ انہیں اچھی نہیں لگتی، منافقین کا یہی حال تھا انہوں نے کہا کہ ہمارے بھائی (نسب میں ان کے بھائی ہوتے تھے اور منافقین ظاہری طور پر دینی بھائی بھی کہلاتے تھے) جو سفر میں گئے یا جہاد میں شریک ہوئے یہ اگر یہیں ہمارے پاس رہتے، سفر میں نہ جاتے، جہاد نہ کرتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے بظاہر ان کا یہ کہنا ہمدردی جتانے کے لیے تھا لیکن وہ یہ نہیں

جانتے کہ ہمدردی خیر کے کاموں سے روکنے میں نہیں۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ ایسا کہنا ان کے قلوب میں حسرت کا سبب ہے پھر فرمایا کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے کوئی شخص کسی جگہ قیام کرنے سے قضائے الٰہی سے نہیں بچ سکتا وہ جہاں بھی ہو گا قضا اور قدر کے موافق اجل مسمی پر اس کو موت آ ہی جائے گی۔ (انوار البیان) زجاج کہتے ہیں کہ اذ یہاں مجرد وقت کے لیے ہے جب وہ سفر کرتے ہیں۔ غزی غازی کی جمع ہے۔

لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ: منافقین جو باتیں مسلمانوں کو راہ خدا سے روکنے کے لیے کہتے تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ ان کے اس قول کو انجام کار ان کی حسرت کا سبب بنادے گا، یہ قول ان کی حسرت کیسے بنے گا اس کی متعدد وجوہات بیان کی گئی ہیں:

① منافقین اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں جب یہ شبہ ڈالیں گے اور وہ ان کے کہنے میں آ کر جہاد کرنے نہیں جائیں گے، پھر جب وہ دیکھیں گے کہ مسلمان جہاد کر کے سلامتی سے مال غنیمت لے کر کامیاب و کامران لوٹے تو ان کو حسرت ہو گی کہ کاش انہوں نے ان منافقوں کا کہنا نہ مانا ہوتا اور جہاد میں چلے گئے ہوتے۔

② قیامت کے دن جب منافقین دیکھیں گے کہ مجاہدین اور شہداء کو اللہ تعالیٰ کس قدر انعام واکرام سے نواز رہا ہے اور ان کو بے پناہ اجر وثواب مل رہا ہے اور ان منافقوں کو اس قول کی بناء پر ذلت اور رسوائی کے عذاب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو وہ حسرت سے کہیں گے کاش ہم نے یہ نہ کہا ہوتا۔

③ منافقین ضعفاء مسلمین کو جہاد سے روکنے کے لیے شبہ ڈالیں گے اور جب وہ مسلمان جہاد پر نہیں جائیں گے تو وہ خوش ہوں گے لیکن بعد میں جب ان مسلمانوں پر ان منافقوں کے مکر وفریب کا حال کھل جائے گا اور وہ ان سے بیزار ہو جائیں گے تو پھر وہ منافق حسرت سے کہیں گے کہ کاش ہم نے یہ نہ کہا ہوتا۔

④ جب منافق متصلب اور پختہ مسلمانوں کے سامنے یہ شبہات بیان کریں گے تو وہ ان کی طرف توجہ نہیں کریں گے اور ان کی سعی رائیگاں جائے گی اس وقت ان منافقوں کو حسرت ہو گی کہ کاش انہوں نے ان سے یہ نہ کہا ہوتا۔ (تبیان القرآن)

وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ: یہ ان کے باطل قول کا رد کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی اکیلے زندگی اور موت میں مؤثر ہے، اقامت اختیار کرو یا سفر کرو، اللہ تعالیٰ ہی مسافر اور محارب کی حفاظت کرتا ہے باوجود یکہ وہاں جان چلی جانے کا اندیشہ موجود ہوتا ہے، جب کہ مقیم اور گھر میں رہنے والے کو موت دے دیتا ہے باوجود یکہ گھر میں بہت سے حفاظتی انتظامات موجود ہوتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وقت آتا ہے تو پھر کسی کی بھی خلاصی نہیں ہوتی، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے، موت وقت مقررہ سے پہلے نہیں آسکتی اور طے شدہ وقت سے تاخیر میں نہیں آسکتی۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ: مسلمانوں کے لیے زجر و توبیخ ہے کہ وہ منافقین کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کریں، انہیں اطاعت کی ترغیب دی جارہی ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ: تم اللہ کی راہ میں اگر قتل ہوگئے یا اللہ کی راہ میں مر گئے تو یہ کوئی نقصان کا سودا نہیں ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رحمت کا سبب ہے اور اللہ کی مغفرت اور رحمت اس سے بہتر ہے جو کچھ ایسی باتیں کرنے والے جمع کرتے ہیں۔ دنیا کے لالچی دنیا ہی کے لیے سوچتے ہیں اور اسی دنیا کو دوسروں کے لیے پسند کرنے کی وجہ سے انہوں نے یہ بات کہی کہ یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، مزید زندگی پالیتے کچھ پیسہ اور کما لیتے اور یہ پیسہ اللہ کی مغفرت اور رحمت کے سامنے کوئی چیز نہیں ہے۔ (انوار البیان) اہل ایمان کو اس میں جہاد کی ترغیب دی جارہی ہے کہ سفر اور جہاد فی سبیل اللہ کی وجہ سے موت نہیں آتی، موت اللہ کے امر سے آتی ہے۔

وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ: اگر تم مر گئے یا مقتول ہوگئے تو اللہ کی بارگاہ میں ضرور جمع کیے جاؤ گے، مرنا اور بارگاہ خداوندی میں پیش ہونا ہر ایک کے لیے ضروری ہے پھر اللہ کی راہ میں کیوں نہ مریں۔ (انوار البیان) یہ بات ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اپنی طبعی موت فوت ہو جائیں یا شہادت کی موت مر جائیں، ہمیں دونوں صورتوں میں اپنے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے، پھر ہمیں اچھے یا برے عمل کا بدلہ ملے گا۔

مصطفٰے کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ {۱۵۹} إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ {۱۶۰} آل عمران

جواب ترجمہ: بس اللہ ہی کی رحمت تھی کہ آپ نے ان کے ساتھ نرمی فرمائی اور اگر آپ تند خو سخت دل ہوتے تو وہ آپ کے پاس سے کب کے منتشر ہو گئے ہوتے بس آپ ان سے در گزر کیجیے اور ان کے لیے استغفار کیجیے اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیے پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے بیشک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ اگر اللہ نے تمہاری مدد کی تو کوئی تم پر غالب نہ ہو گا اور اگر اس نے تمہیں چھوڑ دیا تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے گا اور ایمان والوں کو تو صرف اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ: پچاس تیر اندازوں کو درّہ پر مقرر فرمایا گیا تھا، انہوں نے میدان جنگ سے بھاگتے ہوئے کافروں کو دیکھا تو وہ درّہ چھوڑ دیا، جس پر کافروں نے پلٹ کر وار کیا تو ستر صحابہ کرام شہید ہو گئے، نبی کریم ﷺ نے اللہ کی مہربانی اور رحمت کے باعث ان کے لیے نرمی کی، انہیں معاف کر دیا، کچھ لوگ اس خوفناک، وحشت انگیز، دردناک منظر کو دیکھ کر یہاں سے چلے گئے تھے، انہیں بھی طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنایا، غم پر غم پہنچا مگر کسی کو کچھ نہیں کہا، یہ باتیں ایک طرف آپ کی شجاعت و بہادری کو ظاہر کرتی ہیں اور دوسری طرف اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے آپ ﷺ کی نرمی اور رفق کو ظاہر کرتی ہیں، آپ ﷺ نے ان پر سختی کرنے کی بجائے ان کی غمخواری کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ اور مشفقانہ کی یہاں تعریف فرمائی ہے۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ: بتایا جا رہا ہے کہ اگر آپ ﷺ سخت مزاج، ترش رو ہوتے، سخت دل ہوتے تو یہ لوگ جو آپ ﷺ کے ارد گرد موجود رہتے ہیں یہ سب لوگ

آپ ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جاتے، یہ انسانی فطرت ہے کہ سخت گیر اور سخت طبیعت انسان کے ساتھ کوئی زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتا، یہ نبی کریم ﷺ ہی کی ذات اقدس تھی جن کے پاس رہنے والے کئی کئی سال تک رہے اور آپ ﷺ کی تعریفوں سے رطب اللّسان دکھائی دیے، سیرت النبی ﷺ کی کتابیں انہی فداکاروں اور جانثاروں کی روایات سے بھری پڑی ہیں کہ آپ ﷺ کے عالی اخلاق کیسے تھے؟

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ: اللہ تعالیٰ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ کس قدر محبت تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کی معافی کا اعلان فرمایا اور اپنے حبیب ﷺ کو بھی فرمارہے ہیں کہ آپ بھی انہیں معاف کردیں، معافی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی ان کی بخشش کی دعاء کرتے رہیں، یہ اللہ کی طرف سے ان لوگوں کے ساتھ کمال محبت کا اظہار ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کریں، یہاں حکم دیا گیا ہے جب کہ دوسرے مقام پر ان حضرات کی مشورے والی خوبی یوں بیان کی گئی ہے کہ ان کے کام باہمی مشاورت سے ہوتے ہیں، اگرچہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مشورے والے عمل کو نبی کریم ﷺ کی امت کے لیے رحمت بنایا گیا ہے، جو شخص مشورہ کرتا ہے وہ ہدایت سے محروم نہیں ہوتا۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ: جب باہمی مشاورت ہوجائے تو پھر ارادہ کرلیجیے، اللہ کی ذات پر بھروسہ کیجیے، پہلے مشاورت، پھر ارادہ، پھر توکل علی اللہ کام کا آغاز کردینا چاہیے، توکل کا معنیٰ ہوتا ہے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے پر بھروسہ کرنا، ہم مسلمانوں کا توکل اور اعتماد اللہ کی ذات پر ہی ہے، توکل اسباب ووسائل اختیار کرنے کے خلاف نہیں ہے، تمام تر اسباب ووسائل اختیار کرنے کے بعد اللہ پر ہی امور کی تکمیل کے لیے بھروسہ کیا جائے۔

إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو محبوب رکھتے اور پسند کرتے ہیں جو اللہ کی ذات پر یقین واعتماد رکھتے ہیں، اللہ پر توکل وبھروسہ رکھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی ان کاموں کی طرف کرتے رہتے ہیں جو ان کے لیے بہتر ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ملجاء اعظم ہے، اسی کے آستانہ

رحمت سے ساری مخلوق کی حاجات پوری ہوتی ہیں۔

إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ: اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کریں تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ كَمَا نَصَرَكُمْ يَوْمَ بَدْرٍ فَلَا يَغْلِبُكُمْ أَحَدٌ، وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ كَمَا خَذَلَكُمْ يَوْمَ أُحُدٍ لَمْ يَنْصُرْكُمْ أَحَدٌ، اگر اللہ تعالیٰ تمہاری اس طرح مدد کرے جس طرح اس نے بدر کے دن تمہاری مدد کی تھی تو تم پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے جس طرح اس نے تمہیں احد میں چھوڑ دیا تھا تو پھر تمہاری کوئی بھی مدد نہیں کر سکے گا، یہاں اطاعت کی ترغیب اور نافرمانی سے پرہیز کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے آگاہ فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچے گا اللہ تعالیٰ اس کی مدد کریں گے، میدان کارزار میں لوگوں سے فرمایا گیا تھا کہ اگر تم لوگ صبر کرو، تقویٰ اختیار کرو اور تم پر اگر کفار نے فوراً حملہ کیا تو پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کی جائے گی، میدان بدر میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی۔ یہاں یہ فرمایا کہ جس کی اللہ مدد کرے اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ: جب اللہ تعالیٰ کسی کو تنہا چھوڑ دے، بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد کون ہے جو کسی کی مدد کرے، کوئی نہیں کر سکتا، یہ استفہام انکاری ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ مدد نہ کرے تو کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ: اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی ذات پر بھروسہ اور توکل کریں، جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سارے اختیارات کا مالک و مختار اللہ ہی ہے، اسی کے دست قدرت میں سارے امور کی چابی ہے تو پھر بھروسہ اور اعتماد کلی بھی اسی ذات پر کرنا چاہیے، یہاں اہل ایمان سے مراد جنس ہے، تمام اہل ایمان کو حکم دیا جارہا ہے کہ بھروسہ اسی ذات واحد پر کیا جائے، اس کے فیصلوں کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اس کے حکموں کو کوئی پھیر نہیں سکتا، تو پھر ضروری ہے کہ بندہ کلی طور پر اسی ذات پر بھروسہ و توکل کرے۔ خدا کی ذات پر توکل اور بھروسہ کرنا ایسی چیز ہے جو انسان کو کامیابی و کامرانی کا راستہ دکھاتی ہے، سب دروازوں سے ہٹ کٹ کر ایک اللہ ہی سے آس و امید لگائی جائے۔

خیانت کرنا کتنا بڑا جرم ہے؟

سوال اِس آیت مبارکہ کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ شانِ نزول کی کیا مناسبت ہے؟

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ {۱۶۱} آل عمران.

جواب ترجمہ: اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو شخص خیانت کرے گا وہ اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا پھر ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۔

شانِ نزول: ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نَزَلَتْ هَذِهِ الآيَةُ فِي قَطِيفَةٍ حَمْرَاءَ افْتُقِدَتْ يَوْمَ بَدْرٍ. فَقَالَ بَعْضُ النَّاسِ: لَعَلَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَهَا، (ترمذی، ابواب التفسیر) کہ یہ آیت ایک سرخ رنگ کی روئی دار چادر کے بارے میں نازل ہوئی جو بدر کے دن اموال غنیمت میں سے گم ہو گئی تھی۔ بعض لوگوں نے کہا، شاید چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے لیے رکھ لی ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

② ابن عباس رضی اللہ عنہما وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ کی قرأت کا انکار کرتے تھے ان کا کہنا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ یعنی نبی کے ساتھ دھوکا نہ کیا جاتا ہو جبکہ نبی قتل بھی ہوتے رہے کیونکہ قول خداوندی ہے وَيَقْتُلُونَ الأَنبِيَاءَ یعنی بنی اسرائیل انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ منافقوں نے نبی پر مال غنیمت میں خیانت کرنے کی تہمت لگائی اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ

③ ضحاک رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فوجی دستے مہم پر روانہ کیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غنیمت کا مال ملا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لوگوں میں تقسیم فرمایا لیکن فوجی دستوں کو کچھ نہیں دیا، جب یہ فوجی دستے واپس آئے تو انہوں نے کہا کہ فے کا مال یعنی مال غنیمت تقسیم ہو گیا لیکن ہمیں کچھ نہیں دیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ، راوی کا کہنا ہے سلمہ نے لفظ یغل کو یغل

غین کے زبر کے ساتھ پڑھا۔

④ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا مال غنیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگا تو اس میں سے ایک شخص نے خیانت کی جس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

⑤ الکلبی اور مقاتل کا قول ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب غزوہ احد کے موقع پر تیر اندازوں نے مال غنیمت کے لالچ میں مرکز کو چھوڑ دیا اور کہا کہ ہمیں اس بات کا اندیشہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہیں گے کہ مال غنیمت میں سے جس شخص نے جو چیز لے لی اسی کی ہو گئی اور جنگ بدر کی طرح مال غنیمت کو تقسیم نہیں کریں گے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے یہ بدگمانی کی کہ ہم مال غنیمت میں خیانت کریں گے اور اسے تم میں تقسیم نہیں کریں گے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

⑥ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگوں میں معززین اور شرفاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال غنیمت میں سے ان کے لیے کچھ مخصوص کرنے کے لیے کہا جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ: نبی کے شایان شان نہیں، نبی کے مناسب نہیں، نبی کے لیے یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے، کیونکہ نبی کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، خیانت نبوت و رسالت کے منافی کام ہے، غل کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب غنیمت میں سے کوئی چیز خفیہ طور پر چپکے سے لے لی جائے۔ غل کا معنی دراصل ایسے خزانہ سے چوری کرنا ہے جو سب کی مشترکہ ملکیت ہو، لہٰذا اس کا معنی چوری بھی ہو سکتا ہے اور خیانت بھی، پھر غل کا لفظ دل میں کدورت، بغض و عناد کو چھپائے رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے، چنانچہ اسی مناسبت سے بعض علماء نے یہ معنی بھی کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان نہیں کہ اپنی نافرمانی کرنے والوں کو معاف کر دینے کے بعد اس کے دل میں کچھ کدورت باقی رہ جائے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: جو شخص مال غنیمت میں خیانت کرے گا وہ شخص قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہو گا تو وہ غنیمت کی چیز بعینہ لے کر حاضر ہو گا، وہ اسے اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لاَ يُظْلَمُونَ: ہر انسان نے دنیا میں جو کچھ کیا ہو گا اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یمن سے ایک رنگے ہوئے چمڑے میں کچھ سونا بھیجا، جس سے ابھی مٹی بھی علیحدہ نہیں کی گئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سونے کو چار آدمیوں عیینہ بن بدر، اقرع بن حابس، زید الخیل اور علقمہ یا عامر بن طفیل کے درمیان تقسیم کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی نے کہا: اس مال کے تو ہم ان لوگوں سے زیادہ حقدار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگوں کو محمد پر اطمینان نہیں، حالانکہ میں آسمان والے (اللہ تعالیٰ) کا امین ہوں۔ اور میرے پاس صبح و شام آسمان کی خبریں آتی ہیں۔

فَجَاءَ رَجُلٌ كَثُّ اللِّحْيَةِ مُشْرِفُ الْوَجْنَتَيْنِ غَائِرُ الْعَيْنَيْنِ نَاتِئُ الْجَبِينِ مَحْلُوقُ الرَّأْسِ فَقَالَ اتَّقِ اللّٰهَ يَا مُحَمَّدُ، ایک آدمی جس کی آنکھیں دھنسی ہوئیں، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں، پیشانی باہر نکلی ہوئی، داڑھی گھنی اور سر منڈا ہوا تھا، اپنا تہبند اپنی پنڈلیوں سے اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! اللہ سے ڈریے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری بربادی ہو، کیا میں روئے زمین پر اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے کا مستحق نہیں ہوں؟

اور مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم عدل کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیری بربادی ہو اگر میں نے ہی عدل نہ کیا تو اور کون کرے گا؟ وہ آدمی چلا گیا تو خالد بن ولید نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی گردن نہ اڑا دوں؟ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کی اجازت نہ دی۔ ابو سعید کہتے ہیں کہ جب وہ پیٹھ موڑے جا رہا تھا تو آپ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا: إِنَّ مِنْ ضِئْضِئِ هَذَا قَوْمًا يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ لاَ يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ يَقْتُلُونَ أَهْلَ الإِسْلاَمِ وَيَدَعُونَ أَهْلَ الأَوْثَانِ يَمْرُقُونَ مِنَ الإِسْلاَمِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ لَئِنْ أَدْرَكْتُهُمْ لأَقْتُلَنَّهُمْ قَتْلَ عَادٍ، اس کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن کو مزے لے لے کر پڑھیں گے، مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا یہ اہلِ اسلام کو قتل کریں گے اور بت

پرستوں کو چھوڑ دیں گے اور یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ ابو سعید کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر میں اس قوم کے زمانہ میں موجود رہا تو قوم عاد کی طرح انہیں قتل کر دوں گا (مسلم، کتاب الزکوٰۃ،)

گویا اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اگر رسول اللہ غنائم اور صدقات کو تقسیم کرنے کی کوئی مصلحت ملحوظ رکھیں یا قوم یا رفاہ عامہ کے لیے کچھ حصہ بیت المال میں جمع کریں یا کسی وجہ سے تقسیم غنائم میں دیر ہو تو نبی ﷺ کے متعلق انہیں ہرگز کسی قسم کی بدگمانی نہ ہونا چاہئے، نبی سے متعلق ایسی بدگمانی کرنا نفاق کی علامت ہے، عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ایسے ہی مواقع پر مسلمانوں کے دلوں میں بدگمانی ڈالا کرتے تھے، ایسی بدگمانیوں سے قوم میں پھوٹ پڑ جاتی ہے، ملت کا شیرازہ بکھرتا ہے اور اس کا انجام بغاوت ہوتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو اس معاملہ میں بالخصوص اور عام حالات میں بھی بدظنی سے اجتناب کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ (تفسیر تیسیر القرآن)

مسلمانوں کے مشترکہ اموال سے کوئی چیز چرانا یا اس میں خیانت کرنا (جو کہ غل کا لغوی مفہوم ہے) کتنا بڑا گناہ ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے لگائیے: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

افْتَتَحْنَا خَيْبَرَ، وَلَمْ نَغْنَمْ ذَهَبًا وَلاَ فِضَّةً، إِنَّمَا غَنِمْنَا البَقَرَ وَالإِبِلَ وَالمَتَاعَ وَالحَوَائِطَ، ثُمَّ انْصَرَفْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى وَادِي القُرَى، وَمَعَهُ عَبْدٌ لَهُ يُقَالُ لَهُ مِدْعَمٌ، أَهْدَاهُ لَهُ أَحَدُ بَنِي الضِّبَابِ، فَبَيْنَمَا هُوَ يَحُطُّ رَحْلَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ جَاءَهُ سَهْمٌ عَائِرٌ، حَتَّى أَصَابَ ذَلِكَ العَبْدَ، فَقَالَ النَّاسُ: هَنِيئًا لَهُ الشَّهَادَةُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بَلْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِي أَصَابَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ المَغَانِمِ، لَمْ تُصِبْهَا المَقَاسِمُ، لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا فَجَاءَ رَجُلٌ حِينَ سَمِعَ ذَلِكَ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِشِرَاكٍ أَوْ بِشِرَاكَيْنِ، فَقَالَ: هَذَا شَيْءٌ كُنْتُ أَصَبْتُهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: شِرَاكٌ أَوْ شِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ، کہ ہمیں جنگ خیبر کی غنیمت میں سونا چاندی تو ملا نہیں بس اونٹ بکریاں اور کپڑے وغیرہ ہی تھے، ایک شخص رفاعہ بن زید نے رسول اللہ ﷺ کو ایک غلام تحفۃً دیا تھا جس کا نام مدعم تھا، اس کے بعد آپ وادی القریٰ کی طرف بڑھے، وہاں پہنچنے پر مدعم آپ کو

سواری سے اتار رہا تھا کہ اسے ایک تیر آلگا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی، لوگوں نے کہا اسے جنت مبارک ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: ہر گز نہیں، اس ذات کی قسم! جس کے دست قدرت میں میری جان ہے، اس نے خیبر کے دن اموال غنیمت کی تقسیم سے پیشتر ایک کملی چرائی تھی جو آگ کے شعلے بن کر اس کے گرد لپٹ رہی ہے، جب لوگوں نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد سنا تو ایک شخص ایک تسمہ یا دو تسمے لے کر حاضر ہو گیا، آپ ﷺ نے اسے فرمایا: کہ اگر تم انہیں داخل نہ کراتے تو قیامت کو یہ تسمے آگ بن کر تمہیں جلاتے۔ (بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ أَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ، وَفُلَانٌ شَهِيدٌ. حَتَّى أَتَوْا عَلَى رَجُلٍ فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَلَّا إِنِّي رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ فِي بُرْدَةٍ غَلَّهَا (مسند احمد، تفسیر ابن کثیر) جنگ خیبر کے دن نبی اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کچھ لوگوں نے آکر کہا: فلاں شہید ہے، فلاں شہید ہے، یہاں تک کہ ایک آدمی کا تذکرہ کرنے لگے کہ وہ شہید ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر گز نہیں، اُسے ایک چادر یا ایک عباء چھپانے کی وجہ سے میں نے دوزخ کی آگ میں دیکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے طلب گار اور غضب کے مستحق

سوال ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ {۱۶۲} هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ {۱۶۳} آل عمران

جواب ترجمہ: کیا جو شخص اللہ کی رضا کا تابع ہو وہ ایسے شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور برا ٹھکانا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجات میں مختلف ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کاموں کو دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

ربط و تعلق آیات: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ ہر جان نے جو کمایا اسے اس کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اس کے ساتھ ہی یہ جملہ لا کر واضح فرما دیا کہ

اطاعت گزاروں کی جزا کیا ہے؟ گناہگاروں کی جزا و سزا کیا ہے؟ اس کو واضح کرتی ہوئی یہ آیت نمایاں دکھائی دے رہی ہے کہ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ کیا جو شخص اللہ کی رضا کا تابع ہو وہ ایسے شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کے غضب کا مستحق ہو۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللّٰهِ: ① مال غنیمت کو اللہ کی امانت سمجھنا، اللہ کا مال سمجھنا اور سمجھ کر اس میں خیانت نہ کرنا یہ اللہ کی رضا تلاش کرنا ہے، جو شخص مال غنیمت میں خیانت کرے وہ اللہ کے غصے کو دعوت دیتا ہے۔ یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہیں۔ ② جو شخص اللہ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے، اس کے بعد اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ رضائے مولیٰ کا متلاشی ہے، جو اللہ کا انکار کرتا ہے اور گناہوں کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے وہ اللہ کو ناراض کرتا ہے، یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہیں۔ ③ جو لوگ اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہجرت کرتے ہیں وہ مہاجرین ہیں اور جو اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہیں، ملنے کا نام نہیں لیتے یہ منافقین ہیں، مہاجرین اور منافقین ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ ④ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر حملے کی ٹھانی تو رحمت دو عالم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو بلا کر فرمایا کہ ان مشرکین پر حملہ کریں، ان میں سے کچھ لوگوں نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں ان پر حملہ کیا اور کچھ نے نہیں کیا، کیا حکم نبی ﷺ کی اتباع کرنے والے اور حکم نہ مان کر اللہ کے غصے کو دعوت دینے والے ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ ⑤ نبی اور باقی ساری مخلوق برابر نہیں ہو سکتے، طمع، حرص و ہوس، لالچ یہ وہ پنچ، ذلیل اور حقیر کام ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے عالی منصب کے شایان شان ہیں، جو لوگ سر تا پا ان کاموں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جو ان کاموں سے کوسوں دور ہیں وہ ایک جیسے کیسے ہو سکتے ہیں؟

اگرچہ یہ تفاسیر غزوہ احد کے منظر اور پس منظر میں اپنی جگہ بالکل ٹھیک اور درست ہیں، لیکن یہاں ان الفاظ کو صرف یہیں تک محدود نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ لفظ عام ہے، اسے عام ہی رہنے دینا چاہیے، قیامت کی صبح تک یہ آیت یہی پیغام دیتی رہے گی کہ اللہ کی رضا جوئی اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے والے ایک جیسے نہیں ہو سکتے، کیونکہ جو شخص بھی رضائے مولیٰ کی تلاش میں پیش قدمی کرے گا وہ اس فرمان کی چھتری تلے آتا جائے گا، وہ رضوان اللہ کے سائے میں آتا جائے گا، جو

نفسانیت، نفسانی خواہشات، من چاہی ترتیبات کا غلام بن جائے گا وہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والوں کی فہرست میں اضافہ کرتا جائے گا، یہاں بس زیادہ سے زیادہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ آیت کا نزول ایک خاص واقعہ کے تناظر میں ہوا جب کہ یہ بات ہم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ کا عموم کسی خاص سبب کی وجہ سے کبھی باطل نہیں ہوتا۔

وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ: جو لوگ رضائے مولیٰ کی بجائے رضائے شیطان کے متلاشی ہوں، جو اللہ کے غصے کو دعوت دینے والے ہوں، جو لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے فرامین و احکامات کو پس پشت ڈالنے والے ہوں، جو لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے اوامر کی پابندی کرنے کی بجائے انہیں پرکاہ کی حیثیت دینے کے لیے بھی تیار نہ ہوں، علی الاعلان مخالفت کریں یا پوشیدہ اور خفیہ طور پر کریں، جیسے کافر علی الاعلان اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں، منافقین در پردہ پرچم اسلام کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے، وہاں آرام کے لیے پھولوں کی سیج نہیں ہوگی، وہاں دھکتے انگارے ہوں گے، وہاں جگر کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے شیریں مشروبات نہیں ہوں گے بلکہ گرم اور کھولتا ہوا پانی ہو گا، جہنمیوں کے جسموں سے نکلنے والا خون اور پیپ ہوگی، جو پینے سے پی نہیں جا سکے گی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نہیں ملیں گے بلکہ شعلہ زن آگ کی لپٹیں ان کی چمڑیاں اُدھیڑتی رہیں گی، یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ کی ناراضگی کی کوئی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔

هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ: جو لوگ اللہ کے نافرمان اور حکم عدولی کرنے والے ہیں ان کا انجام بد اس سے پہلے بتا دیا گیا کہ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، وہ بہت بری جگہ ہے، یہاں ان لوگوں کا صلہ اور انجام بتایا جا رہا ہے جو اللہ کی رضا کے متلاشی ہیں، اللہ کے ہاں ان کے درجات ہیں، کیونکہ ان لوگوں کے مختلف اعمال اپنی ذات کے اعتبار سے مختلف چیزوں کے مرتبے کی طرح ہیں، یہ مجاز حقیقت سے کہیں زیادہ بلیغ ہے، حضرات حکماء کہتے ہیں کہ انسانی نفوس ماہیت اور حقیقت کے لحاظ سے مختلف ہیں، بعض ان میں انتہائی ذہین و چالاک ہیں، بعض ان میں انتہائی بلید اور کند ہیں، بعض ان میں نورانی اور روشن ہیں اور بعض تاریک اور گدلے ہیں، بعض ان میں بہترین ہیں اور بعض ان میں کمترین

ہیں، لیکن ان صفات کا اختلاف بدنی مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ماہیت نفوس کے اختلاف کی وجہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ انسان سونے اور چاندی کی معدن (کانوں) کی طرح ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اَلْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ روحیں قید کیے ہوئے لشکر ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ لوگوں کے اپنی ذات میں درجات ہیں نہ کہ ان کے لیے درجات ہیں، اپنی ذات میں درجات ہونا اور ذات کے لیے درجات ہونے میں فرق ہے۔ عرف عام میں درجات کا لفظ ثواب والوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ درکات کا لفظ عذاب و سزا والوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے غصے کے ساتھ لوٹے ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے جو بدترین ٹھکانہ ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات ضروری ہے کہ هُمْ دَرَجَاتٌ ان لوگوں کا وصف ہو جنہوں نے اللہ کی رضاجوئی کی پیروی کی ہو۔ هم ضمیر آیت میں موجود لفظ من کی طرف راجع ہو جو مرجع بعید ہے۔

قرآن کریم کی عادت جاریہ یہ ہے کہ اکثر جہاں ثواب اور رحمت کا تعلق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اضافت و نسبت اپنی طرف کرتے ہیں، جس چیز کا تعلق سزا و عقاب کے ساتھ ہوتا ہے اس کی نسبت و اضافت اپنی ذات کی طرف نہیں کرتے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ تمہارے رب نے اپنے لیے رحمت لکھ دی ہے، یہاں رحمت کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے، جب کہ قصاص کی نسبت اپنی طرف کرنے کی بجائے مخلوق کی طرف کر دی، جیسا کہ فرمایا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، یہاں بھی ان درجات کی اضافت اور نسبت اپنی ذات کی طرف هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ فرمائی ہے، اس سے پتہ چلا کہ یہ صفت ان لوگوں کی بیان کی جارہی ہے جنہیں اجر و ثواب ملنا ہے۔ اس آیت اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا (الْإِسْرَاءِ: ۲۱) (دیکھیے! ہم نے کیسے فضیلت دی ان کے بعض کو بعض پر اور آخرت کے

بڑے درجات ہیں اور بہت بڑی فضیلت) کو نظروں کے سامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں درجات کا ذکر تاکید کے لیے ہے۔

اگر یہ ضمیر رضائے مولیٰ تلاش کرنے والوں کی طرف راجع کرنے کی بجائے اللہ کا غضب سمیٹنے والوں کی طرف راجع کی جائے تو اس صورت میں یہ ضمیر قریب ترین مرجع کی طرف لوٹے گی، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہوگی کہ اہل دوزخ کو دیے جانے والے عذاب کے مراتب میں فرق ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا (الاحقاف: ۱۹) واسطے ہر ایک کے درجات ہیں جو کچھ انہوں نے عمل کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ إِنَّ فِيهَا ضَحْضَاحًا وَغَمْرًا وَأَنَا أَرْجُو أَنْ يَكُونَ أَبُو طَالِبٍ فِي ضَحْضَاحِهَا جہنم میں ایک کم پانی کی جگہ ہے اور زیادہ پانی کی جگہ اور میں امید رکھتا ہوں کہ ابو طالب جہنم کے کم پانی والی جگہ میں ہوں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ يُحْذَى لَهُ نَعْلَانِ مِنْ نَارٍ يَغْلِي مِنْ حَرِّهِمَا دِمَاغُهُ يُنَادِي يَا رَبِّ وَهَلْ أَحَدٌ يُعَذَّبُ عَذَابِي اہل جہنم میں سب سے ہلکے ترین عذاب والا شخص قیامت کے دن وہ آدمی ہوگا جسے آگ کے جوتے پہنائے جائیں گے، اس کی گرمی کی وجہ سے اس کا دماغ ابل رہا ہوگا، وہ آواز دے گا کہ اے میرے رب! کیا کوئی اور بھی ہے جسے میرے جیسا عذاب دیا جارہا ہے۔

اگر ھم ضمیر دونوں کی طرف راجع کی جائے تو اس کا مفہوم پھر یہ ہوگا کہ جس طرح مخلوق کے اعمال مختلف ہیں اسی طرح ثواب والوں کے درجات بھی مختلف ہیں اور عذاب والوں کے درجات بھی مختلف ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص ایک ذرّہ برابر نیکی کرے گا تو وہ اسے دیکھ لے گا، جو شخص ایک ذرّہ برابر برائی کرے گا تو وہ اسے وہاں دیکھ لے گا جب مخلوق کے گناہوں اور نیکی کے لحاظ سے مراتب میں فرق ہے تو عذاب و ثواب کے درجات میں بھی فرق ہوگا۔

وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ: بندے جو کچھ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ بندوں کو ان کے کیے کا پورا بدلہ دے گا، تو پورا بدلہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسے بندوں کے تمام افعال کا علم ہو، ایسا تفصیلی علم ہو جو گمان، شک

اور اندازے سے خالی ہو، اس کے بعد ایسے الفاظ ذکر کر دیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، یہ اس معنیٰ کے لیے تاکید ہے، اس لیے واضح کر دیا کہ نبی کریم ﷺ کی طرف مال غنیمت کی چوری کی نسبت نہ کرو، اللہ کی رضاجوئی کو مخلوق کی رضاجوئی پر ترجیح دو، اللہ کی ناراضگی سے بچو مخلوق کی ناراضگی کی پروانہ کرو، جن باتوں پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ان سے بچو، کیونکہ ان سارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے، وہ باریک بین ہے، کوئی چیز اس کے کیمرے سے پوشیدہ نہیں۔

بعثت مصطفےٰ ﷺ اہل ایمان پر احسان خدا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ {۱۶۴} آل عمران

جواب ترجمہ: درحقیقت اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا جبکہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ربط و تعلق اور مناسبت ماقبل: ہرزہ سرا منافقین نے نبی کریم ﷺ کی طرف مال غنیمت میں خیانت کی نسبت کر دی، اللہ تعالیٰ نے ان کے رد میں صرف یہ نہیں فرمایا کہ میرے نبی ﷺ نے خیانت نہیں کی، بلکہ ساری دنیا کے سامنے اپنے نبی ﷺ کی نبوت و رسالت اور ساری انسانیت کی طرف ان کی بعثت کو احسان عظیم قرار دیا۔

یہ آیت مبارکہ لاکر اللہ تعالیٰ نے ان الزام تراشی کرنے والوں کو بتایا کہ میرے عظیم الشان رسول ﷺ تمہارے شہر میں جنم افروز ہوئے، اسی شہر میں پلے بڑے جوان ہوئے، ان کی مکی اور مدنی زندگی میں کوئی لمحہ اور کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جس میں ان کی طرف صدق وامانت کے علاوہ کسی بات کی نسبت کی گئی ہو، پھر جب ان کے سر پر تاج نبوت رکھا گیا تو اس کے بعد ان کی زندگانی دعوت الی اللہ جیسے عظیم الشان کام میں مشغول دکھائی دینے لگی، دنیا کی جھمیلوں سے آپ کوسوں دور ہیں، تو خیانت کاری کی یہ الزام تراشیاں جو کی جارہی ہیں یہ کسی صورت قابل قبول نہیں ہیں۔

آپ ﷺ کی طرف خیانت وغلول کی نسبت کرنا غلط قرار دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ یہاں لاکر یہ بات واضح کردی کہ میرے حبیب ﷺ کا وجود مسعود تم لوگوں میں میری سب سے بڑی نعمت ہے، میرا تم پر احسان ہے کہ میں نے عظیم الشان رسول تم میں بھیجا، ان کا تم پر احسان ہے کہ تمہارے دلوں کی گندگیوں کو صاف کرتے ہیں، باطل طریقوں کی دھلائی کرتے ہیں، تمہیں علوم نافعہ کی تعلیم دیتے ہیں، جو دنیا اور آخرت دونوں جہان میں تمہارے لیے مفید ہے، ان کی تعلیم تمہیں دنیا میں بھی کام آئے گی، تمہارے دین کے لیے بھی مفید ہے، کونسا عاقل ودانا انسان ہے جس کے دل ودماغ میں یہ خیال گردش کرے کہ وہ ان جیسے عظیم اور پیارے انسان کی طرف خیانت وغلول جیسی باتوں کو منسوب کرے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ میرے نبی ﷺ تم میں سے ہیں، تمہارے شہر والوں میں سے ہیں تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں، تم ایسے کمینے (الزام لگانے والے) لوگ ہو اس بات کو سمجھتے نہیں ہو کہ اپنے حبیب ﷺ کو میں نے تم میں بھیج کر فضل واحسان کیا ہے سارے جہان سے ہٹ کر تمہارے اندر ان کو بھیجا گیا ہے، تم میں سے ان کو اٹھایا گیا ہے، تمہیں یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ عظیم الشان نبی ﷺ تمہارے اندر ہیں، تمہارا ان پر طعن کرنا، ان کی طرف بری باتیں منسوب کرنا یہ عقل وخرد کے خلاف ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر آپ ﷺ کو بھیج کر احسان کیا، تو سب دانشمندوں پر لازم ہے کہ وہ ان کی کمال درجے کی، اپنی بساط وہمت کے مطابق ایسی مدد کریں کہ رشک آئے، تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم ان کے دشمنوں کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ، ان کے دشمن سے لڑائی کرو، دشمنان رسول سے ہاتھوں کے ذریعے مقابلہ کرسکتے ہو تو کرو، زبان سے کچھ کہہ سکتے ہو تو کہو، سیف وسنان سے کچھ کمال دکھاسکتے ہو تو دکھاؤ، یہاں مقصود مسلمانوں کو ترغیب دینا ہے کہ وہ کافروں کے خلاف برسر پیکار ہو جائیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ: اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا کہ ان میں عظیم الشان رسول انہی میں سے بھیجا، یہاں لام اور قد تحقیق کے لیے ہے،

بات کو مضبوط کرنا بتاتا ہے۔ مَنّ کے کلام عرب میں کئی معانی ہیں ① مَنّ وہ جو بنی اسرائیل پر آسمان سے اترتا تھا، جسے من اور سلویٰ کہا گیا ہے۔ وَأَنْزَلْنا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوى (الْبَقَرَة: ۵۷) ② مَنّ کا معنیٰ احسان جتانا، لَا تُبْطِلُوا صَدَقاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذى (الْبَقَرَة: ۲۶۴) صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف پہنچا کر ضائع نہ کرو۔ ③ کاٹنا، نہ ختم ہونا، جیسے فرمان ہے لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (فُصِّلَتْ: ۸) وَإِنَّ لَكَ لَأَجْراً غَيْرَ مَمْنُونٍ (القلم: ۳) ان کے لیے اجر ہے نہ ختم ہونے والا۔ ④ ایسے شخص کی طرف انعام واحسان کرنا جو جزا وشکریہ کا طلب گار نہ ہو، جیسا ارشاد ہے هَذا عَطاؤُنا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ (ص: ۳۹) یہ ہماری بخشش ہے۔ سو آپ احسان کریں یا روک لیں اسی طرح ارشاد ہے وَلا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، زیادہ حاصل کرنے کے لیے احسان نہ کیجیے۔ منان اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام ہے، جس کا معنیٰ ہے ابتدا میں عطا کرنے والا طلب معاوضہ کے بغیر، یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر احسان کیا ہے، ان کے ساتھ اچھائی کی ہے، ان پر انعام کیا ہے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے ساتھ۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سارے عالم کی طرف اللہ تعالیٰ کا احسان وانعام ہے، اس احسان کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ان لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتے جو ان کو اللہ کے عذاب وسزا سے چھٹکارا دلائے گی، انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب واچھا بدلہ پہنچائے گی، یہ بات سارے عالم کے حق میں عام ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی بعثت سارے عالم کی طرف ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ہے کہ وَما أَرْسَلْناكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ (سبا ۲۸) ہم نے آپ ﷺ کو سارے لوگوں کی طرف بھیجا ہے۔ آگے یہ خوش نصیبی اہل ایمان وایقان کی ہے کہ وہ اس انعام واحسان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کی تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے یہاں اس احسان وانعام کے ساتھ اہل ایمان کا خصوصیت سے ذکر فرمایا ہے، جیسے قرآن کریم یوں تو سارے جہاں کے لیے سامان ہدایت ہے، مگر اس سے فائدہ اٹھانے والے اہل ایمان وایقان ہیں، اسی لیے سورت البقرہ میں فرمایا گیا کہ یہ متقین کے لیے ہدایت کا سامان ہے۔ باوجود یکہ یہ سب انسانوں

کے لیے سامان ہدایت ہے، نبی کریم ﷺ یوں تو سارے انسانوں کو دوزخ کی آگ سے ڈرانے والے ہیں لیکن سورۃ النازعات میں آپ ﷺ کے لیے خصوصی طور پر یہ فرمایا گیا کہ آپ ڈرنے والوں کے لیے ڈرانے والے ہیں۔

يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ: نبی کی بعثت ورسالت کے جو اہم ترین مقاصد ہیں ان میں سے ایک بیان کیا جارہا ہے کہ وہ لوگوں پر اس کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ: نبی ﷺ کی بعثت کا دوسرا اہم ترین مقصد بیان کیا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کی صفائی کرتے ہیں، ان کا تزکیہ نفس کرتے ہیں، ان کی اخلاقی تربیت کرتے ہیں۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ: یہاں نبی کی بعثت کا تیسرا مقصد بیان کیا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہیں، اجمال اور تفصیل سمجھاتے ہیں، تعلیم کتاب سے مراد قرآن کریم کی تعلیم ہے، جب کہ حکمت سے مراد قرآن کریم کی تفسیر ہے، جو آپ ﷺ کے ارشادات کی شکل میں موجود ہے، اس سے حدیث شریف مراد ہے، کیونکہ حدیث بھی وحی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن کریم وحی متلو (جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور حدیث وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) ہے، نبی کریم ﷺ کی احادیث قرآن کریم کی تفسیر ہیں، قرآن کریم کی اجمالی باتوں کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے، جن کی طرف یہاں حکمت کے لفظ میں اشارہ دیا گیا ہے۔

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ: نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے انسان اور انسانیت کس ڈگر پر تھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ لوگ آپ ﷺ کی آمد سے پہلے کھلی گمراہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے، بتوں کے پجاری تھے، بیت اللہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے، انسانوں پر مظالم ڈھاتے تھے، انسانی معاشرہ دگرگوں تھا۔

زخم خوردہ مسلمانوں کی پریشانی اور منافقوں کی چالبازی

سوال اِس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور کی تفسیر کیجیے

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ

عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۱۶۵} وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ {۱۶۶} وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَوِ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَاتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ {۱۶۷} الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ {۱۶۸} آل عمران.

جواب ترجمہ: کیا جب تمہیں ایک تکلیف پہنچی حالانکہ تم تو اس سے دوچند تکلیف پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو یہ کہاں سے آئی؟ کہہ دو یہ تکلیف تمہیں تمہاری طرف سے پہنچی ہے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جو تکلیف تمہیں پہنچی جس دن دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں آئی تھیں سو یہ اللہ کے حکم سے تھا اور تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے مومنین کو۔ اور ظاہر کر دے ان کو جنہوں نے نفاق اختیار کیا۔ اور ان سے کہا گیا کہ آؤ جنگ کرو اللہ کی راہ میں یا دفاع کرو، وہ کہنے لگے کہ اگر ہم جنگ کرنا جانتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے، وہ لوگ بہ نسبت ایمان کے آج کفر سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ خوب جاننے والا ہے اس بات کو جسے وہ چھپاتے ہیں، جنہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا اور خود بیٹھ رہے کہ اگر ہماری بات مانتے تو نہ مارے جاتے آپ فرما دیجیے تم اپنی جانوں سے موت کو دفع کرو اگر تم سچے ہو۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ مجھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اگلے سال جب اُحد کی جنگ ہوئی تو مسلمانوں کو جنگ بدر میں مشرک قیدیوں سے فدیہ لینے کی سزا دی گئی چنانچہ مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ وہاں سے چلے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اگلا دانت شہید کیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے مبارک پر چوٹ آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر خون بہا اس واقعہ پر اللہ نے یہ آیت أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ نازل کی۔ راوی کا کہنا ہے احد میں پیش آنے والا انجام آپ کے اپنے نفسوں کی طرف سے ہوا یعنی بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کی پاداش میں ہوا۔ (اسباب النزول)

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ: مسلمانوں کو جو غزوہ احد میں وقتی طور پر شکست ہوئی اور اس سلسلہ میں

تکلیف پہنچی اس مصیبت پر کچھ لوگوں کے منہ سے یہ نکلا أَنَّى هَذَا یہ مصیبت کہاں سے آئی؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اے نبی ﷺ آپ ﷺ ان کو جواب میں فرما دیں کہ یہ اسباب ظاہرہ تمہاری اپنی جانوں کی طرف سے ہیں کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی اور پہاڑی پر جن تیر اندازوں کو بٹھا دیا گیا تھا انہوں نے باوجود تاکیدی حکم کے اس جگہ کو چھوڑ دیا اور مال غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ (انوار البیان)

قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا: تم کو جو تکلیف پہنچی ہے گزشتہ سال غزوہ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت تم دشمنوں کو پہنچا چکے ہو، ستر آدمی ان کے قتل ہوئے تھے اور ستر آدمیوں کو تم قیدی بنا کر مدینہ منورہ میں لے آئے تھے، اس میں تسلی دینے کا پہلو اختیار فرمایا کہ تم اپنے دشمنوں کو اپنی مصیبت سے دوگنی مصیبت پہنچا چکے ہو، اب اگر تمہیں مصیبت پہنچ ہی گئی اور وہ بھی تمہاری نافرمانی کی وجہ سے تو اس پر غم گین کیوں ہو رہے ہو۔ (انوار البیان)

قُلْتُمْ أَنَّى هَذَا: تعجب سے تم نے کہا کہ یہ شکست اور قتل کی مصیبت ہم پر کہاں سے پڑی ہم تو مسلمان ہیں اور اللہ کا رسول ہم میں موجود ہے۔ (مظہری)

قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ: یہاں جس مصیبت کا بیان ہو رہا ہے یہ اُحد کی مصیبت ہے جس میں ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے، تو مسلمان کہنے لگے کہ یہ مصیبت کیسے آگئی؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یہ تمہاری اپنی طرف سے ہے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے لَمَّا كَانَ يومُ أُحُدٍ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ، عُوقِبُوا بِمَا صَنَعُوا يَوْمَ بَدْرٍ مِنْ أَخْذِهِمُ الفِدَاءَ، فَقُتِلَ مِنْهُمْ سَبْعُونَ وفَرَّ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُ، و كُسِرَتْ رَبَاعِيَتُهُ وهُشِمَتِ البَيْضَةُ عَلَى رَأْسِهِ، وَسَالَ الدَّمُ عَلَى وَجْهِهِ، فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: {أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ} بِأَخْذِكُمُ الْفِدَاءَ (مسند احمد (۱/۳۰، ۳۱) کہ بدر کے دن مسلمانوں نے فدیہ لے کر جن کفار کو چھوڑ دیا تھا اس کی سزا میں اگلے سال ان میں سے ستر مسلمان شہید کئے گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں افراتفری پڑ گئی، نبی کریم ﷺ کے سامنے کے چار دانت شہید ہو

گئے، آپ ﷺ کے سر مبارک پر خود تھا وہ بھی ٹوٹا اور چہرہ مبارک لہولہان ہو گیا، اس کا بیان اس آیت مبارکہ میں ہو رہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جَاءَ جِبْرِيلُ، عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، إِنَّ اللهَ قَدْ كَرِهَ مَا صَنَعَ قَوْمُكَ فِي أَخْذِهِمُ الْأُسَارَى، وَقَدْ أَمَرَكَ أَنْ تُخَيِّرَهُمْ بَيْنَ أَمْرَيْنِ، إِمَّا أَنْ يُقدموا فَتَضْرِبَ أَعْنَاقَهُمْ، وَبَيْنَ أَنْ يَأْخُذُوا الْفِدَاءَ، عَلَى أَنْ يُقْتَلَ مِنْهُمْ عِدَّتُهُمْ. قَالَ: فَدَعَا رسولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الناسَ فَذَكَرَ ذَالِكَ لَهُمْ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، عَشَائِرُنَا وَإِخْوَانُنَا، أَلَا نَأْخُذُ فِدَاءَهُمْ فَنتقوّى بِهِ عَلَى قِتَالِ عَدُوِّنَا، وَيَسْتَشْهِدُ مِنَّا عِدَّتُهُمْ، فَلَيْسَ فِي ذَالِكَ مَا نَكْرَهُ؟ قَالَ: فَقُتِلَ مِنْهُمْ يَوْمَ أُحُدٍ سَبْعُونَ رَجُلًا عِدَّةَ أُسَارَى أَهْلِ بَدْرٍ (ترمذی نسائی، تفسیر ابن کثیر، تفسیر طبری، مسند احمد)

کہ جبریل رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا اے محمد ﷺ آپ کی قوم کا کفار کو قیدی بنا کر پکڑ لینا اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا، اب انہیں دو باتوں میں سے ایک کے اختیار کر لینے کا حکم دیجئے، یا تو یہ کہ ان قیدیوں کو مار ڈالیں، یا یہ کہ ان سے فدیہ وصول کر کے چھوڑ دیں، مگر پھر ان مسلمانوں سے اتنی ہی تعداد شہید ہو گی، حضور ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے دونوں باتیں پیش کیں، تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ لوگ ہمارے قبائل کے ہیں، ہمارے رشتے دار بھائی ہیں، ہم کیوں نہ ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیں اور اس مال سے ہم طاقت قوت حاصل کر کے اپنے دوسرے دشمنوں سے جنگ کریں گے اور پھر جو ہم میں سے اتنے ہی آدمی شہید ہوں گے تو اس میں ہماری کیا برائی ہے، چنانچہ جرمانہ وصول کر کے ستر قیدیوں کو چھوڑ دیا اور ٹھیک ستر ہی کی تعداد مسلمانوں کی اس کے بعد غزوہ احد میں شہید ہوئی۔

پس ایک مطلب تو یہ ہوا کہ خود تمہاری طرف سے یہ سب ہوا یعنی تم نے بدر کے قیدیوں کو زندہ چھوڑنا اور ان سے جرمانہ جنگ وصول کرنا اس شرط پر منظور کیا تھا کہ تمہارے بھی اتنے ہی آدمی شہید ہوں وہ شہید ہوئے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی تھی اس باعث تمہیں یہ نقصان پہنچا تیر اندازوں کو رسول کرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں

لیکن وہ ہٹ گئے۔

إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، جو چاہے کرے، جو ارادہ ہو حکم دے، کوئی نہیں جو اس کا حکم ٹال سکے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللّٰهِ: دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن جو نقصان تمہیں پہنچا کہ تم دشمنوں کے مقابلے سے بھاگ کھڑے ہوئے تم میں سے بعض لوگ شہید بھی ہوئے اور زخمی بھی ہوئے یہ سب اللہ تعالیٰ کی قضاوقدر سے تھا، اس کی حکمت اس کی مقتضی تھی۔

وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا: اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ثابت قدم غیر متزلزل ایمان والے صابر بندے بھی ظاہر ہو جائیں اور منافقین کا حال بھی کھل جائے جیسے عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھی جو راستے سے ہی واپس لوٹ گئے تھے۔

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوِ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَاتَّبَعْنَاكُمْ: ایک مسلمان نے انہیں سمجھایا بھی کہ آؤ، اللہ کی راہ میں جہاد کرو یا کم از کم ان حملہ آوروں کو تو ہٹاؤ لیکن انہوں نے ٹال دیا کہ ہم تو فنونِ جنگ سے بے خبر ہیں اگر جانتے ہوتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے، یہ بھی مدافعت میں تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ تو رہتے جس سے مسلمانوں کی گنتی زیادہ معلوم ہوتی، یا دعائیں کرتے رہتے یا تیاریاں ہی کرتے، ان کے جواب کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ تم سچ مچ دشمنوں سے لڑو گے تو ہم بھی تمہارا ساتھ دیتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ لڑائی ہونے کی ہی نہیں۔

دین اور دنیا دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں کہا گیا کہ اگر تم مسلمان ہو تو دین اسلام کی خاطر راہِ خدا میں جہاد کرو، اگر تم دنیادار لوگ ہو تو اس لحاظ سے تم اپنی جان، مال اور گھر والوں کے لیے لڑائی میں شرکت کرو، لیکن ان منافقین نے وہ جواب دیا جو نا قابل سماعت ہے۔

سیرۃ محمد بن اسحاق میں ہے کہ ایک ہزار آدمی لے کر رسول اللہ ﷺ میدان احد کی جانب بڑھے، آدھے راستے میں عبداللہ ابی بن سلول بگڑ بیٹھا اور کہنے لگا اوروں کی مان لی اور مدینہ سے نکل کھڑے ہوئے اور میری نہ مانی اللہ کی قسم ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس فائدے کو نظر انداز رکھ کر اپنی

جانیں دیں؟ لوگو، کیوں جانیں کھو رہے ہو جس قدر نفاق اور شک وشبہ والے لوگ تھے اس کی آواز پر لگ گئے اور تہائی لشکر لے کر یہ پلید واپس لوٹ گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام بنو سلمہ کے بھائی ہر چند انہیں سمجھاتے رہے کہ یَا قَوْمِ، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ أَنْ تَخْذُلُوا نَبِيَّكُمْ وَقَوْمَكُمْ عِنْدَمَا حَضَرَ مِنْ عَدُوِّكُمْ، اے میری قوم: اپنے نبی کو اپنی قوم کو رسوا نہ کروا انہیں دشمنوں کے سامنے چھوڑ کر پیٹھ نہ پھیرو۔

لیکن انہوں نے بہانہ بنا دیا کہ ہمیں معلوم ہے کہ لڑائی ہونے ہی کی نہیں جب یہ بیچارے عاجز آ گئے تو فرمانے لگے أَبْعَدَكُمُ اللهُ أَعْدَاءَ اللهِ، فسيُغْنِي اللهُ عَنْكُمْ. وَمَضَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (سیرت ابن اسحاق) جاؤ تمہیں اللہ غارت کرے اللہ کے دشمنو! تمہاری کوئی حاجت نہیں اللہ اپنے نبی ﷺ کا مددگار ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ بھی انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ: وہ اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے بہت ہی نزدیک تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے احوال مختلف ہیں کبھی وہ کفر سے قریب ہو جاتا ہے اور کبھی ایمان کے نزدیک ہو جاتا ہے۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ: یہ اپنے منہ سے وہ باتیں بناتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں، جیسے ان کا یہی کہنا کہ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالاً لَّاتَّبَعْنَاكُمْ، اگر ہم جنگ جانتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے، حالانکہ انہیں یقیناً معلوم تھا کہ مشرکین دور دراز سے چڑھائی کر کے مسلمانوں کو نیست ونابود کر دینے کی ٹھان کر آئے ہیں وہ بڑے جلے کٹے ہوئے ہیں کیونکہ ان کے سردار بدر والے دن میدان میں رہ گئے تھے اور ان کے اشراف قتل کر دیئے گئے تھے تو اب وہ ان ضعیف مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں اور یقیناً جنگ عظیم برپا ہونے والی ہے۔

وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ: اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی چھپی ہوئی باتوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہے، انہوں نے اپنے مونہوں سے کہا کہ ہمیں لڑائی کا فن نہیں آتا، دوسرا انہوں نے کہا کہ اگر ہم اسے لڑائی سمجھتے تو ہم تمہاری اتباع کرتے۔

الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا: یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے بھائیوں کے بارے

میں کہتے ہیں اگر یہ ہمارا مشورہ مانتے یہیں بیٹھے رہتے اور جنگ میں شرکت نہ کرتے تو ہر گز نہ مارے جاتے۔

قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ: اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں آپ فرمادیجیے! اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹادو کہ اگر یہ ٹھیک ہے اور تم اپنی اس بات میں سچے ہو کہ بیٹھ رہنے اور میدان جنگ میں نہ نکلنے سے انسان قتل و موت سے بچ جاتا ہے تو چاہیے کہ تم مرو ہی نہیں اس لئے کہ تم تو گھروں میں بیٹھے ہو لیکن ظاہر ہے کہ ایک روز تم بھی چل بسو گے چاہے تم مضبوط برجوں میں پناہ گزین ہو جاؤ پس ہم تو تمہیں تب سچا مانیں کہ تم موت کو اپنی جانوں سے ٹال دو، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ آیت عبد اللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہے۔ (تفسیر ابنِ کثیرؒ)

حیات شہدا اور مقام شہدا

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ {۱۶۹} فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ {۱۷۰} يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ {۱۷۱} الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ {۱۷۲} الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ {۱۷۳} فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ {۱۷۴} إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ {۱۷۵} آل عمران

جواب ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں سے رزق دیے جاتے ہیں۔ وہ خوش ہیں اس سے جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا

اور وہ خوش ہو رہے ہیں ان لوگوں کی وجہ سے جو ان کے پاس نہیں پہنچے ان کے پیچھے رہ گئے کہ کوئی خوف نہیں ان پر اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ وہ خوش ہو رہے ہیں، بوجہ نعمت اور فضل خداوندی کے اور اس بات سے خوش ہیں کہ بلاشبہ اللہ ضائع نہیں فرماتا مومنین کے اجر کو۔ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے حکم کو مان لیا اس کے بعد کہ ان کو زخم پہنچ چکا تھا ان میں سے جنہوں نے نیکی کے کام کیے اور تقویٰ اختیار کیا ان کے لیے بہت بڑا ثواب ہے۔ یہ ایسے ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ لوگوں نے تمہارے لیے سامان جمع کیا ہے، لہٰذا تم ان سے ڈرو تو ان کی اس بات نے ان کا اور زیادہ ایمان بڑھا دیا، اور کہنے لگے کہ ہم کو اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کار ساز ہے۔ سو وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل لے کر واپس ہوئے ان کو کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچی اور وہ اللہ کی رضامندی کے تابع رہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ جو بات پیش آئی صرف اس وجہ سے کہ شیطان اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے سو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب احد کی جنگ میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں ڈال دیا، جو جنت کی نہروں پر آن اترتے ہیں اور جنت کے پھل کھاتے اور عرش کے سائے تلے لٹکے ہوئے سنہری فانوسوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں، جب انہوں نے اپنا اچھا اور پاکیزہ کھانا پینا اور آرام پایا تو انہوں نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو ہماری طرف سے کون پیغام پہنچائے گا کہ ہمیں جنت میں رزق دیا جاتا ہے تاکہ وہ جہاد میں کوتاہی نہ کریں اور جنگ میں پس وپیش نہ کریں تو خدا عزوجل نے کہا کہ تمہاری طرف سے یہ پیغام ان کو پہنچادوں گا تب اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ (حاکم، اسباب النزول)

② مسند احمد میں ہے کہ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لَمَّا أُصِيبَ إِخْوَانُكُمْ بِأُحُدٍ جَعَلَ اللهُ أَرْوَاحَهُمْ فِي أَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ، تَرِدُ أَنْهَارَ الْجَنَّةِ، وَتَأْكُلُ مِنْ ثِمَارِهَا وَتَأْوِي إِلَى قَنَادِيلَ مِنْ ذَهَبٍ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ، فَلَمَّا وَجَدُوا طِيبَ مَشْرَبِهِمْ وَمَأْكَلِهِمْ، وَحُسْنَ مُنْقَلَبِهِمْ قَالُوا: يَا لَيْتَ إِخْوَانَنَا يَعْلَمُونَ مَا صَنَعَ اللهُ لَنَا، لِئَلَّا يَزْهَدُوا فِي الْجِهَادِ، وَلَا يَنْكُلُوا عَنِ الْحَرْبِ فَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: أَنَا أُبَلِّغُهُمْ عَنْكُمْ. فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ

هَؤُلاءِ الآيَاتِ: {وَلا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ} وما بعدها (مسند احمد)

جب تمہارے بھائی احد والے دن شہید کئے گئے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ڈال دیں، جو جنتی درختوں کے پھل کھائیں اور جنتی نہروں کا پانی پئیں اور عرش کے سائے تلے وہاں لٹکتی ہوئی قندیلوں میں آرام وراحت حاصل کریں، جب کھانے پینے رہنے سہنے کی یہ بہترین نعمتیں انہیں ملیں تو کہنے لگے کاش کہ ہمارے بھائیوں کو جو دنیا میں ہیں ہماری ان نعمتوں کی خبر مل جاتی تاکہ وہ جہاد سے منہ نہ پھیریں اور اللہ کی راہ کی لڑائیوں سے تھک کر نہ بیٹھ رہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا تم بے فکر رہو میں یہ خبر ان تک پہنچا دیتا ہوں چنانچہ یہ آیتیں اور ان کے بعد والی آیات نازل فرمائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کے بارے میں آیتیں اتریں (مستدرک حاکم) یہ بھی مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ احد کے شہیدوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

③ ابو بکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے کہا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا اور فرمانے لگے جابر! کیا بات ہے کہ تم مجھے غمگین نظر آتے ہو؟ میں نے کہا یا رسول اللہ: میرے والد شہید ہو گئے جن پر قرض بہت ہے اور میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی بہت ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سن! میں تجھے بتاؤں جس کسی سے اللہ نے کلام کیا، پردے کے پیچھے سے کلام کیا، لیکن تیرے باپ سے آمنے سامنے بات چیت کی، فرمایا مجھ سے مانگ جو مانگے گا، دوں گا تیرے باپ نے کہا اللہ عزوجل میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ تو مجھے دنیا میں دوبارہ بھیجے اور میں تیری راہ میں دوسری مرتبہ شہید کیا جاؤں، رب عزوجل نے فرمایا یہ بات تو میں پہلے ہی مقرر کر چکا ہوں کہ کوئی بھی لوٹ کر دوبارہ دنیا میں نہیں جائے گا، کہنے لگے پھر اے اللہ! میرے بعد والوں کو ان مراتب کی خبر پہنچا دی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آیت (وَلَا تَحْسَبَنَّ) الخ، نازل فرمائی، بیہقی میں اتنا اور زیادہ ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تو اے اللہ! تیری عبادت کا حق بھی ادا نہیں کر سکا۔

④ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس یا ستر صحابیوں کو بیئر معونہ کی طرف بھیجا تھا یہ جماعت جب اس غار

تک پہنچی جو اس کنویں کے اوپر تھی تو انہوں نے وہاں پڑاؤ کیا اور آپس میں کہنے لگے کون ہے؟ جو اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اللہ کے رسول ﷺ کا کلمہ ان تک پہنچائے ایک صحابی اس کے لئے تیار ہوئے اور ان لوگوں کے گھروں کے پاس آکر با آواز بلند فرمایا

يَا أَهلَ بِئرِ مَعُونَةِ، إِنِّي رَسُولُ رَسُولِ اللهِ إِلَيكُم، إِنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، فَآمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ، اے بیرِ معونہ والو! سنو میں اللہ کے رسول ﷺ کا نمائندہ ہوں میں گواہی دیتا ہوں کہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، یہ سنتے ہی ایک کافر اپنا تیر سنبھالے ہوئے اپنے گھر سے نکلا اور اس طرح تاک کر لگایا کہ اِدھر کی پسلی سے اُدھر کی پسلی میں آر پار نکل گیا، اس صحابی رضی اللہ عنہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا اَللّٰهُ أَكبَرُ، فُزْتُ وَرَبِّ الكَعبَةِ، رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا، اب کفار نشانات ٹٹولتے ہوئے اس غار پر جا پہنچے اور عامر بن طفیل نے جو ان کا سردار تھا ان سب مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے بارے میں قرآن اترا کہ بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا أَنَّا قَد لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَرَضِينَا عَنْهُ، ہماری جانب سے ہماری قوم کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے وہ ہم سے راضی ہو گیا اور ہم اس سے راضی ہو گئے۔ ہم ان آیتوں کو برابر پڑھتے رہے پھر ایک مدت کے بعد یہ منسوخ ہو کر اٹھالی گئیں اور آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ، اتری (تفسیر طبري (۷/ ۳۹۲ بخاري ۲۸۰۱)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ راہ خدا میں مارے جانے والے زندہ ہیں تم انہیں مردہ خیال بھی نہ کرو، اس سے پہلے سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا تھا کہ تم راہ خدا میں مارے جانے والوں کو مردہ تک نہ کہو، یہاں مردہ سمجھنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے، واضح کیا گیا کہ یہ جو لوگ جس موت سے ڈرتے اور لوگوں کو خوف زدہ کرتے ہیں یہ موت تو مقصود و مطلوب مومن ہے، ان آیات کا نزول بھی اس موقع اور معرکہ کے دوران ہوا جہاں لوگ اللہ کے لیے جانیں لٹا رہے تھے۔

بَلْ أَحْيَاء عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے، قرب

اور شرف عظیم انہیں اللہ کے پاس حاصل ہے، جنت سے رزق دیا جاتا ہے، جنت سے رزق دیا جانا یہ تاکید ہے کہ وہ اللہ کے ہاں زندہ ہیں۔

فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ: یہ شہید جن جن نعمتوں اور آسائشوں میں ہیں ان سے بے حد مسرور اور بہت ہی خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں شرفِ شہادت بخشا ہے اور ابدی زندگی اور جنت کی بیش بہا نعمتوں سے لطف اندوز کر کے کامیاب کیا ہے۔

وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ: استبشار کا معنیٰ بشارت طلب کرنا ہے، یہاں معنیٰ ہے مکمل خوشی۔ اور انہیں یہ بھی خوشی اور راحت ہے کہ ان کے بھائی بند جو ان کے بعد اللہ کی راہ میں شہید ہوں گے اور ان کے پاس آئیں گے انہیں آئندہ کا کچھ خوف نہ ہو گا اور اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی چیزوں پر انہیں حسرت بھی نہ ہو گی۔

حضرت محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ خوش ہیں کہ ان کے کئی اور بھائی بند بھی ہیں جو جہاد میں لگے ہوئے ہیں وہ بھی شہید ہو کر ان کی نعمتوں میں ان کے شریک ہوں گے اور اللہ کے ثواب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں شہید کو ایک کتاب دی جاتی ہے کہ فلاں دن تیرے پاس فلاں آئے گا اور فلاں دن فلاں آئے گا پس جس طرح دنیا والے اپنے کسی غیر حاضر کے آنے کی خبر سن کر خوش ہوتے ہیں اسی طرح یہ شہداء ان شہیدوں کے آنے کی خبر سے مسرور ہوتے ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب شہید جنت میں گئے اور وہاں اپنی منزلیں اور رحمتیں دیکھیں تو کہنے لگے کاش! کہ اس کا علم ہمارے ان بھائیوں کو بھی ہو تا جو اب تک دنیا میں ہی ہیں تا کہ وہ جواں مردی سے جان توڑ کر جہاد کرتے اور ان جگہوں میں جا گھستے جہاں سے زندہ آنے کی امید نہ ہوتی تو وہ بھی ہماری ان نعمتوں میں حصہ دار بنتے پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کے اس حال کی خبر پہنچا دی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہہ دیا کہ میں نے تمہاری خبر تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی ہے اس سے وہ بہت ہی مسرور و خوش ہوئے۔ (تفسیر ابنِ کثیرؒ)

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللهِ وَفَضْلٍ: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان شہدا کے لیے یہ بیان فرمایا کہ وہ

اپنے ان بھائیوں کے بارے میں خوش ہیں جو ابھی تک رتبہ شہادت پر فائز نہیں ہوئے، وہ شہید ہو کر ان کے پاس آئیں گے، یہ خوشی دوسروں سے متعلق تھی، یہاں اللہ تعالیٰ نے ان شہدا کی ان کی ذات سے متعلق خوشی کا ذکر فرمایا ہے، کہ وہ اپنی ذات کو ملنے والی نعمتوں سے خوش ہوں گے، یہاں يَسْتَبْشِرُونَ دوبارہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا استبشار ان لوگوں کے حالات کے بارے میں تھا جو ابھی تک ان سے ملے نہیں ہیں، وہ پیچھے ہیں، دوسرا استبشار ان کی ذات سے متعلق خصوصی حالات کے لیے ہے۔

وَأَنَّ اللهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ: اہل ایمان سے یا شہدا مراد ہیں، یا تمام اہل ایمان مراد ہیں، دونوں کے اجر و ثواب کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرمائیں گے۔ مؤمنین کا لفظ یہاں لانے کا فائدہ یہ ہے کہ اجر کے ضائع نہ ہونے میں شہدا اور تمام اہل ایمان برابر ہیں، سب کا اجر محفوظ ہے۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ: زخم کھانے کے باوجود جن لوگوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی آواز پر لبیک کہا ان کی فضیلت بیان کی جا رہی ہے، ان کی مدح بیان کی جا رہی ہے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی۔ یہ عجیب منظر تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زخموں سے چور چور تھے، اپنے قدموں پر کھڑے نہ ہو سکتے تھے، کچھ دیر ایک شخص دوسرے کو اپنی گردن پر اٹھاتا تھا، پھر یہ شخص دوسرے ساتھی کو کچھ دیر اپنی گردن پر اٹھاتا تھا، کچھ دیر ایک ساتھی دوسرے ساتھی کے ساتھ ٹیک لگائے رکھتا اور کچھ دیر دوسرا ساتھ ٹیک لگائے رکھتا۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ابو سفیان اور اس کے ساتھی (غزوہ احد کے بعد) واپس ہوئے اور مشرکین کا آپس میں مشورہ ہوا کہ ہم شکست دے کر واپس آ گئے (یہ تو کچھ بھی نہ ہوا) سب مسلمانوں کو ختم ہی کر دیتے لہٰذا واپس چل کر پھر حملہ کریں، اس کی خبر آنحضرت ﷺ کو ہو گئی تو آپ ﷺ اپنے صحابہ ﷺ کو لے کر ان کے پیچھے چلے اور مقام حمراء الاسد تک ان کا پیچھا کیا جب ابو سفیان کو یہ پتہ چلا کہ آپ ﷺ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں، تو ابو سفیان اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا، راستے میں بنی عبد القیس کے چند سواروں سے ملاقات ہوئی ان سے ابو سفیان نے کہہ دیا کہ تم محمد ﷺ کو کہہ دو کہ ہم واپس لوٹ کر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تاکہ

مسلمانوں کو بالکل ہی ختم کر دیں، ان لوگوں کی حمراء الاسد میں آنحضرت سرور دو عالم ﷺ سے ملاقات ہو گئی، انہوں نے ابو سفیان کی بات نقل کر دی اس پر آپ ﷺ نے اور آپ کے ساتھیوں نے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہا کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور ہمارا کارساز ہے، اللہ جل شانہٗ نے آیت بالا نازل فرمائی، جس میں مسلمانوں کی تعریف ہے کہ غزوہ احد میں زخم خوردہ ہونے کے بعد بھی، اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی بات مان لی اور دشمن کا پیچھا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے حمراء الاسد تک پیچھا کیا اور جب دشمن کی طرف سے یہ بھبکی ملی کہ ہم نے بہت سا سامان تیار کر لیا ہے۔ تو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ مضبوط اعتقاد اور یقین کے ساتھ پڑھ لیا اور دشمن واپس نہ ہوئے اور سیدھے مکہ معظمہ چلے گئے۔ (انوار البیان)

لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيْمٌ: ان میں سے جس نے نیک اعمال کیے اور تقویٰ اختیار کیا اس کے لیے بڑا اجر ہے، احسان اور تقویٰ کا ذکر بطور قید (یعنی بطور وصف تقییدی) نہیں ہے کیونکہ دعوت جہاد کو قبول کرنے والے سب ہی نیکو کار اور متقی تھے بلکہ ان دونوں کا ذکر بطور مدح ہے اور اجر عظیم ملنے کی علت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ (مظہری)

الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ: شان نزول: حضرت مجاہد رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ اور عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بدر صغریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے (المقتطف من عیون التفاسیر)

بعض کہتے ہیں کہ جنگ احد تمام ہونے پر ابو سفیان نے اعلان کیا تھا کہ اگلے سال بدر پر پھر لڑائی ہے، حضرت ﷺ نے قبول کر لیا، جب اگلا سال آیا حضرت محمد ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کیلئے چلو، اگر کوئی نہ جائے گا تب بھی اللہ کا رسول تنہا جائے گا، ادھر سے ابو سفیان فوج لیکر مکہ سے نکلا تھوڑی دور چل کر کمر ہمت ٹوٹ گئی، رعب چھا گیا، قحط سالی کا عذر کر کے چاہا مکہ واپس جائے، مگر صورت ایسی ہو کہ الزام مسلمانوں پر رہے، ایک شخص مدینہ جا رہا تھا، اس کو کچھ دینا کیا کہ وہاں پہنچ کر اس طرف کی ایسی خبریں مشہور کرنا جن کو سن کر مسلمان خوف کھائیں اور جنگ کو نہ نکلیں وہ مدینہ پہنچ کر کہنے لگا کہ مکہ والوں نے بڑی بھاری جمعیت اکٹھی کی ہے تم کو لڑنا بہتر نہیں مسلمانوں کو حق تعالیٰ

نے استقلال دیا، انہوں نے یہ ہی کہا کہ ہم کو اللہ کافی ہے، آخر مسلمان حسب وعدہ بدر پہنچے، وہاں بڑا بازار لگتا تھا، تین روز رہ کر تجارت کر کے خوب نفع کما کر مدینہ واپس آئے اس غزوہ کو بدرِ صغریٰ کہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی) مسلمانوں کی تیاری کی خبر سن کر مکہ کے کفار راستہ سے واپس چلے گئے تھے، اس پر مکہ والوں نے اپنے لشکر کا نام جیش السویق رکھ دیا تھا، سویق ستو کو کہتے ہیں، مطلب یہ کہ مکہ والوں کا لشکر ستو پینے گیا تھا پی کر واپس لوٹ آیا۔

فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ: جب نعیم بن مسعود اور منافقوں نے مسلمانوں کو ابوسفیان کے لشکر سے ڈرایا تو انہوں نے ان کے قول کی طرف توجہ نہیں کی اور ان کا اللہ تعالیٰ پر یہ اعتماد اور قوی ہو گیا کہ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا انہوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللّٰهِ: یعنی اللہ کا فضل دیکھو نہ کچھ لڑائی کرنی پڑی نہ کانٹا چبھا، مفت میں ثواب کمایا، تجارت میں نفع حاصل کر کے اور دشمنوں پر دھاک بٹھلا کر خدا تعالیٰ کی خوشنودی لیے ہوئے صحیح سلامت گھر واپس آ گئے۔ (عثمانی) بدرِ صغریٰ کی طرح غزوہ حمراء الاسد میں بھی ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ سامان کی خرید و فروخت ہوئی تھی اور مسلمانوں نے بھاری نفع کمایا تھا عموماً فضل سے یہ ہی مالی نفع مراد ہے۔ (عثمانی) یہاں جس نعمت کا ذکر ہے اس سے مراد عافیت، سلامتی اور ثبات علی الایمان اور طاعت اللہ اور طاعت الرسول ہے، یہاں فضل سے مراد تجارت میں نفع حاصل کرنا ہے، یہ لوگ ایسے موسم میں بدر پہنچے تھے کہ یہاں تجارت کی اور خوب نفع کمایا، برائی نے انہیں نہیں چھوا سے مراد یہ ہے کہ انہیں دشمن کی سازش کا سامنا نہیں کرنا پڑا، کوئی زخم نہیں لگا اور لڑائی بھی نہیں ہوئی۔ رضوان اللہ کی پیروی کی سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ دشمن کی طرف جو نکلے تو مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تھا۔

وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ: اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے، اس نے ان پر فضل کیا کہ انہیں ایسا کرنے کی توفیق عطا کی، انہیں ہر اس چیز سے بچایا جو انہیں نقصان دیتی یا پریشان کرتی، ان پر تجارتی نفع کے ذریعے فضل و احسان فرمایا، جو اس سفر سے پیچھے رہ گئے وہ نقصان میں رہے۔

إِنَّمَا ذَالِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ: یہ تو شیطان ہے جو اپنے بھائی بندوں سے ڈراتا ہے، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس عبارت کا مفہوم اس طرح ہے کہ شیطان تمہیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، دوسرا مفہوم یہ ہے کہ شیطان اپنے منافق دوستوں کو ڈراتا ہے تاکہ وہ مشرکین کے خلاف جہاد کرنے سے بیٹھ جائیں، شیطان اپنے ان دوستوں کو ڈراتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی بات کا اثر لیتے ہیں، رہے اولیاء اللہ وہ شیطان کے ڈراوے میں نہیں آتے جب وہ انہیں ڈرانے کی کوشش کرے اور نہ ہی وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں اولیاء سے مراد مشرکین، کفار، منافقین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نہ نکلنے والے ہیں، اکثر مفسرین رحمہم اللہ نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ شیطان تمہیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: تم لوگ شیطانی ڈراوے میں نہ آؤ، تمہیں صرف مجھ سے ڈرنا ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں سے ڈرنے کی بجائے ایک اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرا جائے، یہ چیز شیطانی شر سے محفوظ رکھے گی۔

منافقین کی منافقت، کافروں کی ایذا رسانیاں، بخیلوں کا بخل

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللهَ شَيْئًا يُرِيدُ اللهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ {۱۷۶} إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللهَ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ {۱۷۷} وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ {۱۷۸} مَا كَانَ اللهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَآمِنُوا بِاللهِ وَرُسُلِهِ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ {۱۷۹} وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ {۱۸۰} آل عمران

جواب ترجمہ: اور آپ کو وہ لوگ رنجیدہ نہ کریں جو تیزی کے ساتھ کفر میں جا پڑتے ہیں بیشک وہ لوگ اللہ کو کچھ بھی ضرر نہ دے سکیں گے، اللہ چاہتا ہے کہ ان کو آخرت میں کچھ بھی حصہ نہ دے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کو ایمان کے بدلہ خرید لیا وہ ہر گز اللہ کو کچھ بھی ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور ہر گز گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ ہم جو ان کو مہلت دے رہے ہیں وہ ان کی جانوں کے لیے بہتر ہے بات یہی ہے کہ ہم انہیں مہلت دے رہے ہیں تاکہ وہ گناہوں میں اور زیادہ ترقی کر لیں اور ان کے لیے عذاب ہے ذلیل کرنے والا۔ اللہ مومنین کو اس حالت پر چھوڑنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو جب تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ فرما دے، اور اللہ تم کو امور غیب پر مطلع نہیں فرماتا لیکن اللہ منتخب فرما لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان پر قائم رہے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے ثواب عظیم ہے۔ اور ہر گز خیال نہ کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بخل کرنا ان کے لیے بہتر ہے بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے جس چیز کے ساتھ انہوں نے بخل کیا، عنقریب قیامت کے دن ان کو اس کا طوق پہنایا جائے گا اور اللہ کے لیے آسمانوں کی اور زمین کی میراث ہے اور اللہ ان کاموں کی خبر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو۔

شان نزول: ① وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ یہ آیت قریش کے کفار سے متعلق نازل کی گئی ہے، کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ جتنے مرضی لاؤ لشکر جمع کر لیں، وہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے، اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، پھر رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مقصد اس دین کو باطل قرار نہیں دے سکتے اور اس شریعت کو ختم نہیں کر سکتے، یہ لوگ خود ہی کمزور ہوں گے اور مٹ جائیں گے، نبی ﷺ کی شان بلند سے بلند ہوتی جائے گی۔

② یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ لوگ مسلمانوں کو ڈراتے تھے، یہ لوگ غزوہ احد کے واقعہ کے بعد مسلمانوں میں فتح و نصرت کے حوالے سے مایوسی پھیلاتے تھے، یہ کہتے تھے

محمد ﷺ بادشاہی چاہتے ہیں، اسی لیے کبھی معاملہ ان کے حق میں چلا جاتا ہے، کبھی ان کے خلاف۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ کفار کے کچھ لوگ مسلمان ہوگئے اور پھر قریش کے ڈر سے مرتد ہوگئے، اس وجہ سے نبی کریم ﷺ پریشان ہوگئے، آپ ﷺ یہ سمجھے کہ یہ لوگ ارتداد کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچائیں، اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ اس وجہ سے یہ لوگ آپ ﷺ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ③ اس سے مراد روسائے یہود ہیں، کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے دنیوی اغراض کے حصول کی خاطر نبی کریم ﷺ کی صفات پوشیدہ رکھی تھیں۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ: حضرت رسول اکرم ﷺ کو اللہ پاک نے تسلی دی ہے، خطاب تو آپ ﷺ کو ہے لیکن تسلی کے مضمون میں تمام مسلمان شریک ہیں مطلب یہ ہے کہ جو لوگ تیزی کے ساتھ کفر میں گر رہے ہیں اور کفر انہیں خوب زیادہ مرغوب ہے ان کی حرکتوں اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف ان کی کوششوں سے رنجیدہ نہ ہوں۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت میں منافقین مراد ہیں، حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفار مراد ہیں۔

سوال کافر کے کفر پر غم گین ہونا، گناہ گار کے گناہوں پر پریشان ہونا تو درست ہے، اطاعت ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس اطاعت سے کیوں منع کیا؟

جواب ① کسی کافر کے کفر پر، کسی گناہ گار کے گناہوں پر ایک حد تک غم گین ہونا تو اطاعت ہے لیکن حد سے زیادہ، افراط کی حد تک غم گین ہونا، یہ درست نہیں ہے، نبی کریم ﷺ کافروں کے کفر پر بہت زیادہ غم گین ہوتے تھے، اس غم گینی کی وجہ سے آپ ﷺ کو نقصان پہنچ سکتا تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ آپ ﷺ افراط و اسراف کی حد تک ان کافروں کے کفر پر غم گین نہ ہوں، جیسے دوسرے مقام پر آپ ﷺ کو منع کیا گیا کہ آپ ﷺ ان کی وجہ سے اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچائیں (فاطر ۸)

② یہ لوگ ڈرانے کے ساتھ آپ ﷺ کو غم گین نہ کریں، وہ آپ ﷺ کے خلاف دوسروں کی مدد و نصرت نہ کریں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ہرگز وہ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں دے سکتے، وہ کفر میں

اپنی پھرتیوں کے باعث آپ کو نقصان نہیں دیں گے اپنے آپ کو نقصان دیں گے، ان کی پھرتیوں اور چالاکیوں کا وبال لازماً انہی پر پلٹے گا۔

إِنَّهُمْ لَنْ يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا: یہاں فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، مراد نبی مصطفےٰ کریم ﷺ کو تسلی کی تکمیل ہے، کہ یہ آپ ﷺ کو کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتے، اسی طرح آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی نہیں پہنچا سکتے، اسی طرح اولیاء اللہ کو بھی یہ لوگ ذرا بھر نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہاں شَيْئًا کا لفظ اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے اللہ کی ملکیت میں سے کوئی چیز کم نہیں کر سکتے، حدیث قدسی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارے اگلے پچھلے، تمہارے جنات اور تمہارے انسان سب ہی لوگ ایک متقی شخص کے دل کی طرح ہو جائیں، اس سے میری ملک میں ذرا بھر اضافہ نہیں ہو گا، تمہارے اگلے پچھلے، تمہارے جنات اور انسان سب ایک گناہ گار ترین انسان کی طرح ہو جائیں تو میری ملکیت میں ایک مچھر کے پر برابر کمی نہیں ہو سکتی۔ (بحر العلوم)

يُرِيدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْآخِرَةِ: اللہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو، انہیں جنت نہیں ملے گی، جب جنت نہیں تو لازمی بات ہے دوزخ ٹھکانہ ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سر تا پا کفر میں ڈوبے ہوئے تھے، ان کی سرکشیاں اور طغیانیاں انتہاؤں پر تھیں، پھر انہیں توبہ کی توفیق نہیں ملی، یہ کفر کی موت مرے، یہاں يُرِيدُ صیغہ مضارع اس بات کی طرف اشارہ دے رہا ہے کہ کافروں کی حالت کفر میں استمرار و دوام تھا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ: ساری زندگانی کفر پر گزارنے، توبہ نہ کرنے اور کفر کی حالت پر ہی مرنے کی وجہ سے انہیں ناکامی ملی، اس لیے دوزخ میں ان کے لیے بڑا عذاب ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا: ہدایت کی روشنی ان کفار کے سامنے تھی مگر انہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دی، ایسے لوگ اپنے آپ کو نقصان پہنچاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: جب ان لوگوں نے کفر کو ترجیح دی، اسلام کو قبول نہیں کیا تو ان کا نقصان ہو گیا،

یہ لوگ دردناک عذاب کا ایندھن بن جائیں گے، دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے، چونکہ یہ عادت جاریہ ہے کہ جب کوئی مشتری کسی چیز کو خریدتا ہے تو وہ خرید کردہ چیز پر بہت خوش ہوتا ہے، اسے مزید خوشی اس وقت ملتی ہے جب اس چیز پر اسے منافع ملتا ہے، جب اس چیز میں اسے نقصان ہو جائے تو اسے بہت دکھ، تکلیف اور الم پہنچتا ہے، اسی لیے یہاں عذاب الیم فرمایا گیا، اسے پہنچنے والی شدت اور الم کی وجہ سے، یہاں اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کو دوبارہ لایا گیا ہے تاکید کی وجہ سے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ: اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو خطاب فرمارہے ہیں کہ کفار یہ خیال نہ کریں کہ ہماری ڈھیل ان کے لیے بہتر ہے، یہ بہتر نہیں بلکہ ان کے حق میں بری ہے، اس ڈھیل کا نتیجہ انہیں آخرت میں بہت نقصان پہنچائے گا، مال واولاد کی کثرت انہیں نفع نہیں دے سکتی بلکہ انہیں آخرت میں نقصان ہو گا، ہم تو انہیں مہلت اس لیے دیے چلے جاتے ہیں کہ یہ نافرمانی اور سرکشی میں اور زیادہ آگے بڑھیں۔

إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا: املاء، امہال اور سرکشیوں سے اس لیے وقتی طور پر صرف نظر اور چشم پوشی کی جاتی ہے تاکہ یہ لوگ گناہوں اور سرکشیوں میں مزید ترقی کریں۔ ان کی رسی دراز کی جارہی ہے، جب اللہ پکڑے گا تو پھر یہ ڈھیل اس وقت ڈھیلی نہیں ہو گی۔ اِملاء اور اِمہال کا معنیٰ ہوتا ہے عمر کو لمبا کرنا، گھوڑے کی رسی دراز اس لیے کی جاتی ہے تاکہ جہاں تک چاہے چرتا رہے بالآخر اس کی رسی کھینچ لی جاتی ہے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ: انہی لوگوں کے عذاب کی بات کی جارہی ہے جنہیں پہلے عذاب دینے کی بات کی گئی ہے، جنہیں عذاب الیم دینے کی بات کی گئی ہے، جوں جوں ان کی شر انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کا تذکرہ بڑھ رہا ہے توں توں ان کو دیے جانے والے عذاب کی سنگینی خطرناک شکل اختیار کرتی جارہی ہے، یہاں فرمایا جارہا ہے کہ عذاب الیم کے بعد عذاب مہین بھی انہیں دیا جائے گا، جس میں ان کی ذلت، تحقیر زیادہ مقصود ہے، یہ اس لیے کہ جب انہیں دنیا میں ڈھیل دی گئی، لذات وطیبات دنیویہ سے لطف اندوز ہونے کا بھرپور موقع دیا گیا، دنیا کی زیب وزینت سے خوب فائدہ اٹھانے کا موقع دیا گیا، یہ ساری چیزیں معزز بننے کا موقع فراہم کرتی ہیں، جب ان کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے

معزز بننے کا طریقہ اختیار نہیں کیا تو یہاں توہین آمیز عذاب کا اس لیے ذکر کیا گیا کہ پوری پوری سزا و بدلہ عمل کے مطابق ہو جائے، مقاتل کہتے ہیں یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب کہ عطاء کہتے ہیں کہ یہ آیت بنی قریظہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ: منافقین مخلص مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے ان کے ظاہری دعوؤں کی وجہ سے اور بعض نمازوں میں حاضر ہونے کی وجہ سے ظاہری طور پر یہ امتیاز نہ ہو پاتا تھا کہ منافق کون ہے اور مخلص کون ہے، اللہ جل شانہٗ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تم کو اس حالت پر نہیں رکھنا چاہتا جس پر تم اب ہو بلکہ اللہ پاک کی طرف سے ایسے شدائد اور مصائب پیش آتے ہیں اور پیش آئیں گے کہ ناپاک لوگ یعنی منافقین کا پاک لوگوں (یعنی مومن مخلصین) سے امتیاز ہو جائے کیونکہ مصیبت کے وقت اپنے پرائے کا اچھی طرح پتہ چل جاتا ہے۔ (انوار البیان) یہاں اہل ایمان کے لیے وعدہ نصرت ہے جب کہ منافقین کے لیے وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل کرے گا، جب اسلام کو عظمت و شوکت ملی اور کفر اور اہل کفر کو ذلت کا سامنا کرنا پڑا تو اس وقت یہ امتیاز واضح ہوا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَآءُ: اللہ تعالیٰ شانہٗ تمہیں منافقین کے نفاق پر اس طرح مطلع فرمادیں کہ تم ان کے قلوب کو جان لو ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، حکمت یہ ہے کہ عملی طور پر ظاہری طریقے پر منافقوں کا نفاق کھل جائے اور وہ اس طرح سے واضح ہو کہ جب مصیبتیں پیش آئیں اور اللہ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے مواقع آئیں تو منافقین بھاگ نکلیں، غزوہ اُحد میں عمل سے بھی راہ فرار اختیار کی اور زبانی طور پر بھی ایسے کلمات بول اٹھے جن سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ اندر سے مومن نہیں ہیں، اگر مسلمانوں کو منافقوں کے قلوب کا حال بتادیا جاتا اور مسلمان اپنے اسی علم کی بنیاد پر یہ کہتے کہ تم منافق ہو مسلمان نہیں ہو تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ تمہارے پاس ہمارے منافق ہونے کی کیا دلیل ہے تم غلط کہتے ہو ہم تو سچے پکے مسلمان ہیں، لیکن جب مصیبتوں کا سامان ہوا اور منافق بھاگ کھڑے ہوئے تو ظاہری طور پر خود ہی مسلمانوں سے الگ ہو گئے اور اب ان کا منہ نہ رہا کہ مومن مخلص ہونے کا دعویٰ کریں۔

ہاں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے غیب کی بات بتا دیتا ہے اس غیب میں یہ بھی ہے کہ کسی کا نفاق اور دل کا چور اپنے رسول ﷺ کو بتا دے اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ پر ظاہر فرمائے یا مصائب اور شدائد اور تکالیف اور قربانی کے مواقع سامنے لا کر منافقین کا نفاق ظاہر فرمائے اور سب کے سامنے رسوا فرمائے یہ سب حکمت کے مطابق ہے۔ (انوار البیان)

فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: منافقین کی چالبازیوں، طعنہ زنیوں کا جواب دینے کے بعد اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرما رہے ہیں کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو، یہاں اپنے حبیب ﷺ پر ایمان لانے کا ذکر کرنا چاہیے تھا، لیکن اس کے برعکس تمام رسولوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا، اس میں ایک باریک نکتہ ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ پر بھی ایمان اسی وقت متحقق و معتبر ہو گا جب تمام انبیاء پر ایمان لایا جائے، ایک پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے، جب سب پر ایمان لائیں گے تو نبی کریم ﷺ بھی اس مکمل فہرست میں آجائیں گے، کیونکہ نبی کریم ﷺ وہ پیغمبر ہیں جنہوں نے سب نبیوں کی نبوت کی تصدیق کی ہے، صاحب کتاب نبیوں کی کتابوں کی بھی تصدیق کی ہے، اگر نبی کریم ﷺ ہمیں نہ بتاتے تو ہمیں کیا پتہ چلتا کہ تورات، زبور اور انجیل کیا چیزیں تھیں، اس لیے ایک نبی پر ایمان گویا سب پر ایمان لانا ہے، ایک نبی کا انکار گویا سب کا انکار کرنا ہے، ایک کی تکذیب گویا سب کی تکذیب کرنا ہے۔

وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ: ایمان سارے اعمال میں شرط اولین ہے کامیابی کے لیے، ایمان اعمال کی عمارت کے لیے پہلی سیڑھی ہے، یہاں دو چیزیں ذکر فرمائی ہیں کہ اگر تم لوگ ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے یعنی نفاق سے بچتے رہو گے، اوامر کی پابندی کرتے اور نواہی سے بچتے رہو گے تو تمہارے لیے بڑا اجر ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ: جو لوگ مومن نہ تھے وہ اللہ کی راہ میں جس طرح جان دینے سے بچتے تھے اسی طرح مال خرچ کرنے سے بھی گریز کرتے تھے، اس آیت میں بخل کی مذمت فرمائی اور فرمایا کہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں جو لوگ کنجوسی کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کا یہ عمل ان کے لیے بہتر ہے، یہ تو ان کے لیے بہت ہی

برا ہے اور اس کا برا انجام آخرت میں سامنے آئے گا۔ (انوار البیان)

جس مال و دولت پر یہ بخیل لوگ اپنا حق جتاتے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا ہے، ان کا اپنا کمال اس کے حصول میں نہیں ہے۔ مگر یہ لوگ اس مال میں سے حقوق اللہ بھی ادا نہیں کرتے جیسے زکوٰۃ کی ادائی، صدقہ فطر کی ادائی، قربانیاں اور دوسرے خرچ، بطور رکھ رکھاؤ کے بھی اس مال میں سے کچھ نہیں دیتے، نہ کسی کو ہدیہ دیتے ہیں نہ ہی کسی کو صدقہ دیتے ہیں، ان کا سب سے بڑا بخل یہ ہے کہ یہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اپنے اوپر بھی خرچ نہیں کرتے، نہ اچھا کھاتے ہیں اور نہ ہی اچھا پہنتے ہیں، بیمار ہو جائیں تو اپنے جسم کے لیے اس مال میں سے دوائی بھی نہیں لیتے، جسمانی پرورش کے لیے غذا بھی نہیں کھاتے۔

سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: ان کا مال قیامت کے دن طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈال دیا جائے گا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جسے اللہ نے مال دیا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کا مال قیامت کے دن گنجا سانپ بنا دیا جائے گا، (جس سانپ کے زیادہ زہریلا ہونے کی وجہ سے سر کے بال اُڑ گئے ہوں اسے گنجا سانپ کہا جاتا ہے) یہ گنجا سانپ اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا پھر وہ اس کی دونوں باچھوں کو پکڑ کر کہے گا اَنَا مَالُكَ اَنَا كَنْزُكَ (کہ میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں) (انوار البیان) ایک قول یہاں یہ کیا گیا ہے کہ اس بخل سے مراد علمی بخل ہے، کیونکہ یہودی تورات میں بیان کی گئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریفوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپاتے تھے، اس کتمان (نعت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپانے) کو بخل سے تعبیر کیا گیا۔ ان دو قولوں میں پہلا زیادہ قوی اور اولیٰ ہے۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: بخیلوں کو ان کے بخل سے متعلق باریک اِشارہ دیا گیا کہ تم مال کو چھپا چھپا کر رکھتے ہو، خرچ کرنے والی جگہوں پر بھی خرچ کرنے سے ہچکچاتے ہو، حالانکہ ان کے یہ اموال باقی نہیں رہیں گے، اللہ ہے جس کے خزانے محفوظ رہتے ہیں، واضح کیا گیا کہ آسمانوں کی اور زمین کی میراث سب اللہ کے لیے ہے، سب کا وہی مالک ہے ملکیت حقیقی میں کوئی اس کا ساجھی نہیں، اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کا حکم نازل ہونے پر خرچ نہ کرنا اور مال خرچ کرنے میں اللہ کی

رضا کا خیال نہ کرنا بڑی بے وقوفی ہے جن مالوں کو آپس میں یکے بعد دیگرے میراث میں تقسیم کر لیتے ہیں وہ اولاً آخراً سب اللہ ہی کا ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: یہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کو اس بارے میں اچھی طرح پتہ ہے، یہ حقوق کی دھجیاں اُڑاتے ہیں، حقوق ادا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ اس جرم کی پاداش میں انہیں سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ غنی الاغنیاء ہے

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ، تفسیر اور شان نزول بیان کیجیے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ {۱۸۱} ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ {۱۸۲} آل عمران

جواب ترجمہ: بے شک اللہ نے ان کی بات سنی ہے جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ فقیر ہے اور ہم دولت مند ہیں اب ہم ان کی بات لکھ رکھیں گے اور جو انہوں نے انبیاء کے ناحق خون کیے ہیں اور کہیں گے کہ جلتی آگ کا عذاب چکھو۔ یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور بلاشبہ اللہ بندوں پر ظلم فرمانے والا نہیں ہے۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب آیت مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (البقرۃ:۲۴۵) اتری (کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے اور وہ اسے زیادہ در زیادہ کر کے دے) تو یہود کہنے لگے يَا مُحَمَّدُ، اِفْتَقَرَ رَبُّكَ يَسْأَلُ عِبَادَهُ الْقَرْضَ؟ کہ اے محمد: تمہارا رب فقیر ہو گیا ہے اور اپنے بندوں سے قرض مانگ رہا ہے اس پر یہ آیت لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ آل عمران: ۱۸۱) نازل ہوئی۔ (ابن مردویہ وابن ابی حاتم)

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہودیوں کے مدرسے میں

گئے، یہاں کا بڑا معلم فنحاص تھا اور اس کے ماتحت ایک بہت بڑا عالم اشیع تھا، لوگوں کا مجمع تھا اور وہ ان سے مذہبی باتیں سن رہے تھے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فنحاص اللہ سے ڈر اور مسلمان ہو جا اللہ کی قسم تجھے خوب معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، وہ اس کے پاس سے حق لے کر آئے ہیں، ان کی صفتیں توراۃ وانجیل میں تمہارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ تو فنحاص نے جواب میں کہا: ابو بکر سن، اللہ کی قسم! اللہ ہمارا محتاج ہے ہم اس کے محتاج نہیں، اس کی طرف اس طرح نہیں گڑگڑاتے جیسے وہ ہماری جانب عاجزی کرتا ہے، بلکہ ہم تو اس سے بے پرواہ ہیں، ہم غنی اور تونگر ہیں اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے قرض طلب نہ کرتا جیسے کہ تمہارا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہا ہے۔ ہمیں تو سود سے روکتا ہے اور خود سود دیتا ہے اگر غنی ہوتا تو ہمیں سود کیوں دیتا؟ اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو سخت غصہ آیا اور فنحاص کے منہ پر زور سے مارا اور فرمایا: اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم یہود سے معاہدہ نہ ہوتا تو میں تجھ اللہ کے دشمن کا سر کاٹ دیتا، جاؤ بد نصیبو جھٹلاتے ہی رہو اگر سچے ہو، فنحاص نے جا کر اس کی شکایت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اسے کیوں مارا؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے واقعہ بیان کیا لیکن فنحاص اپنے قول سے مکر گیا کہ میں نے تو ایسا کہا ہی نہیں۔ اس بارے میں یہ آیت اتری۔ (ابن ابی حاتم)

لَّقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ: یہودیوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم لوگ مالدار ہیں جیسا کہ اوپر شان نزول میں بیان کیا گیا ہے، ان لوگوں نے یہ بات استہزا کے طور پر کہی تھی، اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول کسی ایک شخص کا نہیں ہے بلکہ کئی لوگوں کی زبانوں سے نکلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بات سن لی ہے، جنہوں نے یہ بات کہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کی بات کا کوئی ڈر وخوف نہیں ہے۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا: اللہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ ان لوگوں نے کہا ہے ہم اسے لکھ رکھیں گے، اسے لکھنے والے فرشتے لکھیں گے، نہ ہم اس بات کو پھینکیں گے اور نہ ہی اسے فراموش کریں گے، کیونکہ ایسا جملہ انتہائی گستاخی، بے ادبی، سوء کلامی، کفر اور قرآن کریم کے ساتھ استہزا ہے۔

وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ: یہ جملہ ذکر فرما کر ایک باریک اشارہ دے دیا کہ جن لوگوں نے پاکیزہ

ہستیوں انبیاء کرام علیہم السلام کو شہید کیا، ان کا ناحق خون بہایا ان ظالموں سے کیا بعید ہے کہ وہ اس طرح کی کفریہ باتیں نہ کریں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود یہودیوں کو یہ بات سنانے کا یہ فائدہ ہے کہ یہ لوگ اگرچہ قتل انبیاء علیہم السلام کے جرم میں شامل نہیں تھے، لیکن چونکہ یہ اپنے آباؤاجداد کے شیطانی کارناموں پر فخر تو کرتے تھے، یہ خوش تھے کہ ان کے بڑوں نے یہ کام کیے۔

وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ: جہنم کا داروغہ کہے گا کہ تم لوگ جلانے والا عذاب چکھو، لیکن اس کی اضافت ونسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے کیونکہ داروغہ جہنم اللہ کے حکم سے ایسا کہے گا، حریق بمعنیٰ محرِق ہے یعنی جلانے والی، ذوق کھانوں کے ادراک کا نام ہے، اپنے معنیٰ کی وسعت کے لحاظ سے تمام محسوسات اور اُمور عقلیہ پر بولا جاتا ہے۔

ذَالِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ: یہ اسم اشارہ اس عذاب کی طرف ہے جو انہیں دیا جائے گا، اس کا سبب قتل انبیاء علیہم السلام اور ان کے مونہوں سے نکلنے والی ہفوات ہیں، جن کا تعلق ایک طرف معاصی کے ساتھ ہے اور دوسری طرف کفر کے ساتھ ہے، یہاں جو فرمایا گیا کہ تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا یہ اس لیے فرمایا کہ اکثر کام انسانی ہاتھوں سے ہی انجام پاتے ہیں۔

وَأَنَّ اللهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ: آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ کافر عذاب کے اتنے مستحق ہیں کہ اگر اللہ ان کو عذاب نہ دے تو ان پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہوگی پس گویا اس طرز کلام سے کافروں پر عذاب ہونے کو مؤکد طور پر ظاہر کر دیا۔ (مظہری) یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ظلم کی کمال نفی اس کی انتہائی پاکیزگی اور نزاہت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، مبالغے کا صیغہ یہاں اسی معنیٰ کی تاکید کے لیے ہے، یہ صیغہ یہاں نسبت کے لیے ہے کہ اس کی طرف ظلم کی نسبت کی ہی نہیں جاسکتی اور نہ ہی اس سے کسی کے لیے ظلم واقع ہو سکتا ہے۔ (المقتطف من عیون التفاسیر)

یہود کا خود ساختہ بہانہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّى يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

{۱۸۳} فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ
{۱۸۴} آل عمران

جواب ترجمہ: جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ نے ہم سے یہ فرمایا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی کی چیز نہ لائے جسے آگ کھا جائے آپ فرما دیجیے مجھ سے پہلے بہت سے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور جو تم کہہ رہے ہو وہ بھی لائے پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو؟ سو اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ سے پہلے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں وہ کھلی کھلی نشانیاں لائے اور صحیفے لائے اور روشن کتاب لائے۔

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّى يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ: کافروں کی طرف سے نبوت کے معاملے میں یہ دوسرا طعن تھا، وہ یوں کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد و پیمان کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ وہ ایسی قربانی کرے جسے آگ آکر کھا جائے، لیکن اے محمد ﷺ! آپ ﷺ نے اس بارے میں کیا کیا؟ اس لحاظ سے تو یہ بات لازم ہے کہ آپ انبیاء میں سے نہ ہوں۔

شان نزول: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت کعب بن اشرف یہودی، کعب بن اسد، مالک بن صیف، وہب بن یہوذا، زید بن تابوت، فنحاص بن عازوراء وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ لوگ نبی ک ﷺ کے پاس آکر کہنے لگے اے محمد! آپ کا خیال ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب نازل کی ہے، جب کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھائے اور اس کی ہلکی سی آواز بھی ہو جو آسمان سے نازل ہو، اگر آپ ہمارے پاس ایسی قربانی لاتے ہیں تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر للرازی)

عطاء رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ بنو اسرائیل اللہ کے لیے جانور ذبح کرتے اور اس میں سے عمدہ گوشت نکال کر گھر کے وسط میں رکھ دیتے، گھر کی چھت کھلی ہوئی ہوتی تھی، پھر ان کے نبی کھڑے ہو کر اللہ سے دعا کرتے اور بنو اسرائیل گھر کے گرد کھڑے ہوتے تھے، پھر آسمان سے بغیر دھوئیں

کے روشن آگ اترتی، جس کی آواز ہوتی اور اس ساری قربانی کو کھا جاتی تھی۔ (الکبیر للرازی)

یہودیوں کے اس دعوے سے متعلق علماء کے دو قول ہیں، ایک قول سدی کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ تورات میں یہ شرط اس طرح آئی کہ اس کے لیے بھی ایک شرط تھی، وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا تم میں جو شخص آئے جو یہ کہتا ہو کہ وہ نبی ہے تو تم اس کی اس وقت تک تصدیق نہ کرو جب تک کہ وہ تمہارے پاس ایک قربانی لائے جسے آگ آکر کھائے، سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے، جب وہ دونوں آئیں گے تو تم ان دونوں پر ایمان لانا، کیونکہ وہ دونوں بدون قربانی کے آئیں گے جسے آگ کھائے گی، فرمایا کہ یہ عادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک باقی رہی، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو یہ عادت ختم ہو گئی اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس دعویٰ کی شرط تورات پر جھوٹ باندھنا ہے، اس پر کئی وجوہ ہیں، ایک یہ کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو پھر تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات یہی قربانی ہوتی، لیکن پتہ چلا کہ معاملہ یوں نہیں ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے سامنے دکھائے گئے معجزات ایسی چیزیں تھیں لیکن یہ قربانی ان میں نہیں تھی، دوسری بات یہ کہ اس آگ کا اُترنا اور اس قربانی کو کھانا یہ معجزہ ہے تو پھر یہ اور باقی سارے معجزات برابر ہیں، پھر اس معجزے کی تعیین اور تخصیص کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اس سے بڑے زبردست معجزات صادر ہوئے تو قطعی و یقینی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہو گئی، چاہے یہ معجزہ ظاہر ہوتا یا نہ ہوتا۔

قربان رجحان کی طرح مصدر ہے، جو قرب سے ہے، قربان ایسی چیز جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے، چاہے وہ دنبہ ہو، محبت ہو یا کھانا۔ یہودیوں نے تورات کے بارے میں جو دعویٰ کیا وہ محض جھوٹا دعویٰ ہے، تورات میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ: یہود کی اس کذب بیانی اور دروغ گوئی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ انہیں ملامت کیجیے، انہیں سرزنش کیجیے، انہیں ڈانٹتے ہوئے فرمائیے کہ تمہارے پاس مجھ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام معجزات لے کر آئے، وہ کام بھی کر دکھایا جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو کہ قربانی ہو

جسے آسمانی آگ آکر کھا جائے، حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحیٰ علیہ السلام نے تمہارا مطالبہ پورا نہیں کیا تھا؟ تم ان پر کیوں ایمان نہیں لائے تھے؟ کس نے تمہیں انہیں قتل کرنے کی جرأت دی تھی؟ پھر تم نے کیوں ناحق ان کی جان لی اور ان کے پاکیزہ خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے؟ اگر تم لوگ اپنے قول و قرار میں سچے ہو، اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ یہ لوگ عناد کی بناء پر معجزات کے طلب گار ہیں، استرشاد اور طلب ہدایت کے لیے نہیں مانگ رہے، اسی لیے تو ان کا مطلوب و مقصود پورا نہیں کیا جارہا۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ: اللہ تعالیٰ نے کفار، یہود اور منافقین کی طرف سے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے جانے والے الزامات، دیے جانے والے طعنوں کے جواب میں تسلیاں دیں، یہ بھی ایک تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے ہیں تو یہ کوئی نیا کام نہیں ہے، یہ کام تو پہلی امتیں بھی اپنے نبیوں سے کر چکی ہیں، انہیں جھٹلا چکی ہیں۔

جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ: جن نبیوں کو ان کی امتوں نے جھٹلایا وہ انبیاء کوئی تہی دامن و تہی دست ان تک نہیں پہنچے تھے، وہ ان کے پاس معجزات لائے تھے، وہ ان کے پاس چمکتی دلیلیں لائے تھے، وہ ان کے پاس روشن کتابیں لائے تھے مگر وہ لوگ نہیں مانے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے پاس ساری دلیلیں لائے مگر ان کے اعتراضات و اشکالات، ان کے طعنے اور الزام تراشیاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں۔

موت اٹل حقیقت، کامیابی و ناکامی کا مدار

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ {۱۸۵} آل عمران)

جواب ترجمہ: ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے اور تمہیں قیامت کے دن پورے پورے بدلے ملیں گے پھر جو کوئی دوزخ سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا سو وہ پورا کامیاب ہوا اور دنیا کی زندگی سوائے دھوکے کی پونجی کے اور کچھ نہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ: تمام مخلوق کو عام اطلاع ہے کہ ہر جاندار مرنے والا ہے جیسے فرمایا كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمن:۲۶،۲۷) یعنی اس زمین پر جتنے ہیں سب فانی ہیں صرف رب کی ذاتی باقی ہے جو بزرگی اور انعام والا ہے، پس صرف وہی اللہ وحدہ لاشریک ہمیشہ کی زندگی والا ہے جو کبھی فنا نہ ہو گا، جن وانسان کل کے کل مرنے والے ہیں اسی طرح فرشتے اور حاملان عرش بھی مر جائیں گے اور صرف اللہ وحدہ لاشریک دوام اور بقاء والا باقی رہ جائے گا پہلے بھی وہی تھا اور آخر بھی وہی رہے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں لَمَّا تُوُفِّيَ النَّبِيُّ ﷺ وَجَآءَتِ التَّعزِيَةُ، جَاءَهُم آتٍ يَّسمَعُونَ حِسَّه وَلَا يَرونَ شخصه فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيكُم أَهلَ البَيتِ وَرَحمَةُ الله وَبَرَكَاتُه { كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ } إِن فى الله عَزَاءً مِن كل مُصِيبة، وخَلَفًا مِن كُل هَالِكٍ، وَدَرَكًا مِّن كُل فَائِتٍ، فَبالله فَثِقُوا، وَإِيَّاهُ فَارجُوا، فَإِنَّ المُصَابَ مَن حَرُمَ الثَّوابُ، وَالسَّلَامُ عَلَيكُم وَرَحمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، قَالَ جَعفَرُ بنُ مُحَمَّد: فَأَخبَرَنِي أَبِي أَنَّ عَلِي بن أَبِي طَالِب قَالَ: أَتَدرُونَ مَن هَذَا؟ هَذَا الخَضِر، عَلَيهِ السَّلَامُ (در منثور سیوطی (۲/۳۹۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی آرہا ہے ہمیں پاؤں کی چاپ سنائی دیتی تھی لیکن کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا اس نے آکر کہا اے اہل بیت! تم پر سلام ہو اور اللہ کی رحمت وبرکت، ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے تم سب کو تمہارے اعمال کا بدلہ پورا پورا قیامت کے دن دیا جائے گا۔ ہر مصیبت کی تسلی اللہ کے پاس ہے، ہر مرنے والے کا بدلہ ہے اور ہر فوت ہونے والے کا اپنی گم شدہ چیز کو پالینا ہے اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اسی سے بھلی امیدیں رکھو سمجھ لو کہ سچ مچ مصیبت زدہ وہ شخص ہے جو ثواب سے محروم رہ جائے، تم پر اللہ کی طرف سے سلامتی نازل ہو اور اس کی رحمتیں اور برکتیں (ابن ابی حاتم) حضرت علی کا خیال ہے کہ یہ خضر علیہ السلام تھے۔

وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: جب سب مر جائیں گے مدت ختم ہو جائے گی، صلب آدم سے جتنی اولاد ہونے والی تھی ہو چکی اور پھر سب موت کے گھاٹ اتر گئے، مخلوقات کا خاتمہ ہو گیا اس وقت اللہ تعالیٰ قیامت قائم کرے گا اور مخلوق کو ان کے کل اعمال کے چھوٹے بڑے چھپے کھلے صغیرہ

کبیرہ سب کی جزا سزا ملے گی کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہو گا۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ: حقیقت یہ ہے کہ پورا کامیاب وہ انسان ہے جو جہنم سے نجات پالے اور جنت میں چلا جائے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں مَوْضِعُ سَوطٍ فِي الجَنَّةِ خَيرٌ مِّنَ الدُّنيَا وَمَا فِيهَا، جنت میں ایک کوڑے جتنی جگہ مل جانا دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔ اگر تم چاہو تو پڑھو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (آل عمران:۱۸۵) جس کی خواہش آگ سے بچ جانے اور جنت میں داخل ہو جانے کی ہو اسے چاہیے کہ مرتے دم تک اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھے اور لوگوں سے وہ سلوک کرے جسے خود اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلاَّ مَتَاعُ الْغُرُورِ: اس کے بعد دنیا کی حقارت اور ذلت بیان ہو رہی ہے کہ یہ نہایت ذلیل فانی اور زوال پذیر چیز ہے ارشاد ہے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (الاعلیٰ:۱۶) یعنی تم تو دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ دراصل بہتر اور بقاء والی چیز آخرت ہے، دوسری آیت میں ہے وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الآخِرَةِ إِلا مَتَاعٌ (الرعد:۲۶) اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کچھ نہیں مگر تھوڑا سا سازوسامان مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (النحل: ۹۶) جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہو گا، وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِينَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى اور جو چیز تمہیں دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے جو چیز اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔ (القصص:۶۰)

پیارے آقا نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے وَاللّٰهِ مَا الدُّنيَا فِي الآخِرَةِ إِلَّا كَمَا يَغْمِسُ أَحَدُكُم إِصبَعَهُ فِي اليَمِّ، فَلْيَنظُر بِمَ تَرْجِعُ إِلَيهِ؟ اللہ کی قسم! دنیا آخرت کے مقابلہ میں صرف ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنی انگلی سمندر میں ڈبو لے اس انگلی کے پانی کو سمندر کے پانی کے مقابلہ میں کیا نسبت ہے آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایسی ہی ہے، (مسلم، ترمذي، وابن ماجہ)۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا ارشاد ہے دنیا کیا ہے ایک یونہی دھوکے کی جگہ ہے جسے چھوڑ چھاڑ کر تمہیں چل دینا ہے اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں کہ یہ تو عنقریب تم سے جدا

ہونے والی اور برباد ہونے والی چیز ہے پس تمہیں چاہیے کہ ہوش مندی برتو اور یہاں اللہ کی اطاعت کر لو اور طاقت بھر نیکیاں کمالو اللہ کی دی ہوئی طاقت کے بغیر کوئی کام نہیں بنتا۔

مصائب و آلام کے کالے پہاڑ اور اذیتوں کی کالی گھٹائیں

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ {۱۸۶} آل عمران

جواب ترجمہ: تم لوگ ضرور ضرور آزمائے جاؤ گے اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں اور جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور جن لوگوں نے شرک کیا ان کی طرف سے ضرور بالضرور بہت سی باتیں دل آزاری کی سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

شان نزول: ① کعب بن اشرف (یہودی) شاعر تھا، وہ نبی کریم ﷺ کی ہجو کرتا تھا اور اپنے اشعار کے ذریعے کفار قریش کو آپ کے خلاف بھڑکاتا تھا، نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے اس وقت مدینہ کی آبادی ملی جلی تھی، ان میں مسلمان بھی تھے اور مشرک بھی اور ان میں یہودی بھی تھے، نبی ﷺ نے چاہا کہ ان سب کے درمیان باہم صلح کا معاہدہ ہو جائے، مشرک اور یہود آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو ان تکالیف پر صبر کرنے کا حکم دیا انہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ نازل ہوئی۔

② اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر سوار تھے، جس پر ایک فدکی چادر تھی اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے سوار ہوئے اور آپ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے بنی حارث بن الخزرج کی طرف چل پڑے، یہ واقعہ جنگ بدر سے پہلے کا ہے آپ کا گزر ایک مجلس پر ہوا جس میں عبداللہ بن ابیّ موجود تھا، یہ واقعہ عبداللہ بن ابیّ کے مسلمان ہونے سے

پہلے کا ہے مجلس میں ملے جلے لوگ تھے، ان میں مسلمان، مشرک بت پرست اور یہود سبھی لوگ تھے، اس مجلس میں عبداللہ بن رواحہ بھی تھے، فَلَمَّا غَشِيَتِ الْمَجْلِسُ عَجَاجَةُ الدَّابَّةِ خَمَّرَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ أَنْفَهُ بِرِدَائِهِ جب مجلس پر سواری کے چلنے سے گرد و غبار چھا گیا تو عبداللہ بن ابیّ نے اپنی ناک پر ایک چادر رکھ لی، پھر کہا کہ ہم پر گرد نہ اڑاؤ رسول اللہ ﷺ نے سلام کیا اور پھر ٹھہر گئے اپنی سواری سے اترے اور اہل مجلس کو اسلام کی طرف دعوت دی اور ان کے سامنے قرآن پڑھا۔

عبداللہ بن ابیّ نے کہا اے شخص! جو کچھ تم کہتے ہو اس سے اچھی بات کوئی اور نہیں ہے، اگر یہ باتیں حق ہیں تو ہماری مجلس میں ہمیں اذیت نہ دو، اپنی سواری کے پاس واپس جاؤ، جو آپ کے پاس آئے اسے یہ باتیں سناؤ، عبداللہ بن رواحہ نے کہا کہ ہاں یارسول اللہ! ہماری مجلسوں میں ہمیں سنایئے ہمیں آپ ﷺ کی باتیں پسند ہیں، اس موقع پر مسلمانوں، مشرکوں اور یہود کے درمیان تلخ کلامی اور گالی گلوچ ہو گئی، یہاں تک کہ نوبت دست و گریبان ہونے تک پہنچ گئی، نبی ﷺ انہیں ٹھنڈا کرتے رہے جب تک کہ وہ خاموش ہو گئے، اس کے بعد نبی ﷺ اپنی سواری پر سوار ہو گئے اور چل دیے یہاں تک کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں پہنچ گئے۔

آپ ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے سعد! کیا تم نے نہیں سنا کہ ابو حباب نے کیا کہا ابو حُباب سے آپ کی مراد عبداللہ بن ابیّ تھا، اس نے فلاں فلاں بات کہی، اس پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ! اس سے درگزر اور صرف نظر کیجیے، اس ذات کی قسم! جس نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کی، اللہ نے آپ ﷺ پر کتاب نازل کر کے حق پیش کیا، اس جزیرہ نما کے لوگوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ اسے یعنی عبداللہ بن ابیّ کو تاج پہنائیں گے اور اس کی طرف داری کریں گے لیکن اللہ نے آپ ﷺ پر حق نازل کر کے اس منصوبے کو رد کر دیا تو وہ یعنی عبداللہ بن ابیّ اس سے بدک اٹھا اس نے اسی لیے آپ کے ساتھ وہ کچھ کیا جو آپ ﷺ نے دیکھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس سے درگزر کیا، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (اسباب النزول)

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا: تمہیں اپنے مالوں اور جانوں میں ضرور آزمایا جائے گا اور تم ان لوگوں سے جن

کو تم سے پہلے کتاب ملی اور مشرکوں سے بہت کچھ تکلیف کی باتیں سنو گے پھر اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری کے ساتھ رہو تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کام ہیں، سیاق وسباق کلام سے اندازہ لگانا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو کس قدر تسلیاں دے رہے ہیں، انہی تسلیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دین کے لیے آپ ﷺ کو کس قدر ستایا گیا، ان لوگوں نے غزوہ احد میں آپ ﷺ کو بہت ستایا، اللہ کی طرف سے یہاں خبر دی جارہی ہے کہ آئندہ بھی یہ لوگ آپ ﷺ کو ستانے سے باز آنے والے نہیں ہیں، ان آزمائشوں میں مالوں اور جانوں کی آزمائشیں بھی داخل ہیں، یہ سب اطلاع دینے کا مقصد یہ کہ اپنے آپ کو مضبوط کیا جائے اور صبر وثبات، جرأت اور استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے، کیونکہ جب کسی انسان کو آزمائش آنے کا پتہ نہ ہو اور اچانک سے اس پر کوئی مصیبت آجائے تو یہ بات اس پر بڑی شاق گزرتی ہے، جب کہ پہلے پتہ ہونے کی صورت میں اتنی گراں نہیں گزرتی، آدمی ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ تم سے پہلے جنہیں کتاب دی گئی اور مشرکین سے تم تکلیف کی بہت سی باتیں سنو گے اس سے مراد انواع واقسام کی اذیتیں اور تکلیفیں ہیں، جو یہود ونصاریٰ اور مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو حاصل ہو رہی ہیں اور ہونے والی ہیں، ان میں ایک تکلیف وایذا یہ تھی یہودی کہتے تھے کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، یہ بات مسلمانوں کو گراں گزرتی تھی، نصاریٰ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ تین میں سے تیسرا ہے، یہ بات مسلمانوں کے لیے باعث اذیت تھی، یہ لوگ نبی کریم ﷺ کو ہر وہ طعنہ دیتے تھے جو وہ دے سکتے تھے، کعب بن اشرف جیسا یہودی نبی ﷺ کی شان اقدس میں ہجو کرتا تھا، ان کی شان کم کرنے کے لیے اشعار کہتا تھا، رہے مشرکین تو دوسرے لوگوں کو نبی کریم ﷺ کی مخالفت کرنے کے لیے تیار کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کے ساتھ برسرپیکار ہونے کے لیے لشکر جمع کرتے تھے، موقع پاکر مسلمانوں کو روکتے تھے کہ وہ نبی کریم ﷺ کا ساتھ نہ دیں۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ: اللہ تعالیٰ یہاں اپنے حبیب ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دے رہے ہیں کہ ان اذیتوں اور تکلیفوں کا مقابلہ آپ

لوگوں نے صبر و تقویٰ کے ساتھ کرنا ہے، ان دو ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھنے والے لوگ ہی اہل ہمت ہیں، یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

علم چھپانے کا وبال

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلاَ تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاء ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْاْ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ {۱۸۷} آل عمران.

جواب ترجمہ: اور جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ اسے لوگوں سے ضرور بیان کروگے اور نہ چھپاؤ گے انہوں نے وہ عہد اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں تھوڑا سا مول خرید کیا سو کیا ہی برا ہے جو وہ خریدتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلاَ تَكْتُمُونَهُ: اللہ تعالیٰ یہاں اہل کتاب کو ڈانٹ رہا ہے کہ پیغمبروں کی وساطت سے جو عہد ان کا جناب باری سے ہوا تھا کہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں گے اور آپ ﷺ کے ذکر کو اور آپ ﷺ کی بشارت کی پیش گوئی کو لوگوں میں پھیلائیں گے انہیں آپ ﷺ کی تابعداری پر آمادہ کریں گے پھر جس وقت آپ ﷺ آجائیں تو دل سے آپ ﷺ کے تابعدار ہو جائیں گے۔

فَنَبَذُوهُ وَرَاء ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْاْ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ: لیکن انہوں نے اس عہد کو چھپالیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہر کرنے پر دنیا اور آخرت کی جن بھلائیوں کا ان سے وعدہ کیا تھا ان کے بدلے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں الجھ کر رہ گئے ان کی یہ خرید و فروخت بد سے بدتر ہے۔

اس میں علماء کو تنبیہ ہے کہ وہ ان کی طرح نہ کریں ورنہ ان پر بھی وہی سزا ہو گی جو ان کو ملی اور انہیں بھی اللہ کی وہ ناراضگی اٹھانی پڑے گی جو انہوں نے اٹھائی، علماء کرام کو چاہیے کہ ان کے پاس جو نفع دینے والا دینی علم ہو جس سے لوگ نیک عمل جم کر کر سکتے ہوں اسے پھیلاتے رہیں اور کسی بات کو نہ چھپائیں، پیارے آقا مدنی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے مَن سُئِلَ عَن عِلمٍ فکَتَمَهُ أُلجِمَ یومَ

القِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَارٍ، جس شخص سے علم کا کوئی مسئلہ پوچھا جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

خود ستائی اور خود نمائی کی مذمت

سوال اس آیت مبارکہ میں کیا بیان کیا جارہا ہے؟

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَّيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ {۱۸۸} وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ {۱۸۹} آل عمران

جواب ترجمہ: آپ ہر گز خیال نہ کریں کہ جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں اور اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیے ان پر ان کی تعریف کی جائے ان کے بارے میں آپ ہر گز یہ خیال نہ کریں کہ وہ عذاب سے چھوٹ گئے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے ملک آسمانوں اور زمین کا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

شان نزول: ① ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منافقوں کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد پر جاتے وقت پیچھے رہ جاتے تھے اور جب آپ جہاد سے لوٹ آتے تو معذرتیں کرتے اور اپنی معذرتوں پر حلف اٹھاتے اور اپنے ناکردہ کاموں پر بھی اپنی تعریفیں سننا چاہتے جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اسباب النزول)

② زید بن اسلم راوی ہیں کہ مروان بن الحکم مدینہ کے گورنر تھے، ان کے پاس ایک دن ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ موجود تھے، مروان نے کہا کہ اے ابوسعید! مجھے آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَّيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا کے بارے میں بتایئے، قسم بخدا ہم تو اپنے کیے پر ضرور خوش ہوتے ہیں اور ہم پسند کرتے ہیں کہ ناکردہ کاموں پر ہماری تعریف کی جائے۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ اصل قصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کچھ لوگ جہاد کے موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے

پیچھے رہ جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی شکست اور ناپسندیدہ صورت حال پیش آنے پر اپنے پیچھے رہ جانے سے خوش ہوتے تھے اور پسندیدہ صورت حال کے پیش آنے پر اپنے پیچھے رہ جانے پر قسمیں اٹھاتے اور معذرتیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ انہوں نے نہیں بھی کیا اس پر ان کی تعریف کی جائے۔ (اسباب النزول)

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا: یہ نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے یا ہر اس شخص کو خطاب ہے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے، یفرحون فرح سے ہے، فرح اس لذت کو کہتے ہیں جو دل میں حاصل ہوتی ہے، فرح قرآن کریم میں تکبر کے معنیٰ میں بھی آیا ہے، فرح رضا کے معنیٰ میں بھی آیا ہے۔ قرآن میں شان نزول میں ان لوگوں کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ میدان کارزار میں چلے جاتے تھے، مگر کچھ لوگ بیٹھ رہتے تھے، جب نبی کریم ﷺ واپس تشریف لاتے تو یہ لوگ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے، یہ لوگ اپنے کیے پر خوش ہوتے اور ناکردہ کاموں کی تعریف کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرتے تھے، یہ چاہتے تھے کہ جو کام انہوں نے نہیں کیا ہوتا تھا اس کی بھی انہیں شاباش دی جائے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ: یہاں فا زائدہ ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ آپ انہیں عذاب سے نجات پانے والوں میں سے نہ سمجھیے، کیونکہ جھوٹ کا لباس انسان کو بچا نہیں سکتا، جھوٹا لباس صاحب لباس کو بے پردہ کر دیتا ہے اور اسے رسوا کر دیتا ہے، مفازۃٌ یہ مصدر میمی ہے فوز اور نجات کے معنیٰ میں ہے، یہ آیت ان لوگوں کی آراء کو جھٹلا رہی ہے، کیونکہ وہ اس تصنع و تکلف سے اپنے طور پر یہ سمجھتے تھے کہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اللہ نے اطلاع دے دی کہ وہ بچ نہیں سکتے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: اس فطرت اور تصنع و تکلف والے ریاکاروں کو دوزخ کا دردناک عذاب دیا جائے گا۔

وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ: آسمان و زمین کی بادشاہی خالص اللہ ہی کے لیے ہے، وہ مستقلاً ان کا مالک ہے، کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔

وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینے پر قادر ہے، جیسے چاہے اور جس طرح چاہے۔

انسان کی طبیعت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ اپنے کارہائے نمایاں کی تعریف وستائش پر خوش

ہوتا ہے، مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دیتے مگر اس کے باوجود وہ اس بات کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کی تعریف وستائش کی جائے ان کو اس کام کا کریڈٹ دیا جائے جو انہوں نے کیا ہی نہیں ہے، کام دوسروں نے کیا ہے اور اس کی شاباش یہ لینا چاہتا ہے، ایسے لوگ قرآن کریم کی روشنی میں قابل مذمت اور ان کی یہ سوچ اور فکر بھی قابل مذمت ہے۔

بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے مَنِ ادَّعَى دَعْوَى كَاذِبَةً لِيتَكَثَّرَ بِهَا لَم يَزِدْهُ اللهُ إِلَّا قِلَّةً (بخاري مسلم) جو شخص جھوٹا دعویٰ کرکے زیادہ مال کمانا چاہے اسے اللہ تعالیٰ اور کم کردے گا۔

بخاری و مسلم کی دوسری حدیث میں ہے اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَم يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَي زُورٍ (مسلم) جو شخص اپنے پاس کسی ایسی چیز کے ہونے کا دعویدار ہے جو اسے نہیں دی گئی تو وہ شخص جھوٹے کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

صفات و مناجات عقلاء

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ {۱۹۰} الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ {۱۹۱} رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ {۱۹۲} رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ {۱۹۳} رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ {۱۹۴} آل عمران

جواب ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے، اور لیٹے ہوئے، اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں، اے ہمارے رب آپ نے اس کو بے کار پیدا نہیں فرمایا ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں سو آپ ہمیں دوزخ کے عذاب سے نجات دیجیے۔ اے

ہمارے رب اس میں شک نہیں کہ جسے آپ دوزخ میں داخل فرمادیں تو واقعی آپ نے اس کو رسوا کر دیا اور ظالموں کے لیے کوئی مدد گار نہیں۔ اے ہمارے رب بلاشبہ ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ ایمان کے لیے پکار رہا ہے کہ تم ایمان لاؤ اپنے رب پر، سو ہم ایمان لے آئے اے ہمارے رب سو آپ مغفرت فرمادیجیے ہمارے گناہوں کی، اور کفارہ کر دیجیے ہمارے گناہوں کا اور ہمیں نیک بندوں کے ساتھ موت دیجیے۔ اے ہمارے رب اور ہمیں عطا فرمایئے جو آپ نے اپنے رسولوں کی معرفت وعدہ فرمایا اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیے بلاشبہ آپ وعدہ خلافی نہیں فرماتے۔

شان نزول: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ قریش یہود کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا معجزات لے کر آئے ہیں، انہوں نے کہا کہ اپنا عصا اور دیکھنے والوں کے لیے اپنا ید بیضاء، پھر قریش نصاریٰ کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ تم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے تھے؟ انہوں نے جواب دیا وہ کوڑھیوں اور برص والے مریضوں کو شفایاب اور صحت یاب کر دیتے تھے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے پھر یہ لوگ نبی کے پاس آئے اور کہا کہ اپنے خدا سے دعا کیجیے کہ وہ صفا پہاڑ کو ہمارے لیے سونا بنادے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ: ان آیات میں اول تو یہ ارشاد فرمایا کہ آسمانوں کو اور زمین کو جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور رات اور دن کے آگے پیچھے آنے کا جو نظام رکھا ہے جس کے مطابق رات اور دن آگے پیچھے آتے رہتے ہیں اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یعنی یہ چیزیں بتاتی ہیں کہ ان کا پیدا فرمانے والا قادر مطلق ہے، خالق ہے، حکیم ہے۔ (انوار البیان)

آیات پر تنوین تفخیم کے لیے ہے، یعنی بہت سی عظیم نشانیاں ہیں، جو اس کی وحدانیت، کمال علم اور عجیب قدرتوں پر دلالت کرتی ہیں، اس میں ایک باریک اشارہ ہے کہ اس کی قدرت کی نشانیاں اگرچہ بظاہر بہت زیادہ ہیں لیکن ان چیزوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو اس کے غیبی خزانوں میں پوشیدہ ہیں۔ اولی الالباب سے مراد عقل سلیم رکھنے والے لوگ ہیں، جو خالق کے بدائع اور صنائع میں غور و فکر کرتے ہیں۔

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ: یہ نشانیاں ایسی ہیں کہ عقل والے ان کو دیکھتے ہیں اور ان کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب: یہ جو کچھ آپ نے پیدا فرمایا ہے بے کار، عبث اور لایعنی نہیں ہے۔ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تو ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔ درمیان میں ان عقل والوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ یہ لوگ کھڑے اور لیٹے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ زبان سے اور دل سے اللہ کو یاد کرتے ہیں اللہ کی ذات وصفات کا تذکرہ کرنا اس کی تکوین و تخلیق بیان کرنا اس کی قدرت اور حکمت کا تذکرہ کرنا یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہے جن لوگوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے وہی حقیقت میں عقل والے ہیں اور ان کے عقل مند اور عارف ہونے کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں، کھڑے ہوں چل رہے ہوں کسی حال میں ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ (انوار البیان)

رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ: دانشمندوں اور عاقلوں کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں انتہائی درجہ کی زاری کی جارہی ہے کہ ہمارے پروردگار! اگر تو نے ہمیں دوزخ میں پھینک دیا تو تو نے ذلیل ورسوا کر دیا، ایسی صورت میں ظالموں کا کوئی مددگار اور پرسان حال نہیں ہوگا۔

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ: یہ لوگ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے ایک پکارنے والے سے سنا جو ایمان لانے کو پکارتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لائے اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دے۔ پکارنے والے سے مراد اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ ہیں، جو وحی الٰہی کی روشنی میں انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں، محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منادی سے مراد قرآن کریم ہے، اس لیے کہ سب لوگ نبی کریم ﷺ کو نہیں سن سکتے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر الدر المنثور میں لکھتے

ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مومن جن کی بات نقل فرمائی جس نے کہا تھا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ مومن انسان کی بات سنا رہے ہیں جس نے کہا کہ ہم نے ایک منادی کو ایمان کی طرف بلاتے ہوئے سنا ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منادی سے اکثر مفسرین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، بعض کے ہاں منادی سے مراد قرآن کریم ہے، ان کی یہ بات اس لحاظ سے اولیٰ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر شخص دیکھ نہیں سکتا جب کہ قرآن کریم کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے۔

رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلَى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ: ایمان اور اعمال صالحہ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جو اجر و ثواب عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے، اس میں اس کے ملنے کی عاجزانہ درخواست ہے، اعمال میں جو کمی اور کوتاہی ہو اس سے درگزر فرما کر وہی ثواب پورا پورا عطا کیجیے، جس کا رسولوں کی زبانی وعدہ فرمایا ہے اور بعض حضرات نے مَا وَعَدْتَّنَا سے نصرت علی الاعداء یعنی دشمنوں کے مقابلہ میں مدد فرمانے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ مراد لیا ہے، اگر نصرت علی الاعداء مراد لیا جائے تو اس سے عطا دنیوی مراد ہو گی جیسا کہ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ سے عطاء اُخروی مراد ہے جسے آخرت میں ثواب مل گیا اور وہاں کے عذاب سے محفوظ ہو گیا وہ وہاں کی رسوائی سے بچ گیا، إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ، بلاشبہ آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے، ان الفاظ میں اپنی دعاؤں کی مقبولیت کا یقین ظاہر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے وعدے سچے ہیں جو دعائیں ہم نے کی ہیں وہ ضرور قبول ہوں گی۔ (انوار البیان)

مناجات و دعا کی قبولیت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ

الثَّوَابِ {۱۹۵} آل عمران

جواب ترجمہ: پس اللہ پاک نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں ضائع نہ کروں گا تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک دوسرے سے ہو سو جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ان کو ایذا دی گئی اور انہوں نے جنگ کی اور قتل کیے گئے سو میں ضرور ضرور ان کے گناہوں کا کفارہ کر دوں گا، اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یہ بدلہ ملے گا اللہ کے پاس سے اور اس کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

شان نزول: حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں ہجرت کے بارے میں اللہ کو عورتوں کا کوئی ذکر کرتے نہیں سنتی اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی، فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى: سو ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول فرمالیا اور فرمایا کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، اعمال کا ثواب سب کو ملے گا، جو کبھی کوئی فرد ایمان قبول کرے گا، اعمال صالحہ میں لگے گا، دعائیں کرے گا اس کا کچھ بھی ضائع نہ ہو گا، جیسے مردوں کے اعمال صالحہ مقبول ہیں اسی طرح عورتوں کے اعمال صالحہ بھی مقبول ہیں۔ (انوار البیان)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ رَبَّنَا کے ساتھ برابر دعائیں مانگتے رہے یہاں تک کہ ان کے رب نے ان کی دعائیں قبول کر لیں۔ (الوسیط) امام جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس شخص کو کوئی کام پیش آئے تو وہ پانچ مرتبہ رَبَّنَا کے ساتھ دعا کرے اللہ تعالیٰ اسے اس کام سے نجات دے دیں گے جس میں وہ خوف زدہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے وہ عطا کریں گے جس کی اس نے دعا کی،، ان سے پوچھا گیا کہ وہ کیسے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم چاہو تو اللہ کا یہ فرمان پڑھو الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَاماً ... إلخ یہ وہ اخیار (اللہ کے چنے ہوئے بہترین لوگ) تھے جنہوں نے اپنے رب کو پانچ بار پکارا تو اللہ نے ان کی دعاؤں کو قبول فرمایا۔ (الوسیط) فَاسْتَجَابَ میں فا دعا کے جلدی قبول ہونے پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ فا تعقیب کے لیے ہے، چونکہ ان لوگوں نے قلب سلیم کے ساتھ دعائیں کی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے بغیر تاخیر کے ان کی دعائیں قبول فرمائیں۔ (الوسیط) استجاب یہاں اجاب

کے معنٰی میں ہے یعنی اس نے دعا قبول کی، جمہور علماء کے نزدیک "سین" اور "تا" تاکید کے لیے ہیں، جیسے استوقد اور استخلص میں۔ (الوسیط)

بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ: تمہارے بعض بعض سے ہیں، کلبی نے کہا یعنی دین میں باہم مدد کرنے میں اور آپس کی دوستی میں، بعض نے کہا نسب اور انسانیت میں ایک کا دوسرے سے ہونا مراد ہے، کیونکہ سب آدم و حوا کی اولاد ہیں، ہر مرد بھی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے (باستثناء آدم و حوا) اور ہر عورت بھی مرد کی پشت سے پیدا ہوتی ہے، پس عورتوں کو بھی اعمال کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح مردوں کو، علم پر عمل کرنے والوں سے جو وعدہ کیا ہے اس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی شرکت ظاہر کرنے کے لیے یہ جملہ معترضہ بیان کیا۔ (مظہری)

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ: پھر جن لوگوں نے وطن چھوڑے اور اپنی بستیوں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ان کو دکھ دیئے گئے، میری راہ سے مراد ہے میری اطاعت اور میرے دین کی راہ میں یا مجھ پر ایمان لانے کی وجہ سے اور میرے سبب سے۔ وہ میری راہ میں لڑے اور مارے گئے۔ میں ضرور ضرور دور کر دوں گا ان سے ان کے گناہ یعنی ان کے گناہ مٹا دوں گا اور مغفرت کر دوں گا اور ان کو ضرور ضرور ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ (مظہری)

ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ: اللہ کی طرف سے ثواب کے طور پر۔ مبرد نے کہا ثوابًا مفعول مطلق تاکیدی ہے فعل محذوف ہے یعنی لَأُثَيِّبَنَّهُمْ ثَوَابًا میں ان کو ضرور بالضرور یقیناً ثواب عطا کروں گا۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ثواباً جنّٰت سے حال قرار دیا جائے یعنی جنات بطور ثواب دی جائیں گی۔ شاید مِن عِندِ اللّٰہِ ثَوابًا کہنے سے یہ مراد ہو کہ جنات سے بڑھ کر کوئی اور ثواب محض خداداد ان کو ملے گا، اس وقت ثواباً حال نہ ہو گا بلکہ فعل محذوف کا مفعول ہو گا کیونکہ یہ ثواب جنات سے غیر ہو گا یہ ثواب جنات کے علاوہ اللہ کی طرف سے محض عطا ہو گی اور یہ ثواب ان کے اعمال کی جزا ہو گا مگر ہو گا اللہ کی مہربانی سے۔ (مظہری)

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ: حُسْن سے مراد حَسَن ہے اور صفت کی اضافت موصوف کی جانب ہے، یا سب سے اچھا ثواب مراد ہے جس پر کوئی قدرت نہ رکھتا ہو یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے قرب کے بکثرت درجات ہیں اور اس کا قرب تمام جنات اور جنات کی نعمتوں سے بہتر ہے۔ (مظہری)

مومن اور کافر کی زندگی

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز بتایئے کہ ان کا شانِ نزول کیا ہے؟

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ {۱۹۶} مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ {۱۹۷} لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ {۱۹۸} آل عمران.

جواب ترجمہ: اے میرے حبیب! کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکا نہ دے۔ یہ دنیا کا تھوڑا سا فائدہ ہے پھر آخرت میں تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے، اور جو اللہ کے پاس ہے بہتر ہے نیک بندوں کے لیے۔

شان نزول: یہ آیت لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، کیونکہ وہ بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے، وہ تجارت کیا کرتے تھے اور خوش عیشی کی زندگی بسر کرتے تھے، اس پر بعض اہلِ ایمان نے کہا کہ اللہ کے دشمنوں کو ہم اچھی حالت میں دیکھ رہے ہیں اور ہم خود بھوک اور مشقت کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔ (اسباب النزول علامہ واحدی)

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کافروں کی بدمستی کے سامان تعیش ان کی راحت و آرام ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کی طرف اے نبی آپ نظریں نہ ڈالیں یہ سب عنقریب زائل ہو جائے گا اور صرف ان کی بداعمالیاں عذاب کی صورت میں ان کیلئے باقی رہ جائیں گی ان کی یہ تمام نعمتیں آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں اسی مضمون کی بہت سی آیتیں قرآن کریم میں ہیں مثلاً مَا يُجَادِلُ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (غافر ۴)

اللہ کی آیتوں میں کافر ہی جھگڑتے ہیں ان کا شہروں میں گھومنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈالے، دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ (النحل:۱۶) جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے۔

مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَأْوَاھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِھَادُ: دنیا میں چاہے تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں لیکن آخر کار تو انہیں ہماری طرف ہی لوٹنا ہے پھر ہم انہیں ان کے کفر کی پاداش میں سخت تر سزائیں دیں گے ارشاد ہے نُمَتِّعُھُمْ قَلِیْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّھُمْ اِلٰی عَذَابٍ غَلِیْظٍ (لقمان:۲۴) انہیں ہم تھوڑا سا فائدہ پہنچا کر پھر گہرے عذابوں کی طرف بے بس کر دیں گے۔

سورۃ الطارق میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَمَھِّلِ الْکَافِرِیْنَ اَمْھِلْھُمْ رُوَیْدًا (الطارق:۱۷) کافروں کو کچھ مہلت دے دے، سورۃ القصص میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰہُ وَعْدًا حَسَنًا فَھُوَ لَاقِیْہِ کَمَنْ مَّتَّعْنٰہُ مَتَاعَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ثُمَّ ھُوَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ (القصص:۶۱) کیا وہ شخص جو ہمارے بہترین وعدوں کو پالے گا اور وہ جو دنیا میں آرام سے گزار رہا ہے لیکن قیامت کے دن عذابوں کیلئے حاضری دینے والا ہے برابر ہو سکتے ہیں؟

لٰکِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خَالِدِیْنَ فِیْھَا: مسلمانوں کی عمدہ حالت کا بیان ہو رہا ہے، مذکورہ عمدہ صفات ان اہل تقویٰ کی ہیں، جنہوں نے شرک و معاصی سے پرہیز کیا، بچتے رہے، ان لوگوں کے لیے جنتیں ہیں، جن کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کہیں یہاں سے جانا نہیں ہو گا۔

نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ: ان صفات والے لوگوں کی اللہ تعالیٰ کے ہاں مہمانی ہو گی، نزل وہ چیز ہوتی ہے جو مہمان کی آمد پر اس کے لیے تیار کی جاتی ہے، چاہے وہ از قبیل مطعومات ہو یا مشروبات ہو، یا استقبال کے طور پر مہمان کا دل جیتنے کے لیے کیا جاتا ہے، یہ سب نزل یعنی مہمان نوازی میں آتا ہے، کیا خوش نصیبی ہے کہ اللہ کی میزبانی میں ہو گا، دنیا میں کسی بڑے کا مہمان بن کر جائے تو انسان پھولے نہیں سماتا تو جو اللہ کا مہمان ہو گا اس کو کس قدر مسرت و شادمانی ہو گی۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیکوکاروں کے لئے بہتر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں إنما سُمُّوا الأبرار لِأَنَّهُم بَرُّوا الآبَاءَ وَالأَبْنَاءَ، كَمَا أَنَّ لِوَالِدَيْكَ عَلَيْكَ حَقًّا، كَذَالِكَ لِوَلَدِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ، انہیں ابرار اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ماں باپ کے ساتھ اور اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرتے تھے جس طرح تیرے ماں باپ کا تجھ پر حق ہے اسی طرح تیری اولاد کا تجھ پر حق ہے (ابن عدی فی الکامل ج ۴ ص ۳۲۳، بخاری فی الادب المفرد ص ۹۴)

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں اَلأَبرَارُ الَّذِينَ لَا يُؤذُونَ الذَّرَّ (تفسیر ابن کثیر) ابرار وہ ہیں جو کسی کو تکلیف نہ دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مَا مِن نَفْسٍ بَرَّةٍ وَّلَا فَاجِرَةٍ إِلَّا المَوت خَيرٌ لَّهَا، لَئِن كَانَ بَرًّا لَقَد قَالَ اللهُ: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِلأَبْرَارِ (آل عمران:۱۹۸) ہر شخص کیلئے خواہ نیک ہو خواہ بد موت اچھی چیز ہے اگر نیک ہے تو جو کچھ اس کیلئے اللہ کے پاس ہے وہ بہت ہی بہتر ہے اور اگر بد ہے تو اللہ کے عذاب اور اس کے گناہ جو اس کی زندگی میں بڑھ رہے تھے اب ان کا بڑھنا ختم ہوا، اور دوسری کی دلیل آیت وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (آل عمران:۱۷۸) ہے یعنی کافر ہماری ڈھیل دینے کو اپنے حق میں بہتر نہ خیال کریں یہ ڈھیل ان کے گناہوں میں اضافہ کر رہی ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔

اہل کتاب میں ایک قابل تعریف فرقہ

سوال اس آیت مبارکہ کی تفسیر کیجیے

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَن يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلّٰهِ لاَ يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ ثَمَناً قَلِيلاً أُوْلٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ{۱۹۹} آل عمران.

جواب ترجمہ: اور بلاشبہ بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا آپ کی طرف اور جو نازل کیا گیا ان کی طرف جو عاجزی کرنے والے ہیں اللہ کے لیے، وہ نہیں

خریدتے اللہ کی آیات کے بدلہ تھوڑی سی قیمت، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس، بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

شان نزول: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی، اس کا شان نزول یہ ہے کہ جب نجاشی کی وفات ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی روز اس کی موت کی خبر دی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ باہر نکلو اور اپنے اس بھائی کی نماز جنازہ پڑھو، جس کی وفات تمہاری سرزمین سے باہر ہوئی ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ نجاشی ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع کی طرف نکلے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مدینہ شریف سے حبشہ تک کی زمین کے پردے اٹھا دیے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کا تابوت دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز جنازہ پڑھی اور چار تکبیریں کہیں اور نجاشی کے لیے دعاء مغفرت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اس کے لیے دعاء مغفرت مانگو، اس پر منافقین نے کہا کہ اسے دیکھو کہ یہ ایک حبشی نصرانی کی نماز جنازہ پڑھ رہا ہے، جس کو اس نے کبھی دیکھا تک نہیں ہے، پھر اس کے دین پر بھی نہیں ہے، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔

② مستدرک حاکم میں ہے کہ نَزَلَ بِالنَّجَاشِي عَدُوٌّ مِّن أَرضِهِم، فَجَاءَهُ المُهَاجِرُونَ فَقَالُوا: نُحِبُّ أَن نَخْرُجَ إِلَيهِم حَتَّى نُقَاتِلَ مَعَكَ، وَتَرَى جُرأَتَنَا، وَنُجزِيكَ بِمَا صَنَعتَ بِنَا فَقَالَ: لَا دَوَاءَ بِنُصرَةِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ خَيْرٌ مِن دَوَاءٍ بِنُصرَةِ النَّاسِ (مستدرک (۲/ ۳۰۰) نجاشی کا ایک دشمن اس کی سلطنت پر حملہ آور ہوا تو مہاجرین رضی اللہ عنہم نے کہا کہ آپ اس سے مقابلہ کرنے کیلئے چلئے ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں آپ ہماری بہادری کے جوہر دیکھ لیں گے اور جو حسن سلوک آپ نے ہمارے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ بھی اتر جائے گا لیکن نجاشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ لوگوں کی امداد کے ساتھ بچاؤ کرنے سے اللہ کی امداد کا بچاؤ بہتر ہے اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَن يُؤْمِنُ بِاللهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ: اللہ تعالیٰ اہل کتاب کے اس فرقے کی تعریف کرتا ہے جو پورے ایمان والا ہے، قرآن کریم کو بھی مانتا ہے اور اپنے نبی کی کتاب پر بھی ایمان رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ڈر دل میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کے حکموں کی بجا آوری میں نہایت

تندہی کے ساتھ مشغول ہے، رب کے سامنے عاجزی اور گریہ وزاری کرتا رہتا ہے نبی اکرم ﷺ کے جو پاک اوصاف اور صاف نشانیاں ان کی کتابوں میں ہیں اسے دنیا کے بدلے چھپاتا نہیں بلکہ ہر ایک کو بتاتا ہے اور آپ ﷺ کی رسالت کو مان لینے کی رغبت دلاتا ہے۔ یہاں قرآن کریم پر ایمان لانے کا ذکر پہلے کیا گیا، جب کہ دوسری کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم عرش بریں کا آخری پیغام اور اللہ کی آخری کتاب ہے، اللہ کی ساری کتابوں پر جب تک ایمان نہیں لایا جائے گا ایک کتاب پر ایمان لانا معتبر نہیں ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم پچھلی ساری کتابوں پر نگہبان وامین ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے مہیمن (نگہبان) قرار دیا ہے، جو اس کے موافق ہو گا وہ حق ہے اور جو اس کے مخالف ہو گا وہ باطل ہے، اس لیے اس کا باقی کتابوں سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

خَاشِعِينَ لِلّٰهِ: قرآن کریم پر ایمان، تورات، زبور اور انجیل پر ایمان لانے کے باوجود وہ لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کے لیے عاجزی اختیار کرتے ہیں، اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، اس کی رضا وخوشنودی کے طلب گار ہیں۔

لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ ثَمَناً قَلِيلاً: وہ اللہ کی آیات کو تھوڑے معاوضے میں فروخت نہیں کرتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں تبدیلی نہیں کرتے، نبی کریم ﷺ کی صفات اور نشانیاں دنیوی اغراض ومقاصد کے لیے تبدیل نہیں کرتے، متاع قلیل کو ترجیح نہیں دیتے، دین کے بدلے میں اگر سونے چاندی کے بھرپور خزانے بھی مل جائیں تو وہ متاع قلیل اور حقیر پونجی ہے۔

أُولٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ: یہ لوگ جن کی صفات قرآن کریم نے بیان کی ہیں ان کا اجر وثواب اللہ کے پاس ہے، علامہ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی پانچ صفات ایسی بیان فرمائی ہیں جو ان کے دلوں کی صفائی وپاکیزگی پر دلالت کرتی ہیں اور یہ قرآن کریم کا وہ انصاف ہے جو ان ہدایت یافتہ اہل کتاب کے لیے بیان کیا گیا ہے، قرآن کریم نے ان کی صفائی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہیں ان میں وہ بھی ہیں جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ کی

آیات تلاوت کرتے ہیں، یہ لوگ سجدہ ریزیاں کرتے ہیں، ان میں ایک معتدل امت بھی ہے، ان لوگوں کو ان کے اعمال صالحہ اور اعمال حمیدہ کا اجر الگ سے ملے گا۔ ایسی جماعت اللہ تعالیٰ کے پاس اجر پائے گی خواہ وہ یہودیوں کی ہو خواہ نصرانیوں کی، سورہ قصص میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (الانعام:۲۰) جنہیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دے رکھی ہے وہ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جب یہ کتاب ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ برحق کتاب ہمارے رب کی ہے ہم تو پہلے سے ہی اسے مانتے تھے انہیں ان کے صبر کا دوہرا اجر دیا جائے گا اور جگہ ہے جنہیں ہم نے کتاب دی اور جسے وہ صحیح طور پر پڑھتے ہیں وہ تو اس قرآن پر بھی فوراً ایمان لاتے ہیں اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ (الاعراف:۱۵۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے بھی ایک جماعت حق کی ہدایت کرنے والی اور حق کے ساتھ عدل کرنے والی ہے۔

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَیْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ (آل عمران: ۱۱۳) یعنی اہل کتاب سب یکساں نہیں ان میں ایک جماعت راتوں کے وقت بھی اللہ کی کتاب پڑھنے والی ہے اور سجدے کرنے والی ہے۔

اور جگہ ہے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم کہو کہ لوگو: تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جنہیں پہلے سے علم دیا گیا ہے جب ان کے سامنے اس کلام مجید کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، تو وہ اپنے چہروں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے یقیناً اس کا وعدہ سچا ہے اور سچا ہو کر رہنے والا ہے، یہ لوگ روتے ہوئے منہ کے بل گرتے ہیں اور خشوع و خضوع میں بڑھ جاتے ہیں یہ صفتیں یہودیوں میں پائی گئیں گو بہت کم لوگ ایسے تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور انہی جیسے دوسرے لوگ۔

قرآن کریم میں سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا (المائدہ:۸۲) مطلب یہ ہے کہ ایمان والوں سے عداوت اور دشمنی رکھنے

میں سب سے زیادہ بڑھے ہوئے یہود ہیں اور مشرک اور ایمان والوں سے محبت رکھنے میں پیش پیش نصرانی ہیں، اب فرماتا ہے ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم کے مستحق ہیں۔

حدیث میں یہ بھی آچکا ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابو طالب نے جب سورہ مریم کی تلاوت شاہ نجاشی کے دربار میں بادشاہ، اراکین سلطت اور علماء نصاریٰ کے سامنے کی اور اس میں آپ پر رقت طاری ہوئی تو بَكَى وبَكَوْا مَعَهُ، حَتَّى أَخْضَبُوا لِحَاهُم (تفسیر ابن کثیرؒ) سب حاضرین دربار مع بادشاہ رو دیئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ روتے روتے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں۔

نجاشی کے انتقال کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو دی اور فرمایا کہ إِنَّ أَخًا لَّكُم بِالْحَبَشَةِ قَد مَاتَ فَصَلُّوا عَلَيهِ، فَخَرَجَ (بِهِم) إِلَى الصَّحرَآءِ، فَصَفَّهُم، وَصَلَّى عَلَيهِ (بخاری و مسلم) تمہارا بھائی حبشہ میں انتقال کر گیا ہے اور اس کے جنازے کی نماز ادا کرو اور میدان میں جا کر صحابہ رضی اللہ عنہم کی صفیں مرتب کر کے آپ نے ان کے جنازے کی نماز ادا کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ لَمَّا مَاتَ النَّجَّاشِي كُنَّا نُحَدِّثُ أَنَّهُ لَا يَزَالُ يُرَى عَلَى قَبرِهِ نُورٌ (ابی داؤد) نجاشی کے انتقال کے بعد ہم یہی سنتے رہے کہ ان کی قبر پر نور دیکھا جاتا ہے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ يَعنِي: مُسلِمَةَ أَهلِ الكِتَابِ (ابن ابی حاتم) اس سے مراد اہل کتاب کے مسلمان لوگ ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں هُم أَهلُ الكِتَابِ الَّذِينَ كَانُوا قَبلَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ، فَاتَّبَعُوهُ وَعَرَفُوا الإِسلَامَ، فَأَعطَاهُم اللهُ تَعَالَى أَجرَ اِثنَين لِلَّذِي كَانُوا عَلَيهِ مِنَ الإِيمَانِ قَبلَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَبِالَّذِي اتَّبَعُوا مُحَمَّدًا ﷺ. (ابن ابی حاتم) اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے اسلام کو پہچانتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کا بھی شرف انہیں حاصل ہوا تو انہیں اجر بھی دوہرا ملا ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے ایمان کا دوسرا اجر آپ پر ایمان لانے کا۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ثَلَاثَةٌ يُؤتَونَ أَجرَهُم مَرَّتَينِ فَذَكَرَ مِنهُم: وَرَجُلٌ مِّن أَهلِ الكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِي، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر

ملتا ہے جن میں سے ایک اہل کتاب کا وہ شخص ہے جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر مجھ پر ایمان لایا اور باقی دو کو بھی ذکر کیا۔ (بخاری و مسلم)

إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ یعنی حساب کا دن کچھ دور نہیں، جلد آنے والا ہے اور جب حساب شروع ہو گا تمام دنیا کا پائی پائی حساب بہت جلد بے باق کر دیا جائے گا۔ (عثمانی) (سو وہاں کسی کو انتظار کی بھی زحمت نہ اٹھانا پڑے گی) حشر کے مجمع عظیم کو دنیوی مجمعوں کی بھیڑ بھاڑ اور دنیوی عدالتوں کی تعویق اور تاخیر پر ہرگز قیاس نہ کیا جائے۔ (ماجدی) یہ حقیقت ہے کہ اللہ جلد حساب کر لینے والا ہے کیونکہ وہ اعمال اور اعمال کے لائق جزاء سزا سے واقف ہے اور سوچنے کی اس کو ضرورت نہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ اللہ تمام مخلوق کا حساب آدھے دن کی بقدر مدت میں طے کر دے گا اور آدھا دن بھی دنیا کے ایک دن کے آدھے کے برابر۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ جس اجر کا وعدہ کیا گیا ہے وہ بہت جلد ملنے والا ہے۔ سرعت حساب سے مجازاً مراد ہے جلد بدلہ دینا۔ (مظہری) اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب کے پیمانوں کا کامل و مکمل علم ہے، اسی کے پاس استحقاق کے مراتب ہیں، ہر ایک کے لیے جزا و سزا کیا ہے وہ سب جانتا ہے۔

صبر، مصابرہ، مرابطہ اور تقویٰ کا حکم

سوال اس آیت کریمہ میں ایمان والوں کو کیا نصیحتیں کی گئی ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ {۲۰۰} (آل عمران)

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ کے وقت مضبوط رہو اور لگے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔

شان نزول: ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے ایک دن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا اے میرے بھتیجے! جانتے ہو اس آیت کا شان نزول کیا ہے؟ انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں آپ نے فرمایا سنو اس وقت کوئی غزوہ نہ تھا یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو مسجدوں کو آباد رکھتے تھے اور نمازوں کو ٹھیک وقت پر ادا کرتے تھے پھر اللہ کا ذکر کرتے تھے انہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم پانچوں نمازوں پر جمے

رہو اور اپنے نفس کو اور اپنی خواہش کو روکے رکھو اور مسجدوں میں بسیرا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یہی اعمال موجب ایمان ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ: یہاں بتایا گیا کہ اے اھلِ ایمان: تم اطاعت، مصیبت اور گناہوں سے بچاؤ پر صبر سے کام لو، کفار کے مقابلہ کے وقت مضبوطی اختیار کرو اور جہاد کرو اور اپنے تمام حالات میں تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تم جنت میں چلے جاؤ اور دوزخ سے بچ جاؤ۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے علوم کے اصول و فروع کی بہت سی اقسام بیان کی ہیں، اصول میں وہ چیزیں ہیں جو توحید، عدل، نبوت اور آخرت کو ثابت کرتی ہیں، فروع میں وہ چیزیں شامل ہیں جو احکام سے متعلق ہیں جیسے حج اور جہاد وغیرہ، اس سورۃ کو اس آیت مبارکہ پر ختم فرمایا جو تمام تر آداب پر مشتمل ہے، اس لیے کہ انسانی احوال کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو انسان کی ذات کے ساتھ متعلق ہیں اور دوسری وہ جو انسان اور اس کے علاوہ دوسروں میں مشترک ہیں، پہلی قسم میں لازمی طور پر صبر شامل ہے، دوسری قسم میں ضروری طور پر مصابرہ شامل ہے، صبر کے تحت بہت سی انواع شامل ہیں۔ ① پہلی یہ کہ نظر کی مشقت پر صبر کرے، توحید، عدل، نبوت اور آخرت کو پہچاننے میں استدلال پر صبر کرے۔ ② دوسری یہ کہ واجبات اور مستحبات کی ادائیگی پر آنے والی مشقت کو برداشت کرے۔ ③ تیسری یہ کہ جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے بچنے کی مشقت پر صبر کرے۔ ④ چوتھی یہ کہ دنیا کے مصائب، بیماری، فقر، قحط اور خوف جیسی آفات پر صبر کرے۔

اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ تم صبر کرو اس کے تحت یہ ساری اقسام داخل ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک قسم کے تحت بے شمار انواع و اقسام داخل ہیں جن کا کوئی شمار نہیں ہے، پھر مصابرہ کا لفظ ہے، مصابرہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ناپسندیدہ اُمور کو برداشت کرنا جو اس انسان اور اس کے غیر کے درمیان واقع ہیں، اس میں گھر والوں، پڑوسیوں، قریبی رشتہ داروں کی طرف سے اخلاقی گراوٹ کے واقعات کو برداشت کرنا شامل ہے، اس میں ان لوگوں سے انتقام لینا ترک کرنا بھی داخل ہے جو انسان کے ساتھ برائی کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف: ۱۹۹) جاہلوں

سے منہ پھیر لو۔ اسی طرح ارشاد فرمایا کہ وَإِذا مَرُّوا بِاللَّغوِ مَرُّوا كِراماً (الفرقان: ۷۲) جب ان جہلاء کے پاس سے گزرتے ہیں تو شرافت سے گزر جاتے ہیں۔ اس میں دوسروں کو ترجیح دینا بھی داخل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَيُؤثِرُونَ عَلى أَنفُسِهِم وَلَو كانَ بِهِم خَصاصَةٌ (الحشر: ۹) یہ لوگ اپنی جانوں پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ انسان ان کو معاف کر دے جو اس پر زیادتی کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وَأَن تَعفُوا أَقرَبُ لِلتَّقوىٰ (البقرہ: ۲۳۷) تو معاف کر دے تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی داخل ہے، اس لیے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وجہ سے انسان کو تکلیف پہنچتی ہے، اس پر وہ صبر کرے۔

اس میں جہاد بھی داخل ہے، اس لیے کہ جہاد نام ہے اپنے کو ہلاکت کی وادی میں اتارنے کا، اس میں جھٹلانے والوں کے مقابلے میں مصابرہ بھی داخل ہے، ان کے شکوک وشبہات کو دور کرنا بھی اس میں شامل ہے، اس میں وہ تمام حیلے شامل ہیں جن کے ذریعے انسان اہل باطل کے شبہات کو دور کرتے ہوئے اپنے دین کو درست طریقے سے ثابت کرتا ہے، اس لیے صبر کرو میں یہ ساری چیزیں بھی داخل ہوئیں جو انسان کی ذات سے متعلق ہیں اور مصابرہ بھی ثابت ہوا جو اس کے اور دوسروں کے درمیان مشترک باتیں ہیں۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں أُمِرُوا أَن يَّصبِرُوا عَلَى دِينِهِم الَّذِي ارتَضَاهُ اللهُ لَهُم، وَهُوَ الإِسلَامُ، فَلَا يَدَعُوهُ لِسَرَّاءِ وَلَا لِضَرَّاءِ وَلَا لِشِدَّةٍ وَّلَا لِرَخَاءٍ، حَتَّى يَمُوتُوا مُسلِمِينَ، وَأَن يُّصَابِرُوا الأَعدَاءَ الَّذِينَ يَكتُمُونَ دِينَهُم (ابن کثیرؒ) وہ اس بات کا حکم دیے گئے ہیں کہ اپنے دین پر ڈٹے رہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اور وہ دین اسلام ہے، وہ اسے خوشی، غمی، سختی اور نرمی کسی حال میں نہ چھوڑیں، یہاں تک کہ انہیں موت آجائے اور یہ بات کہ ان دشمنوں کے سامنے بھی صبر سے کام لیں جو اپنے دین کو چھپاتے ہیں۔

مرابطہ کہتے ہیں اَلمُدَاوَمَةُ فِي مَكَانِ العِبَادَةِ وَالثَّبَاتِ عبادت کی جگہ میں ہمیشگی کرنے کو اور

ثابت قدمی سے جم جانے کو اور کہا گیا ہے اِنتِظَارُ الصَّلَاۃِ بَعدَ الصَّلَاۃِ، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کو۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں أَلَا أُخبِرُکُم بِمَا یَمحُو اللّٰہُ بِہِ الخَطَایَا، وَیَرفَعُ بِہِ الدَّرَجَات؟ إِسبَاغُ الوُضُوءِ عَلَی المَکَارِہِ، وَکَثرَۃِ الخُطَا إِلَی المَسَاجِدِ، وَانتِظَارِ الصَّلَاۃِ بَعدَ الصَّلَاۃِ، فَذَالِکُمُ الرِّبَاطُ، فَذَالِکُمُ الرِّبَاطُ، فَذَالِکُمُ الرِّبَاطُ (موطأ فی قصر الصلاۃ، مسلم۔ السنن الکبریٰ امام نسائی) آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ کس چیز سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور درجوں کو بڑھاتا ہے، تکلیف ہوتے ہوتے بھی کامل وضو کرنا، دور سے چل کر مسجدوں میں آنا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، یہی رباط ہے یہی مرابطہ ہے یہی اللہ تعالیٰ کی راہ کی مستعدی ہے۔

کہا گیا ہے کہ اَلمُرَادُ بِالمُرَابَطَۃِ ھَاھُنَا مُرَابَطَۃُ الغَزوِ فِی نُحُورِ العَدُوِّ، وَحِفظِ ثُغُورِ الإِسلَامِ وَصِیَانَتِھَا عَن دُخُولِ الأَعدَاءِ إِلَی حَوزَۃِ بِلَادِ المُسلِمِینَ، رابطوا سے مراد دشمن سے جہاد کرنا اسلامی ملک کی حدود کی نگہبانی کرنا اور دشمنوں کو اسلامی شہروں میں نہ گھسنے دینا ہے اس کی ترغیب میں بھی بہت سی حدیثیں ہیں اور اس پر بھی بڑے ثواب کا وعدہ ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا رِبَاطُ یَومٍ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ خَیرٌ مِّنَ الدُّنیَا وَمَا عَلَیھَا (بخاری) ایک دن کی یہ تیاری ساری دنیا اور جو اس میں ہے سب سے افضل ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا رِبَاطُ یَومٍ وَّلَیلَۃٍ خَیرٌ مِّن صِیَامِ شَھرٍ وَقِیَامِہِ، وَإِن مَاتَ جَرَی عَلَیہِ عَمَلُہُ الَّذِی کَانَ یَعمَلُہُ، وَأُجرِیَ عَلَیہِ رِزقُہُ، وَأَمِنَ الفَتَّانَ (صحیح مسلم) ایک دن رات کی جہاد کی تیاری ایک ماہ کے کامل روزوں اور ایک ماہ کی تمام شب بیداری سے افضل ہے اور اسی تیاری کی حالت میں موت آجائے تو جتنے اعمال صالحہ کرتا تھا سب کا ثواب پہنچتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس سے روزی پہنچائی جاتی ہے اور فتنوں سے امن پاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کُلُّ مَیِّتٍ یُختَمُ عَلَی عَمَلِہِ، إِلَّا الَّذِی مَاتَ مُرَابِطًا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ، فَإِنَّہُ یُنمٰی لَہُ عَمَلُہُ إِلَی یَومِ القِیَامَۃِ، وَیَأمَنُ فِتنَۃَ القَبرِ (مسند احمد، سنن ابی داود و سنن الترمذی و صحیح ابن حبان (۷/ ۶۹) ہر مرنے والے کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ کی

تیاری میں ہو اور اسی حالت میں مر جائے اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے اور اسے فتنہ قبر سے نجات ملتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا مَنْ رَابَطَ فِي شَيءٍ مِّنْ سَوَاحِلِ الْمُسْلِمِيْنَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، أَجزَأَتْ عَنْهُ رِبَاطَ سَنَةٍ (مسند احمد) جو شخص مسلمانوں کی سرحد کے کسی کنارے پر تین دن تیاری میں گزارے اسے سال بھر تک کی تیاری کا اجر ملتا ہے،

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنے منبر پر خطبہ پڑھتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ سے اپنی سنی ہوئی بات سناتا ہوں، میں نے اب تک ایک خاص خیال سے اسے نہیں سنایا آپ ﷺ نے فرمایا ہے حَرْسُ لَيْلَةٍ فِي سَبِيْلِ اللهِ أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ لَيْلَةٍ يُّقَامُ لَيْلَهَا وَيُصَامُ نَهَارَهَا (مسند احمد) اللہ جل شانہ کی راہ میں ایک رات کا پہرہ ایک ہزار راتوں کی عبادت سے افضل ہے جو تمام راتیں قیام میں اور تمام دن صیام میں گزارے جائیں۔

ترمذی شریف میں ہے کہ حضرت شرحبیل بن سمط رضی اللہ عنہ محافظت سرحد میں تھے اور زمانہ زیادہ گزر جانے کے بعد کچھ تنگ دل ہو رہے تھے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کے پاس پہنچے اور فرمایا آؤ میں تجھے پیغمبر ﷺ کی ایک حدیث سناؤں آپ ﷺ نے فرمایا ہے رِبَاطَ يَوْمٍ فِي سَبِيْلِ اللهِ أَفْضَلُ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَمَنْ مَاتَ فِيْهِ وُقِيَ فِتْنَةَ الْقَبْرِ، وَنَمَا لَهُ عَمَلُهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (ترمذی) ایک دن سرحد کی حفاظت ایک مہینہ کے روزے رکھنے اور رات کو قیام کرنے سے افضل ہے اور جو اسی حالت میں مر جائے وہ فتنہ قبر سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے اعمال قیامت تک جاری رہتے ہیں۔

حضرت سہل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حنین والے دن ہم رسول کریم ﷺ کے ساتھ چلے شام کی نماز میں نے حضور ﷺ کے ساتھ ادا کی اتنے میں ایک گھوڑا سوار آیا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ میں آگے نکل گیا تھا اور فلاں پہاڑ پر چڑھ کر میں نے نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ قبیلہ ہوازن کے لوگ میدان میں جمع ہو گئے ہیں یہاں تک کہ ان کی اونٹنیاں، بکریاں، عورتیں اور بچے بھی ساتھ ہیں حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا تِلْكَ غَنِيْمَةُ الْمُسْلِمِيْنَ غَدًا إِنْ شَآءَ اللهُ، ان شاء اللہ یہ سب کل

مسلمانوں کا مال غنیمت ہو گا۔

پھر فرمایا بتاؤ آج کی رات پہرہ کون دے گا؟ حضرت انس بن ابو مرثد رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ سواری لے کر آؤ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس گھاٹی پر چلے جاؤ اور اس پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جاؤ خبر دار: تمہاری طرف سے ان کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ صبح تک نہ ہو، صبح جس وقت نماز کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے دو سنتیں ادا کیں اور لوگوں سے پوچھا: هَل أَحْسَسْتُمْ فَارِسَكُمْ؟ کیا تم نے اپنے پہرے دار سوار کی تو کوئی آہٹ نہیں سنی؟ لوگوں نے کہا: نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب تکبیر کہی گئی اور آپ نے نماز شروع کی آپ کا خیال اسی گھاٹی کی طرف تھا، نماز سے سلام پھیرتے ہی آپ نے فرمایا: أَبْشِرُوا فَقَدْ جَآءَكُمْ فَارِسُكُمْ خوش ہو جاؤ تمہارا گھوڑے سوار آ رہا ہے، ہم نے جھاڑیوں میں جھانک کر دیکھا تو تھوڑی دیر میں ہمیں بھی دکھائی دیا گیا، آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اس وادی کے اوپر کے حصے پر پہنچ گیا اور ارشاد کے مطابق وہیں رات گزاری، صبح میں نے دوسری گھاٹی بھی دیکھ ڈالی لیکن وہاں بھی کوئی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا رات کو وہاں سے تم نیچے بھی اترے تھے، جواب دیا نہیں، صرف نماز کیلئے اور قضاء حاجت کیلئے نیچے اترا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے اپنے لئے جنت واجب کر لی اب تم اس کے بعد کوئی عمل نہ کرو تو بھی تم پر کوئی حرج نہیں، (ابو داؤد)

مسند احمد میں ہے ایک غزوہ کے موقع پر ایک رات کو ہم بلند جگہ پر تھے اور سخت سردی تھی، یہاں تک کہ لوگ زمین میں گڑھے کھود کھود کر اپنے اوپر ڈھالیں لے لے کر پڑے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت آواز دی کہ مَن يَحْرُسُنَا فِي هَذِهِ اللَّيْلَةِ فَأَدْعُوَ لَهُ بِدُعَاءٍ يَكُونُ لَهُ فِيهِ فَضْلٌ؟ کوئی ہے جو آج کی رات ہماری چوکیداری کرے؟ اور مجھ سے بہترین دعا لے تو ایک انصاری صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کی یا رسول اللہ! میں تیار ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پاس بلا کر نام دریافت کر کے اس کے لئے بہت دعا کی، ابو ریحانہ رضی اللہ عنہ یہ دعائیں سن کر آگے بڑھے اور کہنے لگے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی پہرہ دوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھی پاس بلا لیا اور نام پوچھ کر میرے لئے بھی دعائیں کیں لیکن اس انصاری صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ دعا کم تھی۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا حُرِّمَتِ النَّارُ عَلَى عَيْنٍ دَمِعَتْ أَوْ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ، وَحُرِّمَتِ النَّارُ عَلَى عَيْنٍ سَهِرَتْ فِي سَبِيْلِ اللهِ، اس آنکھ پر جہنم کی آگ حرام ہے جو اللہ کے ڈر سے روئے اور اس آنکھ پر بھی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں رات کو جاگتی رہی۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مَن حَرَسَ مِن وَّرَاءِ الْمُسْلِمِينَ فِي سَبِيْلِ اللهِ مُتَطَوِّعًا لَا بِأُجرَةِ سُلطَانٍ، لَم يَرَ النَّارَ بِعَيْنَيْهِ إِلَّا تَحِلَّةَ القَسَمِ، فَإِنَّ اللهَ يَقُولُ: وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا (مریم:۷۱) جو شخص مسلمانوں کے پیچھے سے ان کا پہرہ دے اپنی خوشی سے بغیر سلطان کی اُجرت و تنخواہ کے وہ اپنی آنکھوں سے بھی جہنم کی آگ کو نہ دیکھے گا مگر صرف قسم پوری ہونے کے لئے جو اس آیت میں ہے آیت وَإِنْ مِنْكُمْ إِلا وَارِدُهَا یعنی تم سب اس پر وارد ہو گئے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا تَعِسَ عَبدُ الدِّينَارِ وعَبدُ الدِّرْهَمِ وعَبدُ الخَمِيصَةِ، إِنْ أُعْطِيَ رَضِيَ، وَإِن لَّم يُعْطَ سَخِطَ، تَعِسَ وَانتَكَسَ، وإِذَا شِيكَ فَلَا انْتَقَشَ طُوبَى لعَبدٍ آخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِه فِي سَبِيلِ اللهِ، أَشعَثَ رأسُهُ، مُغَبَّرَةٍ قَدَمَاهُ، إِنْ كَانَ فِي الحِرَاسَةِ كَانَ فِي الحِرَاسَةِ، وَإِن كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ، إِن استَأذَنَ لَمْ يُؤذَنْ لَّهُ، وَإِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ (صحیح البخاری) دینار کا بندہ برباد ہوا، درہم کا بندہ برباد ہوا، اور کپڑوں کا بندہ برباد ہوا، اگر مال دیا جائے تو خوش ہو جاتا ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے، یہ تباہ و برباد ہو گیا، اگر اسے کانٹا چبھ جائے تو نکالنے کی کوشش بھی نہ کی جائے، خوش خبری ہو اس بندے کے لئے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے اپنے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے ہے، بکھرے ہوئے بال ہیں اور گرد آلود قدم ہیں، اگر چوکیداری پر مقرر کر دیا گیا ہے تو چوکیدارہ کر رہا ہے اور اگر لشکر کے اگلے حصے میں مقرر کر دیا گیا ہے تو وہیں خوش ہے، لوگوں کی نظروں میں اتنا گرا پڑا ہے کہ اگر کہیں جانا چاہے تو اجازت نہ ملے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول نہ ہو۔

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو میدان جنگ سے ایک خط لکھا اور اس میں رومیوں کی فوج کی کثرت، ان کے آلات حرب کی حالت اور ان کی تیاریوں کی کیفیتیں بیان کیں اور لکھا کہ سخت خطرہ کا موقع ہے، یہاں سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا جواب گیا جس میں حمد و ثنا

کے بعد تحریر تھا کہ أَمَّا بَعدُ فَإِنَّهُ مَهْمَا يَنزِلْ بِعَبدِ مُؤمِنٍ مِن مَنزلَةِ شِدَّةٍ يَجعَلُ اللهُ بَعْدَهَا فَرَجًا، وَإِنَّهُ لَن يَّغلِبَ عُسْرٌ يُسْرَينِ، (طبری، مستدرک حاکم) کبھی کبھی مومن بندوں پر سختیاں بھی آجاتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے بعد آسانیاں بھیج دیتا ہے۔ سنو ایک سختی دو آسانیوں پر غالب نہیں آ سکتی سنو پروردگار عالم کا فرمان ہے آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (آل عمران:۲۰۰) حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے سن ۱۷۰ھ یا سن ۱۷۷ھ میں شہر طرطوس میں حضرت محمد بن ابراہیم بن سکینہ رحمہ اللہ کو جب کہ وہ ان کو الوداع کرنے آئے تھے اور یہ جہاد کو جارہے تھے یہ اشعار لکھوا کر حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کو بھجوائے۔

يَا عَابِدَ الحَرَمَيْنِ لَوْ أَبْصَرْتَنَا ..... لَعَلِمْتَ أَنَّكَ فِي الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

مَنْ كَانَ يُخَضِّبُ خَدَّهُ بِدُمُوْعِهِ ..... فَنُحُوْرُنَا بِدِمَائِنَا تَتَخَضَّبُ

أَوْ كَانَ يُتْعِبُ خَيْلَهُ فِي بَاطِلٍ ..... فَخُيُوْلُنَا يَوْمَ الصَّبِيْحَةِ تَتْعَبُ

رِيْحُ الْعَبِيْرِ لَكُمْ وَنَحْنُ عَبِيْرُنَا ... وَحَتَّى السَّنَابِكُ وَالْغُبَارُ الْأَطْيَبُ

وَلَقَدْ أَتَانَا مِنْ مَّقَالِ نَبِيِّنَا ..... قَوْلٌ صَحِيْحٌ صَادِقٌ لَا يَكْذِبُ

لَا يَسْتَوِي وَغُبَارَ خَيْلِ اللهِ فِي ..... أَنْفِ امْرِءٍ وَّدُخَانَ نَارٍ تَلْهَبُ

هَذَا كِتَابُ اللهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا ..... لَيْسَ الشَّهِيْدُ بِمَيِّتٍ لَا يَكْذِبُ

اے مکہ مدینہ میں رہ کر عبادت کرنے والے: اگر تو ہم مجاہدین کو دیکھ لیتا، تو یقیناً تجھے معلوم ہو جاتا کہ تیری عبادت تو ایک کھیل ہے، ایک وہ شخص ہے جس کے آنسو اس کے رخساروں کو تر کرتے ہیں اور ایک ہم ہیں جو اپنی گردن اللہ کی راہ میں کٹوا کر اپنے خون میں آپ نہا لیتے ہیں۔ ایک وہ شخص ہے جس کا گھوڑا باطل اور بیکار کام میں تھک جاتا ہے اور ہمارے گھوڑے حملے اور لڑائی کے دن ہی تھکتے ہیں۔ اگر کئی خوشبوئیں تمہارے لئے ہیں اور ہمارے لئے خوشبو گھوڑوں کے ٹاپوں کی خاک اور پاکیزہ گرد و غبار ہے۔ یقین مانو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچ چکی ہے جو سراسر راستی اور درستی والی بالکل سچی ہے کہ جس کسی کے نام میں اس اللہ تعالیٰ کے لشکر کی گرد بھی پہنچ گئی اس کی ناک میں شعلے مارنے والی

جہنم کی آگ کا دھواں بھی نہ جائے گا اور لو یہ ہے اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب جو ہم میں موجود ہے اور صاف کہہ رہی ہے اور سچ کہہ رہی ہے کہ شہید مردہ نہیں۔

محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب میں نے مسجد حرام میں پہنچ کر حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کو یہ اشعار دکھائے فَلَمَّا قَرَأَهُ ذَرَفَتْ عَيْنَاهُ تو آپ پڑھ کر زار و قطار روئے اور فرمایا ابو عبد الرحمن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان پر ہوں صحیح اور سچ فرمایا اور جو نصیحت نامہ میرے پاس لائے اس کے بدلے میں تمہیں ایک حدیث لکھواتا ہوں وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے درخواست کی کہ يَا رَسُولَ اللهِ عَلِّمنِي عَمَلًا أَنَالُ بِهِ ثَوابَ المُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایسا عمل بتایئے جس سے میں مجاہد کا ثواب پالوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا هَل تَستَطِيعُ أَنْ تُصَلِّيَ فَلَا تَفْتُرَ وَتَصُومَ فَلَا تُفْطِرَ ؟ کیا تجھ میں یہ طاقت ہے کہ نماز ہی پڑھتا رہے اور تھکے نہیں اور روزے رکھتا چلا جائے اور کبھی بے روزہ نہ رہے، اس نے کہا یا رسول الله، أَنَا أَضْعَفُ مِن أَن أَستَطِيعَ ذَالِكَ، اس کی طاقت کہاں؟ میں اس سے بہت ہی ضعیف ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَو طُوِّقْتَ ذَالِكَ مَا بَلَغتَ المُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ أَوَمَا عَلِمتَ أَنَّ الفَرَسَ المُجَاهِدَ لَيَسْتَنُّ فِي طِوَلِهِ فَيُكتَبُ لَهُ بِذَالِكَ الحَسَنَاتُ (مسند احمد) اگر تجھ میں اتنی طاقت ہوتی اور تو ایسا کر بھی سکتا تو بھی مجاہد فی سبیل اللہ کے درجے کو نہ پہنچ سکتا، تو یہ بھی جانتا ہے کہ مجاہد کے گھوڑے کی رسی دراز ہو جائے اور وہ اِدھر اُدھر چر جائے تو اس پر بھی مجاہد کو نیکیاں ملتی ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر حال میں ہر وقت ہر معاملہ میں اللہ کا خوف کیا کرو۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا اِتَّقِ اللهَ حَيْثُمَا كُنتَ وأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلقٍ حَسَنٍ، اے معاذ! جہاں بھی ہو اللہ کا خوف دل میں رکھ اور اگر تجھ سے کوئی برائی ہو جائے تو فوراً کوئی نیکی بھی کر لے تاکہ وہ برائی مٹ جائے اور لوگوں سے خلق و مروّت کے ساتھ پیش آیا کر۔ (معجم طبرانی صغیر، مسند احمد)

الحمد للہ تعالیٰ، آج تفسیر معارف الفرقان پر دوسری بار لکھتے ہوئے سورۃ آل عمران پایہ تکمیل

کو پہنچی ہے، اس سے پہلے والی طباعت میں چیدہ و چنیدہ مقامات کی تفسیر کی گئی تھی، دوبارہ ان متروکہ مقامات کو بھی شامل تفسیر کیا گیا ہے، اس وجہ سے کہیں سے مضامین سابقہ کو ہٹانا پڑا اور کہیں اضافہ کرنا پڑا، یوں سلسلہ مضامین دراز ہوتا چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس دینی کاوش کو قبول فرماتے ہوئے اسے ہماری نجات کا ذریعہ اور صدقہ جاریہ بنائے، آمین

خادم اسلام، **محمود الرشید حدوٹی**

۳۱ مئی ۲۰۲۵ء ۳ ذی الحج ۱۴۴۶ھ بروز ہفتہ، بعد نماز ظہر۔ بمقام حدوٹ۔ مری

نظر ثانی: ۸ جولائی ۲۰۲۵ء بروز منگل، قبیل صلاۃ العصر، جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور